آج کل

اسوج شک سمت ۱۸۸۱
اکتوبر سنہ ۱۹۵۹ء

۵۰ نئے پیسے

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

سرورق:۔ مہاتما گاندھی
رسالے کی پشت پر۔ وادیٔ کلّو کا ایک منظر

اسوج شک سمت ۱۸۸۱

اکتوبر ۱۹۵۹ء

جلد ۱۸ نمبر ۳

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ:۔ ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

۱۵-اگست کو ہم نے آزادی کی ۱۲ ویں سالگرہ منائی۔ اس بارہ سال کی مدت میں ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جو کچھ ہوا ہے وہ ہر اعتبار سے حوصلہ افزا ہے، مگر ابھی ہمارے سامنے بہت سے مسائل ہیں جنھیں حل کرنے کے لئے ملک کے ہر فرد کو جان توڑ کوشش کرنا ہوگی اور یہ تبھی ہو سکتا ہے کہ ہم میں پوری طرح اتحاد و اتفاق رہے اور ملک کا مجموعی مفاد ہمارے پیشِ نظر ہو۔ چنانچہ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اس موقع پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے انتشار اور افتراق کی قوتوں کے مقابلے میں اتحاد برقرار رکھنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم اگر مذہب، ذات پات یا کسی اور بنیاد پر بٹے رہے تو ہم ناکام رہیں گے، اور عوام کے شاندار مستقبل کی تعمیر کی اُمید بھی ختم ہو جائے گی۔ ہمیں ایک بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنا ہے۔ دنیا یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہندوستان، جس نے گاندھی جی جیسی شخصیت کو جنم دیا ہے، کیا کرتا ہے۔

روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف امریکہ کے دورے پر جا رہے ہیں اور اس کے بعد صدر آئزن ہاور روس جائیں گے۔ امن پسند دنیا میں ان دوروں پر بڑی خوشی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس طرح نہ صرف ان دونوں ملکوں کی باہمی کشیدگی ختم ہو جائے گی بلکہ امنِ عالم کے استحکام کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بھی اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ان دوروں سے عالمی کشیدگی کم ہوگی اور آئندہ سربراہوں کی کانفرنس اور دیگر سمجھوتوں کے لئے فضا سازگار ہوگی اور اس کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔

بلاشبہ ہندوستان میں اب انگریزی کی وہ حیثیت قائم نہیں رہ سکتی جو پہلے تھی۔ اس کی جگہ عام کاروبار کے لئے علاقائی زبانوں سے کام لینا ہوگا۔ لیکن ایک ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے انگریزی سے یکدم قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ بقول پنڈت نہرو انگریزی، ترقی یافتہ دنیا سے واقفیت کے لئے ایک کھڑکی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہ کھڑکی بند کر دی گئی تو اس سے خود ملک کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ لوک سبھا میں پنڈت نہرو نے مسٹر انتھونی کے ریزولیوشن پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انگریزی زبان ہندوستان میں ایک مددگار زبان کی حیثیت سے اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ یہاں کے لوگ اس کی ضرورت محسوس کریں گے، اور اس کے بارے میں فیصلہ ہندی نہ جاننے والوں کی رائے سے کیا جائے گا۔

صدرِ جمہوریہ نے اس سال سنسکرت اور فارسی کے جن چار فضلاء کو اعزازی سندیں عطا کی ہیں ان میں فارسی کے مشہور عالم ڈاکٹر ہادی حسن بھی شامل ہیں۔ انھیں ان کی نمایاں علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں یہ اعزاز دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہادی حسن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فارسی کے پروفیسر تھے اور آج کل شانتی نکیتن کے اعزازی وزیٹنگ پروفیسر ہیں۔ آپ ایرانی اکادمی تہران کے بھی اعزازی ممبر ہیں۔ ادارۂ آج کل ڈاکٹر صاحب کو پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہے۔

آسام کے گورنر جناب سید فضل علی کا انتقال پُرملال پورے ملک کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔ آپ نے مختلف حیثیتوں میں ملک کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ آسام کی گورنری سے پہلے آپ عدلیہ کے بلند ترین مراتب پر فائز رہے، اور آپ کو جنوری ۱۹۵۷ء میں 'پدم وبھوشن' کا اعزاز بھی دیا گیا تھا۔

فرنگی محل کے ممتاز عالم مفتی مولانا عبدالقادر صاحب لکھنؤ میں رحلت فرما گئے۔ مرحوم مفتی صاحب خالص خادمِ شریعت تھے اور انھوں نے ساری عمر خدمتِ حدیث میں گزاری ——— اناللہ وانا الیہ راجعون

امن کا دیوتا

ہندوستان کی سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ دورِ حاضر کا سب سے بڑا انسان اس کی خاکِ پاک سے اُٹھ کر عالمِ انسانیت پر چھا گیا۔ ہر سال اکتوبر کی دوسری تاریخ کو ہم اس کا جنم دن مناتے ہیں، اس کی تعظیم کے لئے نہیں بلکہ خود کو پستی سے اُٹھانے کے لئے، اپنے سینوں کو کینے اور بغض کی آلائشوں سے پاک کرنے کے لئے، راستی کے راستے پر چلنے اور ارادوں کو مستحکم بنانے کے لئے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا مردِ مجاہد تھا جس نے نہ صرف مستقیم الحال رہ کر ہندوستان کی خدمت کی بلکہ پوری انسانی قوم کو ایک ایسی راہ دکھائی جہاں فتنہ و فساد اور جنگ و جدل کا گذر نہیں۔ قوموں کی اس جنگِ زرگری میں اس نے ہمیں یہ سبق دیا کہ اہنسا کمزور کا حیلہ نہیں بلکہ طاقتور کا حربہ ہے۔ راہِ یقین سے متزلزل کرنے والے کتنے ہی حادثات نے اُسے روکا لیکن وہ ثابت قدم رہا ؎

مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار
بہ کعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

آئن سٹائن نے گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں فخر کرنا چاہیئے کہ وہ ہمارے عہد میں ہوئے ہیں۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ان کے زمانے میں ہوئے جنھوں نے ان کی تلقینات کو خود اُن سے سنا، جنھوں نے ان کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر خود اُن سے دادِ صداقت لی۔

آج بھی ہم ان کو یاد کر کے انھیں کے مرتب کردہ آئینِ حیات کو اپنے آپ پر نافذ کر سکتے ہیں۔ آج بھی ہم اپنی خامکاریوں سے خود کو بچا کر اس پختہ کار کے عزم و استقلال کو اپنا رہنما بنا سکتے ہیں۔

کاروانِ ملک کا وہ سالار ہم میں آج موجود نہیں۔ لیکن سیاست کے بحرِ ذخار میں وہ روشنی کا مینار اب بھی ہماری ناخدائی کر رہا ہے۔ اس نورِ ہدایت سے اب بھی دلوں کی سیاہیاں کافور ہو رہی ہیں۔ وہ کون سا شعبۂ زندگی ہے جس کو اس نے نہ سنوارا ہو۔ وہ کیسا میدانِ عمل ہے جس میں اس نے کارہائے نمایاں نہ دکھائے ہوں۔ وہ گفتار محبت کا مالی تھا، بیشۂ سیاست کا شیر تھا، ملکِ اخوت کا شہریار تھا، مشرب کا فقیر، دل کا امیر، دیکھنے کو ہڈیوں کی ایک پوٹ جسے نرم سی کھال کے رومال میں قدرت نے لپیٹ کر رکھ دیا ہو لیکن جو اپنے ایمان و یقین سے دنیا پہ بھاری تھا۔ اس نے ہمیں درس دیا تھا کہ خیال سے بھی کسی کو آزردہ نہ کرو۔ اس نے دنیا کو بتایا تھا کہ انسانی مشکلات کا حل صلح و آشتی میں ہے نبرد آزمائی میں نہیں۔ اس نے جبر و استبداد کے سامنے کبھی نہ جھکنے کی قسم کھائی تھی۔ آخر جبر و استبداد اس کے سامنے بلکہ اس کے ادنیٰ خادموں کے سامنے جھک گئے۔ اس نے اپنے خادموں اور ساتھیوں کو بامِ عروج پر پہنچایا خود اس حال مست فقیر نے گلیمِ فقر کو تختِ شاہی سے تعبیر کیا۔ چرب زبان سیاست دانوں نے اُسے ننگا فقیر کہا لیکن انھیں کب معلوم تھا کہ وہ برہنہ تن اور آہنی جگر سورما تنہا اس سلطنت کے آفتابِ جلال و کامرانی کو شکست و ندامت کی تاریکیوں میں ڈبو دے گا جس کا دعویٰ تھا کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

صدیوں کے بعد ایسا روشن ضمیر اور نیک انسان صفحۂ عالم پر نمودار ہوتا ہے۔ آج اس کے یومِ ولادت پر ہم سب کو اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیئے۔ آؤ ہم سب عہد کریں کہ اپنے عزیز ملک اور بنی نوعِ انسان کی بہبود کے لئے اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کر دیں گے۔ اس سے بڑا نہ کوئی ایمان ہے نہ صداقت۔ اور اگر عمل کی یہ صورت ہو جائے تو بہ یک زبان پکار اُٹھیں ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

قاضی عبدالودود

سُلطان القصص مُصنّفۂ مہجور بنارسی

عنایت حسین خاں نصیرالدولہ[1] نصیرالدین علی خاں بہادر صمصام جنگ متخلص بہ نصیر کے بیٹے اور امین الدولہ عزیزالملک علی ابراہیم[2] خاں بہادر نصیر جنگ متخلص بہ حال[3] و خلیل کے پوتے تھے۔ قرینہ ہے کہ یہ بنارس میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ ایک جگہ انھوں[4] نے خود لکھا ہے کہ "بہارِ بوستان دولت آمد" سے ۱۲۰۲ میرا سالِ ولادت معلوم ہوتا ہے اور سنہ ۱۲۷۲ھ میں میری عمر ایک حساب سے ۷۰ اور دوسری سے ۵۶ ہے (تاریخ تحریر ۱۴ ربیع الثانی سنہ ۷۲ھ)، مگر "بہار الخ" سے ۱۲۰۲ نہیں، ۱۲۱۲ مستخرج ہوتا ہے، اور ۱۲۱۲ھ میں متولد ہوئے تو ۷۲ھ میں عمر ۶۰ کے لگ بھگ قرار پاتی ہے۔ طرہ یہ کہ خاتمۂ سلطان القصص میں یہ عبارت ملتی ہے:

"جب کہ سن اس خاکسار کا ۲۵ برس کا تھا، تب یہ شگرف نامہ اس خاکسار نے ۵ برس کے عرصے میں تصنیف کیا تھا اور سلخ ماہ ذیقعد سنہ ۱۲۳۲ھ[5] ... ہجری کو فراغ اس کی تحریر سے حاصل ہوا تھا"

اپنی تعلیم اور تصانیف وغیرہ کے متعلق ان کا بیان ہے:

"اس ہیچمدان کو درس کتب فارسیہ و عربیہ و منطقیہ و طبیہ سے فراغ حاصل ہوا تو دل ... سخنگوئی کا مائل ہوا ... منشی رام جس صاحب مخموم و مجیط کی خدمت ... میں رجوع لایا ... پانچ[6] دیوان اشعار، ایک تذکرۂ[7] شعرائے نادرہ گفتار اور ایک دیوان مثنویات کہ ۱۱۰ مثنوی (کذا) اس میں مندرج ہیں اور ایک قیامت نامہ رقم زدۂ کلک ... ہوئے۔ روزنامیکہ توسن ... عمر ... الواے مسابقت بیست و پنج میں سرگرم تھا ... قصہ خواناں فصیح البیاں تو کہ بیتے، داستانیں کہا کرتے ... الف لیلیٰ (کذا) اور قصۂ چہار درویش دلریش، بہار دانش، عیار دانش، سکندر نامہ، شاہنامہ،

---

[1] نام و خطاب و تخلص دیباچۂ سلطان القصص میں درج ہے۔ غالباً یہ یوسف علی خاں صاحبِ حدیقۃ الصفا وغیرہ کے نواسے تھے۔

[2] خطابات دیباچۂ مذکور سے ماخوذ

[3] خلیل تخلص دیباچۂ مذکور میں، حال تذکرۂ عشقی وغیرہ میں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے خطباتِ دتاسی کے حاشیے میں علی تخلص بتلایا ہے اور خلیل و حال کی تغلیط کی ہے۔ علی تخلص نہ تھا اور تغلیط بے اصل ہے

[4] مہجور کی بیاض ادارۂ تحقیقات اردو کی ادبی نمایش کے لئے علی ابراہیم خاں کے چھوٹے بھائی کے اخلاف سے ملی ہے (فہرست نمایش شمارہ ۱۴۲)

[5] ۱۲۳۲ صاف لکھا ہے، مگر لفظوں میں ایک ہزار دو سو بیس۔ خاتمۂ سلطان القصص میں "فراغ حاصل ہوا تھا" کے بعد یہ عبارت ہے: "پھر ۲۵ برس برابر یہ مسودہ پڑا رہا۔ ہر چند کئی مرتبہ اس کے لکھنے اور لکھوانے کا قصد کیا ... ممکن نہ ہوا۔"

[6] داستان کے ورق ۲۳۷ میں مہجور کے ۴ دواوین کا ذکر ہے۔

[7] اس کا نام مدائحُ الشعرا ہے، اس کے دو نسخے (رامپور، حبیب آباد) میری نظر سے گذرے ہیں۔ قیامت نامہ و دواوین کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

قصۂ امیرا یا مسلم، لیلیٰ مجنوں وغیرہ کہ سب کتابیں فارسی میں انتخابیں (کذا)، ہیں، نظر سے گزریں، معلوم ہوا کہ یہ سب کتابیں مبتدیوں کو محتاج تعلیم و تدریس ہیں، اور فسانۂ عجائب کہ سرور نے عالمِ سرور میں لکھا ہے، فسانۂ عجائب اور قصۂ غرائب ہے، لہٰذا یہ بات خاطر قاصر میں گزری کہ ایک فسانۂ نادرِ زمانہ مطول و یگانہ زبان اردوئے معلیٰ میں لکھنا چاہیئے.. سلاست سے کام رکھا سلطان القصص نام رکھا:۔ سن بارہ سے چونسٹھ ہجری.. میں تحریر سے اس کتاب .. کے فراغ اور خاطر پژمردہ باغ باغ ہوئی۔"

دیباچۂ سلطان القصص میں ایک[1] مثنوی ۱۹۰ اشعار کی شامل ہے، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

نصیر الدین طوسی[2] نے جو دستاں[3] — لکھی ہے فارسی میں با دو صد شاں
امیر حمزہ[4] کی وہ داستاں ہے — عجائب اور غرائب کچھ بیاں ہے
ولا کن جس قدر ہیں داستان گو — بیاں کرتے ہیں وہ اردو میں اس کو
بیاں کی ان کے ہے ساری لطافت — نہیں ہے خوب ورنہ کچھ عبارت
الف لیلیٰ[5] کو بھی گو میں نے دیکھا — ولیکن کیا کہوں میں حال اس کا
نہ ہیں دلچسپ قصے نہ حکایت — بیاں نہ خوب کچھ ہے نہ عبارت
بہار و دانش و دیگر کتابیں — کہ ہیں وہ فارسی میں انتخابیں
سبھوں کو بار ہا ہے میں نے دیکھا — سبحان اللہ کیا مذکور ان کا
پر جو ہو اول و آخر بیک طور — نہ دیکھا گو بہت میں نے کیا غور
فسانہ یہ عجائب ہے جو مشہور — حقیقت میں عجائب کچھ ہے مشہور
بیاں کرتا ہے اوّل تو خیالات — مطابق اس کے لکھتا ہے بدیہات[6]
بھنگڑ[7]ن کی کہیں لکھتا زباں ہے — کہیں شہدوں کا کچھ کرتا بیاں ہے
مبصر ہیں جو اس فن کے خوش اطوار — وہی داب سخن سے ہیں خبر دار
جو ہیں نافہم وہ کرتے ہیں تعریف — نہیں وہ جانتے ہیں ذم و توصیف

اس مثنوی کا خاتمہ اشعارِ ذیل پر ہوا ہے، اور اس کے بعد عربی کے اشعار ہیں جن کے مقطع میں مہجور تخلص آیا ہے،

زبس کہ نادرِ دوراں ہے قصہ — ہے سلطان القصص نام اس کا رکھا
اور ہی باغچۂ مہجور ہی نام — عدد و تاریخ کے ہیں اس میں ارقام
کچھ اب پڑھتا ہوں اشعار مناجات — پہ عربی میں بصد فخر و مباہات

باغچہ لکھا ہے مگر جب باغیچہ نہ پڑھا جائے، مصرع موزوں نہیں ہو سکتا، اس کے مقابل حاشیے میں ۱۲۶۶ مرقوم ہے۔

مہجور نے دیباچۂ سلطان القصص میں اپنا نام و خطاب اس طرح لکھا ہے، "اقبال الدولہ نواب عنایت حسین خان بہادر" مگر یہ نہیں بتایا کہ خطاب کس نے دیا تھا۔

دیباچۂ مذکور سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے ریذیڈنٹ مسٹر لوہ[1] (کذا)، کے ذریعے نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور بادشاہ نے انھیں دم گیارہ پارچہ کا خلعت "عطا کیا تھا۔ لکھنؤ میں انھیں شاہزادگان "خاندان تیموریہ" سکندر شکوہ اور آسمان قدر سے ملنے کا موقع بھی ملا تھا، اور ان دونوں نے بھی انھیں خلعت دئے تھے انھوں نے وہاں حسب ذیل اشخاص سے بھی ملاقات ہونے کا ذکر کیا ہے: نواب روشن الدولہ وزیر، نواب اکبر علی خاں و نواب حسین علیخاں پسران سالار جنگ، سلطان علیخاں و اصغر علیخاں برادران[2] سالار (ر) جنگ، سبحان علی خاں، "مولوی غلام[3] علیخاں بہادر وزیر الممالک" میر علی مرثیہ خواں "نایک زماں" "استاد دوراں اور افسر الشعرا شیخ امام بخش ناسخ" اور "وحید الزماں خواجہ حیدر علی آتش"

مصنّف نے میرزا عالی قدر کے یہاں سے خلعت پانے اور "انواع عنایات تا دمِ حیات مبذول" رہنے کا ذکر کیا ہے (دیباچہ)، میرزا طہماسپ بہادر نے بھی انھیں خلعت دیا تھا، اور مرزا عثمان بہادر، احمد جاں[4] بہادر، میرزا عبد اللطیف میرزا اظفر بخت، مرزا لعل بہادر، میرزا عبد اللہ بہادر (مع صاحبزادگاں) مرزا سکندر بخت سے ان کی ملاقات تھی[5]۔ "جناب مرزا محمد ضیاء الدین محمد[6] (کذا) بخت

---

[1] ۱۹۰ اشعار کو مصنف نے "چند اشعار" لکھا ہے

[2] نصیر الدین طوسی کی طرف داستان امیر حمزہ کا انتخاب شاید ہی کسی اور شخص نے کیا ہو۔ [3] داستان [4] حمزہ [5] لیسلہ [6] کذا۔

[7] ظنی تصحیح، قلمی نسخے میں پھکرن۔

---

[1] Low [2] "برادران" غلط ہے، پسران چاہیئے [3] اس نام کا کوئی شخص وزیر اودھ نہیں ہوا۔ [4] بیاض میں "میرزا کیخسرو جلال بہادر عرف میرزا احمد جاں" [5] "ملاقات تھی" میری طرف سے اضافہ، قلمی نسخے میں صریحاً کچھ لفظ یہاں چھوٹ گئے ہیں [6] بیاض میں "محمود" بھی صحیح معلوم ہوتا ہے

عرف مرزا بلاقی بہادر کہ شرح بذل و سخاوت و اخلاق و عنایات جو حضرت ممدوح کے ہیں تحریر ہوئیں تو اگر کتاب دوسری بھی لکھی جائے تب بھی اختتام نہ پائے سعادت ملازمت معہ (کذا) مرشدزادۂ عالی مرتبت مرزا ہشتر یار بہادر حاصل ہوئی جہاندار شاہ ولیعہد شاہ عالم بنارس میں مرے تھے اور ان کے اخلاف کا قیام وہیں رہا تھا' غالباً یہ سب انھیں کے اخلاف ہیں۔

مصنف کے تعلقات یمین الدولہ خلف شمس الدولہ ابن سعادت علیخاں سے بنارس میں بہت گہرے تھے' ان کے بیٹے باقر علی خاں سے مصنف کی بیٹی کا عقد ہوا تھا۔ نواب اقبال الدولہ سے بھی ان کی ملاقات رہی تھی۔ مہاراجہ اودت نرائن سنگھ بہادر مہاراجہ ایسری پرشاد نرائن سنگھ بہادر راجہ کاشی' دیو نرائن سنگھ نبیرۂ بابو اوسان سنگھ خلف الرشید بابو شیو نرائن سنگھ بہادر سے بھی آپ کے تعلقات رہے تھے۔ انھیں اگسٹس بروک رزیڈنٹ بنارس سے ملنے کا موقع بھی ملا تھا اور ان کے ذریعے سے لارڈ بنٹنک کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا تھا۔ مسٹر ماڈک سکریٹر کے وسیلے سے لارڈ ایلین (ایلن برا ؟) سے بھی ملے تھے۔ (دیباچہ)

بیاضِ مہجور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۲۷۱ھ میں پٹنہ اور وہاں سے شیخپورہ (وطن آبائی) گئے تھے۔ دیباچے میں ہے:

"نواب مبارک الدولہ خلف ... مرزا جنگلی .. ابن .. شجاع الدولہ .. ادہ .. مرزا مینڈھو خلف .. شجاع الدولہ .. سے عظیم آباد میں معہ (کذا) خلعت ملازمت ہوئی"

قرینہ تو نہیں کہ مرزا مینڈھو ۱۲۷۱ھ میں زندہ ہوں غالباً یہ اس سے پہلے بھی عظیم آباد گئے تھے۔ عظیم آباد میں ان کے چھوٹے بھائی غلام علی کا قیام بھی تھا (بیاض)

مہجور کا سالِ وفات معلوم نہ ہو سکا' ۲۵ صفر ۱۲۷۳ھ تک ان کے زندہ ہونے کا ثبوت موجود ہے (بیاض مہجور) باغیچۂ مہجور سے ۱۲۶۶ نہیں' ۱۲۶۵ نکلتا ہے' مگر دیباچے کی جو عبارت مقالے کے صفحۂ ۱ میں نقل ہو چکی ہے' اس میں تصنیف سے فارغ ہونے کا سال ۱۲۶۴ مرقوم ہے' اور کتاب کے آخر میں یہ عبارت درج ہے: "المرقوم دہم .. شعبان .. دوشنبہ ۱۲۶۴ھ (لفظوں میں بھی) .. ہجری .." آخر میں جو قطعات تاریخ ہیں' ان میں مصرعہائے ذیل سے تاریخ نکالی ہے: "زہے گلشن کہ بےخوف خزاں ہے" (اس کے نیچے ۱۲۶۱ مرقوم) "یہ افسانہ دل آویز جہاں ہے" (اس کے نیچے بھی ۱۲۶۱) "تیار یہ تازہ ہوا (ہوا ؟) باغیچۂ مہجور" (اس کے نیچے ۱۲۶۵)۔ مصنف لکھتا ہے کہ "ایں چند تواریخ کہ باختلاف سنیں کہ گفتہ شدند' بعض تاریخ تسوید ایں فسانہ بودند و بعض آوان تحریر مجلد ہذا بودہ اند بنظر ضائع شدن آنہا در کتاب مندرج گردید" لطف یہ کہ کسی مادّے سے سنہ مطلوبہ مستخرج نہیں ہوتا۔

سلطان القصص کا صرف ایک نسخہ میرے علم میں ہے اور یہ حسین آباد سے ادارۂ تحقیقات اردو کی نمائش کے لئے مستعار ملا ہے (فہرست شمارہ ۲۳) یہ بقول کاتب "۵۱ جز دو ورق" پر مشتمل ہے' خاتمے میں مرقوم ہے کہ "یہ کتاب بتعجیل تمام خط ناقص سے اس مصنف کے لکھی گئی اور اختتام کو پہنچی" (اس کے بعد وہ عبارت جو مقالۂ ہذا کے صفحۂ میں نقل ہوئی ہے)۔ ممکن ہے یہاں پر قدیم مسودے کی طرف اشارہ ہو' بہرحال نسخۂ پیشِ نظر کا کاتب بُرا املا ہے۔ اذاں کو آذاں (دیباچہ) کثرت کو کسرت (دیباچہ)' بالکل کو بلکل (ورق ۷۶) اور یاقوت کو یعقوت (۷۹) لکھتا ہے۔

دیباچے میں حمد و نعت و منقبت کے بعد بہادر شاہ کی مدح ۱۲ سطروں میں ہے۔ اس کی کچھ عبارت ملاحظہ ہو:

"ظل اللہ جہاں پناہ .. عکس آئینۂ شریعت رسالت پناہی .. عدالت کا وہ عالم ہے کہ فتنہ و فساد برطرف ہے امن و اماں ہر طرف ہے .. گنج کے گنج بے ملال در گنج فقرا و غربا کو مرحمت کر دیے .. جو زبردست ہیں زیر دست رہیں' جو بالا ہیں پست رہیں"

دیباچے میں بنارس سے متعلق جو کچھ مرقوم ہے وہ بعد حذف بعض عبارات درج ذیل ہے:

"فی التعریف بلدۃ البنارس و ساکنہا۔ بنارس عجب شہر سراپا بہار ہے کہ ہر کوچہ غیرت گلزار ہے اور ہر بازار رشک باغ و بہار ہے' حسینانِ گرو کا دنگل ہے' برہنہ ادان گلرو (کذا) کا جنگل ہے .. راقم

کیوں جو طعنیں نہ ہوں یار گندھر بیں
بیکنٹھ کی جگہ ہے یہ کاشی زمین ہے

بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ حقیقی بھائی تھے' بڑے مہجور' منجھلے علی محمد (متوفی ۱۲۷۱ھ) اور چھوٹے غلام علی' مسطر ۱۷ سطری ہے' داستان کی سطر اول یہ ہے: "راویان اخبار ہمیشہ بہار اور ناقلان آثار گلزار روزگار خوشہ چینان خرمن کشت زار سخن"

اور شیخ محمد علی حزیںؒ رحمت قریں فرماتے ہیں :

از بنارس نروم معبد عام است ایں جا
ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا

از بس کہ مکانات سنگین ہیں تو ہر طرف کوہ وقار و تمکین ہیں ۔ ہر سمت بیستوں ہے ہر بندۂ صنم رشک فرہاد (و) مجنوں ہے .. کاتک کا ایک میلا ہے، پریزادوں کا جھمیلا ہے .. جس پری پیکر پر نظر کی قیامت گزر گئی، نگہ کا پھرانا مشکل ہو گیا ۔ پہلو میں دل بیکل ہو گیا ۔ لب دریا پہ میلا ہے ہر معشوق حسن میں اکیلا ہے ... دریا میں ہزاروں کنول اور چراغ روشن ہے عکس ان کا پانی میں پرتو افگن ہے ۔ وہ سحر کا وقت عالم نور، بنارس کی صبح مشہور، روشنی کا وفور، ہر گھاٹ غیرتِ طور، وقت طلوع آفتاب، ہر موج دریا رشک (کذا) بے تاب، روشنی کی پانی میں چمک، ہر دیول کے کھڑے کی جھلک، پروانہ وار تماشائی کا ہجوم، پریزادوں کے حسن کی دھوم، نوبت کا شور، شہنا کی کیفیت زور، ایسے ایسے گھاٹ بنائے ہیں کہ جلوے نور کے دکھائے ہیں، شہر میں لاکھوں مکان سنگین ہیں، شرمندہ یہاں کا رفرنگ و چین ہیں ۔ سڑک شفاف، ہر کوچہ و رہگذر صاف، نل (کذا) شہر کا تیار ہے، ہر گلی میں ہزاروں نل دمن سا عاشق زار ہے، جب پانی برس کر کھل گیا، نمناکی کو جی ترس گیا، کیچڑ نظر نہ آیا .. کرسی ہر دوکان (کذا) کی تا کمر ہے غیرت سے ہر سنگ مرمر رشک شیب و مرمر (کذا) ہے ۔ صرافوں کی دوکانوں پر روپیہ اور اشرفی کا انبار ہے، زر و جواہر بے شمار و قطار ہے، ہر جوہری بچہ دُر در گوش ہے مرصع پوش ہے، حسن میں شہرۂ آفاق ہے، زمانہ اُن کے نظارۂ حسن کا مشتاق ہے، ہزاروں مہاجنوں کی دوکانوں پر گوٹا پٹھا زربفت و کمخاب ہے جس کی چمک سے خورشید عالمتاب بیتاب ہے ۔ شال دوشالہ کیا مال ہے' .... شیریں یہاں کی حلوائیوں سے کمتر ہے ۔ فرہاد کی عقل کو چکر ہے .. سودا فرماتے ہیں

یہ وصیت ہے میری اب کل پہ — گاڑ دینا مٹھائی کے پُل پہ

مٹھائی بنارس کی مشہور ہے، شہرہ اس کا ہر نزدیک و دُور ہے (کذا) .. چوک کا ہیکو ہے سارا جہاں ہے، چار دانگ عالم کی کثرت کا سماں ہے ۔ مسجدیں وہ رفیع الشان ہیں کہ ملائکان عرش اعظم شنوائے اذاں ہیں .. اما مباڑے یہاں مشہور ہیں، روشنی بخش دیدۂ حق ہیں .. شیخ محمد علی حزیں .. کا جو مزار ہے وہ بھی کثیر الانوار ہے .. سالار مسعود غازی کا جو میلا ہے وہ بھی اپنے حسن میں اکیلا ہے .. ہولی کے بعد جو منگل کا میلا ہے وہ بھی پریوشوں کا جھمیلا ہے .. دریا میں وہ میلا ہے ہر ایک امیر اپنی دولت پہ کھیلا ہے ۔ ہزاروں کشتیاں عالم نور ہیں، خوبی سے قریب اور زشتیوں سے دُور ہیں، ہر کشتی پہ رقص و سرود ہے، ہزاروں پریوش موجود ہے، ہر طرف کو دریا میں ہجوم ہے، گانے بجانے کی دھوم ہے .. تمام شہر کے دوکاندار موجود ہیں، چراغوں کی کثرت سے زمین غیرت نجم فلک ہے مہتاب کی روشنی میں چاند کی چمک ہے، یہ میلا تمام ہندوستان میں مشہور ہے ۔ ہولی ایسی ہوتی ہے کہ برج کے ہوش کھوتی ہے، خصوصاً مہاراجہ بیکنٹھ باشی راجہ اودیت نرائن سنگھ بہادر راجۂ کاشی کی سرکار میں، صبح کے وقت وہ اُجلی مجلس ہوتی ہے کہ عقل طلسم (کذا) کو موجِ حیرت میں ڈبوتی ہے، یا تو زمانہ گلال سے لال تھا یا زمین و آسماں نور سے معمور بلا اہمال تھا" راجہ اندر کے اکھاڑے کی کیفیت کر دی پرستان کی پریوں کے لب پہ رشک سے آہ سرد ہے ۔ جدھر کو نگہ جاتی ہے سفیدی صبح کی طرح ساری محفل سفید نظر آتی ہے : عجب راجہ حسین خوبصورت دھرم مورت پرتھی پال حمیدہ خصال تھا ۔ ایسے ایسے اہلِ ہنر و کمال نوکر تھے کہ مثل ان کے بڑی بڑی سرکاروں میں کمتر تھے ۔ نواب میر تقی علی خاں، راجہ میر شیر علیخاں، شیخ پناہ علی، مولوی لعل محمد منطقی، مولوی عبد العلی فاضل، منشی سیتل سنگھ منشی بلاغت رقم جادو قلم، مولوی غلام حسین ریاضی داں کہ ہندوستان میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے بلکہ ولایت عرب و عجم میں بھی کوئی ان کے برابر نہیں ہے ۔ افضل الفضلا اعلم العلما .. زائر حاجی مولوی گلشن علی افلاطون زمانی ارسطوئے جہانی حکیم میر نعمت علی خاں .. حکیم مرزا حیدر .. مغفور تھے کہ تمام عالم میں مشہور تھے کہ مہاراجہ صاحب بہادر بے بہا دُر تھے سخاوت

ہیں شہرۂ جہاں تھے۔۔ علم موسیقی میں وہ لوگ یکتا۔۔ کہ جن کا جواب نہ تھا۔۔ میاں کاموں۔۔ پٹے کے مالک ہوئے۔۔ گانے کے بادشاہ۔۔ فرزند۔۔ ان کے۔۔ میاں شادی خاں۔۔ الحق کہ خلف الرشید تھے۔۔ استادان سابق کو بھو کر دیا۔ میاں جعفر خاں دھرپت کے مختار استادان سابق کے یادگار۔ میاں غلام حسین وہ کریا گائے کہ سننے والوں کے رونگٹے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔ میاں پیار (کذا) خاں، جیون شاہ، نرمول شاہ محمد شاہی بین کار نادرۂ روزگار ایسے بین بجائے کہ نور کے عالم دکھائے پریاں اتر آئیں، راجہ اندر کے اکھاڑے کی پریوں نے بین بجانے کی قسمیں کھائیں۔ میاں کلو کی سارنگی اس ساز و طرب سے بجی کہ تمام ہندوستان میں دھوم مچی۔۔ بھائی ان کے کموں لیدان کے استاد ہوئے۔ ہنون سنگھ نے وہ پکھاوج بجائی کہ تن مردہ میں جان آئی۔۔ بیٹے ان کے کنور جوت سنگھ نے ایسی پکھاوج بجائی اور ایسا خیال گائے کہ تان سین کو خیال میں نہ لائے سدا رنگ دنگ ہو گئے۔۔ ہر چند غلام رسول استاد زمانہ ہوا۔۔ مگر۔۔ نواب میر تقی علی خاں مرحوم نے ایسے باج (کذا) بجایا کہ جانے غلام رسول باج راج اقلیم موسیقی سے لے کر آیا حیدرو نے وہ طبلہ بجایا کہ اس کا بھی نظیر نظر نہ آیا۔۔ غلام رسول بہروپیے نے وہ نئے روپ دکھائے کہ بڑے بڑے قیافہ شناسان ذوی العقول میں (کذا) کے فہم میں نہ آئے۔ نورخاں رستم داستاں، میر فتح علی کاظم علی خاں مرحوم نے وہ داستانیں امیر حمز (حمزہ) کی کہیں کہ یادگار زمانہ رہیں۔۔ رتن کربلائی ایسا کہروا ناچے کہ کہار ہار گئے، سٹرن زیت (کذا) ایسا گائے کہ مثل اس کا سننے میں نہ آیا۔ چنری کانے (کذا) فن میں بڑے سیانے، بیری سکین (کذا)، بڑے بامروت و سخاوت گانے کے فن میں راوت اور اکثر نازنینان مہ لقا ایسا گاتا گائیں کہ ہندوستان میں دھومیں مچائیں۔۔ ٹپے کو غزل کر دیا غزل کو ہزل کر دیا۔۔ پس ایسے لوگ اہل کسب و کمال صاحبان حسن و جمال مہاراجہ اودیت نرائن سنگھ کی سرکار میں نوکر تھے۔ ماشاءاللہ فرزند ارجمند ان کے۔۔ مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر۔۔ ہیں جو مہاراجہ بکنیٹھ باشی نے کام کئے اس سے ہزار چند زیادہ مہاراجہ بہادر نے نام کئے۔۔ ہر چند کہ اس خاکسار کو اس سرکار سے کچھ سروکار نہیں ہے مگر از آنجا کہ رئیس اعظم اس خطۂ رشک باغ و بہار کے ہیں لہٰذا بطریق یادگار اس ورق مجموعۂ روزگار پر مرقوم ہوا۔ اب توصیف سے شعرائے سخن رس بنارس کے یہ تحریر دلپذیر بسر دلیف ہوتی ہے کہ اول شعرائے نامی والا مقامی منشی رام سہائے صاحب محیط د مغموم۔۔ اگر سخندانان نامی سابق ان کے دقائق کلام بلاغت انجام کو ملاحظہ فرماتے، بسر دلیف حیرت و حسرت ہو جاتے۔۔ سودا کو سودا ہو جاتا۔۔ مصحفی شعر گوئی کی قسم کھاتے۔۔ جرأت۔۔ جرأت سخنگوئی کی نہ پاتے۔۔ حسرت حسرت میں رہتے شعر نہ کہتے میر درد درد اشک سے آہ سرد بھرتے قصد سخنگوئی نہ کرتے، میر سوز اپنا دیوان جلاتے لب پر سخن شاعری کا نہ لاتے۔ انشاءاللہ خاں شعر گوئی چھوڑ کے انشا لکھا کرتے، ناسخ کا کلام منسوخ ہو جاتا آتش آتشِ رشک سے جل جاتے۔ برق کے دیوان پر بجلی گرتی۔ مرثیہ خوانوں کا کیا حال بیان کروں۔۔ شیخ رحم علی مرثیہ خواں مغفور از غرب تا شرق مشہور ہوئے۔ شیخ جان محمد کے اوصاف سے عالم عالم معمور ہوئے۔۔ یہاں شہدوں کا کیا کام ہے، یہ شہدپن یہاں سے دور ہے۔۔ نواب علی ابراہیم خاں مغفور کے عہد سے شراب و بھنگ کی دوکانیں خراب ہوئیں۔۔۔ نوربافانِ بنارس نے کاریگرانِ چین و فرنگ کو دنگ کیا۔ وہ نیا ڈھنگ کمخاب و زربفت و مشروع و گلبدن کا نکالا کہ بڑے بڑے کاریگروں کے فہم میں نہ آیا۔ بنارسی دوپٹا، ساریاں شملے ایسے ایسے بنائے کہ سپاٹو اور شملے تک نظر نہ آئے۔"

مہجور نے داستان بڑے دعوے سے لکھی ہے، دیباچے میں جو مثنوی شامل ہے اس میں بکثرت اشعار اس کی تعریف میں ہیں، لیکن اس میں وہی باتیں ہیں جو اس کے عہد کی اور داستانوں میں ہیں۔ ایک بڑا عیب یہ ہے کہ بار بار ایک ہی قسم کے واقعات لکھتا ہے اور کم و بیش ہر جگہ ایک ہی طرح کا بیان ہے۔ مہجور کی زبان میں کسی قدر کہنگی ہے اور صحت کی اسے زیادہ پروا نہیں۔ ذخیرۂ الفاظ اس کا البتہ بڑا ہے اور اس داستان کا مطالعہ زبان شناسوں کے لئے مفید

ہو سکتا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو محجور کے اسلوبِ بیان کے بہترین نمونوں میں شمار ہو سکتا ہے:

"اتنے میں سلطان بھی مع (کذا) شاہزادی اور شاہزادیاں وزیرزادیاں اسی مورپنکھی پر تشریف لائے، ناچ کو حکم ہوا، ناچ ہونے لگا، دھوم عشرت و عیش کی برپا ہوئی، ستر ہزار کشتیوں پر ایک مرتبہ ناچ ہونے لگا، بارہ سے نوبتیں روشن چوکیاں بجنے لگیں، تمام کو روشنی ہو کے آتشبازیاں چھٹنے لگیں، کنول اور چراغاں اور غوطہ خور دریا میں لاکھوں اور ہزاروں چھوٹ گئے۔ ادھر دونوں طرف دریا کے باغ سے لے کر وہاں تک وہ روشنی صحرا میں ہوئی، وہ آگ سی روشنی کی لگ گئی کہ اگر سوئی گرے تو اٹھا اٹھائیے ادھر دریا میں وہ روشنی ستر ہزار کشتیوں پر وہ روشنائی آتش بازیوں کی وہ کثرت وہ زور و شور عجیب طرح کی دھوم دھام تھی کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتا ہے۔ بیان کو یہ گنجائش کہاں جو ذرہ بھی اس کا بیان کر سکے۔ شبانہ روز گانا بجانا آتش بازیاں روشنی کی کثرت، مہینے بھر برابر عیش و عشرت کا یہی رنگ رہا۔ بعد مہینے بھر کے سلطان نے فرمایا کہ اب مہینا بھر ایک ہی طور پہ جو گزرا ہے تو طبیعت سیر ہو گئی اب اگر مکانوں پر چلیں تو بہتر ہے۔ ملکہ نے عرض کی ہم طالع (تابع) مرضی ہیں، جو امر ہوئے وہی (کذا) ہم کو منظور ہے، اسی وقت کشتیاں سب آ کے کنارے پر لگ گئیں۔ وہ فجر کا وقت دھندلکا دھندلکا، چھوٹے چھوٹے تاروں کا ڈوبنا، بڑے بڑے تاروں کی چمک، نکھراپن اور تلاہٹ آسمان کی، نور کا وقت، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، جھونکا بادِ صبح کا جو نازنینوں کے بدن سے لگ کے آتا ہے تو کوسوں تک معطر ہوا جاتا ہے۔ آنکھوں میں نیند کا نشہ، دریا کی اور آسمان کی ایک سی رنگت، آتش بازیوں کا چھوٹ چھوٹ بجھتے جانا، چراغوں کا ٹھنڈے ہوتے جانا، سبزے کی بہار، ریت کی چمک، درختوں کا جوبن، لاکھوں یا سی ناروں کا دریا میں پڑنا، کچھ عجب عالم تھا کہ نہ دید ہے نہ شنید ہے۔ غرض جب کشتیاں کنارے پر پہنچیں تو پہلے سلطان اترے، بعد ان کے شاہزادی اور ملکہ ان کے بعد شاہزادیاں، وزیرزادیاں، ان کے بعد ڈومنیاں گائنیں، ان کے بعد خواصیں اور خواجہ سرا سب اترے۔ ملکہ جو کبھی ایک قدم پیادہ چلنے اور کشتی پر چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا تو بیساختہ تمام بدن پسینے پسینے ہو گیا

پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

ایک نے دوسرے کو اپنے دل کی دھڑک دکھا کر یہ بات کہی بوا تیرے سر کی قسم ہے ذرا میرے کلیجے پر ہاتھ دھر کے دیکھنا، ہے ہے کیسا ہاتھوں پڑا اچھلتا ہے، نگوڑا ہول کشتی پر چڑھنے کا دل میں سما گیا ہے۔" (ورق ۱۱۱ و ورق ۱۱۳)

محجور نے غزلِ ذیل میر کے جواب میں کہی تھی، اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

"رقومہ پانزدہم ماہ صفر ۱۲۷۲ھ ہجری" (بیاض)

اس میں کچھ شک نہیں کہ نظم کا پایہ نثر سے پست تر ہے:

یہ ولولے شباب ہیں اور جوش مستیاں ہیں دن ہیں جوانیوں کے ساغر پرستیاں ہیں

ان دنوں اوج پر ہے پست ہمتی ہماری دکھلائیں اوج بالا ہر دم یہ پستیاں ہیں

دوری میں جن کی رہتے ہم روز و شب ہیں بیتاب وہ حال پر ہمارے ہر وقت ہنستیاں ہیں

مئی عدل یہ ہیں انصاف تازہ یہ ہے بے جرم و بے گنہ ہی یاں مشکیں کستیاں ہیں

ساقی سرور کیسا حال ان کا کیا کہوں ہیں ہے نشۂ جوانی اور شور مستیاں ہیں

اللہ رے خواب غفلت کوئی چونکتا نہیں ہے اک دم کی بس یہ ساری دنیا میں ہستیاں ہیں

ان روزوں چشم تر کا کیا اپنے رنگ لکھوں آنسو کے بدلے آنکھیں شب خوں برستیاں ہیں

اشعار لکھنے کا یہ یاں زور ان دنوں ہے ہاتھوں میں لے کے پھرتے عشاق دستیاں ہیں

اے عشق و نوجوانی بازار عشق وا ہے مضمون تازہ تر کی ان روزوں سستیاں ہیں

کھڑکی میں بیٹھے تو گہ آ کے بندہ پرور صورت کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہے دور تو جوانی کوئی پوچھتا نہیں ہے ان روزوں جنس عشرت ساقی یہ سستیاں ہیں

اک جام مے نے سیر ہر دو جہاں کھائی کیسی صنم پرستی یاں مے پرستیاں ہیں

مشرب کا حال میرے پوچھو نہ زاہدو کچھ ساقی سے ... ہیں ہم ساغر پرستیاں ہیں

دل کو ہیں چھین لیتے محجور اک نگہ میں یہ لوگ ہیں جہاں کے کیسی وہ بستیاں ہیں

ایم اے حفیظ بنارسی

صبحِ بنارس

نگاہوں کی خلدِ یقیں دیکھتا ہوں
جمالِ بہشتِ بریں دیکھتا ہوں
ستاروں کی روشن جبیں دیکھتا ہوں
ہیں جنت بروئے زمیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

یہ مستی کی دنیا یہ مستی کا عالم
اندھیرے اُجالے کا ملنا یہ باہم
یہ رجنی یہ اوشا کا پُرکیف سنگم
عجب منظرِ دل نشیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

عجب کافری ہے عجب ساحری ہے
ہر اک چیز مستی میں گم ہو گئی ہے
ہواؤں کے ہاتھوں میں اک بانسری ہے
فضا میں چھڑی بھیرویں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

یہ اُس پار سورج کا اوپر نکلنا
یہ پانی پہ کرنوں کا گر گر مچلنا
یہ سونے کا حدِ نظر تک پگھلنا
کسی دیوتا کی جبیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

یہ پُوجا کی تھالی یہ دستِ حنائی
یہ گورا بدن اور یہ نازک کلائی
یہ بہکے قدم یہ نگاہیں لجائی
ادائیں یہ کیا شرمگیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

نہا کر کوئی لاجونتی کھڑی ہے
لئے دستِ نازک میں گنگا جلی ہے
کوئی حور ہے یا کوئی جل پری ہے
یہ کیا جلوۂ نازنیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

ہے سورج کی جانب کوئی ہاتھ اُٹھائے
ہیں جوگی کہیں مرگ چھالا بچھائے
مگن ہیں یہ کب سے سمادھی لگائے
کوئی خواب تو میں نہیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

یہ گنگا کے اُس پار ریتی ہی ریتی
پیامِ جنوں اہلِ اُلفت کو دیتی
نہ کیوں لہلہائے یہاں دل کی کھیتی
کہ ہر شے نشاط آفریں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

یہ کشتی کی سیر اور سویرے سویرے
یہ زلفوں کے بادل گھنیرے گھنیرے
یہ مہکی فضائیں یہ روشن اندھیرے
عجب منظرِ دل نشیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

کہیں اہلِ گجرات ڈیرا سجائے
کہیں زلفِ بنگال جادو جگائے
کہیں حسنِ پنجاب دل کو لبھائے
نہ بچنے کی صورت کہیں دیکھتا ہوں
بنارس کی صبحِ حسیں دیکھتا ہوں

تمکین کاظمی

گرامی

جالندھر شہر میں ککے زئی برادری بڑی مشہور تھی جس کے ایک فرد شیخ سکندر بخش تھے جو نیل کی رنگائی کا کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر کیا کرتے تھے جن کی حویلی جالندھر کے لال بازار میں اب تک مشہور ہے۔ اسی حویلی میں ۱۸۵۶ء میں ایک بچہ نے جنم لیا۔ جمعرات کی صبح کے چار بجے تھے کہ دایہ نے شیخ سکندر بخش کو فرزند کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کے دو مشہور بزرگوں کے والدین نیل کا کام کرتے تھے ایک گرامی کے والد اور دوسرے شبلی کے والد، اتفاق سے ان دونوں کی ولادت بھی ایک سال آگے پیچھے ہوئی ہے۔ یعنی ۱۸۵۶ء میں گرامی نے جنم لیا اور ۱۸۵۷ء میں شبلی نے۔

شیخ سکندر بخش نے اس نومولود کا نام شیخ غلام قادر رکھا اور گھر پر مکتبی تعلیم ہونے لگی۔ محلے کی مسجد میں بسم اللہ ہوئی اور وہیں تعلیم کا آغاز ہوا مسجد کے مکتب کی تعلیم ختم ہونے کے بعد جالندھر کے مشہور خدارسیدہ بزرگ حضرت خلیفہ ابراہیم کی خدمت میں حاضری شروع ہوئی اور خلیفہ صاحب نے گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ ختم کرایا۔ شیخ غلام قادر کی تعلیم جاری ہی تھی کہ اُن کے والد شیخ سکندر بخش اللہ کو پیارے ہو گئے اور بڑے بہنوئی شیخ غلام احمد غلامی درد تر کی نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور سلسلۂ تعلیم جاری رہا۔ ترکی نہ صرف قابل اور فاضل تھے بلکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کی صحبت نے شعر و سخن کی چاٹ بھی لگا دی اور غلام قادر نے طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ اور مست تخلص اختیار کیا۔ جب جالندھر کی تعلیم ختم ہو چکی تو لاہور کا قصد کیا اور بپیادہ پا لاہور پہنچ کر اورنٹیل کالج میں شرکت کی۔ منشی فاضل کا امتحان بڑے اعزاز سے پاس کیا اور پھر وکالت کا امتحان بھی دیا مگر قانون سے چوں کہ دل چسپی نہ تھی اس لئے سند لی اور نہ وکالت کی۔

قیام لاہور کے زمانے میں کچھ دنوں تک ٹیوشن کرتے رہے پھر نواب سر فتح علی خاں قزل باش کے اتالیق مقرر ہو گئے اور پھر امرتسر کے مدرسہ میں مدرس ہو گئے مگر چند ہی مہینے بعد لدھیانہ چلے گئے اور گورنمنٹ ہائی سکول کی مدرسی کر لی۔ چوں کہ وارفتگی اور لاابالی پن طبیعت میں تھا۔ اس لئے بجائے طلباء کو کورس پڑھانے کے شعر یاد کراتے رہے جب اسکول کا معائنہ ہوا اور انسپکٹر نے بچوں سے سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ بچے نصاب میں بالکل کورے ہیں چناں چہ انسپکٹر نے سخت ریمارک درج کیا اور حضرت مست نے مدرسہ کو خیرباد کہہ دیا۔

چوں کہ ترکی ان دنوں ریاست کپورتھلہ میں تھے اس لئے یہ بھی وہیں پہنچے اور بہن بہنوئی کے ساتھ رہنے لگے۔ ترکی نے بڑی دل سوزی سے تربیت کی مست تخلص اچھا نہ تھا اُسے گرامی سے بدل دیا اور شعر گوئی کی باقاعدہ مشق کرانے لگے، عروض بھی پڑھایا اور مدت تک اپنے ساتھ رکھ کر تیار کیا۔ چناں چہ ادبی صلاحیت، عروض و قافیہ پر عبور ترکی ہی کی صحبت میں حاصل ہوا اور ترکی ہی نے گرامی کو گرامی بنایا۔

کپورتھلہ کے ایک طویل قیام کے بعد گرامی نے لدھیانہ کا رُخ کیا وہاں ایک پولس سپرنٹنڈنٹ پارٹن نامی تھا جو ان کا دوست تھا اس نے سارجنٹ کی حیثیت سے پولیس میں نوکر رکھ لیا مگر وارستہ مزاجی کی وجہ سے پابندی نہ ہو سکی اس لئے نوکری چھوڑ کر پٹیالہ، مالیر کوٹلہ وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے رام پور پہنچے، رام پور میں داغ و امیر، جلال و اسیر سے ملاقاتیں رہیں مگر چوں کہ نواب

رام پور کو فارسی کا ذوق نہ تھا اس لئے کوئی مستقل صورت روزگار کی نہ بنی اور وہاں سے پٹیالہ واپس ہو گئے۔ پٹیالہ میں بھی کوئی صورت نہ نکل سکی البتہ خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ نے عرصہ تک اپنا مہمان رکھا اور ایک سفارشی چٹھی حیدرآباد کے رزیڈنٹ کے نام لکھ دی۔ گرامی چٹھی لے کر لاہور پہنچے، ان دنوں "پیسہ اخبار" میں بعض شعراء نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شان میں منقبت کا سلسلہ شروع کیا تھا گرامی نے بھی اس میں حصہ لیا اور چند قصائد کہہ کر چھپوائے جس کے صلے میں سجادہ نشین درگاہ نے ایک دستار اور طلائی تمغہ بھجوایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی لکھا کہ بارگاہ خواجہ غریب نوازؒ سے آپ کو حیدرآباد دکن جانے کا حکم ہوا ہے۔ انھیں دنوں گرامی نے حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری دی اور وہیں فی البدیہہ ایک نظم کہہ کر پڑھی۔ واپس آکر سوئے تو رات کو خواب میں حضرت ہجویریؒ نے بھی فرمایا کہ دکن جاؤ۔ چناں چہ ان دونوں بشارتوں نے دکن کی رہنمائی کی اور خلیفہ محمد حسین وزیر اعظم پٹیالہ کی جو چٹھی رزیڈنٹ کے نام تھی وہ بھی یاد آ گئی اور گرامی نے دکن کا رخ کیا

گرامی کے حیدرآباد پہنچنے اور ملازم ہونے کی صحیح تاریخ مل ہی نہ سکی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ سرکاری ریکارڈ میں بھی گرامی کے تقرر کی مسل (فائل) ہے اور نہ کوئی داخلہ ہے میں نے گرامی کے متعلق سارا ریکارڈ فراہم کر لیا ہے۔ ۲۳۔ ربیع الثانی ۱۳۱۸ء (مطابق ۲۰۔ اگست ۱۹۰۰ء) کو گرامی نے ایک درخواست معتمد فنانس کے پاس پیش کی تھی۔ کہ "میرا تقرر قدر بلگرامی کی جگہ پر ہوا ہے جو چار سو روپے کی تھی مگر مجھے دو سو روپے دیئے گئے پندرہ سال سے اسی پر قانع ہوں اور کثیر اخراجات کی وجہ سے فاقہ مستی کرتا ہوں اب میں نے ایک مثنوی مولانا روم کی مثنوی پر لکھنا شروع کیا ہے اس لئے مجھے وطن میں رہ کر اس مثنوی کو ختم کرنے کی اجازت دی جائے۔"

اس درخواست پر معتمد فنانس نواب عماد جنگ نے ریکارڈ طلب کیا مگر حیرت ہے کہ معتمدی فنانس اور محکمۂ صدر محاسبی میں کوئی ریکارڈ گرامی کے تقرر کا مل نہ سکا بالآخر صدر محاسبی (اکاؤنٹنٹ جنرل آفس) نے موازنہ (بجٹ) سے صرف اتنا داخلہ دیا کہ ۱۲۹۸ف کے موازنے سے گرامی کو دو سو روپے تنخواہ جاری ہے۔ ۱۲۹۸ف شروع ہوتا ہے۔ ۹ اکتوبر ۱۸۸۸ء سے، افسوس ہے کہ قدر بلگرامی کے متعلق بھی کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ البتہ ایک عرضی محبت فاطمہ بنت محمد نقی زوجہ میر غلام حسین قدر کی ۲ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ (۲۲ اگست ۱۸۸۶ء) کی لکھی ضرور ملتی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ چار سال ہوئے حضرت بندگان عالی جب کلکتہ رونق افروز ہوئے تھے تو بنارس[1] میں میرے شوہر نے قصیدہ گذرانا تھا اور حضور نے ازراہ قدردانی ہمراہ رکاب لا کر چار سو روپیہ تنخواہ جاری فرمائی تھی اس تنخواہ کی ابتدائی کے چھ مہینے کے بعد ہی قدر کا انتقال ہو گیا اور بیوہ تین سال سے پریشان ہے، وغیرہ۔"

افسوس ہے کہ بے چاری محبت فاطمہ کی عرضی قدر مرحوم کے تقرر کا ریکارڈ نہ ملنے کی وجہ سے بے کار گئی۔ اس کے بعد سید احمد زید نے ایک اور عرضی پیش کر کے تیئیس ۲۳ روپے آٹھ آنے وظیفہ جاری کرا دیا تھا۔ بہرحال حیدرآباد کے ریکارڈ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۸ف / ۱۸۸۸ء سے گرامی کے نام دو سو روپے وظیفہ جاری تھا۔

عزیز ملک نے نقوش لاہور کے شخصیات نمبر جلد اول (ص ۵۶۔ ۶۲) جنوری ۱۹۵۶ء میں ایک مقالہ گرامی پر لکھا ہے جس میں بیان کیا ہے کہ حضور نظام نے گرامی کا تقرر کر کے بلوایا۔ مگر اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ البتہ حیدرآباد میں عام شہرت یہی رہی کہ گرامی نے رزیڈنٹ کی سفارش پر ملازمت پائی ہے چناں چہ ابتداً گرامی کا قیام بھی رزیڈنسی کے محلے میں رہا اور اُن کے احباب بھی زیادہ تر رزیڈنسی کے ملازم ہی رہے۔ مذکورہ بالا مضمون میں عزیز ملک نے ایک مادۂ تاریخ "گرامی بحضور آمد" نقل کیا ہے گرامی اور حضور کے اعداد جوڑنے سے ۱۲۸۶ء نکلتے ہیں جو فصلی ہجری عیسوی کوئی سنہ بھی گرامی کی آمد کا نہیں ہو سکتا۔ ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ کی درخواست میں گرامی نے جو یہ لکھا ہے کہ "پندرہ سال سے اسی پر قانع ہوں" سو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۰۳ھ سے گرامی کے نام تنخواہ جاری ہے۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ ۱۲۹۸ف شروع ہوتا ہے ۳ صفر ۱۳۰۶ھ سے اس طرح گرامی کا تقرر ۱۳۰۶ھ اور ۱۸۸۸ء کا قرار پاتا ہے۔

---

[1] حضور نظام نے ایک سفر کلکتہ میں واپسی کے وقت بنارس کے مقام پر قدر کو باریاب فرما کر ساتھ لا کر تقرر فرمایا تو بے چارے قدر چھ مہینے کے اندر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۹۰۰ء میں پھر کلکتہ سے واپسی میں بنارس میں مقام فرما کر امیر مینائی کو باریاب فرمایا اور انھیں حیدرآباد آنے کے لئے فرمایا تو ۱۹۰۰ء میں امیر حیدرآباد آئے اور یہاں آتے ہی بیمار ہو کر ۱۹۰۲ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے۔

گرامی کی رخصت کی مسل (فائل) میں ایک درخواست گرامی کی لکھی ہوئی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے۔

"خداوند نعمت! خاکسار نے سات سال سے کسی قسم کی رخصت نہیں لی۔ اب پنجاب میں میری والدہ صاحبہ سخت علیل ہیں اگر مجھے یکم جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ سے تین ماہ کی رخصت معہ تنخواہ پیشگی ایام رخصت مرحمت فرمائی جائے تو والدہ صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادتِ دارین حاصل کروں فقط زیادہ آداب!"

اس درخواست سے صاف ظاہر ہے کہ سات سال ہوئے گرامی کا تقرر ہوا اور تقرر کے بعد سے انھوں نے رخصت نہیں لی، چناں چہ گرامی ہی کے بیان کے بموجب ۱۳۰۶ھ میں تقرر ہونا ثابت ہوتا ہے اس طرح عزیز ملک کا لکھا ہوا مادۂ تاریخ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ گرامی ۱۳۰۵-۶ھ میں حیدرآباد آئے اور ان کا تقرر ۱۳۰۶ھ میں ہوا گویا تیس اکتیس برس کی عمر میں گرامی حیدرآباد پہنچے اور نوکر ہوئے۔

داغ اور گرامی کی آویزش کے بعض قصے لوگوں نے یہ سمجھ کر مشہور کر دیئے ہیں کہ دونوں ایک ہی دربار کے شاعر تھے اور دونوں میں یقیناً چشمک رہی ہوگی مگر یہ بالکل غلط ہے گرامی جب رام پور پہنچے ہیں انھیں دنوں داغ نے اپنی مثنوی "فریاد داغ" ختم کی تھی چناں چہ گرامی نے ایک نظم بطور تقریظ کہی جو ۲۵ شعر کی ہے اور اس طرح شروع ہوتی ہے۔

بیا اے بلبل کلک خوش آہنگ	بمدح داغ سر کن نغمۂ چنگ
فصاحت خندۂ صبح خیالش	بلاغت نغمۂ مرغ کمالش
بلندی از دماغش بہرہ بردہ	نزاکت با خیالش شیر خوردہ
بہارستان صبح زندگانی	ادا فہم رموز نکتہ دانی

اور اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؂

نیاید از زبان نکتہ پرور	گرامی مدحت داغ سخن ور

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ گرامی کا تقرر ۱۸۸۸ء میں ہوتا ہے اور اسی سال داغ بھی حیدرآباد پہنچے اور سوا سال رہ کر پھر دہلی واپس ہو جاتے اور وہاں سے نو مہینے کے بعد حیدرآباد آ کر ملازم ہو جاتے ہیں اس طرح جو دوستی رام پور میں ہوئی تھی وہ حیدرآباد میں بھی باقی رہتی بلکہ اور مستحکم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک میں نے تحقیق کی ہے۔ داغ اور گرامی کے تعلقات نہایت خوش گوار رہے ہیں میرے والد مغفور حضرت تجلی داغ کے شاگرد اور گرامی کے دوست تھے وہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ "داغ اور گرامی میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی" داغ کے دوستوں شاگردوں وغیرہ سے جو معلومات مجھے ہوئی ہیں ان کی بنا پر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے اور دونوں حیدرآباد میں ایک دوسرے سے بہت کم ملتے جلتے تھے مگر جب کبھی ملتے بڑی ہی محبت سے ملتے تھے اور حاضر و غائب ایک دوسرے کے مداح تھے۔

نواب میر حسن علی خاں امیر جو داغ کے شاگرد اور یار غار تھے۔ گرامی کے بھی بہت دوست تھے چناں چہ گرامی کی آمد و رفت امیر کے پاس بہت تھی اُن سے بھی میں نے یہی سنا ہے کہ دونوں کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔

ترکی جو گرامی کے بہنوئی تھے اور گرامی کے حیدرآباد آنے کے بعد وہ بھی حیدرآباد آ گئے تھے اور یہیں مرے۔ والد مغفور کے دوست اور مخلص تھے۔ والد نے اپنا فارسی کلام آخر میں انھیں کو دکھانا شروع کیا تھا ان کی وجہ سے میری آمد و رفت بھی گرامی کے پاس تھی۔ ترکی کی ایک صاحبزادی جو گرامی کی حقیقی بہن کی بیٹی تھیں زیادہ تر گرامی ہی کے پاس رہتی تھیں۔ ترکی اور گرامی کے تعلقات ابتداً بہت خوش گوار تھے۔ ترکی ہی نے انھیں گرامی بنایا، تعلیم و تربیت دی چناں چہ کہا ہے ؂

گرامی ز شاگردیم شد گراں	وگرنہ ہماں قسمت دیوانہ بود

کیونکہ تھا نک ترکی اور گرامی کے مراسم بہت اچھے تھے وہیں سے دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ گرامی بڑے ہی ضابطہ کم سخن تھے۔ مگر بھڑک جاتے تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ ترکی نہایت محرور المزاج، منہ پھٹ اور زیادہ گو تھے چنانچہ ترکی نے گرامی کی ہجو کہی قصائد و غزلیات تک میں گرامی پر چوٹیں کیں چناں چہ ترکی کا پہلا دیوان موسوم بہ "گلزار صدیقی" جو قیام مانکپور کے زمانے میں ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء میں طبع ہوا ہے گرامی کی ہجو سے بھرا ہوا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ترکی صاف دل اور قلندر منش بزرگ تھے۔ چند ہی سال کے بعد انھوں نے سارے گلے شکوے بھلا دیئے چناں چہ جب گرامی حیدرآباد پہنچ گئے تو ترکی کا دل اُن کی طرف سے صاف تھا۔ چناں چہ یہ شعر اس صفائی کا گواہ ہے ؂

اہل اندراغ و گرامی پرسمش ترکی خبر	چوں نسیم آنکس کہ از باغ دکن آید بروں

اور جب ۱۳۱۳ھ میں ترکی نے "آنکھوں دیکھے شعراء کا تذکرہ "سخنورانِ دکن" کے نام سے شائع کیا تو گرامی کے متعلق لکھا:۔

"گرامی در عربی و فارسی مستند، واز قرابت داران این فقیر است
شاعریست نازک خیال، جدّت پسند و بلند پرواز دیوان فارسی
مکمل کردہ..... عمر شریفش از پنجاہ سال تجاوز کردہ "

(سخنوران چشم دیدہ صفحہ ۹۸-۱۰۰)

مگر یہ سب دکھاوے کی باتیں تھیں۔ گرامی اور ترکی کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہ تھے۔ گو خلوص و محبت نہ تھا۔ مگر برملا ایک دوسرے کی شکایت بھی نہ کرتے تھے۔ پھر بھی چشم و ابرو سے ظاہر ہو جاتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے مکدر ہیں۔

گرامی کا تقرر شاعر کی حیثیت سے ضرور ہوا تھا مگر وہ سوا دربار خاص اور خصوصاً سال گرہ کے دربار کے عام طور پر حضور میں باریاب نہ ہو سکتے تھے اور نہ دربار شاہی میں انھیں رسوخ تھا اس کی وجہ حضور نظام کی فارسی سے ناواقفیت یا بیزاری نہ تھی بلکہ حیدرآباد میں گرامی کو رزیڈنسی کا آدمی سمجھا جاتا تھا کیوں کہ رزیڈنٹوں کا عام طریقہ یہ تھا کہ جس کسی کو سفارش کر کے دربار نظام میں نوکر رکھا دیتے اس سے اپنے تعلقات باقی رکھتے تھے اور اکثر رزیڈنسی میں بلا کر حالات پوچھتے اور اپنا مطلب نکالنے کی پوری کوشش کرتے تھے اسی لئے حیدرآباد کے امرا بھی گرامی سے الگ الگ رہتے تھے اور حضور نظام بھی زیادہ مانوس نہ تھے چناں چہ جب انھوں نے وطن میں قیام کرنے کی خواہش کی تو فوراً اجازت دے دی گئی اور وہ ۱۳۰۹ف/۱۹۰۰ء میں وطن جا کر ایک طویل عرصے تک مقیم رہے اور پھر حیدرآباد آکر چند سال گزار کر دوبارہ وطن میں قیام کرنے کی اجازت چاہی تو انھیں خوشی سے اجازت دے دی گئی اور وہ ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

اس بات کو گرامی بھی محسوس کرتے تھے اس لئے وہ خود بھی لوگوں سے دُور دُور رہتے تھے۔ چناں چہ اس دور کے شعرائے فارسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد، نواب ضیا یار جنگ ضیاء مولوی مسعود علی محوی، سند الملک غاشو تری مولوی وحیدالدین عالی، مولوی سیّد قطب الدین فاضل، وغیرہ سے گرامی کے مراسم زیادہ نہ رہے بلکہ ان لوگوں سے دور دور ہی رہے لوگ اس کو گرامی کا خرانٹ پن سمجھتے تھے مگر حقیقت یہی تھی کہ رزیڈنسی کا آدمی سمجھ کر یہ بزرگ خود گرامی سے دُور رہنا چاہتے تھے اور گرامی کو بھی اس کا احساس تھا۔

مولانا امجد حیدرآبادی جو آج ہندوستان کے ممتاز رُباعی گو شاعر ہیں ابتداً ترکی کے شاگرد تھے کسی بات پر ترکی خفا ہو گئے اور اپنے پاس آنے سے امجد کو منع کر دیا اور انھوں نے گرامی سے دوستی کر لی اور امجد کے کلام کی اصلاح گرامی نے بڑی دیدہ ریزی سے شروع کی اور جب امجد نے اپنی رُباعیات کا مجموعہ شائع کیا تو سرورق پر گرامی کی یہ رُباعی بڑے تفاخر سے شائع کی اور اب تک اس پر فخر کرتے ہیں ؎

امجد بہ رُباعی است فرد امجد | کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز | روح سرمد بہ گفت امجد امجد

گرامی کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسرا عقد اقبال بیگم ترکی سے کیا تھا جو بڑی ہی سلیقہ مند خاتون تھیں، ان کے والد شیخ قمرالدین کلکے زئی خاندان ہی کے بزرگ اور بڑے ذی عزت آدمی تھے شادی کے وقت شائد وہ زیادہ مرفہ الحال بھی تھے کیوں کہ مشہور تھا کہ گرامی نے اقبال بیگم سے شادی نہیں کی بلکہ اقبال بیگم گرامی سے شادی کر کے انھیں ہوشیار پور لے گئیں کئی بار میں نے اقبال بیگم کو ترکی کے گھر میں بھی دیکھا ہے اور دو ایک مرتبہ خود ان کے گھر میں بھی جا چکا ہوں کیوں کہ والد ماجد کے ساتھ گرامی کے پاس جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے اندر جا کر بیگم گرامی سے بھی ملاقات کی نہایت باسلیقہ اور بڑی ہی شفیق خاتون تھیں گرامی جتنے از خود رفتہ تھے وہ اتنی ہی ہوش مند تھیں۔

گرامی کے احباب زیادہ تر محلہ رزیڈنسی کے رہنے والے تھے نواب حسن علی خاں امیر، پروفیسر سجاد مرزا بیگ دہلوی، بوٹے خاں کشمیری، حاجی ابراہیم خانساماں، مولوی مردان علی مددگار محاسب وغیرہ گرامی کے روزانہ کے ملنے والے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر نواب حسن علی خاں امیر کے دیوان خانہ میں جمع ہوتے تھے۔ مجھے گرامی کی شعر خوانی بہت پسند تھی۔ ان کا خاص لہجہ اور دلجوئی مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ یوں تو ترکی بھی بڑی عمدگی سے شعر پڑھتے تھے مگر ان میں وہ سوز نہ تھا۔ گرامی میں خاصا سوز تھا جو انھیں کا حصہ تھا۔

گرامی اپنے سر پر شملہ یا صافہ بڑی ہی بے پروائی سے باندھا یا لپیٹا کرتے تھے۔ میں نے جب کبھی انھیں صافے میں دیکھا اسے بے ترتیب ہی پایا ہے یہ بے ترتیبی ان کے چہرے پر بُری بھی نہ معلوم ہوتی تھی۔ ترکی ٹوپی بھی گرامی اکثر پہنتے تھے جو انھیں بہت بھلی معلوم دیتی تھی۔ گرامی عموماً حیدرآباد کی تراش کی شیروانی پہنتے تھے، کبھی کبھی گرم لمبا کوٹ بھی پہنا کرتے تھے، معلوم نہیں اُونچا سُنتے تھے یا کھوئے رہنے کی وجہ سے جلد نہ سُنتے تھے بہر حال ان سے

دو دو تین تین بار بات کہنی پڑتی تب کہیں جواب ملتا تھا۔ ایک بات مجھے گرامی میں عجیب نظر آئی میں نے انھیں کبھی پنجابی شلوار یا چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ تنگ موری کا اقبال شاہی پاجامہ دکنی تراش کا پہنے ہوئے نظر آتے تھے۔ پاؤں میں شو زیادہ تر چڑھاؤ جوتا پہنتے تھے، پان خوب کھاتے تھے حقے کا بھی بہت شوق تھا، چائے کے بھی رسیا تھے جہاں جاتے چائے ہی پیتے اور جو گھر پر جاتا اُسے بھی چائے پلاتے تھے۔

نماز کے زیادہ پابند نہ تھے ممکن ہے کہ گھر پر قضا پڑھ لیتے ہوں مگر باہر تو وقت پر نماز نہ پڑھتے تھے۔ حسن علی خاں کے گھر سے قریب مسجد تھی یہ لوگ بیٹھے گپ لڑاتے رہتے اور اذان ہوتی اسی پارٹی کے بعض ارکان اُٹھ کر نماز کو جاتے مگر چند اور حضرات کے ساتھ گرامی بدستور بیٹھے رہتے تھے۔ فطرتاً نہایت ہی بھولے بھالے مخلص بزرگ تھے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں نے باوجود ترکی کے گھر زیادہ آمد و رفت ہونے کے کبھی گرامی کو ترکی کے گھر آتے نہیں دیکھا اور نہ کبھی ترکی کو گرامی کے گھر جاتے دیکھا یا سُنا البتہ بیگم گرامی ترکی کے گھر بہت آیا کرتی تھیں اور ترکی کی صاحبزادیاں بھی گرامی کے گھر میں بہت آتی جاتی تھیں۔ یوں اکثر مقامات پر میں نے ترکی اور گرامی کو ملتے ہوئے دیکھا ہے۔ گرامی بہت ہی ادب اور قاعدے سے ترکی سے ملتے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ترکی بھی ان سے بڑی ہی شفقت کے ساتھ مخاطبت کرتے تھے جس کے وہ عادی نہ تھے

حیدرآباد سے جانے کے دس سال بعد ۲۶ مئی ۱۹۲۷ء کو گرامی نے ہوشیارپور میں انتقال کیا اور اُن کے انتقال کے بعد بیگم گرامی کے نام پچاس روپے وظیفہ تاحیات ۲۲۔ شوال ۱۳۴۶ھ (۱۴، اپریل ۱۹۲۸ء) سے حضور نظام نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ جاری فرمایا۔

۲، آبان ۱۳۴۰ف (۸ ستمبر ۱۹۳۱ء) کو بسم اللہ بیگم نے (جو حیدرآباد کے محلہ ملک پیٹھ میں رہتی تھیں) ایک درخواست پیش کی کہ ۵ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال بیگم کا انتقال ہوشیارپور میں ہو گیا ہے۔ اس لئے ان کی تنخواہ بسم اللہ بیگم اور شاہ محمد کے نام جو مرحومہ کے حقیقی بھانجے ہیں جاری کی جائے مگر چوں کہ یہ لوگ مرحومہ کے زیر پرورش نہ تھے اس لئے اس تنخواہ یا اس کے کسی حصے کی اجرائی ان پر نہ ہو سکی۔

میرے خالہ زاد بھائی میر یاسین علی خاں بی۔ اے (علیگ) انکم ٹیکس آفیسر کو گرامی بہت چاہتے تھے کیوں کہ گرامی جب حسن علی خاں آمیر کے گھر آتے انھیں دادا (آمیر) کی گود میں بیٹھا ہوا پاتے اس لئے کھینچ کر اپنی گود میں بٹھا لیتے۔ یاسین علی خاں کبھی گود میں بیٹھ جاتے کبھی ان کے کندھوں پر چڑھ کر گردن پر سوار ہو جاتے اور گرامی ہنستے، انھوں نے اپنی ایک غزل بھی یاسین علی خاں کو یاد کرا دی تھی جسے تتلا تتلا کر یاسین علی خاں پڑھا کرتے اور گرامی سُن کر خوش ہوتے تھے۔ یہ واقعہ چالیس سال سے زیادہ عرصے کا ہے مگر وہ منظر اب تک میری آنکھوں میں پھرتا ہے اور اتفاق سے وہی گرامی کے یاد کرائے ہوئے پانچ شعر اب تک یاسین علی خاں کو یاد ہیں۔ چناں چہ میں نے ان سے یہ شعر لکھوا لئے ہیں جو نقل کئے جاتے ہیں۔ غالباً یہ غزل دیوان گرامی میں موجود ہے۔

آں پری گر از چمن گرم عتاب آید بروں	بلبل از گل گل ز بو، بو از گلاب آید بروں
یار گر آید بروں ناخوردہ مے از مے کدہ	مست از مستی و مستی از شراب آید بروں
موجم از سر رفت اما شور عشق از سر رفت	جائے خوں از زخم ہائے کہنہ آب آید بروں
گر رسد آوازۂ ایں پارسی رند دیار	خسرو از دہلی ظہیر از فاریاب آید بروں
اے گرامی غم مخور از گیر و دار رستخیز	باش تا آں مہدئ عالی جناب آید بروں

ماہ نامہ نقوش لاہور بابت ماہ جون ۱۹۵۶ء میں مولانا غلام رسول مہر نے ملک حبیب احمد خاں پر۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہوئے حکیم قرشی کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے سُناتے ہوئے گرامی کے چار شعر بھی نقل کئے ہیں جو یہ ہیں۔

ما خویش را بہ نیم نظر ہاں فروختیم	خود را فروختیم و چہ ارزاں فروختیم
ما سبحہ را بہ رشتۂ زنار ساختیم	ایماں بہ کفر کفر بہ ایماں فروختیم
دیوانگی نبود بلا سنج امتیاز	داماں بہ جیب، جیب بہ داماں فروختیم
قانونِ عقل نسخۂ ایماں کتاب ہوش	در امتحانِ چشم سخن داں فروختیم
شور ہوس ندانست گرامی دماغِ فقر	دستے بہ جیب و پائے بہ داماں فروختیم

جی تو چاہتا ہے کہ گرامی کے منتخب اشعار پیش کر دوں مگر مضمون طویل ہو رہا ہے اس لئے ختم کرتا ہوں۔

چاند تک پہنچنے کی راہ!

(ایک قدیم ہندوستانی روایت)

"بڑوں سے جب بھی کچھ پوچھو وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ "خاموش! تم ابھی بچے ہو!" جنگلوں میں بندروں کے بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے "ہم بچے نہیں ہیں، نہیں ہیں!" انھوں نے فیصلہ کیا۔

"ہم انھیں بتا دیں گے!" ان کا سردار بولا۔ "ہم اپنا جتھا بنائیں گے اور من مانی کریں گے!"

جلسہ ختم ہوا، اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے، لیکن اس رات وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نہیں سوئے، بلکہ ٹولیاں بنا کر، ایک جھیل کے کنارے درختوں کی سب سے اونچی شاخوں پہ سو رہے۔

آدھی رات ہوگی جب ایک بندر کی آنکھ کھلی۔ درخت کے اوپر سے جو اس نے دیکھا تو جھیل میں پانی کے اندر، اُسے چمکتا ہوا چاند نظر آیا۔ "اٹھو، جاگو ساتھیو!" وہ چلایا "چاند جھیل میں گر گیا ہے! چلو، چل کے اُسے نکالیں جلدی کرو، کوئی اور نہ پہنچ جائے!"

"ہاں ہاں چلو!" سبھی بولے "اس سے ہم دنیا بھر میں مشہور ہو جائیں گے!"

"چاند تک پہنچنے کا یہی طریقہ ہے" سردار نے کہا "کہ ہم ایک دوسرے کے پیچھے زنجیر بنا کر چلیں!"

بندروں کی ایک لمبی زنجیر بنی — ہر بندر نے ایک دوسرے کی دُم مضبوطی سے پکڑ لی۔ ان کے پانی میں کودنے کی آواز جنگل میں گونج اُٹھی، اور وہ چاند کو نکالتے نکالتے آپ بھی ڈوب مرے!

رضا نقوی

چلنا تیرا کام ہے راہی

تیرا سفر ہر سانس ہے راہی تیرا سفر ہر گام چاند چھپے یا سورج نکلے تجھ کو کب آرام
وقت کے تیور دیکھنے والے وقت کا سن پیغام شام کے پیچھے صبح ہے پیارے صبح کے پیچھے شام

چلنا تیرا کام ہے راہی، چلنا تیرا کام

راہ ہے تیری سیدھی بالکل دیکھ نہ دائیں بائیں ممکن ہے موسم کی ہوائیں آکر لوری گائیں
ممکن ہے منزل کے فسانے تیرا جی بہلائیں منزل کیسی، منزل تو ہے تیری تھکن کا نام

چلنا تیرا کام ہے راہی، چلنا تیرا کام

اپنی کمندیں پھینک رہے ہیں تجھ پر مہر و ماہ اپنا افسوں پھونک رہے ہیں تجھ پر عزّ و جاہ
عقل بھی رہزن، عشق بھی رہزن، دونوں روکیں راہ ان کی باتوں میں مت آنا دونوں ہیں بدنام

چلنا تیرا کام ہے راہی، چلنا تیرا کام

زلفوں والے رہزن تجھ پر پھینک رہے ہیں جال ٹیڑھے ہیں ابرو کے اشارے سیدھی کر لے چال
رنگ بھی دھوکا، نور بھی دھوکا دونوں ہیں جنجال ہوش کی آنکھیں کھول کے چلنا دام بچھے ہیں دام

چلنا تیرا کام ہے راہی، چلنا تیرا کام

پیڑ کھڑے ہیں بیچ ڈگر میں شاخوں کو پھیلائے چھاؤں گھنی ہے، سر ہوا ہے، نیند نہ تجھ کو آئے
مسجد کی دیواریں بھی ہیں مندر کے بھی سائے رستے میں مے خانے بھی ہیں خطرہ ہے ہر گام

چلنا تیرا کام ہے راہی، چلنا تیرا کام

راہی ہے ہر راہ کا چکّر تیری سمجھ کا پھیر شمع اندھیرے سے گھبرائے، یہ کیسا اندھیر
رات خنک تھی آ گئی جھپکی سو گیا تھوڑی دیر دیکھ رضاؔ کی یہ بدبختی دیکھ اس کا انجام

چلنا تیرا کام ہے راہی — چلنا تیرا کام

حسن امام

نوراللہ شاہ وحشت

گیا ہتر اس طرح بسا ہُوا تھا کہ چوسر کی بساط کی صورت سڑکیں قدم قدم پر کٹتی کاٹتی بچھی ہوئی تھیں۔ محلہ مرادپور میں جو سڑک پچھم سے پورب کو جاتی تھی اسی پر غنی منزل کا پھاٹک دکھن رُخ کا اور اس کے مقابل ذرا پورب کو دبتی ہوئی ایک شاندار دو منزلہ عمارت اُتر رُخ کی تھی جس میں منشی ولی اللہ مختار اور اُن کے صاجزادے مسٹر نوراللہ شاہ وحشت بیرسٹرایٹ لاء رہتے تھے۔ اور پورب کی طرف ل کر اس سڑک کو دوسری سڑک کاٹتی ہوئی گزرتی تھی جو دکھن سے اتر کو جاتی تھی۔ س کے اتروادی کونے پر پورب رُخ کا ایک مکان[1] ہُوا کرتا تھا جس میں منشی امیرالدین ہا کرتے تھے جو اس زمانہ میں ڈسٹرکٹ بورڈ میں ہیڈ کلارک تھے مگر بعد کو بورڈ ے سکریٹری ہو کر ریٹائر ہوئے تھے۔ ذرا اور اُتر کو چل کر دونوں منزلوں کو اُٹھائے ، پایوں والا ایک مکان منشی سیتل پرشاد مختار کا کرایہ پر اُٹھا ہوا تھا جس ، راقم الحروف طفلِ مکتب کی عمر میں بسر کر رہا تھا۔ مجھ کو تین مہینے کی عمر سے رت دادی اماں مرحومہ نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے کر پرورش کیا تھا، س کے ساتھ میرا رہن سہن تھا۔ میرے والدین دو چوراہے دُور دوسرے مکا ن میں اور پورب جا کر آباد تھے۔ اکثر ہمارا قیام غنی منزل میں ہوا کرتا تھا جو میر ی سگی پھوپھی مرحومہ کا مکان تھا۔ شاہ ولی اللہ مختار تو ذاتی شکل و شباہت کے ن رسیدہ شخص تھے جو مختار تو کہیں سے نہیں معلوم ہوتے تھے البتہ بزرگی اد عیاں راچہ بیاں تھی۔ کچہری جاتے یا وہاں سے واپس آتے کبھی کبھی دکھائی دے جاتے۔ اپنی پالکی گاڑی ان کی سواری میں ہوا کرتی تھی۔ مسٹر نوراللہ شاہ کو کچہری جاتے بہت کم دیکھتے تھے آدمی وجیہہ، خاصے گورے چٹے، سُرخ و سفید مگر قد میانہ تھا۔ داڑھی صفاچٹ۔ گھنی مگر اصلاح شدہ مونچھیں زیب دیتی تھیں۔ ایک دن میرے والد ماجد سے ملنے تشریف لائے تھے تو انگریزی لباس میں عجیب طریقے سے کسائے کبر و نخوت کا مجسمہ نظر آرہے تھے۔ اس دن اُن کی طرف سے طبیعت کو جو انقباض محسوس ہوا تھا وہ یاد آکر آج تک منہ سے پانی پانی کئے دیتا ہے۔ اس وقت جانتے کہاں تھے کہ یہ لباس عجُب تھا جو ہیئت کذائی کی تخریب کا جوابدہ تھا۔ فی زمانہا پروفیسر کلیم الدین مشہور تنقید نگار نے اپنے والد بزرگوار کا جو مجموعۂ کلام شایع کیا ہے اس کے ساتھ ڈاکٹر عظیم الدّین مرحوم کی تصویر بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی لباس نے ایسا تان رکھا ہے کہ خواہ مخواہ ان پر بھی خود پسند ہونے کا پورا دھوکا ہوئے بغیر نہیں رہتا حالانکہ بزرگ وحشت اور معاصر عظیم دونوں منکسر، متواضع اور خلیق تھے۔

قیام گاہ سیتل پرشاد مختار والے مکان سے غنی منزل جانا روز کا معمول تھا۔ حضرت وحشت سے تعارف ہو ہی چکا تھا لہٰذا اکثر شام کو وہ اپنے بالاخانہ سے سڑک کی طرف جھکے محوِ تماشہ نظر آجایا کرتے تو سلام کے لئے ہاتھ اُٹھ ہی جاتا۔ موصوف بزرگانہ شفقت فرماتے اور خیر خبر پوچھ لیا کرتے۔ ہنوز ہم ان کو شاعر نہیں جانتے تھے مگر ایک طرح سے شاعری کی حیثیت سے ان کا نام پہلے پہل سُنا تھا جو غلط فہمی پر مبنی تھا۔

۱۹۰۶ء میں حضرت دادی اماں نے جنّت کا سفر فرمایا اور میرے

---

[1] اس کا قایم مقام اب وارثی مینشن ہے جس میں عزیزی سید محبوب احمد سلمہٗ ایڈوکیٹ رہتے ہیں۔

قبلہ گاہی حاجی سید علی امام بیرسٹر ایٹ لا کو مدّ نظر تھا کہ اپنا مکان از سرِ نو تعمیر کریں لہٰذا ممدوح مع متعلقین اسی سبیتی پر شاد والے مکان میں اٹھ آئے ہم لوگوں کے اسٹیٹ کے منیجر مولوی شمس الہدیٰ مرحوم ایک فوجداری مقدمہ میں ماخوذ ہو گئے تھے جس کی پیروی کے لئے قبلہ گاہی مع در سب ڈویژن اورنگ آباد گئے ہوئے تھے۔ محرم کا اوّل عشرہ ختم نہ ہوا تھا۔ ساتویں تاریخ تھی۔ قریب مغرب ہم ٹوئے غنی منزل جا رہے تھے کہ حسبِ معمول وحشت صاحب کٹہرے سے لگے نگراں راہ نظر آئے۔ سلام دعا ہوئی۔ پوچھنے لگے کہ:۔

"مہندی کا جلوس دیکھنے کس کے ساتھ جاؤ گے، تمھارے ابا تو ہیں نہیں؟"

جواب میں کچھ عرض بھی نہ کرنے پائے تھے کہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

"ہم ساتھ لے چلیں گے"

اس جلوس کے دیکھنے کا ہمارا معمول نہ تھا لہٰذا ممدوح کے وعدے نے ہم کو نہ تو خوش وقت فرمایا نہ ہم نے اس کو کوئی اہمیت دی۔ ہر روز کی طرح کھا پی کر سو رہے۔ نادقت کو اٹھنے کی عادت نہ تھی لہٰذا نوکر نے جو جگایا تو اسی حرکت نے بد دماغ کر دیا تھا کہ اوپر سے اس نے منحوس خبر سنائی کہ "نور اللہ شاہ مر گئے"۔ یقین کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ یہ تو سمجھ میں بھی آنے والی بات نہ تھی۔ کھینچ کر ایک چانٹا اس کو رسید کر ہی تو دیا۔ اپنی صفائی میں اس غریب نے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر کی طرف توجہ دلا کر بتایا کہ سب لوگ جا چکے ہیں۔ میری طلبی کے لئے کئی بار آدمی آ چکے ہیں۔ تب جا کر خبرِ وحشت اثر نے دماغ کو بیدار کیا۔ حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو کر باوضو افتاں خیزاں وہاں پہونچا تو میت کو غسل دیا جا رہا تھا۔ مختارہ ولی اللہ پہلے ہی خلد آباد ہو چکے تھے۔ صاحبزادے یکہ و تنہا رہتے تھے۔ صرف نوکروں کی معیت تھی۔ امام باڑے والے قبرستان میں جب قالبِ بے جان کو امانت رکھتے وقت چادر ہٹائی گئی تو چہرہ دیکھ کر ہم تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ آج بھی حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ ایسا مانند و شہاب رنگ، اتنا شگفتہ چہرہ، گالوں پر گلابِ تازہ کا شبہ، اتنے سلیقے کی رنگ آمیزی زندوں میں نہیں دیکھی۔ مرے مُردے کا سوال ہی نہیں۔ بس یوں لگتا تھا کہ کوئی نو بادۂ حُسن و شباب محوِ خوابِ ناز ہے۔ لا اُبالی مرد جس کو چاہے جیسے نوازے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون منہ سے کہتا تھا مگر دل کہتا تھا نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْس (ترجمہ:۔ سو رہو جیسے دلھن سوتی ہے)

تجہیز و تدفین کے بعد جو واپس آئے تو پہلی بار معلوم ہوا کہ مرحوم شاعر بھی تھے اور ایک ننھا سا مجموعۂ کلام "یا ساغر وحے" کے نام سے شائع بھی کر چکے تھے مگر کہیں اپنا نام پتہ سوائے تخلص اس پر درج ہونے نہ دیا تھا۔ جو کچھ فرماتے تھے سب فارسی میں۔ اس وقت تو ہم کیا تمیز اچھے برے کلام کی کر سکتے تھے۔ البتہ ایک اثر ان کے کلام کا اسی زمانہ میں یاد ہے۔ منشی امیر الدین کے ساتھ شاہ عبد العزیز آزاد بطور ماتحت بورڈ میں ملازم تھے۔ موخر الذکر ایک دن ماسٹر سید امیر حیدر صاحب افسر سے ملنے آئے اور ایک بہت ہی شکستہ خط میں لکھی ہوئی نظم صاف کرنے کو دے گئے۔ ماسٹر صاحب کا خط پختہ تو نہ تھا مگر اچھا تھا۔ کئی دن کی محنت کے بعد وہ مسودہ بصورتِ مبیضہ تیار ہوا تو رات کے کھانے دانے سے فارغ ہو کر شاہ عبد العزیز آزاد بلوائے گئے اور نظم ان کو سنائی جانے لگی۔ مثنوی کی بحر میں وحشت مرحوم نے حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ کا شجرۂ بیعت نظم فرما کر آخر میں طولانی مناجات بھی لگا دی تھی۔ شاہ عبد العزیز اس سلسلہ میں بیعت تھے لہٰذا ان کا تاثر تعجب خیز نہ تھا۔ افسر صاحب نیچری ہونے پر فخر کرتے تھے اور ع منم کہ غایت حرماں نہ با آنم نہ با اینم" راقم الحروف پر صادق آتا تھا مگر حال یہ تھا کہ یہ کہنا مشکل تھا کہ سب سے زیادہ متاثر کون تھا۔ آنسو کسی کے بھی نہیں تھم رہے تھے۔ "یا ساغر وحے" مطبوعہ کا ایک نسخہ تو سالوں بعد کسی صورت دستیاب ہوا اور کلامِ وحشت کے مطالعہ سے فیضیاب ہوا مگر باوجود پیہم طلب و تقاضا شاہ عبد العزیز آزاد نے شجرہ منظوم دینا تھا نہ دیا۔ وعدے کر لیتے تھے مگر ایفا کی نوبت کبھی نہ آئی۔ یہاں تک کہ مرشد گنج قدس سرہٗ کے پوتے حضرت مولانا شاہ رحمت اللہ میاں نے تاکیدیں کیں مگر وہ بھی ضایع گئیں۔ صاحبزادہ صاحب علیہ الرحمہ کا خاص کرم اس ناچیز کے حال پر تھا اس لئے انھوں نے یہ تاکیدیں فرمائی تھیں۔

وہ جو میں اوپر لکھ آیا ہوں کہ ان کے مرنے سے پہلے حضرت وحشت کو شاعر نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی تھا تو غلط فہمی کے تحت۔ تو اس کا قصہ یہ ہے کہ لوگ ان کو نئی نئی انگریزی زندگی کی وجہ سے بجائے پورا نام لینے کے مختصراً "این، شاہ" کہا کرتے تھے۔ ۱۹۰۵ء سے پہلے میں انگریزی حروفِ ہجا تک سے واقف نہ تھا لہٰذا لوگوں کے رواں تلفظ کو "این، انشا" باور کر کے کبیدہ خاطر ہوا کرتا تھا کہ شاعر کے تخلص کو مجہول طریقے سے کیوں تلفظ کرتے ہیں۔ انگریزی

کی شُد بُد کے بعد معلوم ہُوا کہ واقعہ کیا تھا۔ اس لئے تفاول صحیح مگر اس کا طریقہ محلِ نظر۔

مسٹر نوراللہ شاہ کی شادی نہیں ہوئی تھی لہٰذا ان کی وراثت ان کے برادر عم زاد حافظ رحمت اللہ مظفرپوری کو پہونچ گئی۔ چہلم کرنے کے لئے حافظ صاحب گیا آئے تو نوراللہ شاہ کا مکان کرایہ پر لے لیا گیا اور فوراً ہی ہم لوگ اس میں منتقل ہوگئے۔ اس وقت تک اِدھر اُدھر پڑی پُرانی اکثر تحریریں حضرت وحشت کی موجود تھیں جن کو میں محفوظ کرتا جاتا تھا۔ منجملہ اس کے ایک وصلی دستیاب ہوئی تھی جس کو میں بے حد عزیز رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی اسی شب کی لکھی ہوئی تھی جس شب حضرت وحشت نے دنیا سے منہ موڑا تھا اور جو کچھ تحریر فرمایا تھا وہ بھی بہت ہی معنی خیز تھا یعنی

تو بکارِ کسے نمی آئی — بکنارِ کسے نمی آئی
بچہ امیدی تواں مردن — بمزار کسے نمی آئی

خوشخط مشق فرمایا تھا اور ذیل میں دستخط کے ساتھ تاریخ بھی درج کردی تھی۔

بات یہ ہے کہ مسٹر نوراللہ شاہ وحشت بڑے کم آمیز تھے مگر اس کم آمیزی کا تعلق کسی صورت بھی بددماغی سے نہیں تھا۔ میرے علم میں ان کے احباب کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ البتہ منشی امیرالدین سے وہ ٹوٹ کر ملتے تھے۔ منشی صاحب زاہد و عابد اور جناب وحشت رند۔ پارسا۔ گویا ایک تو اس سرے اور دوسرا اُس سرے مگر خلوص و یگانگی کا یہ عالم کہ منشی صاحب کے یہاں وحشت صاحب سے پردہ نہ ہوتا تھا۔ شادی نہ انھوں نے کی نہ اُنھوں نے بلکہ منشی صاحب کی ایک یا دو ہمشیرہ بھی ناکتخدا ہی رہیں۔ اپنے مجموعۂ کلام کا نام "باساغرِ مے" رکھ کر خود ہی 'مرید جام' ہونے کا راز فاش کر بیٹھے تھے مگر اس ام الخبائث کو بار یاب صحبت کرکے یہ بھی ثابت کر گئے کہ ؎

مے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است
بلکہ مے می شود از صحبتِ ناداں بدنام

سچ ہے جس کی خدا چاہے لاج رکھ لے اور اپنی رحمتوں سے نوازنے کے لئے جہاں سے چاہے بہانے کھڑے کرلے ؎

لبے اُفتادہ بدمست و بے اُفتادہ در طاعت
تو دانی تا بلطف از خاک بر داری کداماں را

آیئے اب کلامِ وحشت کی سیر بھی کرلی جائے۔ مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید۔ گنتی کی چند غزلیں اور صرف دو تضمینیں ہیں جن کو یکم مئی ۱۹۱۲ء کی نقل کردہ میری ایک بوسیدہ سی بیاض محفوظ کئے ہوئے ہے کہ انھیں سے انتخاب کرنا ٹھیرا۔ بکاول دیگ کے ایک دو چاولوں کو ٹٹول کر پلاؤ زردے کے دم پخت کے متعلق حکم لگا سکتا ہے تو اہلِ نظر کو اظہارِ خیال کے لئے جو کچھ نذر کیا جارہا ہے وہ کافی سے زیادہ ہے۔

بہارِ یادِ تُست اے جان در گلزارِ خاطر ہا
عجب باشد کہ باشی در پے آزارِ خاطر ہا
ہمانا خاطرِ یاراں سبک تر باشد از مینا
خوشا مردِ گراں مایہ کہ نبود بارِ خاطر ہا

فصلِ گل آمد بجوش و گلعذارِ من کجا — نغمہ زد بلبل مگر رشکِ بہارِ من کجا
ہر کہ یادت کرد میگویند خاطر جمع داشت — من بیادت می تپم صبر و قرارِ من کجا
خیمہ زد ابر و برآمد لالہ ہم ساغر بکف — مست شد ہم بلبل و گل میگسارِ من کجا

فصلِ گل بانگار باید شد — ز آسماں ہوشیار باید شد
یا بصحرا گزر بباید کرد — یا بسوئے کوہسار باید شد
یا بصحنِ چمن بباید ماند — یا لبِ جوئبار باید شد
الغرض ہر کجا کہ شوق برد — ذوقِ بوس و کنار باید شد
چشم گریانم ابر را گوید — حالیا خرمسار باید شد
جاں تنہا فدائے یار مباد — نیز ایماں نثار باید شد
تا قرارے بیک نگہ بخشند — سالہا بے قرار باید شد
وحشت، آزاد و مست زی کافر
پائے بندِ مزار باید شد

مبارک اے دلِ ناداں کہ امشب یار می آید
زصہبائے جمالِ خویشتن سرشار می آید
کہ جلوہ می کند اندر بتاں تا ہر برہمن را
رموزِ حق شناسی در خورِ زنار می آید
مسیحا را نمی پرسم، بچشمِ تو ہمی نگرم
کہ درمانِ غمم زاں نرگسِ بیمار می آید
مگر ناخن زند مطرب دلِ مجروحِ عاشق را
کہ با ہر ضربِ مضرابش فغاں از تار می آید

بکوئے یار چوں آئی فغانے ساز کن وحشت
برنگِ بلبلِ نالاں کہ در گلزار می آید

ناز فدایت می کند ہر لحظہ باشانے دگر — عاشقِ جانباز را ہر دم بود جانے دگر
یا نگاہ شرمگیں یا ناز یا تمکین یار — می رسد اندر دلم ہر لحظہ مہمانے دگر
ہم غم ہجراں دہد ہر روز آں پیماں شکن — ہم تسلی بخشدم با عہد و پیمانے دگر
فارغ از اسلام ہستم بے نیاز از ماسوی — می کند شوقِ تو ام تلقینِ ایمانے دگر
گو شکر ریزد لبہائے بتاں وحشت مگر
می دہد لعلش خبر از شکرستانے دگر

بریار اگر بخواہی کہ شبے رسیدہ باشی — ہمہ عمر در خیالش ز ہمہ رمیدہ باشی
چہ کند فروغ حسنت بکسے چوں من چو گویم — ز خراب خستہ وحشت تو مگر شنیدہ باشی

عرفی شیرازی کے صرف ایک مقطع کی تضمین

مرا یار یست اندر جہاں کہ جاں را می دہد صورت
نگنجد در جہاں لیکن دلِ من باشدش خلوت
رخش نادیدہ بشنیدہ مگر از خویش شہرت
چناں رقصید عرفی بر درِ بتخانہ کز حسرت
برہمن گفت کایں کافر چہ اوستادانہ می رقصد

ز مومن آیتِ ایماں ز ملحد سورِ دہریت
ز کافر کفر بشنید از موحّد نکتۂ وحدت
ہمہ تمکین بود و لیک بر افسانۂ عشقت
چناں رقصید عرفی بر درِ بتخانہ کز حسرت
برہمن گفت کایں کافر چہ اوستادانہ می رقصد

بتا در میکدہ بنگر کہ میخوارانِ خوشش نیّت
چناں زیں عمر بغم آگیں نمی گیرند جز عشرت
مگر نشنیدہ ولیکن زفیضِ جام بے منّت
چناں رقصید عرفی بر در بتخانہ کز حسرت
برہمن گفت کایں کافر چہ اوستادانہ می رقصد

ایک تضمین حافظ شیرازی کی اس غزل کے چند اشعار پر تھی جس کا مطلع ہے ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے — بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاو ہوئے

ایک غزل نعت میں بیدل عظیم آبادی کی زمین میں تھی اور خوب تھی افسوس وہ ورق جس پر اس کو نقل کیا تھا محفوظ نہ رہ سکا۔

ٹیس کا بانی مشرقی مذاق کے آب و تاب کو پہلے جو دھو نہ سکا تھا اس سے معاشرے کی بنیاد مستحکم ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ جیسے جیسے غلامانہ ذہنیت جڑ پکڑتی گئی غیر ملکی ملمّع ظاہر سے باطن تک چڑھتا چلا گیا۔ نور اللہ شاہ وحشت وطنی عصبیت کو سنبھالے رکھنے والوں کی روشن یادگار کی حیثیت سے قدر و منزلت کے قابل آج بھی ہیں!

مفتوں کوٹی

غزل

ہیں وابستہ ہم ان بہاروں سے اب تک — وہ جو کھیلی ہیں شراروں سے اب تک
وہ ہیں ضو فگن چاند تاروں سے اب تک — نہ واقف ہوا تو اشاروں سے اب تک
ہوا یہ بھی میرے مقدر سے ممکن — اٹھے تھے نہ طوفاں کناروں سے اب تک
ہوں پابندِ آدابِ عہدِ گلستاں — رہ و رسم ہے خارزاروں سے اب تک
نہیں ہیں، تو جلووں میں رونق کہاں ہے — برستی ہے حسرت نظاروں سے اب تک
دل اپنا منور، نظر اپنی روشن — ہمیں ربط ہے ماہ پاروں سے اب تک
وہ حدِ نظر میری کیا پا سکیں گے — نہ آگے بڑھے جو ستاروں سے اب تک
ابھی تک ہیں تنکے نشیمن کے باقی — ہمیں انس ہے شاخساروں سے اب تک
ترے تذکرے میں ہے محتاط مفتوں
نکالا ہے کام استعاروں سے اب تک

گرامی

ملک الشعرا حضرت مولانا غلام قادر گرامی مرحوم، شاعرِ خاص نظامِ دکن، اپنے زمانے میں فارسی کے عدیم المثال شاعر تھے، چناں چہ خود ہی فرماتے ہیں ؎

گر رسد آوازۂ ایں پارسی در ہند و پارس
خسرو از دہلی ظہیر از فاریاب آید بروں

آپ کے باب میں تمکین کاظمی کا
مضمون صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ فرمائیں

پنج گنجِ گرامی

بسے گشتم و جز ملکِ عشق کم دیدم ــــ ولائتے کہ دراں بندہ بے خداوند است

ستارہ دشمن و رہ پیچ پیچ و منزل دور ــــ عسس بہ راہزنان یار و رہنما خفتہ است

ما سبحۂ ز رشتۂ زنّار ساختیم ــــ ایماں بکفر و کفر با یماں فروختیم

آہم بسرِ راہے ماہم بسرِ بامے ــــ دیوار با میدے امید بدیوارے

آئینہ بکف جلوہ و نظارہ ہوس مست ــــ فرصت زپرافشانیٔ مژگاں گلہ دارد
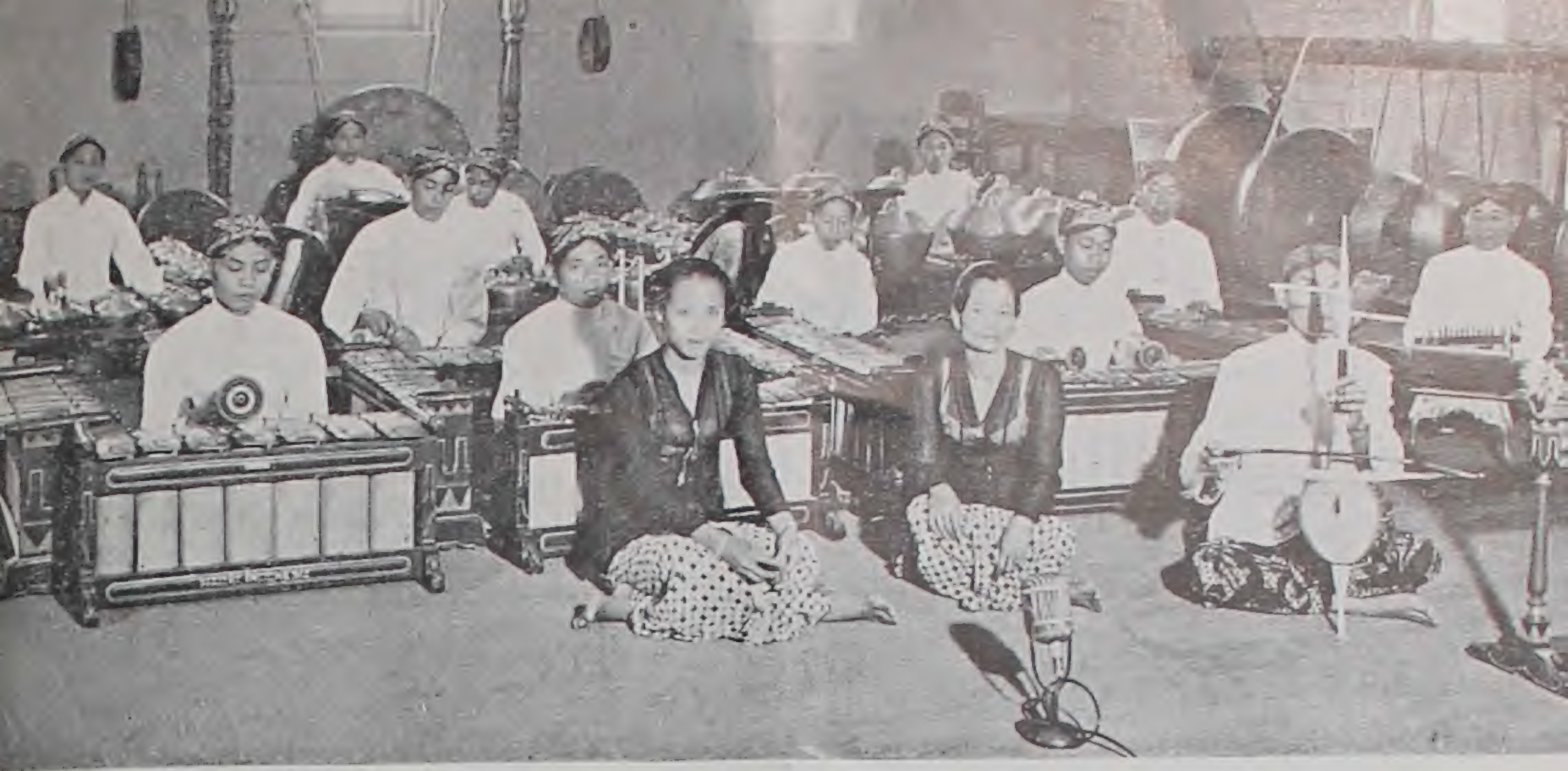
گمیلان

دائیں طرف (اوپر) گنڈیر ۱

دائیں طرف (نیچے) گمبانگ کایو — انڈونیشی کاٹھ ترنگ

گونگ

گیملان — انڈونیشی آرکسٹرا

محمد فیاض کا مضمون "انڈونیشی موسیقی اور گیملان" صفحہ ۲۸ پر درج ہے

چلم پونگ

کنڈانگ
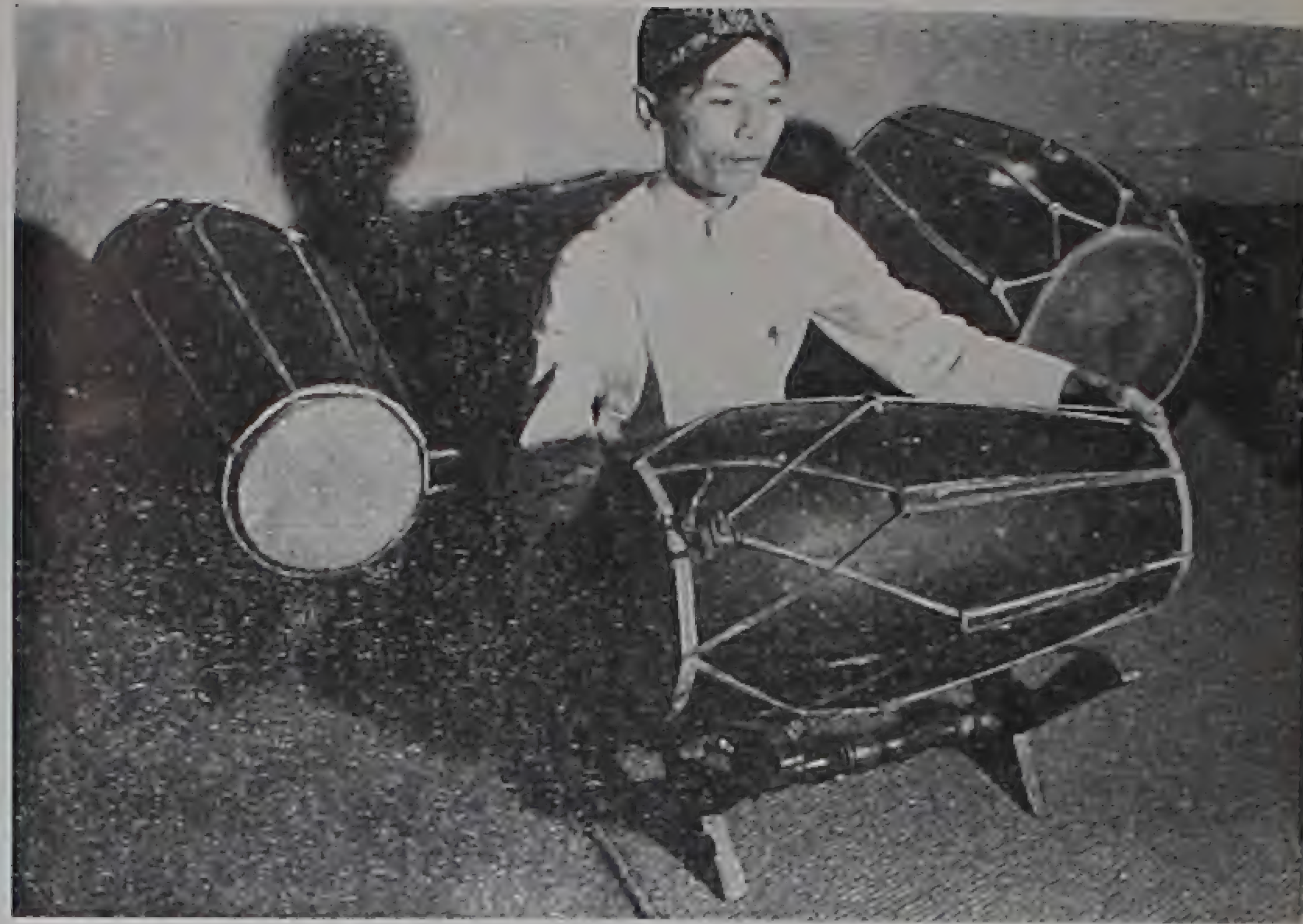
سولنگ (بانسری)، سارون اور گنڈیر

مکامہ میں گنگا کا پُل

طُرفہ قریشی

غزل

دہر کی کیفیتیں بھی قہر کا عالم بھی ہے
آنکھ میں انسان کی تریاق بھی ہے سم بھی ہے

ہے کہیں جشنِ مسرت تو کہیں ماتم بھی ہے
لَو چراغِ زندگی کی تیز بھی مدھم بھی ہے

کر جلال آمیز اس کو یا جمال آمیختہ
زندگی شعلہ بھی ہے اور زندگی شبنم بھی ہے

بھولنا اچھا نہیں عشرت میں عسرت کا خیال
ہر خوشی کے بعد انساں کے لئے اک غم بھی ہے

زیست کا مقصد تبسم ہی تبسم تو نہیں
بے خبر! کچھ اقتضائے دیدۂ پُرنم بھی ہے

اب یہ تیری اپنی مرضی کر جسے چاہے قبول
کاسۂ درویش بھی ہے اور جامِ جم بھی ہے

میں ہوں انساں، میرے دل میں اے حرم کے پاسباں
حُرمتِ سینا بھی ہے اور عظمتِ مریم بھی ہے

کس کو اپناتا ہے دیکھیں اہلِ گلشن کا مذاق
خندۂ گُل بھی یہاں ہے گریۂ شبنم بھی ہے

میں ہوں بیمار اس کا، جس کے التفاتِ خاص میں
زخمہائے حضرتِ ایوب کا مرہم بھی ہے

احتیاط اے آرزو مندِ محبت احتیاط!
رشتۂ حُسن و محبت خام بھی محکم بھی ہے

کل یہ اے طرفہ کہیں خاصہ مغنی بن نہ جائے
آج کا شاعر مجسم سُر بھی ہے سرگم بھی ہے

محمد فیاض

انڈونیشی موسیقی اور گمیلان

انڈونیشی جزائر میں رقص و موسیقی کی روایات بہت گہری اور قدیم ہیں عام پسند موسیقی یا لوک سنگیت کی ہمہ گیر مقبولیت کے علاوہ قدیم کلاسکی موسیقی بھی بڑی ترقی یافتہ شکل میں پائی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جس طرح مجموعی طور پر انڈونیشی ثقافت مقامی اور بیرونی تہذیبوں کا خوشنما امتزاج ہے اسی طرح موسیقی پر بھی باہری اثرات کی چھاپ ملتی ہے لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ انڈونیشی موسیقی ترقی کی جس منزل پر ہے وہاں اُسے پہنچانا خالص انڈونیشی قوم کا ثقافتی کارنامہ ہے۔ جغرافیائی محل وقوع، موافق آب و ہوا اور زمین کی استوائی زرخیزی ایسے عناصر تھے جن کے سبب پچھلے لگ بھگ دو ہزار سال کے عرصہ میں بھانت بھانت کی تہذیبوں کا ورود ناگزیر تھا لیکن ان تہذیبوں کے اثرات کو اپنانے اور مقامی تہذیب میں ان کو حسنِ خوبی سے سمونے میں بلاشبہ انڈونیشیوں کی تخلیقی اور اختراعی ذہانت کا ہاتھ ہے جو رقص و موسیقی کے معاملہ میں بڑی نمایاں فنی لیاقت اور ہنرمندی کے حامل ہیں۔ فنونِ لطیفہ کی دلدادگی اُن کے قومی مزاج کی ایک خصوصیت ہے۔ رقص، موسیقی، فنِ تمثیل، نقاشی و مصوری غرض ہر شعبہ میں ان کا فن ساری دُنیا سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔

رقص و موسیقی تو عوامی زندگی کا ایک جزو ہیں اور روزمرہ کی زندگی میں ان کا دخل رسمیت یا ٹیم ٹام سے یکسر خالی ہے۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں موسیقی اور اس کے دوران میں رقص کا شروع ہو جانا ایک معمولی بات ہے اس کے لئے کسی خاص موسم یا تقریب کی ضرورت نہیں۔

چوکیدار پہرہ پر بیٹھے بیٹھے یکایک ایک تان لگا کر کوئی لوک دُھن شروع کر دیتا ہے۔ گھر کی ملازمہ کام کرتے کرتے گنگنانے لگتی ہے۔ شام کو محلوں کے بچّے کھیلتے کھیلتے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں ڈفلی ہے کوئی خالی ٹین کو لکڑی سے بجا رہا ہے کوئی بانس کے ٹکڑوں کو پیٹ کر آواز پیدا کر رہا ہے دو چار تالیاں بجا رہے ہیں۔ پورے آرکسٹرا کا لُطف آ رہا ہے۔ کہروا کی لے جب روانی پر آئی تو ان میں سے ایک کُود کر قریب کھڑے ہوئے ٹرک کے ہڈ پر سوار ہو گیا اور ہولے ہولے قدموں سے جسم کو لچکا لچکا کر ناچنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دوسرا بھی شامل ہو گیا۔ تال میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ دو ننھے رقاص ہاتھوں کی جنبش، جسم کی لچک، گردن کی حرکت اور چہرے کی مسکراہٹ سے ایک دوسرے کو جواب دینے لگے۔

انڈونیشی زندگی میں یہ واقعات یعنی رقص و موسیقی کا یکایک پھوٹ پڑنا کسی استعجاب کا باعث نہیں ہوتا۔ راہ گیر کھڑے ہو کر متوجہ نہیں ہوتے، لوگ کھڑکیوں سے سر نکال کر دیکھنے نہیں لگتے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رقص و موسیقی کے ان مظاہروں میں کوئی انڈونیشی "بے تُکاپن" نہیں محسوس کرتا۔

رقص و موسیقی سے دلدادگی کی دوسری منزل وہ ہے جس میں اہتمام کو دخل ہوتا ہے۔ تقریبات میں موسیقی کا رواج بڑا ہمہ گیر ہے خوشی کے موقعوں پر لاؤڈ اسپیکر پر گراموفون ریکارڈوں کی دہاڑ کے بجائے آپ کو شامیانے کے ایک گوشہ میں دو چار سازوں کے سامنے کھڑے ہوئے موسیقار کا منظر یہاں بہت دیکھنے میں آئے گا۔ گمیلان کے متعدد سازوں کے اجتماع کے درمیان بیٹھا ہوا "دالنگ" کٹھ پتلیوں کی مدد سے راماین اور مہابھارت کی سچائی اور شجاعت کے قصّے سُناتا ہے تو ہجوم کسی اعلیٰ درجہ کے کانسرٹ کے مقابلہ میں کم نہیں ہوتا۔ گھروں گھروں میں ضیافتوں کے موقعوں پر اور یہ مواقع انڈونیشی

طرزِ زندگی میں بہت عام ہیں) رقص کے لئے آرکسٹرا کا اہتمام غیر معمولی بات نہیں۔ یورپی، امریکی اثرات کی بناء پر تعلیم یافتہ طبقہ میں گو یورپی رقص بہت مقبول ہے۔ تاہم عوام میں "جوگت" نام کے رقص اور "کرون چونگ" موسیقی کا بڑا رواج ہے۔ پیشہ ور رقاص اور موسیقار بھی ہیں لیکن رقص و موسیقی کی تربیت اور مظاہرہ کسی مخصوص طبقے تک محدود نہیں خود صدر سوکارنو کی دو صاحبزادیاں جاوائی رقص کی اچھی کلاکار مانی جاتی ہیں اور سُنا جاتا ہے کہ کسی حد تک ہندوستانی رقص سے بھی متعارف ہیں۔

فنِ رقص و موسیقی کے معاملہ میں انڈونیشی ذوق محدود نہیں۔ اور بیک وقت ایک شخص کا ملکی، یورپی اور ہندوستانی موسیقی کا دلدادہ ہونا شاذ و نادر بات نہیں۔ ہندوستانی فلمی موسیقی خاص طور پر عوام میں بہت مقبول ہے[1] اور بہت سے ہندوستانی فلمی نغمے انڈونیشی الفاظ میں گائے جاتے ہیں۔

جہاں تک خالص انڈونیشی موسیقی کا تعلق ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ باہری اثرات (خصوصاً یورپی امریکی) اس کی ترقی کے لئے مضر ہیں لیکن ساتھ ساتھ اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ لوگوں میں اپنی روایاتی قدروں کا احساس بھی بڑھ رہا ہے خصوصاً جاوا اور بالی کے جزیروں میں جہاں کی آبادی ثقافتی طور پر بڑی حد تک صحت مند ہے اور نہ صرف اُپج کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے بلکہ تاریخ میں اب تک ان قدروں کی پاسبانی کرتی آئی ہے۔

انڈونیشی کلاسیکی موسیقی کی بنیاد جس نظام پر قائم ہے وہ قدیم چینی نظام موسیقی کے دائرہ میں آتا ہے جسے Cyclic یا Pentatonic system کہتے ہیں (افسوس ہے کہ اس کی تفصیل جس کے دوران میں مختلف نظاموں کا تقابلی تذکرہ ضروری ہو جائے گا دائرۂ مضمون سے باہر ہے) اس نظام میں سپتک میں سروں کا تعین ہندوستانی سنگیت سے مختلف ہے۔ یہاں ایک طریقے سے سپتک کو پانچ برابر حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے جسے سلندرو Slendro کہتے ہیں اور دوسرے طریقے سے سات نابرابر حصّوں میں جسے پیلوگ Pelog کہتے ہیں۔

دونوں طریقے بہ یک وقت رائج ہیں۔ پیلوگ اور سلندرو کے ساز اور ان پر گائی جانے والی موسیقی گو الگ الگ ہیں تاہم ایک ہی مجموعۂ ساز میں دونوں طرح کے سازوں کا استعمال اور ایک ہی محفل میں دونوں طرح کی موسیقی کا گایا جانا قابلِ اعتراض نہیں۔ پیلوگ اور سلندرو کے سپتکوں میں سُروں کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے۔

کھرج رکھب رکھب گندھار گندھار مدھم مدھم پنچم دھیوت دھیوت نکھاد نکھاد کھرج

سلندرو: بارنگ لیما داوا گلو بارنگ نم

پیلوگ: بارنگ لیما پیلوگ داوا گلو پنگو بانگ نم

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انڈونیشی نظام کے ایک قائم سُر کو ہم کھرج مان لیں تو اس سپتک کا کوئی بھی انڈونیشی سُر ہمارے سپتک کے کسی سُر سے نہیں ملے گا۔ ہندوستانی موسیقی سے آشنا کان اور اپنی راگ راگنیوں کی بنیاد پر نغمگی تلاش کرنے والا ذوق اس نظام پر مبنی موسیقی میں "بے سُرا پن" محسوس کرے گا لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی اجنبی موسیقی سے لُطف اندوز ہونے کے لئے اور اس کی خوبیوں کی داد دینے کے لئے ہمیں اپنی ملکی موسیقی کے خالص علمی یا نظری تصوّرات کو ایک لمحے کے لئے الگ رکھنا پڑے گا ورنہ ہمارا ذوق خواہ کتنا ہی راغب ہو اور ہماری جستجو کتنی ہی نیک نیتی پر مبنی ہو ہم لُطف اندوزی میں ناکام رہیں گے ایک بار اپنے راگ اور ٹھاٹ کے تصوّرات کو بھول کر (جو بلا شُبہ آسان کام نہیں) گمیلان کی سنگیت پر جاوانی، سنڈانی یا بالی کی موسیقی سُنیے۔ عجب نہیں کہ سازوں کی سرور آگیں ہم آہنگی، موسیقار کی خوش الحانی اور نغمہ کا سوز و گداز اور اس کی شیرینی آپ کا دل موہ لے۔

گمیلان

انڈونیشی موسیقی میں سازوں کے مجموعہ کو جسے گمیلان کہتے ہیں، ایک ممتاز مقام حاصل ہے جس کی مثال کسی دوسری موسیقی میں مشکل سے ملے گی بیسیوں سازوں پر مشتمل یہ آرکسٹرا مقامی موسیقی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ بلکہ گمیلان کے بغیر انڈونیشی موسیقی کا تصوّر ہی محال ہے۔ یہ ضرور ہے کہ موقعہ و محل کے اعتبار سے سازوں میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے لیکن سازسنگیت خواہ وہ گائکی کی سنگت میں ہو خواہ محض ساز کی۔ چاہے وہ ڈرامہ کے لئے مخصوص ہو یا کٹھ پتلیوں کے کھیل کا ساتھ دے ہمیشہ گمیلان کے ساز کام آتے ہیں۔ گمیلان کی موسیقی خصوصاً انڈونیشی ڈرامہ وائنگ Wayang کی جان ہوتی ہے پھر گمیلان کی

---

[1] انڈونیشیا میں ہندوستانی فلمیں بہت پسند کی جاتی ہیں شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں کسی روز ہندوستانی فلم نہ "چل" رہی ہو۔

مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سلطان کے محلوں سے لے کر دیسہ (گاؤں) کی جھونپڑیوں تک میں پایا جاتا ہے، وسط جاوا کے چند اضلاع میں تو گمیلان کی ملکیت کا اوسط ایک گمیلان فی پانچ سو نفوس تک ہے اور یہ اوسط گمیلان کے سازوں کی تعداد ان کے وزن اور قیمت کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز ہے۔ گمیلان اور اس کی موسیقی کا انڈونیشی زندگی میں کیا مقام ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ میلاد نبیؐ کے موقعہ پر بڑی مسجدوں کے احاطہ میں محض گونگ "پر مشتمل گمیلان جسے "گمیلان سیکاتی" کہتے ہیں بجائے جانے کا رواج ہے[1]۔

گمیلان ایک مکمل مجموعہ ساز ہے۔ سازوں کی فہرست بڑی طویل ہے ہر موقعہ کے لئے سازوں کی تعداد مخصوص ہے چند کو چھوڑ کر بقیہ سارے ساز الگ الگ سلندرو اور پیلوگ کے سروں پر ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے آرکسٹرا میں دونوں طرح کے ساز ہوتے ہیں۔ ان سازوں کی علاقائی تقسیم بھی ہے جاوائی، سنڈانی اور بالی گمیلان الگ الگ خصوصیات کے حامل ہیں۔ چناں چہ اس مختصر مضمون میں سارے تفصیل لینا ممکن نہیں البتہ اہم سازوں کا مختصر ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ڈنگ

تانبہ اور ٹن کی ملاوٹ کی دھات سے بنے ہوئے یہ طشت کی شکل کے ہوتے ہیں جن کا قطر ایک فٹ سے لے کر ایک گز تک اور وزن ۱۵-۲۰ سیر سے ایک من تک ہوتا ہے۔ طشت کے درمیان عموماً نصف کرہ کا ابھار ہوتا ہے جسے بندھی ہوئی مٹھی یا گھنڈی لگی ہوئی چوب سے ضرب لگا کر بجایا جاتا ہے آواز کی کرختگی کو کم کرنے کے لئے چوب کی گھنڈی پر کپڑا یا نمدہ منڈھ دیا جاتا ہے۔ گونگ گمیلان کی سب سے پچھلی صف میں لکڑی کے نقش و نگار بنے ہوئے چوکھٹوں سے لٹکتے ہیں اور سازندہ انھیں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بجاتا ہے۔ گمیلان میں ایک گونگ عموماً بہت بڑا ہوتا ہے جسے گونگ آگنگ Gong Agung کہتے ہیں۔ اس کا سُر زیادہ تر لیا پہ ہوتا ہے۔ گونگ آگنگ کے علاوہ ایک آرکسٹرا میں مختلف سُروں پر چڑھے ہوئے مختلف جسامت کے کئی اور گونگ ہوتے ہیں۔ ان سب کے الگ الگ نام ہیں۔ گونگ انڈونیشیا کا قدیم ترین ساز ہے اور اس کو بنانا بہت بڑا فن مانا جاتا ہے

گمیلان کی موسیقی میں گونگ تائی کا ساز کہا جاتا ہے جو نغمہ کے دوران میں مخصوص وقفوں پر بجایا جاتا ہے جن کو ہم چاہیں تو "سم" کہہ سکتے ہیں۔

لفظ "گھنٹہ" یا "گھنٹی" گونگ کی آواز کا اندازہ کرنے کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ ایک حد تک بھونڈے ہیں۔ خصوصاً گونگ آگنگ کی اس مرغوب کن مرتعش صدا کے لئے جو صرف سُنی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے گونگ بھی اپنی سُریلی گونج کے ساتھ پوری موسیقی کو اس طرح سہارا دیتے ہیں جیسے ہوا خوشبو کو۔ جہاں گونگ آگنگ کی تھراہٹ قدرت کی بے پایاں وسعت کا احساس دلاتی ہے وہاں دوسرے گونگ کی مدھر گونج میں آپ جھرنوں کی کلبلیں، دریاؤں کی روانی اور درختوں کی سرگوشیاں سن سکتے ہیں۔

بونانگ

ترنگ کے اصول پر بنا ہوا یہ ساز دھات کی ہانڈیوں پر مشتمل ہوتا ہے یہ ہانڈیاں لکڑی کے فریم پہ منڈھی ہوئی رسیوں پہ دو قطاروں میں اس طرح رکھی جاتی ہیں کہ کھلا ہوا منہ نیچے کی طرف ہوتا ہے۔ ہانڈی کے پیندے میں گونگ کی طرح نصف کرہ کا ابھار ہوتا ہے جسے لکڑی کی دو موٹی چوبوں سے بیٹھ کر بجایا جاتا ہے۔ ایک ساز میں دس یا بارہ ہانڈیاں ہوتی ہیں جو سلندرو یا پیلوگ کے کم و بیش دو سپتک گھیرتی ہیں۔ اونچے سُروں پر چڑھے ہوئے بونانگ کی آواز ہندوستانی جل ترنگ سے کچھ ملتی ہے۔

سارون

یہ ساز کانسہ کی بنی ہوئی پانچ یا سات پتریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ پتریاں لکڑی کے ایک چوکھٹے پر پنوں سے جڑی ہوتی ہیں جن کے نیچے کارک یا بید کا تار چڑھا ہوتا ہے جس سے پردے لکڑی کو نہیں چھوتے انہیں لکڑی یا سینگ کے بنے ہوئے ایک ہتھوڑے سے بجایا جاتا ہے۔ ایک گمیلان میں اونچے نیچے سُروں پر چڑھے ہوئے عموماً چار یا پانچ سارون ہوتے ہیں۔ آواز بہت مدھم ہوتی ہے اور سازندہ ہر پردے کو بجاتا اور انگلی سے چھو کر آواز کو دباتا چلتا ہے۔

گنڈیر

گنڈیر سارون سے ملتے جلتے مگر پتلے پردے رسیوں میں گندھے ہوئے ایک فریم پر لٹکائے جاتے ہیں ہر پردے کے نیچے دھات سے بنے ہوئے چونگے قطار میں رکھے ہوتے ہیں جو طرب یعنی آواز میں گونج پیدا کرنے کا کام دیتے ہیں۔ پرانے

---

[1] البتہ رمضان شریف کے مہینے میں اور جمعہ کو عموماً گمیلان نہیں بجایا جاتا۔

سازوں میں یہ طرب کے پونگلے موٹے بانس کے پوروں سے بنے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ گو ایک سپتک کے گنڈیر بھی ہوتے ہیں لیکن عموماً بڑے آرکسٹرا میں تین یا زائد سپتکوں کو گھیرے ہوئے اُونچے اور نیچے سُروں پر چڑھے ہوئے دو گنڈیر ہوتے ہیں۔ سازندہ ڈبکی کی شکل کی بنی ہوئی لکڑی کی دو مضرابوں کو انگوٹھے کے پاس کی دو انگلیوں میں پکڑ کر بجاتا ہے اور کبھی کبھی انگوٹھے، چھنگلیا یا کہنی سے سُروں کو خاموش کرتا جاتا ہے ورنہ ضرب لگانے کے دیر بعد تک طرب سُر کی جھنکار پیدا کرتا رہتا ہے۔

گمبانگ کایو

یہ کاٹھ ترنگ ہے اور آواز بھی ہندوستانی کاٹھ ترنگ سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ کم و بیش تین یا چار سپتک گھیرے ہوئے ۱۶ یا ۲۱ پردے ہوتے ہیں ڈبکی کی شکل کی چوبوں پر عموماً نمدہ مڑھا ہوتا ہے۔

گن رانگ

یہ مختلف جسامت اور شکلوں کی ڈھولکیں ہوتی ہیں جو ہندوستانی ڈھول، ڈھولک اور مردنگ سے ملتی جلتی ہیں ایک گمیلان میں چار مختلف گندانگ ہوتے ہیں اور عموماً ایک ہی سازندہ انھیں بجاتا ہے۔ ایک ڈھولک سازندہ کے سامنے رحل نما اسٹینڈ پر رکھا ہوتا ہے جسے وہ دونوں ہاتھوں سے بجاتا ہے۔ بائیں طرف پُشت سے ملا ہوا ایک قدرے اونچے اسٹینڈ پر بڑا ڈھول ہوتا ہے۔ دائیں ہاتھ کی طرف مردنگ کی شکل کا گندانگ کھڑا رکھا جاتا ہے اور قریب ہی ایک اور چھوٹی ڈھولک ہوتی ہے سازندہ ان سب کو یکے بعد دیگرے بجا کر تال دیتا ہے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ گن رانگ کے بھی طبلہ کی طرح بول ہوتے ہیں جیسے دنگ، ہم، ڈونگ، تک، ڈنک وغیرہ۔

رباب

گمیلان میں یہ اپنے ہاں کی سارنگی کا بدل ہے۔ سالم لکڑی سے بنی ہوئی پان کی شکل کی تونبی ہوتی ہے جس پر کھال منڈھی ہوتی ہے۔ یک تارا کی طرح پتلی ڈنڈی پر دو لمبی کھونٹیوں سے تونبی تک دو تار جاتے ہیں۔ تونبی کے نیچے ایک باریک لمبی کیل سی ہوتی ہے جس کے سہارے ساز کو کھڑا کر کے بجایا جاتا ہے۔ سارنگی کے گز کی طرح کے کمانچے سے تاروں کو رگڑ کر اور انگلیوں کے گانٹے سے ہلکے سے دبا کر سُر نکالتے ہیں۔ قیمتی رباب کی ڈنڈی اور کھونٹیاں ہاتھی دانت کی بنی ہوتی ہیں۔ ہر رباب کے ساتھ ایک خوبصورت نقشین چوکھٹا ہوتا ہے جس کے سہارے ساز کو کھڑا کرتے ہیں۔

رباب کے سُروں میں ساز کی سادہ بناوٹ کی وجہ سے سارنگی یا دلربا کا سا سُریلاپن اور گہرائی نہیں ہوتی تاہم اُن میں ایک طرح کا سوز ضرور ہوتا ہے۔ گمیلان میں رباب اہم ترین ساز مانا جاتا ہے۔ اصل نغمہ کی ابتدا یہی ساز کرتا ہے اور گاتک کی پوری سنگت کرتا ہے۔ رباب نواز جسے "نیاگا" کہتے ہیں۔ گمیلان کی قلمرو کا "راجہ" مانا جاتا ہے۔ کنداتک (ڈھولک) اس کا "پاتیہ" (وزیر اعظم) اور گونگ "جکسہ" Jaksa (منصف) کہلاتے ہیں۔ ایک اور خیال کے مطابق رباب کی موسیقی کو سانس اور ڈھولک کی تھاپ کو دل کی دھڑکن سے تشبیہ دیتے ہیں۔

چلم پونگ

گمیلان کا یہ سب سے خوبصورت ساز بربط سے مشابہ ہوتا ہے۔ ناؤ کی شکل کی کھوکھلی تونبی دو اُونچے اور دو نیچے پایوں پر اس طرح رکھی ہوتی ہے کہ ساز ہمیشہ ڈھلوان رہتا ہے۔ بت نزیچ چھوٹے ہوتے ہوئے دھات کے تاروں کے کوئی ۱۳ جوڑے ہوتے ہیں جو ملیل تارا کی طرح کھونٹیوں سے کسے جاتے ہیں تاروں کا ہر جوڑا منڈولین کے طرح ایک ہی سر پر کھینچا جاتا ہے۔ انگوٹھے کے بڑھے ہوئے ناخن سے تاروں کو چھیڑ کر بجاتے ہیں۔ سُروں کو کبھی کبھی دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں سے خاموش بھی کیا جاتا ہے۔

سُولِنگ

یہ انڈونیشی سیدھی بانسری ہے جو بانس کی بنی ہوئی ۶ انچ سے لے کر ایک فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ کٹی ہوئی "زبان" کے بجائے کنگارے میں ایک چوکور سوراخ ہوتا ہے جس سے سانس دیتے ہیں۔ پیلوگ کے سُروں کی بانسریاں زیادہ تر چار سوراخ کی ہوتی ہیں یوں تین سے سات سوراخ تک کی بانسریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ آڑی بانسری کا بھی رواج ہے جسے مقامی زبان میں بنگسی Bangsi یا بنگسنگ Bangsing کہتے ہیں گمیلان کے استعمال کے علاوہ یہ عوام کا مقبول ساز ہے۔ ہندوستان کی طرح انڈونیشیا میں بھی بانسری محنت کش اور تنہائی میں کام کرنے والوں کی رفاقت کرتی ہے۔ رات کے سناٹے میں یہاں بھی دُور سے بنسری کی مدھر تان سُنی جا سکتی ہے۔

کچاپی

یہ تین سپتکوں کو گھیرے ہوئے ۱۸ اکہرے تاروں کا ایک قدرے سادہ ساخت کا بربط ہوتا ہے جس کے ۸ یا ۹ تار موٹے تانبے کے ہوتے ہیں۔ بجانے کا

طریقہ چلم پونگ سے مختلف نہیں ہوتا۔ اس کے موٹے تاروں سے بہت کچھ وینا سے ملتی جلتی آواز نکلتی ہے۔

تربانگ

یہ لکڑی کے گھیرے پر منڈھے ہوئے چمڑے سے بنا ہوا ڈف ہوتا ہے اسے ربانہ Rebana بھی کہتے ہیں کسی کسی ساز کے گھیرے میں کٹے ہوئے تین یا چار شگافوں میں مجیرے کی شکل کے چھوٹے جھانجھ کے جوڑے لگے ہوتے ہیں جو بجاتے وقت ڈف کی تھاپ کے ساتھ ساتھ ریم کی سی چھنا چھن بھی پیدا کرتے جاتے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ بالکل اسی قسم کا ایک ساز شمالی ہندوستان میں ڈفالی نام کے گھومتے پھرتے موسیقاروں کے پاس بھی پایا جاتا ہے اور وہ بھی اسے ربانہ کہتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر کے بیان سے معلوم ہوگا گمیلان کے سازوں کی تعداد اور ان کے وزن کے باعث اس مجموعۂ ساز کا نقل و حمل آسان نہیں یہی وجہ ہے کہ بڑے اور مشہور گمیلان ہمیشہ ایک مقررہ جگہ پر رکھے رہتے ہیں جو عموماً بڑا ہال یا بارہ دری ہوتی ہے۔ یہیں سامعین جمع ہوتے ہیں۔ ایک یا ڈیڑھ فٹ اونچے چبوترے پر دری کا فرش ہوتا ہے اور ہر سازندہ کے لئے کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چھوٹی سی بوکور چٹائی ہوتی ہے۔ فرش کی اگلی صف میں عموماً بائیں جانب دو یا تین موسیقار اس طرح دوزانو ہو کر بیٹھتے ہیں کہ ان کے منہ سامعین کی دائیں یا بائیں جانب ہوتے ہیں (سامعین کی طرف منہ کرکے گانا یہاں خلاف آداب موسیقی ہے۔ اکثر موسیقار گانے وقت اپنا منہ رومال سے چھپا لیتے ہیں) موسیقار کے قریب ہی رباب نواز بیٹھتا ہے اور اس کے پیچھے کندانگ بجانے والا، گمبانگ نواز بھی قریب ہی بیٹھتا ہے۔ دائیں جانب سامنے چلم پونگ یا کچاپی ہوتے ہیں اور درمیان میں گندیر، پچھلی صفوں میں بونانگ وغیرہ دوسرے ساز ہوتے ہیں اور سب سے پچھلی صف میں گونگ، بڑے بڑے گمیلان میں گونگ کے علاوہ بقیہ سارے سازوں کے سلندر اور پیلوگ سُروں پر چڑھے ہوئے الگ الگ دو سٹ ہوتے ہیں۔

گمیلان کے سازندے پھول بوٹے چھپے ہوئے "باتک" کے تہمد، سفید بند گلے کے کوٹ اور صافہ سے ملتی جلتی "باتک" کی ٹوپیوں میں اس آرکسٹرا میں ایک مخصوص مشرقی شان پیدا کرتے ہیں۔

انڈونیشی موسیقی میں مختلف قاعدوں پر مبنی علامات Notations کا رواج گیتوں اور دھنوں کو محفوظ رکھنے تک محدود ہے۔ ساز بجاتے وقت ان کا استعمال نہیں ہوتا۔ موسیقار البتہ گانے کے بول کتاب سے دیکھ کر گاتے ہیں۔ گمیلان کا کنڈکٹر بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے فرائض غالباً ریہرسل تک محدود رہتے ہیں۔ اصل مظاہرہ میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

آخر میں یہ ذکر ہندوستانی ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا کہ انڈونیشی بھی گمیلان کے سازوں کو اسی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں جس طرح ہندوستانی سازندے اپنے ستار یا سرود کو۔ سازوں کا غلط استعمال اور ان کے سروں کی نقل دوسرے سازوں پر اتارنا بہت برا مانا جاتا ہے اور ایسا کرنے والے کے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ وہ غمگین نتائج سے دوچار ہوگا۔ اس سلسلے میں بہت سی داستانیں سننے میں آتی ہیں۔ ساز بڑی احتیاط اور صفائی سے رکھے جاتے ہیں اور ہر جمعرات کو انھیں لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ زیادہ مشہور اور پرانے گمیلان کو احتراماً "کیا ہی" (عزت مآب، عالی جناب) کہا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ ان کے بڑے شاعرانہ نام بھی رکھے جاتے ہیں جیسے "بارش شیر و شکر" "دعوت مسرت" "ابر رحمت" "بہبود وطن" "فراموش کار عشق" وغیرہ وغیرہ۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھئے

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

منوّر لکھنوی

غزل

درخورِ جذب سزاوارِ یقیں بن جاؤ
مرکزِ دائرۂ عشق تمہیں بن جاؤ

آستیں اپنی مرے خون سے رنگیں کر لو
اور بھی میری نگاہوں میں حسیں بن جاؤ

چشمِ کافر کو گماں تم پہ ہو بُت خانے کا
دِلِ مومن کے لئے کعبۂ دیں بن جاؤ

تم کو ضامن ہیں کہوں اپنی عبودیت کا
مرے جذباتِ پرستش کے امیں بن جاؤ

اختیاراتِ مشیت کے ملے جاتے ہیں
مجھے ڈر ہے کہ خدا تم نہ کہیں بن جاؤ

یہ کواکب یہ مہ و مہر جگہ سے ہٹ جائیں
تم جو چاہو تو ابھی عرش نشیں بن جاؤ

نقش از رنگ جمالی رُخ و لب کے ابھرے
سامنے آکے مرے لعبتِ چیں بن جاؤ

آتشِ طور سمجھ کر اسے کھو جائیں کلیم
شعلۂ نورِ سرِ لوحِ جبیں بن جاؤ

مجھے شادابیٔ اشعار کی دولت دے دو
مرے گلزارِ معانی کی زمیں بن جاؤ

غیر آباد منوّر کا مکانِ دل ہے
آؤ اِس خانۂ خالی کے مکیں بن جاؤ

حسن نعیم

غزل

مرے حرفِ غم میں آنسو، نہ فغانِ شب، نہ آہیں
مرے مکتبِ جنوں میں ہیں کتابِ دل نگاہیں

وہی کہہ کے خیر مقدم، رہیں بے نیاز مجھ سے
وہی دے کے اذنِ رخصت مجھے روکنا بھی چاہیں

تری سعیٔ بے رخی کو یہ پتہ نہیں ہے شاید
مرے دل سے کھُل چکی ہیں تری بے خبر نگاہیں

ابھی ظرفِ دل کے لائق نہیں کیفِ قرب و دُوری
کوئی وعدہ کیا کریں ہم، کوئی عہد کیا نباہیں

مرے عشق سے اُجالا تری خلوتِ وفا میں
تری یاد سے منوّر مرے دل کی بارگاہیں

ابھی حُسنِ خود نگر سے نہیں ربطِ عشقِ خود بیں
ابھی کیا نعیم ڈھونڈیں غمِ دوست میں پناہیں

شریندیر کمار

نقوش

کھڑکی مشرق کی سمت کھلتی تھی!

اس لئے جب وہ کتاب کو نہایت بداحتیاطی سے ایک جانب پھینک کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو سامنے بل کھاتی ہوئی سڑک سے اُٹھنے والے گرد و غبار کو ساتھ لئے سورج کی لاتعداد چمکیلی کرنیں اچانک اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ پلکیں اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکیں آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے حلقے اور گہرے ہو گئے اور اُن کے قریب کی جلد پہ تین چار بدنما شکنیں اُبھر آئیں۔ اس کا پورا چہرہ تاباک ہو اُٹھا اس کے علاوہ گرد و غبار کے ذرّات اس کے بھورے بھورے بالوں میں بُری طرح اٹک کر رہ گئے ___ یکبارگی ہوا کا ایک تیز جھونکا جو آیا تو اس کے خوبصورت لمبے بالوں کی کئی چھوٹی چھوٹی لٹیں سامنے چہرے پر آ پڑیں۔

اس کی نگاہیں سامنے پھیلی ہوئی لامتناہی وسعتوں میں بے وجہ بھٹک رہی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان میں عجیب بے تعلقی کے تاثرات موجود تھے ___ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی، سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سڑک پر آنے جانے والے راہ گیروں کی بے شمار، عجیب عجیب بے ہنگم آوازیں سُن رہی تھی۔ سب کچھ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ اس کے دل میں کوئی اور ہی بات تھی۔

لیکن وہ بات اتنی اہم نہ تھی کہ اُس کے لئے اُسے اتنا سوچنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ روزانہ یہی ہوتا تھا۔ اور آج بھی وہی ہوا تھا، اُس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ سب کچھ تو مسلسل تین سال سے ہو رہا تھا۔

روزانہ کی طرح آج بھی بستر سے اُٹھنے کے بعد جب اس نے گھڑی دیکھی تو سات بج رہے تھے۔ یوں ہی پلنگ سے اُٹھتے ہوئے حسبِ معمول اس نے سوچا کل وہ چھ بجے سے پہلے اٹھنے کی کوشش کرے گی۔ پھر معمول کے مطابق بہت سے کام کرنے کے بعد وہ کچن میں گئی۔ اور خادمہ کو دوپہر کے کھانے کے متعلق ضروری ہدایات دے کر سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں شمی اس کی منتظر تھی ___ اُسے دیکھتے ہی وہ بڑے پیار بھرے انداز میں مسکرائی اور شمی کے رخساروں پر ہلکی ہلکی لالی پھیل گئی ___ اُس نے غور سے شمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا ___ گذرتی ہوئی بہار کا یہ آخری ہفتہ تھا۔ آج موسم قدرے خوش گوار تھا۔ اور آج کے اس خوبصورت موسم کی مناسبت سے شمی نے ایک سفید سوٹ پسند کیا تھا۔ آج اس نے واقعی بڑا خوبصورت لباس زیبِ تن کیا تھا اس نے تعریفی نگاہوں سے شمی کی طرف دیکھا! اس کو دیکھ کر وہ پھر ایک بار مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"کوئی خاص بات ہے؟" اُس نے دریافت کیا۔

"کچھ بھی تو نہیں" شمی نے جواب دیا اور وہ خاموش ہو گئی ___ شمی اس وقت کوئی ناول بڑی دلچسپی اور انہماک سے پڑھ رہی تھی ___ شاید اس کی موجودگی اس پر بار گذرتی ہو ___ اس نے خیال کیا اور کسی کام کا بہانہ کر کے مکان کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے جب قریب کے کسی مندر سے گھنٹیوں کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز اس کے کانوں میں آئی تو جیسے کسی نے آہستہ سے اس کے کانوں میں کہہ دیا "چلو! اٹھو۔ وقت ہو چکا۔" اور بجلی کی سی تیزی سے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی ___ پہلے تو وہ کچن میں گئی اور خادمہ سے ناشتے کا بندوبست کرنے کے لئے کہہ کر سیدھے ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ شمی ابھی

تک بیٹھی اسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی ــــ قریب پہنچنے کے بعد اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ تمّی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی بڑی بڑی حیا آلود پلکیں جھک گئیں کتاب تپائی کی جانب پھینک کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک تو بہ شکن انگڑائی لی اور اس کے لب صرف ایک لمحے کے لئے کھلے۔

"چلیئے" اس نے کہا کہاں ؟ یہ بتانے کی کسی کو ضرورت نہ تھی دونوں مکان کے اندرونی حصّے میں چلی گئیں اور کوئی پندرہ منٹ بعد ناشتہ کر کے ڈرائنگ روم میں واپس آگئیں ــــ اس کے بعد تمّی نے کالج جانے کے لئے کتابیں اکٹھی کیں، سینڈل پہنے، قلم لیا اور کچھ رقم پرس میں ڈالی۔ اپنی ماں کی طرف رخصتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کالج کے لئے روانہ ہوگئی قریب ہی بس اسٹاپ تھا۔

جب تک تمّی نظر آتی رہی وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی رہی اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو معمول کے مطابق اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس نے ایک اہم فریضہ انجام دے دیا ہے ــــ اس کے بعد کچھ دیر یونہی سارے مکان میں تین چار چکّر کاٹے پھر ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے وہی ناول اٹھا کر سرسری نگاہوں سے اُس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی وہ اُکتا گئی۔ کتاب اُسے قطعاً غیر دلچسپ معلوم ہوئی۔ کتاب کو ایک جانب پھینک کر وہ اُسی کھڑکی کے قریب آکھڑی ہوئی۔

اُس کے دل پر ایک عجیب اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مایوسی اور نااُمیدی سے دوچار تھی۔ لیکن اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ اس کی کچھ عادی سی ہو چلی تھی۔ جب بھی وہ تنہا ہوتی یہ اُداسی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ــــ بسا اوقات وہ سوچنے کی کوشش کرتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے دل پر ماتمی فضا کیوں طاری ہے؟ وہ زندگی سے اِتنی مایوس کیوں ہے؟ وہ اُداس کیوں ہے؟ اور تب اُونچی اُونچی دیواروں پر سے گذرتی ہوئی اس کی نگاہیں ایک خوبصورت تصویر پر آکر رُک جاتیں۔ اُس کی تیز نگاہیں تصویر پر مرکوز ہو جاتیں اور وہ اُس کا جائزہ لینا شروع کرتی۔ وہ گھنٹوں ٹکٹکی باندھے اس تصویر کی طرف دیکھا کرتی! ایک بے جان تصویر۔ اگر اس میں جان ہوتی تو اس کی تیز نگاہوں کے تیر سے وہ بے اختیار چلّا اٹھتی! کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر اکثر وہ گھنٹوں اس تصویر کی طرف دیکھا کرتی! یہ اس کے مرحوم شوہر کی تصویر تھی!

لانبے لانبے سیاہ بال جو تصویر میں گہرے بھورے رنگ کے نظر آتے تھے چھوٹی سی پیشانی، جس پر ہمیشہ بلا وجہ شکنیں پڑی رہتیں۔ آنکھیں بھی اسی مناسبت سے چھوٹی چھوٹی تھیں۔ لیکن چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ اس کی اُبھری ہوئی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ جو زیادہ سگریٹ نوشی کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے۔ چھوٹا دہانہ اور رنگ سانولا تھا ــــ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ایک رُعب تھا، ایک عجیب وقار تھا۔

اگرچہ شادی سے پہلے وہ ایک اوباش مرد تھا لیکن جب اس نے اُسے پالیا تو اس کو سکون مل گیا۔ اس کا رویّہ بدل گیا اس کے دل میں اپنی بیوی کے لئے بے انتہا پیار تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے حد محبّت کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنی بیوی کی کسی بات کو نہیں ٹالا وہ ہر بات میں اپنی بیوی سے مشورہ لینا ضروری خیال کیا کرتا تھا ــــ لیکن اس پر بھی وہ مطمئن نہیں تھی بظاہر وہ بھی اپنے شوہر کو چاہتی تھی لیکن یہ محبّت، یہ پیار، یہ جذبہ اُس کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر نہیں آتا تھا۔ وہ اس لئے ایسا کرتی کیوں کہ اُسے اپنے شوہر کی محبّت کا کچھ تو صلہ دینا ہی چاہیئے تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُسے اپنا قبول صورت شوہر پسند نہ تھا۔ دراصل بات کچھ اور ہی تھی!

جب اس کی عمر چودہ برس کی تھی۔ اس کے وقت اس کے ذہن پر کسی اور ہی مرد کی تصویر چھائی ہوئی تھی۔ کسی اور ہی مرد کے خوبصورت خدوخال اس کے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ گئے تھے کوئی اور ہی نوجوان اس کے تصوّرات کی دُنیا میں آباد تھا۔ وہ دل سے کسی اور ہی دیوتا کی پرستش کیا کرتی تھی اور اس کا خیالی دیوتا اس کے مرحوم شوہر سے بہت مختلف تھا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا ــــ اُسے اپنے شوہر میں وہ سب کچھ نہ مل سکا جس کا اس نے خواب دیکھا تھا ــــ اس نے یہی سوچ کر اُسے اپنے شوہر کا درجہ دیا تھا کہ وہ اُس کے معیار پر پورا اُترے گا، لیکن ایسا نہ ہوا ــــ پھر بھی اُس نے کوئی احتجاج نہ کیا ــــ بیس سال کی عمر میں اُس کی شادی ہوئی تھی اور اب اس بات کو تقریباً بیس سال ہو رہے تھے۔ اُس نے سترہ برس کا طویل عرصہ اپنے شوہر کے ساتھ بسر کیا تھا ــــ بغیر ایک لفظ کہے، خاموشی سے وہ سب کچھ برداشت کرتی گئی، اس کے خیالی دیوتا کے نقش دھیرے دھیرے مدّھم پڑ گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ بالکل ختم ہو گئے۔

تین برس قبل ــــ جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا تھا تو اُس کی عمر اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی ــــ بہار کے دن بیت چکے تھے۔ جوانی کی گرم گرم راتیں، صبح کے وقت الاؤ میں دم توڑتی ہوئی آگ اور سسکتی ہوئی راکھ کی طرح سرد پڑ چکی تھیں۔ اب اُس خیالی مجسمہ کی تلاش بے سُود تھی ــــ شوہر کے انتقال کے بعد اُس نے اپنے آپ کو زندگی کے اُس موڑ پر پایا جہاں زندگی کے سارے لُطف اور ساری لذّتیں مونھ موڑ لیتی ہیں۔ پھر کوئی پیار بھری مسکراہٹ کسی کا استقبال نہیں کرتی، معمولی سی بات کے لئے ایک طویل عرصے تک انتظار نہیں کیا جاتا۔ کئی دنوں تک غائب رہنے کے بعد اچانک نظر آجانے پر محبّت اور پیار میں ڈوبا ہوا آنسوؤں کا دریا امنڈ نہیں آتا ــــ

بہرحال خزاں آچکی تھی۔ درختوں کے بڑے بڑے، سبز اور ملائم پتّے آہستہ آہستہ پیلے پڑنے لگے تھے اور پھر ٹہنیوں سے جُدا ہو کر زمین پر بکھر گئے تھے ہوا کا ایک تیز جھونکا جو آیا تو زمین بالکل صاف تھی۔ بچا کھچا سرمایہ بھی اب لُٹ چکا تھا۔ اور درخت تنہا کھڑا تھا ــــ اب پھر بارش آئے گی، سیاہ سیاہ بدلیاں اُفق پر نمودار ہوں گی، پھر ــــ؟ پانی کا ایک قطرہ ــــ پھر دوسرا پھر تیسرا ــــ اور چند دن بعد بہار ــــ لیکن نہیں نہیں یہ ناممکن تھا۔ اُس کے ذہن کی فضاؤں پر پھر ایک بار کسی خیالی مجسّمے کی کالی کالی بدلیاں نہیں چھا سکتی تھیں ــــ بارش تو بہت دور کی بات!

پھر بھی وہ اس کا شوہر تھا اس کی موجودگی میں زندگی کے دن کسی نہ کسی بہانے کٹ ہی جاتے تھے لیکن اب ــــ؟ اب اُس کے مرنے کے بعد پہاڑ سے دن اور لمبی راتیں کاٹے نہ کٹتی تھیں۔ لیکن اس نے اس کا ایک حل نکال لیا ــــ اب وہ زیادہ تر ثمّی کے ساتھ رہنے لگی اس کا زیادہ وقت ثمّی کے ساتھ ہی گذرتا ــــ رفتہ رفتہ اس کا اپنا وجود سرے سے ختم ہو گیا۔ وہ ثمّی میں کھو کر رہ گئی۔ ثمّی آج یہ کام کرے گی ثمّی آج یہ کھانے گی۔ ثمّی کو آج ایک بجے اسکول جانا ہے، کل ثمّی کی چھٹی ہے۔ ثمّی شام کو باہر گھومنے جائے گی، ثمّی کے کپڑے خراب ہو چکے ہیں۔ ثمّی نے اون کا سوئٹر پہن رکھا ہے۔ پھر بھی ثمّی کو سردی لگ رہی ہے۔ ثمّی کو گرم کوٹ کی ضرورت ہے۔ ثمّی کو وہ چاہیئے، ثمّی اس کی خواہاں ہے۔ ثمّی یہ چاہتی ہے۔ ثمّی، ثمّی، ثمّی! ــــ صبح بستر سے اُٹھنے کے بعد سب سے پہلے وہ ثمّی کے متعلق سوچتی۔ اور رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی تو ثمّی اس کے دماغ پر چھائی رہتی۔

لیکن پھر ایک ایسا وقت آیا جب اُسے کسی اور مشغلے کے متعلق سوچنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیوں کہ اب ثمّی نے باقاعدہ کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اب اس کا زیادہ وقت باقاعدگی سے کالج جانے اور اس کے علاوہ امتحانات کی تیاری میں صرف ہو جاتا ــــ اور تب چپکے سے ایک دن نہ معلوم کون سا دن تھا وہ؟ ــــ بہرحال ایک دن ثمّی کا بھوت اُس کے سر سے اُتر گیا ــــ اُس نے پھر ایک بار محسوس کیا کہ وہ تنہا ہے اور پہاڑ سی زندگی سامنے ہے ــــ اُسے یاد نہیں تھا، وہ کون سا دن تھا؟۔ بہرحال اُس دن جب اُس نے ثمّی کی کتابوں کے شیلف کا جائزہ لیا تو اُسے دو چار ناول ملے۔ جنھیں لے کر وہ قریب کے ایک دوسرے کمرے میں چلی گئی اور پھر روزانہ کہیں نہ کہیں سے کتابیں منگوا کر پڑھنے لگی ــــ اسی دوران میں اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ بے حد اُداس ہے۔ اُس کے دل پر ایک عجیب ماتمی فضاء طاری ہے۔ اور جب اُس نے اس پر غور کیا تو اُسے معلوم ہوا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اُس کا شوہر مر چکا ہے۔ اُس کا وجود سرے سے ختم ہو چکا ہے۔ صرف سامنے ایک اُونچی دیوار پر اُس کی ایک خوبصورت سی تصویر آویزاں ہے اور ــــ بس!

اُس کے بالوں میں گرد و غبار کے ذرّات بُری طرح پھنس کر رہ گئے تھے ــــ اس نے دھیرے دھیرے ان میں اُنگلیاں گھمانی شروع کیں اور اس طرح اُسے یک گونہ سکون ملا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اب اس کا دل بالکل پُرسکون ہے! ــــ اور یُوں ہی بالوں کو صاف کرنے کے لئے وہ اندر قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور بال سنوارنے لگی اچانک اس کی نظر اپنے کپڑوں پر پڑی جو کئی دن کے مسلسل استعمال کے باعث بے حد میلے ہو چکے تھے اُن میں جگہ جگہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں چہرہ بھی بے رونق دکھائی دیا ــــ اُسے یہ سب کچھ بڑا ہی عجیب معلوم ہوا۔ اس نے پھر ایک بار اپنے قیمتی لیکن بے حد میلے کپڑوں کی طرف دیکھا اور بے اختیار اُسے اپنے آپ سے گھن ہونے لگی ــــ بال سنوارتے سنوارتے جب اس کی نظر اپنے چند سفید بالوں پر پڑی تو بے اختیار اُسے جھرجھری سی آگئی ــــ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ بالکل بدل چکی

ہے۔ اب وہ پہلی جیسی نہیں رہی ـــــ اُس کے بال، اُس کی آنکھیں، اُس کی پیشانی، اُس کے بھرے بھرے ملائم رخسار، اس کے متناسب اور تنومند بازو، بستہ اور سڈول جسم سب کچھ بدل چکا ہے۔ اس کی آنکھوں سے حسرت کے آثار نمایاں تھے۔

آج کالج جانے کے لئے شمّی نے ایک سفید سُوٹ پہنا تھا جو اس کے حُسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ اُس کے سیاہ، لانبے لانبے بال ناگنوں کی طرح بل کھا رہے تھے اور خوبصورت حیا آلود پلکیں آنکھوں پر جُھکی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا شمّی بہت خوبصورت ہے۔ اُس سے بھی زیادہ خوبصورت! وہ اپنی جوانی میں جتنی حسین تھی۔ اس سے بھی کہیں زیادہ شمّی حسین ہے!! ـــــ اگر آج وہ بھی ایک سفید سُوٹ پہنے تو؟ اگر آج وہ بھی بن سنور کے بیٹھے تو؟ اس نے سوچا، لیکن دوسرے ہی لمحہ اپنے اس خیال پر اُسے ہنسی بھی آ گئی ـــــ اُس کی عمر چالیس سال ہو چکی تھی۔ اُس کے سر کے بال جگہ جگہ سے سفید پڑ رہے تھے۔ اُس کی سیاہ آنکھیں حلقوں میں مقید ہو رہی تھیں۔ اُس کے چہرے پر گوشت لٹک آیا تھا۔ اُس کا جسم بھدّا اور بیڈول ہو چکا تھا، اُس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ سب ہی کچھ تو ختم ہو چکا تھا ـــــ خزاں زدہ بکھرے ہوئے پتّوں کو بھی ہوا کے تیز جھونکوں نے لوٹ لیا تھا ـــــ اب درخت تنہا کھڑا تھا۔ ننگی، پتلی اور سیاہ ٹہنیوں کا بے معنی بوجھ سنبھالے! ـــــ اُس نے سوچا یہ بے کار کا بوجھ۔ اب وہ نہ سنبھال سکے گی۔ لیکن کیوں؟ اچانک ایک سوال اُس کے ذہن کی گہرائیوں سے اِس شدّت کے ساتھ اُبھرا کہ ایک لمحے کے لئے وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھی ـــــ اگر سچ مچ یہ ایک بوجھ ہے، اگر واقعی زندگی ایک بوجھ ہے تو پھر اس بوجھ کو ڈھونے کے باوجود شمّی کیوں کر خوش رہتی ہے؟ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کیوں رقص کرتی ہے؟؟ اُس کی پیشانی پر تفکرات اور پریشانی کے آثار کیوں نظر نہیں آتے؟؟؟ وہ کیوں مطمئن نظر آتی ہے؟ اطمینان کا یہ نہ ختم ہونے والا خزانہ اُسے کہاں سے دستیاب ہو گیا؟؟ یہ آرام، یہ سکون، یہ حُسن، یہ رنگت، یہ خد و خال، یہ زندگی بے صبر، بے محل اور پھر ماحول سے بغاوت کا یہ جذبہ اُس کے دل میں کب پیدا ہوا؟ کیسے پیدا ہوا؟ ـــــ وہ خوش ہے، وہ ہمیشہ خوش رہتی ہے۔ شمّی کو اُس نے کبھی ناخوش نہیں دیکھا۔ آخر کیوں؟ کس لئے؟؟ ـــــ شمّی اس کی بیٹی ہے لیکن اب وہ اُس کی ساتھی بھی تو ہے ـــــ چاہیئے تو یہ تھا کہ شمّی اس کے غم کو سمجھتی۔ اس کی پریشانیوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتی۔ اس کی ناامیدیوں کو دُور بھگانے کا بیڑا اٹھاتی۔ لیکن نہیں! وہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی وہ تو کسی اور ہی دُنیا میں مگن رہتی ہے۔ اس نے اپنی ایک الگ دنیا بسا رکھی ہے۔

یہاں پہنچ کر اچانک وہ چونک اُٹھی! تو گویا شمّی نے اپنی زندگی کا ساتھی تلاش کر لیا ہے۔ اسی لئے اب اسے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی لئے اب وہ اُس کی مصیبت، اُس کے غم اور اُس کی پریشانیوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی بے خبر رہتی ہے۔ اسی لئے ـــــ اسی لئے ـــــ! زندگی میں پہلی بار اس نے شمّی کے خلاف اپنے دل میں ایک عجیب نفرت، ایک عجیب اجنبیت اور ایک عجیب حسد کا احساس پایا ـــــ بال سنوارتے سنوارتے ایک دم اس نے کنگھی ایک جانب پھینک دی۔ سنوارے ہوئے بال سر کے ایک شدید جھٹکے سے چاروں طرف پھیل گئے۔ اور وہ زور زور سے پیروں کو پٹکتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

وہ کالج سے شمّی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی!

اچانک قریب کے کسی اسکول سے آتی ہوئی گھنٹی کی پُر شور آواز اس کے کانوں سے آ کر ٹکرائی۔ وہ اس وقت ایک کرسی پر پڑی اونگھ سی رہی تھی ـــــ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بجلی کی سی تیزی سے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے قیمتی لیکن حد درجہ کثیف لباس کو دُرست کرنے کی کوشش کی۔ اور جب وہ اس کام سے فارغ ہو چکی تو اُسی تیزی سے کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی ـــــ گھنٹی کی آواز اب صاف اور واضح طور پر سُنائی دے رہی تھی۔ اس کا اندازہ ٹھیک ہی نکلا پانچ بج رہے تھے شمّی کے آنے کا وقت ہو چکا تھا! ـــــ وہ یوں ہی بے معنی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ دیر بعد جب اُس نے یوں ہی سرسری نگاہوں سے پوری سڑک کا جائزہ لیا تو دُور اُسے ایک سفید غرارہ لہراتا نظر آیا اور جب وہ قریب آیا تو اُس نے دیکھا وہ شمّی ہی تو تھی!

ایک شدید جھٹکا اس کے دل پر لگا۔

"شمّی آ رہی ہے" جیسے کوئی آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں یہ اس کے کان میں کہہ رہا ہو "شمّی آ رہی ہے"۔ شمّی، جو اُس کی بیٹی تھی۔ شمّی، جو اس کی دوست تھی، شمّی جو اس کی ساتھی تھی۔ شمّی جو اس کی سب کچھ تھی۔ وہی شمّی آ رہی تھی۔

اُس کی پیشانی پر پسینے کے بے شمار قطرے اُبھر آئے۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح تیز تیز چلنے لگی۔ اس کے ہاتھ پیر بُری طرح کانپنے لگے —— اُس کے جسم کا رواں رواں جیسے اسے خبردار کر رہا تھا —— شمّی آ رہی ہے —— شمّی آ رہی ہے —— شمّی آ رہی ہے۔

اس نے سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور جب دوبارہ اُس نے اپنی نگاہیں کھڑکی سے باہر ڈالیں تو اُس نے دیکھا شمّی گھر سے اب صرف پندرہ یا بیس قدم کے فاصلے پر تھی۔ لیکن وہ اکیلی نہ تھی، اس کے ساتھ کوئی پستہ قد نوجوان تھا —— اُسے کچھ تشویش سی محسوس ہوئی —— دُوری کے باعث وہ سمجھ نہ سکی کہ وہ کون ہے؟ یوں تو تقریباً روز ہی شام کو لوٹتے وقت شمّی کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور ہوتا تھا۔ اور اس نے اس پر کبھی توجہ بھی نہ کی تھی۔ لیکن آج ——؟

برآمدے میں ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ یہ آواز دھیرے دھیرے قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز سُنائی دی۔ پھر کوئی بھاری بھاری قدموں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا —— اس نے مڑ کر دیکھا، سب سے پہلے اس کی نظر شمّی پر پڑی، جو کتابیں میز پر رکھ چکی تھی اور اب اندر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے آنے والے شمّی کے نوجوان ساتھی کی طرف نظریں دوڑائیں —— ایک لمحے کے لئے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں کے قریب سینکڑوں گولے بیک وقت چھوڑ دیئے گئے ہوں! جیسے بے شمار کبوتر پھڑپھڑاتے ہوئے اُس کے دماغ کے اندر گھس کر شور مچا رہے ہوں اُسے محسوس ہوا جیسے زمین بتدریج اُٹھ کر آسمان سے جا ملی ہے!!! —— اس کے سامنے، اس کے بالکل مقابل ایک نوجوان کھڑا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا وہ! بالکل اُس نوجوان کی طرح جو کبھی اس کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ جو تصوّرات کی اس چھوٹی سی دُنیا میں سب سے نمایاں اور سب سے اُونچا درجہ رکھتا تھا! وہ اب مجسّم حقیقت بن کر اس کے سامنے کھڑا تھا —— وہ بات نہیں کر رہا تھا وہ مُسکرا نہیں رہا تھا، وہ ہنس نہیں رہا تھا، اُس کا چہرہ پُرسکون تھا، وہ خاموش کھڑا تھا —— چُپ چاپ —— بُت کی مانند! لیکن پھر بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی —— اس نے ایک عجیب کشش محسوس کی! خزاں زدہ پتّے تو ختم ہو چکے تھے لیکن دُور اُفق پر پھر ایک بار کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں پھر —— ؟ پانی کا ایک قطرہ —— پھر دوسرا —— پھر تیسرا —— اور پھر لگاتار —— تانتا سا بندھ گیا —— مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اور کھڑکی کے قریب کھڑی وہ بھیگ رہی تھی!! —— اس نے اپنا ہاتھ پیشانی سے لگا لیا۔

" میرے خدا! " اس نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا —— یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ اس کا مجازی خدا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا خیالی دیوتا! —— چودہ برس کی عمر کا خواب آج حقیقت سے ہم آغوش ہو رہا تھا لیکن —— اب تو پانی سر سے اُونچا ہو چکا تھا —— یوں ہی ایک اضطراری کیفیت کے زیرِ اثر اس نے اپنی اُنگلیاں بالوں میں گھمانا شروع کیں۔ اور جذبات کی شدّت کے باعث ایک بار جب اس نے زور سے اپنا ہاتھ کھینچا تو دو تین بال اُنگلیوں میں اُلجھ کر اس کی نگاہوں کے سامنے آ گئے وہ سب کے سب سفید تھے۔ چاندی کی طرح سفید! سورج کی چمکیلی اور گرم شعاعوں کے سامنے وہ سونے کی طرح چمک رہے تھے!!

نوجوان نے ایک بار غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا، ایک لمحے —— صرف ایک لمحے کے لئے شدّت سے اسے خواہش ہوئی کہ وہ اس پر مسکراتی ہوئی نگاہیں ڈالے لیکن —— وہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بے تعلقی کے تاثرات نمایاں تھے۔

" بیٹھ جاؤ " اس نے بڑی مشکل سے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

" شکریہ " اس نے جواب دیا اور قریب کی ایک کرسی کھینچ کر سر جھکائے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ایک لفظ بھی تو نہ کہا۔

شمّی، ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے میں تھی۔ وہ بھی اُٹھ کر اُسی کمرے کی جانب چلی گئی۔ اس نے جھانک کر دیکھا —— اندر شمّی اپنا لباس تبدیل کر رہی تھی —— اس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں اُبھریں، مگر جلد ہی مطمئن نظر آنے لگی، وہ واپس آ گئی۔ شمّی کے واپس آنے میں ابھی اور پانچ چھ منٹ باقی تھے ابھی تو بہت دیر تھی۔ اس اثناء میں وہ اُس سے بہت کچھ گفتگو کر سکتی تھی۔

" تمھارا نام؟ " اس نے اپنی نگاہیں نوجوان کے چہرے پر مرکوز کر دیں اور خواہ مخواہ مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

" جی —— ونود ——" اس نے متانت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ جس پر اجنبیت کی اتنی موٹی تہہ تھی کہ بے اختیار وہ کانپ اُٹھی۔

دوسرے سوال کے لئے اپنی کمزور یادداشت کی مدد سے مناسب الفاظ ابھی اس نے اپنے ذہن میں منتخب کئے ہی تھے کہ اچانک شمّی کمرے میں داخل ہوئی اُس کے اندازے کے خلاف شمّی جلد ہی واپس آ گئی۔ اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی

شمّی کو دیکھتے ہی نوجوان کے چہرے پر پھر ایک بار مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور اُس کی موجودگی کو مکمل طور پر نظرانداز کر کے اور اپنی موٹی موٹی اُنگلیوں کی مدد سے میز کے کناروں کو بجاتا ہوا وہ ہونے ہولے گنگنانے لگا ——— شمّی نے بھی مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جُھکا لیا! اس کے بعد وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

وہ کھڑکی کے قریب کھڑی بغور یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اُسے اپنی کنپٹیوں کے قریب جلن سی محسوس ہوئی۔ اُس کے سارے جسم میں جیسے ایک آگ سی لگ گئی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے شمّی کو بُلایا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

کوئی دو منٹ بعد جب شمّی اس کے پاس آئی تو اُس نے سر سے پیر تک اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

——— "یُوں ہی گھومنے ——— اس کے بعد ہم نے سینما جانے کا پروگرام بنایا ہے ساڑھے نو بجے تک واپس آ جاؤں گی۔ مگر کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا" شمّی نے حسبِ معمول لاپرواہی سے جواب دیا۔ اور واپس ڈرائنگ روم کی طرف جانے کے لئے مڑنے لگی تبھی اُس نے پھر ایک بار اُسے پکارا۔

"ٹھیرو" اس نے کہا "ونود کہاں رہتا ہے؟"

"کالج کے ہوسٹل میں ——— کالج کے قریب ہی رہتا ہے" اور پھر اُس کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کہنے لگی۔ "اب جاؤں؟"

"اوہوں!" اس نے نفی میں سر ہلا دیا "تُم نہیں جا سکتیں!!"

"کیوں؟" شمّی کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اور وہ منھ کھولے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگی "کیوں؟" اس نے کہا اور اس کے بعد اس کے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"اس لئے کہ یہ میں کہہ رہی ہوں" اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے صاف اور واضح آواز میں کہا۔

"یہ تو کوئی وجہ نہیں" شمّی نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اور پھر کچھ دیر رُک کر جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی "میں تو ضرور جاؤں گی۔ وعدہ جو کیا ہے میں نے!"

"تُم جاؤ گی؟" اس کی ماں نے گھورتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور ان نگاہوں کی تاب نہ لا کر شمّی نے سر جُھکا لیا۔ اور اس کے بعد ایک لفظ کہے بغیر چُپ چاپ، تیز تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی

کوئی پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ پیر پٹختی ہوئی واپس آ گئی۔ شاید۔ وہ ونود کو رُخصت کر کے واپس آئی تھی۔ وہ اُس وقت اندر ہال کے ایک کونے میں کھڑی کتابوں کے ایک شیلف کا جائزہ لے رہی تھی۔

"نہیں گئیں؟" بغیر سر اُٹھائے اور نگاہیں بدستور کتابوں پہ جمائے اس نے دریافت کیا۔

"نہیں!" شمّی نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں فولاد کی سی سختی تھی۔ اس کے بعد جب اس نے اپنی نگاہیں اٹھائیں تو اُس نے دیکھا شمّی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے بے بسی کے آثار نمایاں تھے۔

چاروں طرف تاریکی پھیل رہی تھی۔ لیکن اس کا دل پوری طرح پُرسکون تھا!

سامنے کی بل کھاتی ہوئی سڑک پر معمول کے خلاف آج زیادہ شور و غل نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی راہ گیر تیز تیز قدم اٹھاتا۔ گزر جاتا تو خاموشی کچھ دیر کے لئے ختم ہو جاتی۔ قدموں کے چاپ کی آواز فضا میں سر اُبھارنے لگتی۔ ایک قلیل وقفہ کے بعد ہی قدموں کی چاپ مدّھم پڑنے لگتی۔ حتیٰ کہ فضاء میں پھیلی ہوئی آواز کی لہریں ہوا کے دوش پہ اڑ کر دُور چلی جاتیں۔ آواز دم توڑ دیتی۔ لیکن کان کے پردوں سے ٹکرا کر عجیب پُرشور آواز پیدا کرنے والی یہ لہریں ذہن میں بھی کچھ دیر کے لئے ایک گونج سی پیدا کر دیتیں۔ رفتہ رفتہ یہ گونج بھی ختم ہو جاتی اور پھر چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔

بات خلافِ معمول ضرور تھی۔ لیکن اتنی غیر معمولی بھی نہیں کہ اس کے لئے اتنا کچھ سوچنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔

برآمدے میں دیوار کے سہارے وہ بہت دیر سے کھڑی تھی۔ وہ اندر جانا چاہتی تھی۔ اور بظاہر یہ ایک معمولی سی بات تھی۔ لیکن لاشعوری طور پر یہ بات اس کے لئے قریب قریب ناممکن تھی۔ اس کا جسم ذہن کے تابع نہیں تھا۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ وہاں سے نہیں ہٹ سکتی جیسے وہ اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتی، جیسے کسی نے پیروں کے ساتھ ساتھ ذہن کو بھی زنجیروں میں جکڑ لیا ہو۔ وہ اندر جانا چاہتی تھی لیکن وسیع مکان کے طویل و عریض کمروں میں جیسے کوئی چیز اس پہ جھپٹ پڑنے کو تیار بیٹھی تھی ——— اس کا تصوّر کرتے ہی اس کا دم گھٹنے سا لگا ——— یہ وہی خاموشی تھی جو سارے گھر

پر چھائی ہوئی تھی۔ یہ وہی سناٹا تو تھا جو اُسے کاٹنے کے لئے دوڑتا تھا۔ یہ وہ سکوت ہی تھا جس کے احساس ہی سے اُسے اپنی سانس رُکتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی اور اسی لئے وہ یہاں برآمدے میں آگئی تھی۔ تاکہ کھلی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں اپنی سانس ٹھیک کر سکے۔ دل و دماغ پر چھائی ہوئی اِس اُداسی کو ختم کرنے کی کوشش کرے ـــــ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر چیز نے اسے شکست دینے کی قسم کھا رکھی ہو۔ یہاں آکر بھی اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ سامنے بل کھاتی ہوئی سڑک پر معمول کے خلاف آج زیادہ شور و غل نہیں تھا۔ عجیب خاموشی چاروں طرف مسلّط تھی۔ وہی خاموشی جس کے احساس کو ختم کرنے کے لئے وہ اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آگئی تھی۔

صبح سے کافی گرمی پڑ رہی تھی۔ لیکن شام کو جب سورج مغرب کی سمت جا رہا تھا تو موسم بڑی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی لالی پھیل رہی تھی سرد ہوا کے تیز جھونکے جسم کو گدگدا رہے تھے۔ دُور، سڑک کے اس پار، دُور تک پھیلے ہوئے ناریل کے اُونچے اُونچے درختوں کی طرف سے آتے ہوئے سرد ہوا کے یہ تیز جھونکے اُسے بہت شوخ معلوم ہوئے۔

اس نے جھانک کر دیکھا ـــــ اندر ڈرائنگ روم میں اسی میز کے قریب کُرسی پر بیٹھی ہوئی تمّی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک دوسری کتاب رکھی تھی۔ ایک چھوٹی سی نوٹ بک میز پر کُھلی پڑی تھی۔ کتاب کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے ـــــ اُسے تمّی کی حرکات میں کچھ اضطراری کیفیات کا احساس ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جلد سے جلد اس کام سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو ـــــ تمّی کو اس عجیب حالت میں دیکھ کر بے اختیار خواہش ہوئی کہ تمّی سے اس کی وجہ دریافت کرے، لیکن ـــــ اچانک جیسے اُسے کوئی بُھولی بسری بات یاد آگئی۔ اور الفاظ اُس کی زبان تک آکر رُک گئے۔ اس کے لب ایک لمحے کے لئے کُھلے، اور پھر خود بہ خود بند ہو گئے، وہ خاموش ہو گئی۔

وہ بڑی دیر تک اسی جگہ کھڑی رہی ـــــ تمّی نے اب کتابیں بند کرکے لاپرواہی کے مخصوص انداز میں شیلف کی جانب پھینک دی تھیں۔ اور پھر کُرسی سے اُٹھ کر اندر، اپنے کمرے کی جانب چلی گئی تھی۔ کوئی دس منٹ بعد وہ پھر ڈرائنگ روم کی طرف لوٹ آئی۔ اُسے ڈرائنگ روم میں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ سُنائی دی جو رفتہ رفتہ قریب تر ہوتی جا رہی تھی ـــــ وہ دم سادھے کھڑی رہی ـــــ شاید آج پھر تمّی نے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا ـــــ اُس نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے آپ کو اس قضیہ سے بے تعلّق رکھے۔ لیکن خیالات تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اور وہ سوچنے لگی، اُسے کیا کرنا چاہیئے؟ وہ کیوں کر تمّی کو باہر جانے سے روک سکتی ہے؟ اگر وہ سرے سے اس کی بات قبول ہی نہ کرے۔ اگر وہ صاف اِنکار کر دے۔ تب ـــــ؟ ـــــ قدموں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ نصف منٹ کا قلیل عرصہ بھی نہ گزرا ہوگا کہ وہ قدموں کی چاپ اسے اپنی پُشت پر سُنائی دی ـــــ اس نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا!

تمّی اس کے قریب سے گزر کر سڑک کی جانب چلی گئی۔ ایک لفظ بھی تو نہیں کہا اس نے بس ـــــ وہ ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دفعتاً تمّی کے قدم رُک گئے، وہ رُک گئی اور پلٹ کر اپنی ماں کی طرف جھجکتی ہوئی مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے دھیمی لیکن صاف اور واضح آواز میں کہا۔

"آج ـــــ یوں ہی گھومنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اگر۔ اگر آپ بھی ساتھ ہو چلیں تو کافی لُطف رہے۔"

اُس واقعہ کے پورے آٹھ دن بعد آج تمّی نے اس سے بات کی تھی۔ اس کے لہجے کی اجنبیت کو اس نے صاف طور پر محسوس کیا۔ لیکن تمّی کی توقع کے خلاف اس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اُس کی توقّع کے خلاف اس نے مختصر طور پر صرف اتنا کہا۔

"نہیں! میری طبیعت آج کچھ پریشان سی ہے ـــــ تم چلی جاؤ ـــــ"

جواب سُننے کے بعد تمّی کوئی ایک منٹ اور کھڑی رہی۔ شاید وہ آگے کچھ سُننے کی خواہش مند تھی لیکن اُس نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اور تمّی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی سڑک کے ایک موڑ پر پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی قریب ہی بس اسٹاپ تھا۔

اُس کے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک اسی جگہ کھڑی رہی اور پھر بڑی مشکل سے اندر، ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ چاروں طرف سکوت کا عالم تھا۔ اُسے پھر ایک بار اپنی سانس ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ وہ اندر ہال کی طرف چلی گئی ـــــ ہال کے ایک کونے میں دو ملازم پڑے اونگھ رہے تھے تیسرا کونے میں میز پر رکھے ہوئے ریڈیو سیٹ پر جُھکا ہوا تھا۔
ـــــ اس نے سوچا وہ اکیلی، زیادہ دیر تک یہاں نہ ٹھہر سکے گی۔ کسی خیال کے زیرِ اثر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اور تقریباً بیس منٹ بعد جب وہ باہر نکلی تو

اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ملازموں کو دو تین ضروری کاموں کے متعلق ہدایات دینے کے بعد جب وہ برآمدے میں سے ہوتی ہوئی باہر سڑک پر نکل آئی تو اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا!

شمی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ آج موسم واقعی خوش گوار ہے۔ وہ سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگی۔

تقریباً تین فرلانگ آگے جاکر سڑک بائیں جانب مڑ جاتی تھی۔ اس موڑ پر ایک پگڈنڈی سڑک سے جُدا ہوتی تھی۔ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی یہ پگڈنڈی اس کے مکان کی پُشت کی طرف سے گزرنے والی ایک چھوٹی سی نہر کی طرف جاتی تھی۔ یہ نہر کسی زمانے میں چلتی ہو گی لیکن اب تو خستہ حالت میں تھی۔ اس نے آج تک، ہمیشہ اسے خشک ہی دیکھا تھا۔ اس کے ہر دو جانب گھنے اور چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھُنڈ کے جھُنڈ پھیلے ہوئے تھے —— وہ اُسی جانب چلی گئی، ٹوٹی پھوٹی اور خشک نہر کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ آگے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ جس جگہ پہنچ کر وہ رُکی تھی وہاں برگد کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تھا۔ درخت کے موٹے اور سیاہ تنے کے قریب پڑے ہوئے ایک اُونچے پتھر پر وہ دھیرے سے بیٹھ گئی۔

جب بھی وہ تنہا ہوتی: تنہائی کے عالم میں جب بھی اُسے اپنے قبول صورت مرحوم شوہر کی یاد آتی۔ گھر پر چھائی ہوئی خاموشی جب بھی اُسے کاٹنے کو دوڑ پڑتی جب بھی اُسے گھٹن محسوس ہوتی، جب وہ اداس ہوتی وہ اسی نہر کی طرف نِکل آتی

اُسے اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ پچھلی بار وہ کس موقعہ پر یہاں آئی تھی۔ لیکن جہاں تک اس کی کمزور یادداشت کا تعلق تھا۔ اس بات کو قریباً تین ماہ ہو رہے تھے تین ماہ بعد آج پھر وہ اس خشک نہر کی طرف نِکل آئی تھی۔

اُسے یاد نہیں تھا۔ پچھلی بار وہ کس موقعہ پر یہاں آئی تھی۔ لیکن آج صبح سے لے کر شام تک پیش آنے والے وہ سارے واقعات اب بھی اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ جو اُسے یہاں تک کھینچ لانے کے محرک ثابت ہوئے تھے۔ آٹھ دن پیشتر سنیچر کی شام کو یکے بعد دیگرے پیش آنے والے وہ سارے حیرت انگیز واقعات بھی برابر اس کے ذہن میں چکر کاٹ رہے تھے۔ اُسے وہ ساری باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہ آٹھ دن پہلے شمی کی زبان سے نکلے ہوئے وہ الفاظ اُسے یاد تھے —— اچھی طرح یاد تھے اور اس کے فوراً بعد اسے اپنے وہ الفاظ یاد آ گئے۔ جو اس نے اس سلسلے میں شمی سے کہے تھے —— اس نے سوچا، اس وقت شمی کے سامنے انکار کر کے اس نے بہت اچھا کیا۔ اس انکار سے پہلے ہی اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچا ہو۔ مگر یہی کیا کم تھا کہ انکار کے بعد اس نے کسی غیر معمولی اضطراری کیفیت کا احساس نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں —— اپنے اس اقدام کو اس نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

آٹھ دن کی طویل مدت کے بعد آج شمی نے اس سے بات کی تھی جھجکتے ہوئے، اجنبی کی طرح! —— اس کی سمجھ میں نہ آیا، شمی نے اپنے اس طرزِ عمل سے کون سی بات اس پر واضح کرنے کی کوشش کی تھی؟ اُسے شمی کے اس طرزِ عمل میں کوئی خاص مقصد نظر نہ آیا۔ پھر اس نے سوچا، شاید اب شمی پورے طور پر اُس سے تعلقات منقطع کرنا چاہتی ہے۔ تبھی تو اس کے لہجے میں اتنی اجنبیت تھی شاید وہ اس پر واضح کرنا چاہتی تھی کہ اب وہ سِنِ شعور کو پہنچ چکی ہے اور اب اُسے اس کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ اپنا بھلا بُرا وہ خود سوچ سکتی ہے۔ اب یہ بندشیں اس کے لئے بے کار ہیں۔ اب وہ آزاد ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت آزادی کے اس حق سے اُس کو محروم نہیں کر سکتی! —— یہ تو بہت بُری بات ہے —— اس نے سوچا اگر واقعی شمی نے یہاں تک سوچ لیا ہے تو پھر سچ مچ دنیا کی کوئی طاقت اُسے ونود کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتی وہ ونود کی طرف بڑھے گی۔ چاہے اس کی راہ میں ہزاروں رکاوٹیں کیوں نہ ہوں۔ چاہے اس سلسلے میں اسے اپنی زندگی تک سے ہاتھ دھونا پڑے! —— اور پھر شمی کی ضدی طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف بھی تو تھی۔

ونود کی یاد کے ساتھ ساتھ اُسے اپنا مرحوم شوہر کی یاد آ گئی —— لانبے لانبے سیاہ بال جو ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی تصویر میں گہرے بھورے رنگ کے نظر آتے تھے۔ چھوٹی سی پیشانی جس پر ہمیشہ، بلاوجہ شکنیں پڑی رہتیں۔ آنکھیں بھی اسی مناسبت سے چھوٹی چھوٹی تھیں، لیکن تمام چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں اُبھری ہوئی یہ آنکھیں ہی تھیں۔ جو سامنے کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کے دل میں پیوست ہوئی جاتی تھیں۔ ہونٹ پتلے تھے اور زیادہ سگرٹ نوشی کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے۔ اور رنگ سانولا تھا۔ اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ایک رُعب تھا، ایک عجیب وقار تھا —— اُس کی آنکھوں کے سامنے اپنے مرحوم شوہر کی صورت گھوم گئی اور وہ اُس کا مقابلہ ونود سے کرنے لگی —— ونود! کتنا خوبصورت تھا وہ!! بالکل اُس نوجوان کی طرح جو

کبھی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ــــــ خزاں زدہ پتے تو ختم ہو ہی چکے تھے لیکن اب تو صرف ونود کے تصوّر ہی سے دُور اُفق پہ کالی کالی بدلیاں چھا رہی تھیں بس ـــ اُس کے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس نے اپنا ہاتھ پیشانی سے لگا لیا۔

قسمت نے اس کے ساتھ بہت بھیانک مذاق کیا تھا۔ جوانی کے ابتدائی ایّام میں اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی۔ کہ اچانک غیر متوقع طور پر اس کی ملاقات اس نامعلوم نوجوان سے ہو جائے جس نے اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ اُس کی یہ خواہش پوری ضرور ہوئی لیکن اب ـــ ؛ جب وہ زندگی کے اس موڑ پہ کھڑی تھی ۔ جہاں پہنچ کر زندگی کے سارے لُطف اور ساری لذّتیں موتھ موڑ لیتی ہیں۔ پھر کوئی پیار بھری مُسکراہٹ کسی کا استقبال نہیں کرتی معمولی معمولی سی بات کے لئے ایک طویل عرصہ تک انتظار نہیں کیا جاتا۔ کئی دن غائب رہنے کے بعد اچانک نظر آ جانے پر محبّت اور پیار میں ڈوبا ہوا آنسوؤں کا دریا اُمنڈ نہیں آتا۔ خواہش پوری ضرور ہوئی مگر اُس وقت جب کہ درختوں کے بڑے بڑے سبز اور ملائم پتے آہستہ آہستہ پیلے پڑنے لگے تھے اور پھر ٹہنیوں سے جُدا ہو کر زمین پر بکھر گئے تھے !! جب کہ خزاں آ چکی تھی !!!

پھر اُسے نِتّمی یاد آ گئی جس نے یقیناً، زندگی بھر ونود کا ساتھ دینے کا عہد کر لیا تھا۔ لیکن ــــ اس نے سوچا ــــ یہ ناممکن ہے، قطعاً ناممکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ نِتّمی کو ونود کا خیال اپنے ذہن سے نکال دینا ہوگا۔ کم سے کم اس کی زندگی تک نِتّمی ونود کا تصوّر بھی اپنے ذہن میں نہیں لا سکتی۔ اُسے اس ونود کے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے جو کبھی اس کے تصوّرات کی دُنیا میں آیا تھا۔

آج سے ٹھیک آٹھ روز قبل سنیچر کی اُس ویران سی شام کو ونود سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اُس روز، شام کو کالج سے لوٹتے وقت وہ نِتّمی کے ساتھ ہی اس کے ہاں چلا آیا تھا اور اُسی روز شام کو ان دونوں نے ایک لمبا چوڑا پروگرام بنایا۔ یہ وہی شام تو تھی جب، زندگی میں پہلی بار اس نے نِتّمی کے دل کو سخت اذیّت پہنچائی تھی۔

اُس واقعہ کے بعد نِتّمی گھر سے بالکل بے تعلّق سی نظر آنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے پہلی بار اس گھر میں قدم رکھا ہو۔ وہ گھر کی ایک فرد ہوتے ہوئے بھی اجنبی سی لگتی تھی۔ اُس واقعہ کے بعد اس نے اس سے بات کرنا ترک کر دیا تھا۔ لیکن اُس کے دوسرے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ناشتے کی میز پہ نِتّمی عموماً اکیلی ہوتی۔ کبھی کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا کہ اس نے ابھی ناشتہ ختم بھی نہ کیا ہوتا کہ نِتّمی اُچھلتی کودتی کھانے کے کمرے میں چلی آتی۔ وہ اُس کے قریب کرسی پر بیٹھ جاتی۔ اور تب کمرے میں مکمل سنّاٹا چھا جاتا۔ صرف پلیٹوں اور چمچوں کے ٹکرانے کی آواز ہوتی یا پھر نِتّمی کے دھیرے دھیرے گنگنانے کی آواز! جو اُس کی پُرانی عادت تھی۔ اس کے بعد نِتّمی کتابیں اکٹھی کرتی۔ سینڈل پہنتی، قلم لیتی اور کچھ رقم پرس میں ڈال کر برآمدے میں سے ہوتی ہوئی سامنے کی سڑک پر چلی جاتی سڑک کے موڑ پہ پہنچ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی!

پہلے تو نِتّمی کے لوٹنے کے بعد شام کی چائے دونوں ساتھ پیا کرتی تھیں لیکن اب کالج سے لوٹنے پر نِتّمی سیدھی اپنے کمرے کی طرف چلی جاتی اور دروازہ اندر سے بند ہو جاتا۔ دروازہ اُس وقت تک نہ کھُلتا جب تک کہ آٹھ نہ بج جاتے اور ملازم کھانے کے لئے دروازے پر دستک نہ دیتی ــــ سچ مچ وہ کتنی بدل چکی تھی! وہ معصوم اور پیاری سی نِتّمی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ جو دن رات اس کے اردگرد منڈلایا کرتی تھی۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے کبھی نہ تھکتی تھی۔ جو ہمیشہ اپنی مخصوص پیار بھری مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا کرتی تھی ــــ بہرحال اُس کا وہ قبول صورت شوہر زندہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ پیاری نِتّمی موجود تھی۔ سب کچھ بدل چُکا تھا۔ اُس کی تو دنیا ہی بدل چکی تھی!

بے شمار تلخیاں ذہن میں سمیٹے اور برگد کے بوڑھے درخت کے موٹے اور سیاہ تنے کا سہارا لے کر دھیرے سے وہ اُٹھ کھڑی ہوئی خشک، ٹوٹی پھوٹی اور اُجڑی ہوئی نہر کے ہر دو جانب کھڑے گھنے درختوں کو تاریکی نے ڈھانپ لیا تھا ــــ اُس نے کلائی پہ بندھی ہوئی اپنی خوبصورت سی گھڑی پہ نظر ڈالی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ کافی وقت ہو چکا تھا ــــ وہ گھر واپس ہو گئی۔

گھر پہنچنے کے بعد ملازموں سے دریافت کرنے پر اُسے معلوم ہوا کہ نِتّمی ابھی تک واپس نہیں آئی ــــ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ نِتّمی ونود کے ساتھ گئی ہے۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو اتنی دیر کبھی نہ ہوتی ــــ اس ضدّی اور بدمزاج لڑکی پر بے اختیار اُسے غصّہ آ گیا! اُسے پرسوں والا وہ واقعہ یاد آیا جب وہ کسی کام کی غرض سے لیب میں

برنز اسٹریٹ کی طرف جا رہی تھی۔ کوئی پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ شمّی کا کالج راستے ہی میں پڑتا تھا۔ اُسے یاد آیا۔ عین اس وقت جب بس کالج کے سامنے سے گزر رہی تھی تو ونود اور شمّی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کالج کی عمارت سے باہر نکل رہے تھے شمّی کی نظر تو اس پر نہیں پڑی تھی۔ لیکن ونود نے یقیناً اُسے دیکھ لیا تھا کیوں کہ دوسرے ہی لمحے اُس نے آگے کی طرف جُھک کر سرگوشی کے انداز میں شمّی سے کُچھ کہا تھا۔ اس کے بعد بس آگے بڑھ گئی تھی مگر اس کا ذہن تو وہیں رُک گیا تھا۔ سارے خیالات اسی ایک نقطے کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ بس میں بڑی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی تھی! ——— اُسے وہ بات اچھی طرح یاد تھی اور محض اُس بات کی بنا پر وہ شرط لگا سکتی تھی کہ آج پھر شمّی ہوسٹل گئی ہے۔ اور یہ کہ شام گذارنے کے لئے دونوں نے مل کر کوئی لمبا چوڑا پروگرام بنایا ہوگا ——— شمّی اتنا آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس کا احساس اُسے پہلی ہی ہوا تھا۔

وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ملازم نے آکر کھانا میز پر لگ جانے کی اطلاع دی۔ وہ بے خیالی کے عالم میں کھانے کے کمرے میں چلی گئی۔ کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں ——— میز کے پاس دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تو وہ جس پر وہ خود بیٹھتی تھی اور دوسری اُس کے دائیں جانب رکھی تھی ——— اُسے یاد آیا، کسی زمانے میں یہاں ایک اور کرسی ہوا کرتی تھی۔ جو اس کے بالکل مقابل، میز کی دوسری جانب رکھی ہوتی۔ دائیں طرف کی جگہ شمّی کو دے دی گئی تھی اور سامنے والی کرسی پر اس کا شوہر بیٹھا کرتا تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا۔ اور شوہر کی زندگی کے آخری دنوں میں تو یہ ایک اصول بن کر رہ گیا تھا ——— شوہر کے مرنے کے بعد کئی دن تک وہ کرسی اُسی طرح پڑی رہی۔ اُن دنوں خالی جگہ کو دیکھتے ہی بے اختیار اُسے اپنا مرحوم شوہر یاد آجاتا تھا۔ اور پھر اُس کی آنکھیں یک بارگی اشکوں سے بھر آتی تھیں اور پھر کچھ کھائے بغیر وہ اُٹھ جاتی تھی اور تب زبردستی ایک دن شمّی نے اس کرسی کو وہاں سے اٹھوا دیا تھا۔ کیوں کہ اُسے اپنی پیاری ماں بے حد عزیز تھی۔ اُسے کسی صورت میں غمگین نہیں دیکھ سکتی تھی ——— شمّی سچ مچ اس کا کتنا خیال رکھتی تھی! اُس نے سوچا۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ لیکن لیٹنے کے بعد جب اُس نے ایک کتاب پڑھنے کے لئے اٹھائی تو پچھلے کئی دنوں سے یکے بعد دیگرے پیش آنے والے سارے واقعات پھر ایک بار اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اُس کے دل میں ایک نئی اُلجھن کروٹیں بدلنے لگی۔

کھانے کی میز پر شمّی کے بارے میں جو خیال اُس کے ذہن میں آیا تھا اُس نے اُس کے ذہن پر کافی اثر چھوڑا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سچ مچ شمّی اُس کا کتنا خیال رکھتی تھی! اور ایک ایک کر کے شمّی کی ساری اچھی اچھی باتیں اُسے یاد آگئیں ——— اس نے سوچا شمّی کی ناراضی بے سبب نہیں ہے۔

سنیچر کی اس ویران شام کو اُس نے جو انکار کیا تھا وہ بالکل معمولی بات تھی۔ اس سے پہلے بھی اُس نے کئی بار شمّی کو باہر جانے سے منع کر دیا تھا اور تب پیشانی پر ایک شکن لائے بغیر اس نے اس کی بات مان لی تھی۔ ایک لفظ بھی تو نہیں کہا تھا۔ لیکن اس دن؟ اُس دن اس نے بہت کچھ کہہ دیا، معلوم نہیں کیوں؟ اس نے سوچا۔ شاید ونود اس کا بہت گہرا دوست ہو۔ اور اس لئے اُس سے کئے ہوئے وعدے کو وہ توڑنا نہ چاہتی ہو۔ اور تب اُسے خیال آیا ہو سکتا ہے ونود اُس کے نزدیک ایک دوست کے علاوہ اور بھی کچھ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں ہم خیال ہوں، ہم مذاق ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں ساتھی ہوں، گہرے ساتھی، زندگی بھر کے ساتھی!

اچانک اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی ——— یہ نہیں ہو سکتا! اس کا دل جیسے پکار اٹھا، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے فیصلہ کر دیا۔ لیکن اس کو شمّی کی بے بس نگاہیں یاد آگئیں ——— کتنے عجیب لہجے میں کہا تھا اُس نے ——— میں تو جاؤں گی، ضرور جاؤں گی، وعدہ جو کیا ہے میں نے! ——— اور اس کے بعد اس کی وہ معصوم نگاہیں جن سے بے بسی کے آثار نمایاں تھے!! ——— اُس نے بُرا کیا، بہت بُرا کیا تھا اُس نے۔ اگر وہ اس وقت اجازت دے دیتی۔ تو آج شمّی کتنی خوش نظر آتی! ——— لیکن وہ ونود ونود کی وہ مسکراہٹ، پھر شمّی کا وہ حسن، اُس کی وہ شعلہ بار نگاہیں۔ اُس کے وہ سخت کلمات! سچ مچ اجازت دینا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن شمّی کی وہ بے بس نگاہیں جن میں دُنیا بھر کے غم پوشیدہ تھے ——— بے اختیار اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ زیرو کینڈل پاور کا بلب روشن تھا۔ لیکن پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے گہری تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا ہو۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف مہیب اندھیرا پھیلا ہوا ہو اور اس مہیب اندھیرے میں اُسے بے شمار نگاہیں رقص کرتی نظر آئیں ایسا لگ رہا تھا جیسے بیک وقت سینکڑوں بے بس نگاہیں اُس کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ چاروں طرف سے نگاہوں کے لاتعداد، زہر میں بُجھے ہوئے تیر اس کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور اُس کے جسم میں پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ نگاہیں جو لاچار تھیں، نگاہیں جن سے اُداسی ٹپک رہی تھی۔ نگاہیں جو معصوم تھیں، جن میں بے پناہ درد پوشیدہ تھا۔ نگاہیں جو بے بس نہیں۔ شعلہ بار تھیں بلــــ اچانک اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے لحاف کے اندر دُبکے ہوئے اس کے بھدّے، موٹے، بد نما اور پستہ قد جسم کو دیکھ کر کمرے کے در و دیوار ہنس دیئے ہوں!! ــــ اس نے فوراً لحاف ایک طرف پھینک دیا اور بجلی کی سی تیزی سے کھڑے ہو کر دوسرا بٹن دبا دیا ــــ تیز، سفید روشنی سے اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اُس نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا اور کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

پُونم کا خوبصورت چاند دور ــــ بہت دُور نیلگوں فضاؤں میں رقص کر رہا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے ــــ اُسے ہر چیز میں ویرانی اور بے بسی کی جھلک نظر آئی۔ لے دے کر بات یہیں پر آ کر رُک گئی تھی بلــــ ــــ سامنے لامحدود خلاؤں میں اُسے دو چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ یہ شمی کی آنکھیں تھیں۔ بے بسی کے ساتھ مسلسل اُسے گھور رہی تھیں!

اس نے روشنی بجھا دی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ تبھی ایک خیال جانے کہاں سے رینگتا ہوا اس کے ذہن میں گھس آیا ــــ بجلی کے اِس چھوٹے سے بلب کی روشنی بھی ایک چھوٹی سی جنبش کی مرہونِ منّت تھی، ذرا سی حرکت اور ایک دم اُجالا، ذرا سی جنبش اور قصہ ختم، گھُپ اندھیرا! ــــ ــــ اس نے محسوس کیا۔ جیسے اس کا ذہن بوجھل ہو چکا ہے۔ اُس کی بڑی بڑی پلکیں آنکھوں پر جھک آئیں۔ وہ سو چکی تھی۔

صبح بستر سے اُٹھنے کے بعد جب اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو خلافِ معمول نو بج رہے تھے۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ مارے غصّے کے سارا گھر سر پر اٹھا لیتی کہ اُسے وقت پر کیوں نہ اُٹھایا گیا۔ مگر آج ایسا نہ ہوا۔ وقت دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی اور اپنے تھکے ہوئے اعضاء کو آرام پہنچانے کی خاطر نہانے چلی گئی۔ اور جب وہ نہا کر باہر نکلی تو اُس کا چہرہ کسی انجانی مسرّت کے احساس سے کھِل گیا۔ نہانے کے بعد اس نے ایک سفید سوٹ پہنا۔ بڑے ہی اطمینان کے ساتھ بال سنوارے اور پھر ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔

حسبِ معمول، شمّی ایک کُرسی پر بیٹھی تھی۔ لیکن اُس کا سر جھکا ہوا تھا آنکھیں سُرخ انگارہ معلوم ہو رہی تھیں۔ بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑوں پہ جگہ جگہ شکنیں پڑی ہوئی تھیں ــــ شاید ساری رات کروٹ بدلتے بیتی تھی۔

"شمّی!" اس نے دھیرے سے پکارا۔ مگر شمّی نے شاید سُنا نہیں۔ کیوں کہ اُس کے پکارنے پر بھی وہ بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی ــــ ــــ وہ دبے قدموں سے اس کے قریب جا پہنچی اور چپکے سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ اور اُس کے بالوں میں اُنگلیاں گھُمانے لگی ــــ شمی نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا پھر اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ کُرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ــــ شمی اس سے دُور ہی رہنا چاہتی تھی۔ اُس نے اسے شدّت سے محسوس کیا۔ مگر کہا کچھ نہیں! ــــ شمی کُرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور میز کے قریب جا کر خواہ مخواہ کتابیں ٹٹولنے لگی۔

"ٹھیرو!" اس نے رُعب دار آواز سے کہا ــــ شمّی نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیرو!" اس نے کہا اور اُس کے بعد وہ رُک گئے۔ الفاظ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ کُرسی کی پُشت کا سہارا لے کر وہ دھیرے سے اُس پر بیٹھ گئی۔ اور پھر بڑے ہی دھیمے لہجہ میں رُکتے رُکتے یہ چند الفاظ اس کے منھ سے نکلے۔

"شمّی! ــــ میری بیٹی! ــــ ادھر آؤ ــــ" اس نے کہا۔ "اِدھر آؤ۔ آج تم کالج نہیں جاؤگی۔ سمجھیں؟ جاکر جلدی سے نہالو اور اپنا سفید سُوٹ پہن لو۔ پھر ہم ونود کے پاس چلیں گے۔ کالج کے ہوسٹل میں رہتا ہے نا وہ؟ ــــ بس! تو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ورنہ وہ کالج چلا جائے گا

تم سُن رہی ہو نا میں کیا کہہ رہی ہوں؟ ــــ ہمیں ونود کے پاس جانا ہے ــــ تم نے اپنے لئے جیون ساتھی کا انتخاب تو خوب کیا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی اس بات سے بلــــ اچھا اب جاؤ اور جلدی سے لباس تبدیل کر کے آؤ!! تم سُن رہی ہو نا؟"

شمّی نے آنکھیں پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔
درخت کے بڑے بڑے، سبز اور ملائم پتّے جو آہستہ آہستہ پیلے پڑنے لگے تھے۔ اب ٹہنی سے جُدا ہو کر زمین پر بکھر گئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا جو آیا تو زمین بالکل صاف تھی۔ بچا کھچا سرمایہ بھی اب لُٹ چکا تھا۔ اب درخت تنہا کھڑا تھا! لیکن ــــــــ اس کی ماں سوچ رہی تھی اب پھر بارش ہوگی۔ سیاہ سیاہ بدلیاں اُفق پر نمودار ہوں گی، پھر ــــ؟ پانی کا ایک قطرہ ــــ پھر دوسرا ــــ پھر تیسرا ــــ اور چند دن بعد سچ مچ بہار!!!

مکامہ میں گنگا کا پُل

اس سال مئی میں وزیرِاعظم پنڈت نہرو نے بہار میں مکامہ کے مقام پر گنگا کے عظیم الشّان پل کا افتتاح کیا۔ یہ پل چھ ہزار فٹ لمبا ہے اور انجنیرنگ کا شاندار کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

دریائے گنگا ہمالیہ کے پہاڑوں سے نکل کر شمالی ہند کے میدانوں سے گذرتا ہوا جب بہار میں داخل ہوتا ہے تو اس کا پاٹ تقریباً پانچ میل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہونچتے پہونچتے گنگا میں بہت سے چھوٹے بڑے دریا شامل ہو جاتے ہیں۔ جس جگہ یہ پُل تعمیر کیا گیا ہے وہاں فی منٹ جتنا پانی بہتا ہے وہ اندازاً ہندوستان کے بعض بڑے بڑے شہروں کی پورے دن کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ دریا طغیانی پر ہوتا ہے تو بحرِ ذخّار معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں گنگا کا پل تعمیر کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی لیکن بعض وجوہ سے یہ تجویز ملتوی ہو گئی اور پھر ۱۹۵۲ء میں یہ کام شروع کیا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں مشہور انجنیر اور سیاست داں ایم، وِسویسوارّیا نے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔

یہ دوہرا پُل ہے۔ اوپر ریلوے لائن گذرتی ہے اور نیچے سڑک ہے۔ یہ ریلوے لائن ایسٹرن ریلوے کی چھوٹی لائن کو نارودرن ریلوے کی بڑی لائن سے ملاتی ہے۔

اس پل کی تعمیر پر ۱۵ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے اور اس سے شمالی بہار کو فوری فائدہ پہونچے گا جو جنوب کے صنعتی علاقے کے مقابلے میں اب تک پس ماندہ زرعی علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ شمالی بہار میں چھوٹی صنعتوں کی ترقّی کے بڑے امکانات ہیں لیکن سستی بجلی مہیّا نہ ہونے کی وجہ سے یہ ترقّی رُکی ہوئی تھی۔ اب اس پل کی تعمیر کے بعد جنوبی بہار کی کانوں سے آسانی کے ساتھ کوئلہ پہونچایا جائے گا جس سے بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا اور اس طرح صورت حال یکسر بدل جائے گی۔ براونی کے بجلی گھر میں پہلے ہی ۳۰ ہزار کلوواٹ بجلی تیار ہوا کرے گی، گویا اب ہم گنا اضافہ ہو جائے گا اور یہ اضافہ اس پل کی تعمیر کا براہِ راست نتیجہ ہوگا۔

اس پل سے نہ صرف شمالی بہار کو فائدہ پہونچے گا بلکہ شمالی بنگال، آسام، اتر پردیش کا مشرقی حصّہ اور نیپال بھی مستفید ہوں گے۔ کیونکہ اب تک ان علاقوں کو سامان پہونچانے کے لئے پٹنہ، مکامہ، مونگھیر، بھاگلپور اور ساکری گلی گھاٹ پر کشتی وغیرہ کے ذریعے گنگا کو عبور کیا جاتا تھا اور یہ طریقہ کسی صورت میں اطمینان بخش نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس پل کی تعمیر کے بعد پورے علاقے میں تعمیر و ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی اور عام خوشحالی کا دَور دَورہ ہو جائے گا۔

مشترکہ کھیتی باڑی سے
پیداوار میں اضافہ

پنجاب کے ضلع کرنال میں ایک گاؤں ہے۔ جھنجھاری، یہاں کے کسانوں نے امدادِ باہمی اور بہتر کھیتی باڑی کے طریقے اپنا کر ترقی اور خوشحالی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

پہلے پہل صرف سات کسانوں نے مشترکہ کھیتی باڑی کا فیصلہ کیا۔ گاؤں کے چند اور لوگ محنت مزدوری کے ذریعے ہاتھ بٹانے کو تیار ہو گئے اور اس طرح کھیتی باڑی کے لیے ایک امدادِ باہمی سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی۔

ان سب کے ملے جلے وسائل اور کوششوں کی بدولت سوسائٹی نے بہت جلد ایک ٹریکٹر خرید لیا، بڑھیا بیج حاصل کیے، اچھی کھاد منگوائی اور کھیتی باڑی کے بہتر طریقوں کو اپنایا۔ تھوڑی مدت میں کھیت کی کایا پلٹ گئی اور گیہوں کی پیداوار فی ایکڑ ۵ من سے بڑھ کر ۱۰ من ہو گئی۔ آمدنی کے اس اضافے سے سوسائٹی نے بہت جلد وہ رقم چکا دی جو شروع شروع میں اُدھار لی تھی۔

امدادِ باہمی سوسائٹیوں کو بڑھاوا دیجیے۔ یہ آپ کی بھلائی اور قوم کی ترقی و خوشحالی کے لیے ہیں۔

پلان کی مدد اپنی مدد ہے، اپنی مدد آپ کیجیے

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

دہلی

(افسانہ نمبر)

فہرست

سرورق:۔ علی عباس حسینی کی کہانی 'یہ ڈائن فکر' کو ہمارے ادارے کے فن کار جوتش بھٹاچارجی نے اپنے موقلم سے رنگوں میں پیش کیا ہے۔

کارتک شک سمت ۱۸۸۱

نومبر ۱۹۵۹ء

جلد ۱۸ نمبر ۴

سالانہ چندہ:۔ ہندوستان میں۔ چھ روپے
پاکستان میں چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:۔ نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ:۔ ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، حکومت ہند

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر 'آجکل' اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

روس نے چاند پر راکٹ پہونچا کر سائنس کی دنیا میں اپنی شاندار کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ روسی راکٹ لیونک ۲ زمین سے روانگی کے کوئی ۳۴ گھنٹے کے بعد چاند پر پہونچ گیا۔ گویا اس نے اس قلیل مدت میں سوا دو لاکھ میل سے زیادہ سفر طے کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب خلا کے سفر کی بہت سی دشواریوں پر قابو پا لیا گیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب انسان چاند پر پہونچ کر اپنے ڈیرے جمائے گا۔ بقول پنڈت نہرو قدیم علم نجوم میں چاند انسانوں کی قسمت پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اب بیچارے چاند کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ فضائے بسیط پر سائنس کی اس فتح کے پیش نظر اب اس بات کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے کہ ایٹمی اسلحہ پر پابندی لگا دی جائے، بین اقوامی کشمکش ختم ہو اور تخفیفِ اسلحہ پر سمجھوتہ ہو جائے۔ ایسے سمجھوتے سے خلا کی تسخیر میں بھی بین اقوامی تعاون کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔

روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ دنیا کے سارے ملک چار سال کے اندر اندر بالکل غیر مسلح ہو جائیں۔ اور اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام بری، بحری اور ہوائی فوجوں کا وجود ختم کر دیا جائے۔ فوجوں کے جنرل اسٹاف اور جنگ کی وزارتیں توڑ دی جائیں، ایٹم اور ہائیڈروجن بم برباد کر دیئے جائیں اور آئندہ کے لئے ان کی تیاری ممنوع قرار دے دی جائے۔

مسٹر خروشچیف کی یہ تجاویز دلیرانہ ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسانیت کی بقاء اسی میں ہے کہ دنیا ہمیشہ کے لئے جنگ کے خوف سے نجات پا جائے۔ ہر جگہ امن و امان کا دور دورہ ہو اور تمام انسان مل جل کر پیار محبت سے رہیں۔ گاندھی جی نے دنیا کو یہی راستہ دکھایا اور انھیں اصولوں کی تعلیم دی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج دنیا امن و عافیت کے اسی راستے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ہندوستان اور چین کی سرحد کے معاملے میں چین نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ یقیناً تسلی بخش نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اس بارے میں مشتعل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کا رویہ صلح جویانہ ہے اور وہ گفت و شنید کے ذریعہ اس مسئلے کے پُرامن فیصلہ کا خواہاں ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم نہرو نے صاف صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ ہندوستان اپنی جگہ اٹل رہتے ہوئے سرحدی تنازعات کا چین سے پُرامن تصفیہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ حکومتِ ہند میک ماہن لائن کی سختی سے پابند ہے۔ یہ لائن ہندوستان اور چین کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ پھر بھی اگر یہ بین اقوامی سرحد کسی جگہ معینہ جغرافیائی حدود سے تجاوز کرتی ہے تو اس مسئلہ پر گفت و شنید کی جا سکتی ہے۔

۱۵ ستمبر کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے مبارک ہاتھوں سے آل انڈیا ریڈیو کی تجرباتی ٹیلی ویژن سروس کا افتتاح ہوا۔ ملک میں نشریات کی ترقی میں یہ ایک شاندار اضافہ ہے۔ فی الحال یہ سروس تجرباتی منصوبے کی حیثیت رکھتی ہے۔ امید ہے کہ یہ تجربہ کامیاب رہے گا اور جلدی باقاعدہ ٹیلی ویژن پروگرام ہونے لگیں گے جس سے نہ صرف عوام کے لئے تفریح کا سامان مہیا ہوگا بلکہ ان کی تعلیم و تربیت بھی ہو سکے گی۔ اور ہر خاص و عام سائنس کی اس اہم ایجاد سے مستفید ہو سکے گا۔

ہمیں افسوس ہے کہ اردو کے ممتاز ادیب اور صاحبِ طرز افسانہ نگار چودھری محمد علی ردولوی ۱۰ ستمبر کو اپنے وطن ردولی ضلع بارہ بنکی میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے اردو میں فطرت نگاری کی بنیاد ڈالی اور حقیقت پرستی اور خیال آفرینی کے امتزاج سے افسانہ نویسی میں ایک نئی راہ پیدا کی۔ وہ بذلہ سنج اور خوش طبع ادیب تھے اور نفسیات میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے انتقال سے اردو زبان و ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے۔

علی عبّاس حسینی

یہ ڈائن فکر

(جرمنی کے سدرین سے استفادہ)

کسی زمانے میں ایک عورت تھی، بڑی غریب، دکھیاری، کوکھ جلی۔ میاں اس کا مزدوری کرتا تھا۔ دن بھر کی محنت مشقّت کے بعد مشکل سے آنے دو آنے کما لاتا۔ اسی میں انھوں نے آپ اپنا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا۔ دونوں ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر بسر کر لیتے تھے، اس لئے کہ وہ سستی کا سمے تھا۔ بس دونوں کو فکر اگر کسی بات کی تھی تو وہ پیٹ کی نہ تھی اولاد کی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے بچّے نہیں ہوئے۔ ایک اوپر ایک پانچ اولادیں ہوئیں اور سب بیٹے! لیکن ایک بھی پندرہ دن کا نہ ہونے پاتا کہ نہ جانے کون سا روگ لگ جاتا کہ بس گھڑی دو گھڑی کی بیماری میں وہ چٹ پٹ ماں کی گود سے چھوٹ کر گور گڑھے کو بساتا۔ ماں بیچاری ہر مذہب کے پیروں، فقیروں، سنتوں مہنتوں، ملّاؤں اور پیانوں کے پاس جاتی، ہاتھ جوڑتی، گڑگڑاتی، گنڈے تعویذ لاتی، مسجدوں میں طاق بھرتی، مندروں میں پرشاد چڑھاتی، گرجاؤں میں بتّیاں جلاتی، مگر کسی کی آئی نہ ٹلتی، موت اس کی گود خالی ہی کرتی چلی جاتی۔

جب چھٹا پیٹ میں آیا تو ماں نے منّت مانی کہ "اگر اب کے اصل خیر سے نو مہینے کٹ گئے تو میں اس بچّے کو پیدا ہوتے ہی کسی اور کو دے دوں گی۔ بس میں اس کی دائی کھلائی ہی کہلاؤں گی۔ "ماں" کہہ کے وہ اسی کو پکارے گا جو اسے گود لے لیگی۔ میں جھوٹوں بھی اس کی ماں ہونے کا دعویٰ نہ کروں گی!" مگر چھٹا تو بھن برا بھی نکلا۔ صبح کو وہ ہوا، اور دوپہر ہی کو اس کا باپ دو منزلے مکان کی مرمّت کے سلسلے میں اونچی سیڑھی سے پھسل کر گرا اور چند منٹ میں پھڑک کر ٹھنڈا ہو گیا۔ دکھیاری بیوہ سَوَر سے نکل پڑی، اسی حالت میں اسے میاں کی مٹّی ٹھکانے لگانے کا سامان کرنا پڑا۔ جب بڑی رات گئے وہ خاک کے ڈھیر کو خاک میں ملا کر شمشان سے پلٹی تو چھاتی سے لگے بچّے کی فکر ہوئی۔ سوچتی تھی اب تو اس کے جینے کی اور بھی ضرورت ہے۔ شوہر کا نام اسی سے تو چلے گا۔

رات تو جوں توں کروٹیں بدل بدل کر اس نے کاٹی، صبح سویرے ہی ناقوس کی صداؤں، گھنٹوں کی آوازوں اور اذان کی تکبیروں میں وہ اپنے بچّے کے لئے ماں ڈھونڈھنے نکلی۔

جسم پر میلے چکٹ، سَوَر والے کپڑے تھے، بالوں پر مرگھٹ کی خاک تھی۔ کلیجے سے چمٹا ہوا بچّہ بھی چیتھڑوں ہی میں لپٹا تھا، بالکل چوہے کا بچّہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں جاتی بھکارن سمجھ کر دھتکاری جاتی۔ صورت دیکھتے ہی ہر عورت اسے جھڑک دیتی۔ "جا، جا، کہیں اور لے جا، ہمارے ہاں ایسے نالی کے کیڑے کی ضرورت نہیں۔"

وہ گڑگڑاتی: "دیوی! میں تم سے اس کا خرچ اٹھانے کو نہیں کہتی، نہ اپنے لئے روٹی کا کوئی ٹکڑا مانگتی ہوں۔ میں اپنے گھر رہوں گی، ہر تیسرے چوتھے گھنٹے آکر اس کو دودھ پلا جایا کروں گی، دھوؤں گی، نہلاؤں گی، اور جو چیتھڑا لتّا آپ دیں گی اسے پہنا دوں گی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ آپ اس کو اپنا بیٹا کہہ دیں اور اس کی ماں بن جائیں۔" — مگر اس ملک میں جہاں مذہب کے بھید ہوں، ذاتوں کے بھید ہوں، دولت غربت کے بھید ہوں، غریب بیوہ کا بیٹا کون اپناتا؟

وہ برابر ہفتوں اپنے ہی شہر میں نہیں، آس پاس کے قصبوں، دیہاتوں میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھری، مگر ہر جگہ سے صاف جواب ملا۔ کوئی گدڑی میں لپٹے

لعل کو گود دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔

ایک دن جھٹ پٹے کے وقت، جب وہ تھکی ہاری بیٹھی سوچ رہی تھی کہ شاید بھگوان کو یہی منظور ہے کہ اس کی کوکھ بھی اس کی مانگ کی طرح اُجڑی رہے، اسے ایک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر اُدھر نظر ڈالی جدھر سے یہ آواز آرہی تھی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک بی بی کالے کپڑے پہنے اور کالی نقاب منہ پر ڈالے اس کی طرف چلی آرہی ہیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی اور وہ بچے کو چھاتی سے لگا کر بھاگنے کے لئے پلنگ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

آنے والی نے کہا۔ "ٹھہرو، ڈرو نہیں، میں تمہاری مدد کو آئی ہوں!"

ماں نے تھرّاتے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر بچہ لے لیا۔

اور بولیں: "میں تمہارے بچے کی ماں بننے کے لئے تیار ہوں۔ میں اس کی بھی ذمہ داری لے سکتی ہوں کہ تمہارا بچہ زندہ رہے، بڑا ہو، ایک اچھا انسان بنے اور ساری عمر تمہاری خدمت اور اطاعت کرے۔"

ماں خوشی سے بوکھلا کر بولی۔ "دھنیہ ہیں آپ دیوی، دھنیہ ہیں۔"

وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر بولیں۔ "مگر ایک شرط بھی ہے!"

وہ اسی طرح خوش خوش بولی۔ "مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے!"

دیوی بولیں۔ "تو شرط یہ ہے کہ اپنے بچے کا جسم ہی نہیں، اس کی روح بھی مجھے دے دو!"

روح کا نام سنتے ہی ماں کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ تلملا گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھرا پھرا کے پوچھا۔ "بی بی، آپ کون ہیں؟"

خاتون نے کہا۔ "میں فکر کی ڈائن ہوں!"

بچے کی ماں اس ڈائن کا نام سنتے ہی ڈر اور تکلیف سے کانپنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑے۔ ڈائن بولی۔ "رونے دھونے سے کوئی کام نہیں۔ غریب بچوں کا میری گود کے سوا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اپنے بچے کی جان بچانا چاہتی ہو تو میری شرط قبول کرو، نہیں تو تم جانو اور تمہارا کام!"

یہ کہہ کر اس نے بچے کو کھترے پلنگ پر ڈال دیا اور اس کے انداز سے یہ ٹپکنے لگا کہ وہ اب غائب ہوا ہی چاہتی ہے۔ ماں کی ممتا پھڑپھڑائی۔ اس نے لپک کر پاؤں پکڑ لئے۔ وہ گڑگڑا کر بولی۔ "بس یہ جیتا رہے، مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔ آپ ہر طرح اس کے جی جان کی مالک ہیں۔"

ڈائن نے جھک کر بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا، دو تین بار "بیٹا بیٹا" کہہ کر چٹکی بجائی اور وہ نظروں سے غائب ہوگئی۔

اس دن سے دکھیاری ماں کو کچھ نہ کچھ کام ضرور مل جاتا، کبھی کچھ کوٹنے پیسنے کو، کبھی کچھ سینے پرونے کو، مگر بس اتنا ہی کہ وہ اپنا اور بچے کا پیٹ پال لے اور اس کی دیکھ بھال کر سکے۔ بچہ بڑھنے لگا، گھٹنیوں چلا، تتلا کے بولا، آہستہ آہستہ اس لائق بھی ہوا کہ ہلکے پھلکے کاموں میں ماں کا ہاتھ بھی بٹائے، دکھیاری بیوہ اسے تعلیم نہ دلوا سکی۔ اس سے تعلیم گو مفت تھی، پر وہ اونچی ذات والوں کا اجارہ تھی، نیچی ذات والے بس باپ دادا کا پیشہ ہی اختیار کر سکتے تھے۔ اس لئے اس بچے کو بھی آٹھ دس برس کے سن سے محنت مزدوری کے کاموں میں لگ جانا پڑا۔ ماں بھی دُکھ جھیلتے جھیلتے اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ اب اسے نہ اچھی طرح ڈوب سوجھتے تھے اور نہ ہاتھوں کے رعشے کی وجہ سے چکی ہی پیسی جاتی تھی۔ اس لئے جیسے ہی بچے نے جوانی میں قدم رکھا وہ کام کرنا چھوڑ بیٹھی۔ اب وہ بیٹے ہی کی کمائی پر بسر کرتی تھی۔ روکھا پھیکا پھر پیٹ بھر ملنے لگا تھا اور بیٹا صحیح سلامت تھا اور ہر وقت اس کی خدمت اور اطاعت میں لگا رہتا تھا۔ بس ایک بات تھی کہ ماں کے کلیجے کو ہر وقت برمائی رہتی تھی۔ بیٹے کے چہرے پر نہ تو جوانی کی چمک آتی تھی اور نہ اس کے کاموں سے کوئی پھرتی، تیزی ٹپکتی۔ زردی نے اس کے چہرے پر گھر بنا لیا تھا اور قہقہے ہنسی سے تو گویا اس سے جنموں جنموں کا بیر تھا۔ کبھی کبھی وہ مسکراتا ضرور تھا، مگر جب بھی اس کے پپڑائے ہونٹ ایسی مسکراہٹ کے لئے کھلتے تو یہ نہ جان پڑتا کہ کلی پھول بن رہی ہے، بلکہ یہ معلوم ہوتا کہ گہرے گھاؤ کے منہ سے سوکھی پیپ صاف کی جارہی ہے۔ ایسی مسکراہٹوں پر ماں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکل پڑتے۔

بیوہ ماں نے سوچا۔ لاؤ اس کا بیاہ کردوں، اپنی عورت آجانے سے شاید اس کا دل کھل اُٹھے۔ یہ ہر وقت کا مرجھانا، کمھلانا شاید چلا جائے۔ وہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی اُٹھی اور ذات برادری میں ہر جگہ اپنے بیٹے کے لئے دلھن مانگتی پھری۔ اسی ملک میں جہاں بیٹی والے روپئے دے کر، بڑے بڑے جہیز دے کر لڑکیوں کے لئے بر حاصل کرتے ہیں، وہ جہاں جاتی لوگ اس کے لڑکے کا نام سنتے ہی کان پر ہاتھ دھرتے۔ "نا بی بی، جیتی جی مکھی کون نگلے گا۔ سب کو معلوم ہے کہ تمہارا بیٹا بے روح کا ڈھانچہ ہے۔ ایسے میں کون جان بوجھ کر اپنی جائی کو بھاڑ میں جھونکے گا!"

جب ہر جگہ سے ٹکا سا جواب ملا تو وہ انسانوں کی دنیا سے نکل کر دیوتاؤں

کی دنیا میں اپنی فریاد لے کر چلی - اس نے پورے چالیس دن سورج دیوتا کو پانی چڑھایا - پھر گڑگڑا کر دعا کی :-

"اے سورج دیوتا، تیری روشنی، گورا ہو کہ کالا، اچھوت ہو کہ برہمن، محل ہو کہ جھونپڑی، پھلواری ہو کہ کوڑا گھر، ہر ایک پر یکساں طور پر پڑتی ہے، مجھ دکھیاری بیوہ کی بھی سُن لے! میرے بیٹے کو ایک روح دے دے -"

سورج کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا - اس نے بیوہ سے جھڑک کر کہا -

"کیا بکتی ہے بڑھیا، ہم اسی کو اُگلتے بڑھاتے ہیں جس میں خود سے بھیکنے اور آگے چلنے کی ہمت ہو - تیرا لڑکا تو اتنا بزدل ہے کہ اس کے دل میں مجھ سے آنکھ لڑانے کا خیال تک نہ آیا -" اور اس نے بادلوں کی نقاب اپنے چہرے پر ڈال لی -

ماں بے چاری اب چاند کے درشن کے لئے دوڑی - چودھویں کی چاندنی میں وہ ندی کے پانی میں گردن تک ڈوب کر کھڑی ہو گئی اور اس نے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کی - "اے چندرما دیوتا، تم تو استریوں پہ خاص طور پر مہربان رہتے ہو، تم ہی اس کرمجلی پہ دیا کرو اور میرے بیٹے کے لئے ایک روح دے دو!"

چاند ہنسا "ارے بڑھیا پاگل ہو گئی ہے ؟ تو روح کس کے لئے مانگتی ہے - تیرے بیٹے نے تو بچپنے میں بھی ہمیں توڑنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا - ایسے کم ہمت کے لئے میرے پاس کوئی روح نہیں ہے !" اور وہ راہُل کے منہ میں چھپ کر بیٹھ رہا -

وہ پہاڑوں کے پاس گئی - چلتے چلتے جو پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے، وہ نوکیلے پتھروں سے چھل گئے، ہموار چٹانوں پر اس کے خون سے بھرے تلوے پھول بوٹے بنانے لگے تھے مگر وہ لاٹھی ٹیکتی کراہتی اوپر چڑھتی ہی چلی گئی - ایک اونچی چوٹی پر پہنچ کر اس نے فریاد کی - "اے پہاڑو، تم میں سے بہتیروں کی چوٹیوں پر دیوی دیوتا بستے ہیں - تم اتنے مضبوط ہو کہ ان اتنی بڑی بڑی طاقتوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہو، تم ہی میرے بیٹے کے لئے ایک روح دے دو!"

پہاڑوں میں ایک گرج ہوئی - انھوں نے لفظوں کی صورت اختیار کی جیسے کوئی کہہ رہا ہے "کیا بکتی ہے بڑھیا! تیرے بیٹے میں ہمیں کاٹ کر نہر نکالنے کا حوصلہ نہیں، ہماری چوٹیوں پر چڑھ جانے کی ہمت نہیں - وہ اتنا کمزور ہے کہ اگر ہماری فضا میں پلی ہوئی روح اس کے جسم میں ڈال دی جائے تو وہ نازک شیشے کی بوتل کی طرح ٹوٹ کر چور چور ہو جائے گا !" اور اس کی ایک سِل اس طرح ٹوٹ کر گری کہ اگر بیوہ ماں جلدی سے دور نہ بھاگ گئی ہوتی تو وہ پس کر چٹنی ہی ہو گئی ہوتی -

وہ مضبوط، تناور، چھتنار درختوں کے پاس گئی - اس نے ان سے لجاجت سے کہا :

"تم ہرے بھرے رہو! اپنے پھلوں، پھولوں کا صدقہ میرے بچّے کے لئے مجھے ایک روح دے دو!"

ان کی پتیاں ہوا سے سرسرائیں اور ان سے آواز پیدا ہوئی "تیرے بیٹے نے ہم پر چڑھ کر نہ تو کبھی چڑیوں کے گھونسلے اور انڈے بچے تلاش کئے اور نہ ہماری پھنگیوں سے کبھی کوئی پھل توڑا - ایسے کم ہمت کے لئے ہمارے پاس کوئی روح نہیں ہے" اور ایک شاخ اس طرح چرچرائی کہ محسوس ہوا کہ اس کے سر پر آ رہی ہے گی - وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھی بھاگی -

وہ اب بالکل مایوس ہو چکی تھی - اس کو یقین آ گیا تھا، اس بیچارے اس کے بچے پر رحم کرنے والا کوئی اس دنیا میں نہیں - بس ایک دریا رہ گیا تھا - وہ اس کے کنارے بھی حجت تمام کرنے کے لئے پہنچی -

پہلے تو اس نے اس میں ڈبکیاں لگا لگا کر اشنان کیا، کپڑے دھوئے، نچوڑے، پھر وہ کمر تک پانی میں جا کر ہاتھ جوڑ کر بولی "اے ماں! اے دیوی! تو اپنے کناروں پر ہر آنے والے کی پیاس بجھاتی ہے ہر ایک کو سیراب کرتی ہے تو ہی اس پیاسی کو بھی اپنی دیا کی ایک بوند دے دے! میرے لڑکے میں روح ڈال دے!"

دریا غرّایا، موجوں نے پیچ و تاب کھایا، کنارے کی لہروں کے منہ میں کف آ گیا - انھوں نے بیوہ ماں پر تھوک کر کہا "تو ہم سے اپنے ڈرپوک بچے کے لئے روح مانگتی ہے - ہمارا سینہ موتیوں سے بھرا پڑا ہے - اس سے آج تک یہ نہ ہو سکا کہ وہ ہم میں غوطہ لگا کر ایک موتی بھی ان میں سے نکال لے جاتا !" اور ایک بڑا سا موجہ آیا، بوڑھی ماں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ دھارے کے ساتھ تنکے کی طرح بہنے لگی -

وہ اسی طرح ڈوبتی، اُبھرتی بے سدھ ہی چلی جا رہی تھی کہ اچانک کنارے کے سوار میں اُلجھی - اس نے پانی سے سر نکال کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ بیچ دریا میں ایک چٹان ہے - اس پر ایک پری بیٹھی ہے - ایک گال سورج، ایک چاند، لٹیں چھٹک کر اس طرح پھیلی ہیں کہ دونوں کنارو

پر سوار کی صورت اختیار کر لی ہے - ہاتھ میں ایک بانسری ہے جسے اس طرح بجا رہی ہے کہ چرند و پرند سب اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں اور کناروں پر اُگے ہوئے درخت بھی تھر کتے "جھومتے" محسوس ہوتے ہیں -

بوڑھی ماں ڈوبنے کو بھی نہ ڈری - وہ پھلانگتی چھلانگتی، غوطے کھاتی، پانی پیتی چٹان پر پہنچ گئی - اس نے پری کے صندلی پاؤں آنکھوں سے لگا کر کہا

" دیوی ! دیوی !! بس اب ایک اکیلے تم سے آسرا رہ گیا ہے ! مجھ پر رحم کھاؤ اور مجھے میرے بیٹے کے لئے ایک رُوح دے دو -"

پری کھل کھلا کر ہنسی معلوم ہُوا موتی کی لڑیاں پانی میں گر رہی ہیں - وہ بیوہ کے جھکے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی :

"بس اتنی سی بات کے لئے تو جہاں بھر میں ماری ماری پھرتی ہے ؟ جا، اپنے جوان بیٹے کو میرے پاس لے آ - میں دیکھوں تو اس نے اپنے آپ کو کیسا بنایا ہے - گھبرا نہیں، میں اسے اب اپنی روح دے دوں گی -"

ماں نے خوشی کے آنسو بہا کر پوچھا " دیوی، آپ کا نام کیا ہے ؟"

وہ بولی " مجھے خوشی کی دیوی کہتے ہیں -" اور وہ اس طرح مسکرا دی کہ سارے میں اُجالا سا پھیل گیا - ہر چیز جگمگ جگمگ کرنے لگی -

ماں نے دیوی کے پاؤں چومے اور خوش خوش گھر پلٹی - جو پیر پہلے من بھر کے تھے، اب اُن میں پر لگ گئے تھے - وہ دوڑتی، تیز تیز قدم رکھتی، ہانپتی، خوشی سے متوالی جب گھر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا جوان بیٹا گھٹنوں میں سر رکھے خاموش بیٹھا ہے - بڑھیا نے اسے بازو سے پکڑ کے جھنجھوڑا :

"لے جلدی سے اُٹھو، نہاؤ، دھوؤ، خوشی کی دیوی کے پاس چلو، وہ تمہیں اپنی روح تک دینے کے لئے تیار ہیں -"

بیٹے نے ماں کی طرف آنکھ اُٹھائی - سفید سفید دیدے دکھائی دیئے - ماں گھبرا کر پیچھے کھسک گئی -

"ارے کیا ہُوا میرے لعل ! تم بولتے کیوں نہیں ؟" وہ چیخی -

لڑکے نے سسک کر کہا " میں خوشی کی دیوی کے پاس جا کر کیا کروں گا ماں ! بڑھتی کی فکر نے تو میری آنکھیں تک لے لیں، اور اب تو میں تمہارا درشن بھی نہیں کر سکتا۔"

اور اس نے ماں کے پاؤں ٹٹولنے کے لئے ہاتھ بڑھائے - بڑھیا نے ایک دل دوز آہ کی، اس کا کلیجہ پھٹ گیا اور وہ زمین پر گر کر مر گئی -

--- اور "خوشی کی دیوی" اس بے رُوح فکر مند جوان کا آج تک انتظار کر رہی ہے !

فلاح و بہبود کے پروگرام کے لئے عملہ

بہبود کے توسیعی پروجیکٹوں میں بہبود کی کارکنوں کی حیثیت سے روزگار پر لگانے کے لئے مختلف تربیتی اداروں میں ۴۰۱۱ خواتین زیر تربیت ہیں - ان میں سے ۱۰۶۰ کو گرام سیوکاؤں کی حیثیت سے، ۷۹ کو مکھیہ سیوکاؤں کی حیثیت سے، ۲۶ خواتین کو مڈوائفوں کی حیثیت سے ۱۰۶۱ کو دایہ کی حیثیت سے، ۲۱۱ کو بطور امبر چرخہ انسٹرکٹر اور ۶۲۳ کو دستکاری کی اُستانیوں کی حیثیت سے تربیت دی جا رہی ہے - اس تربیت کا مقصد یہ ہے کہ مرکزی سماجی بہبود کے بورڈ کی طرف سے عورتوں کے لئے بہبود کے پروگراموں مثلاً مابعد نگرانی اور سماجی و اخلاقی سدھار کے پروگرام کے تحت چلائے گئے گھروں سے وابستہ پیداواری مراکز وغیرہ میں ان عورتوں کو کام پر لگایا جا سکے -

اس کے علاوہ جلد ہی ۱۶۰ عورتوں کو گرام سیوکاؤں نیز ۳۰ عورتوں کو مکھیہ سیوکاؤں کی تربیت دی جائے گی -

اس وقت اس تربیتی پروگرام کے تحت ۳۶۰۶ عورتوں کو تربیت دی جا چکی ہے - ان تربیت یافتہ عورتوں میں سے ۲۹۵۳ مکھیہ سیوکائیں، ۲۳۵ مڈوائفیں، ۵ دایہ، ۱۹۳ امبر چرخہ انسٹرکٹر اور ۷۴ دستکاری کی اُستانیاں ہیں -

شاد عارفی

غزل

حیرتِ جلوۂ محبوب بتاؤں ڈر رہا تھا کہ کہیں جاگ نہ جاؤں

راستیٔ قدِ خوباں پہ نہ جاؤں فائدہ مند نہیں سرو کی چھاؤں

شکوۂ حالِ پریشاں پہ کہا اس کا مطلب ہے کہ زلفیں نہ بناؤں

آپ ہی مجھ سے کھنچے رہتے ہیں میں تو کانٹوں سے بھی دامن نہ بچاؤں

قدرِ گل ہائے چمن ہے اُس سے ق کیوں میں گلچیں کو نہ سینے سے لگاؤں

اہلِ گلشن بھی پرائے تو نہیں اہلِ گلشن سے یہ ہر طور نبھاؤں

آپ کے دل کو اذیّت ہوگی میں اگر آپ کی باتوں میں نہ آؤں

شعر اشکوں میں ڈھلے ہیں کیا کیا جب یہ چاہا کہ اُسے حال سناؤں

حد کا جب کوئی تعیّن ہی نہیں غیر ممکن، قدم آگے نہ بڑھاؤں

اپنے ماحول کا نقشہ لے شادؔ

زندگی اپنی بگاڑوں تو بناؤں

کنہیالال کپور

ترقی پسند غالب

پہلا منظر

[باغِ بہشت میں مرزا غالب کا محل - مرزا دیوان خانہ میں مسند پر بیٹھے ایک پری زاد کو کچھ لکھوا رہے ہیں - ساغر و مینا کا شغل بھی جاری ہے - ایک حورِ ساقی کے فرائض انجام دے رہی ہے -]

(منشی ہرگوپال تفتہ داخل ہوتے ہیں)

تفتہ - آداب عرض پیر و مرشد - یہ آج پری زاد سے کس قسم کا انتقام لیا جا رہا ہے کہ اسے اچھا خاصہ کاتب بنا دیا -

غالب - آؤ آؤ مرزا تفتہ - بہت دنوں کے بعد آئے ہو - بھئی بیٹھو - کچھ اپنی کہو، ہماری سنو -

تفتہ - لیکن بندہ نواز یہ سلسلہ کیا ہے ؟ کیا کوئی تازہ غزل لکھوائی جا رہی ہے ؟

غالب - جنت اور تازہ کلام ! میاں جہاں دودھ اور شراب کی نہریں ہوں - حوریں اور پری زاد زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہر وقت چشم براہ اور گوش بر آواز ہوں وہاں احساسِ نا امیدی کہاں - اور اس کی عدم موجودگی میں سازِ غزل سے کوئی نغمہ اُبھرے یا پھوٹے یہ کس طرح ممکن ہے - واللہ کیا دن تھے وہ بھی جب شراب کے ایک جرعے کو ترستے تھے - قرض کی مے پینے میں کتنا مزا تھا - جب . . . . .

تفتہ - قطع کلام معاف مرزا صاحب، کل ریاض خیرآبادی سے اس موضوع پر ایک شعر سنا بخدا لطف آ گیا -

غالب - ارشاد

تفتہ - اپنی یہ وضع اور یہ دشنام مے فروش سن کے جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

غالب - سبحان اللہ کیا تیور ہیں شعر کے - خدا خوش رکھے ریاض کو، خمریات میں بڑا نام پیدا کیا ہے - لیکن رہا مولوی ہی ساری عمر - ظالم نے جنت میں آ کر بھی نہیں چکھی -

تفتہ - باتوں باتوں میں میرا سوال تو آپ فراموش ہی کر گئے - میں نے عرض کیا تھا - پری زاد سے کیا لکھوایا جا رہا ہے -

غالب - کوئی نئی چیز نہیں یونہیں اپنی چند غزلوں کو بنانے کے لئے بیٹھ گیا - سوچا - بیکار مباش -

تفتہ - گستاخی معاف حضور - لیکن ان غزلوں میں اصلاح کی گنجائش کہاں ہے سونے پر سہاگا کرنے کی ٹھانی ہے کیا ؟

غالب - گنجائش اس طرح نکل آئی کہ ان میں رجعت پسندی کے کافی عناصر ہیں انھیں ترقی پسند سانچے میں ڈھال رہا ہوں -

تفتہ - خوب، خوب ! تو جنت میں آنے کے بعد آپ کو ترقی پسند بننے کا شوق ہوا ہے - خدارا اپنے پہ نہیں، تو اپنے عزیزوں پر رحم کیا ہوتا -

غالب - بھئی بات تو تم ٹھیک کہتے ہو - لیکن ہوا کے رُخ کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے

تفتہ (طنزاً) ~ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب اور ہم اگر جواب میں کہیں ~ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

تفتہ - حضور! خدا کے لئے بیان میں مزید وسعت پیدا کرنے سے احتراز فرمایئے - بے چارے نقاد پہلے ہی کافی پریشان ہیں - اگر اصلاح شدہ کلام کی شرح لکھنا پڑی تو خیر و عافیت معلوم ہو جائے گی -

غالب - میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کلام دار البقا میں رہے گا -

تفتہ ۔ تو اس سے آپ کا مطلب تو حل ہو گا نہیں دارالمکافات کے نقّاد آپ کا شمار ترقّی پسند شعراء میں کرنے سے تو رہے ۔

غالب ؂ دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ۔

تفتہ ۔ بجا ارشاد ہوا قبلہ ! ایک سوال بڑی دیر سے میرے ذہن میں چٹکیاں لے رہا ہے ۔ اجازت ہو تو عرض کروں ۔

غالب ۔ بلا تأمّل کہیئے ۔

تفتہ ۔ جنّت کی حقیقت تو آپ کو معلوم ہو گئی ۔ کبھی جنّت میں دِلّی کی بھی یاد آئی ۔ خاص کر محلہ بلّیماراں کی ؟

غالب ۔ محلہ بلّیماراں ! آہ مرزا تفتہ ۔ یہ تم نے کس کی یاد دلادی ؂
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے ۔ خدا گواہ ہے وہاں سے آئے ہوئے نوّے برس ہونے کو آئے لیکن محلہ بلّیماراں کا نقشہ دن رات میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے ۔

تفتہ ۔ تو کیوں نہ ایک آدھ دن کے لئے دِلّی کی سیر کی جائے ۔ یہاں رہتے رہتے بھی تو طبیعت اُوب گئی ہے ۔ نہ مشاعرے نہ مجلسیں ، نہ نوک جھونک نہ لطیفہ بازی ۔ بس ہر طرف شہد اور دودھ کی نہریں ۔ اور ان پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں ۔

غالب ۔ لیکن وہاں جائیں تو کیسے ، نہ تقریب نہ دعوت نامہ ، اور پھر دِلّی میں ہمیں کون پوچھے کون سمجھے گا ۔

تفتہ ۔ یہ بات تو نہیں جناب ، دِلّی کیا سارے ہندوستان میں آپ کے لاکھوں پرستار موجود ہیں ۔ ابھی چند دن ہوئے پنڈت ہری چند اختر وہاں سے تشریف لائے ہیں ۔ انھوں نے وہ وہ قصے سنائے کہ طبیعت مچل مچل گئی ۔

غالب ۔ اچھا ، کچھ ہم بھی سنیں ، کیا کہا انھوں نے ؟

تفتہ ۔ دِلّی میں آپ کا شاندار مزار تعمیر کیا گیا ہے ۔ ایک فلم آپ کی زندگی پر بنائی گئی ہے اور آپ کا دیوان ، دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے ۔

غالب ۔ جزاک اللہ ، اور یہ اُس غالب کی عزّت افزائی کی گئی جسے ساری عمر یہ شکایت رہی ؂ ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

تفتہ ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپ کی وفاتِ حسرت آیات کے منتظر تھے جونہیں آپ اللہ کو پیارے ہوئے قدر افزائی کے ڈونگرے برسنے لگے ۔

غالب ۔ یہ بات تھی تو ہمیں ہلکا سا اشارہ کر دیا ہوتا ۔ ہم برسوں پہلے سفرِ آخرت کر لیتے ۔

تفتہ ۔ تو فرمایئے ۔ دِلّی چلئے گا ۔ اختر صاحب کی زبانی پتہ چلا کہ لال قلعہ میں عظیم الشان مشاعرہ ہو رہا ہے ۔

غالب ۔ لال قلعہ ! مشاعرہ !! یہ تو گویا دو آتشہ ہے ، بھئی ضرور چلیں گے ۔

(دوسرا منظر)

[لال قلعہ دِلّی کے دیوانِ عام میں غالب کی یاد میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے ۔ شعراء اسٹیج پر جلوہ افروز ہیں ۔ سامعین بے تابی سے کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں ۔ اسٹیج سیکرٹری مائیک کے سامنے آتا ہے ۔]

اسٹیج سیکرٹری ۔ صاحبِ صدر ، خواتین و حضرات ! یہ مشاعرہ اقلیمِ سخن کے اُس شہنشاہ کی یاد میں منعقد کیا گیا ہے جسے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نامِ نامی سے یاد کیا جاتا ہے ۔ جو اسی لال قلعہ کی محفلوں میں بارہا غزل سرا ہُوا اور جس کے کلام نے عوام کے علاوہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کو محظوظ و مسحور کیا ۔ کاش وہ آج ہمارے درمیان موجود ہوتا اور اپنی غزل سرائی سے ہمارے دلوں کو گرماتا ۔

ایک آواز ۔ حضرت ، آپ نے مجھے یاد فرمایا ۔ میں تو آپ کے درمیان موجود ہوں ۔

(سامعین میں ہلچل سی مچ جاتی ہے سب پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں)

ایک اور آواز ۔ میں ہرگوپال تفتہ بڑی مسرّت سے آپ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہ نفسِ نفیس اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں ۔

[مرزا غالب اور منشی ہرگوپال تفتہ اسٹیج کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ سامعین کھڑے ہو کر آداب بجا لاتے ہیں ۔ صاحبِ صدر اور اسٹیج سیکرٹری مرزا اور تفتہ کے حق میں دست بردار

ہو جاتے ہیں]

غالب (کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے کے بعد) بھئی تفتہ! شمع بردار کہاں ہے۔ اس سے کہو کہ شمع کسی ترقی پسند شاعر کے سامنے لائے۔

ایک شاعر۔ گستاخی معاف مرزا۔ ہمارے مشاعروں میں شمع بردار نہیں ہوتا ہم بجلی کے لیمپ کی روشنی میں مائیک کے سامنے اپنا کلام پڑھتے ہیں۔

غالب۔ تو پھر شروع کیجئے۔ یہ دونوں چیزیں تو موجود ہیں۔

مصائب دہلوی۔ غزل سماعت فرمائیے۔

غالب۔ بھئی کوئی ترقی پسند نظم سنائیے۔ آخر ہم جنت سے غزل سننے کے لئے تو نہیں آئے۔

مصائب دہلوی ۔ معاف کیجئے مرزا۔ نظم سے تو میں تائب ہو چکا ہوں۔

غالب۔ ہائیں۔ نظم سے توبہ کرلی۔ آخر کیوں؟

مصائب دہلوی۔ وجہ بیان کئے دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے۔

غزل سے بدکنا
غزل سے بھڑکنا
مرا ایک معمول سا ہو گیا تھا
میں لکھتا تھا نظمیں
جنھیں اہلِ محفل
بجھارت پہیلی معمّا سمجھتے
سمجھتے نہ کچھ بھی بس اتنا سمجھتے
مگر میں نے دیکھا
کہ نظموں میں میری
نہیں مغز کوئی
یہ نظمیں کیا، محض تھی جعل سازی
کہ پڑھ کے انھیں شہر کا کوئی قاضی
پکارے "الٰہی یہ کیا بک رہا ہے
کہ لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے"
میں جب بھی کوئی نظم
محفل میں پڑھتا
تو دانتوں تلے انگلیاں
داب کر سب
کنکھیوں سے یوں دیکھتے میری جانب
کہ جیسے ہو احساسِ رحم ان میں پیدا
کسی نیم پاگل کسی سر پھرے پہ!
بالآخر یہ سوچا
کہ حد مسخرہ پن کی ہوتی ہے کوئی
چناں چہ غزل کی طرف لوٹ آیا
بچایا مجھے شکر تیرا خدایا

غالب۔ خوب، بہت خوب۔ تو گویا شام کا بھولا صبح کو گھر لوٹ آیا۔ لیکن صاحب ہم غزل نہیں سنیں گے۔

مصائب دہلوی۔ اگر آپ نظم ہی سماعت فرمانا چاہتے ہیں تو پھر حضرت جدّت لکھنوی سے کہیئے کیوں کہ وہ ترقی پسندوں کے سالار ہیں۔

غالب۔ جدّت لکھنوی اسٹیج پر تشریف لائیں۔

جدّت لکھنوی۔ مرزا صاحب! مصائب دہلوی نے تو صرف نظم سے توبہ کی ہے میں نے شاعری سے توبہ کرلی ہے۔

غالب۔ تعجب، آخر اس انقلاب کی وجہ؟

جدّت لکھنوی۔ اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو وجہ بھی ظاہر کئے دیتا ہوں۔

غزل سے مجھے اس لئے دشمنی تھی
کہ آساں نہیں ہے غزل اچھی کہنا
بڑا مارنا پڑتا ہے اس میں تپّا
بڑی دور کی لانا پڑتی ہے کوڑی
جو سچ پوچھئے ایک نشتر غزل کا
ہے سو لاکھ بے کیف نظموں پہ بھاری
مگر چاہتی ہے غزل وہ ریاضت
کہ جس کے تصوّر سے لرزہ ہو طاری
چنانچہ بڑے چھوٹے مصرعے ملاکر[۵]
میں لکھتا رہا ایسی مہمل سی نظمیں
کہ پڑھ کے جنھیں آئے قاری کو غصّہ

---

[۵] یہ کہنا جدّت صاحب کی جدّت ہے

پڑھی نظم دلّی کی مجلس میں میں نے
تو مرزا دور نے ایک یوں مجھ کو ٹوکا
"ابے دیکھ تو تو یہ کیا کر رہا ہے۔
نہیں آتا لکھنا تو کیوں مر رہا ہے"
اسی دن سے کی میں نے نظموں سے توبہ
کہ مشکل بہت شاعری کا ہے شعبہ
چنانچہ میں خاموش ہوں چھ برس سے
فقط اللہ ہو اللہ ہو کر رہا ہوں

غالب۔ آپ کی معذرت بجا۔ لیکن اگر آپ بھی رضامند نہیں تو پھر نظم پڑھنے کے لئے کس سے کہا جائے؟

جدّت لکھنوی۔ بسولہ حیدرآبادی جو ہیں۔

غالب۔ بسولہ حیدرآبادی تشریف لائیں۔

بسولہ حیدرآبادی۔ مرزا صاحب۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کو غزل یا نظم سناؤں گا تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ یہ شغل تو مدّت سے ترک کر رکھا ہے اگر چاہیں تو فضا میں ہتھوڑا یا درانتی لہرا کر دکھا سکتا ہوں۔

غالب۔ خدا نخواستہ۔ کہیں ہمارا سر پھوڑنے کا ارادہ تو نہیں۔

بسولہ حیدرآبادی۔ تسلّی فرمایئے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔

غالب۔ لیکن آپ نظم سنانے سے کیوں گریز فرما رہے ہیں؟

بسولہ حیدرآبادی۔ بات دراصل یہ ہے مرزا کہ شاعری ایک بے کار مشغلہ ہے۔ نیز جو بات ہتھوڑے میں ہے وہ قلم میں کہاں

غالب۔ معاف کیجئے۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بسولہ حیدرآبادی۔ مطلب ابھی واضح کئے دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے ؎

کبھی قلم ہاتھ میں تھا میرے
غزل بھی کہہ لیتا تھا میں خاصی
نہ جانے کیا میرے دل میں آئی
کہ توڑ ڈالا قلم کو ساتھی
پکڑ کے ہاتھوں میں اک ہتھوڑا
ادب کی تخلیق کر رہا ہوں
ہتھوڑے سے یعنی لکھ رہا ہوں
ادب برائے یہ ...[1] ہے
نہیں ادب یہ برائے دلّی
میں صاف اعلان کر رہا ہوں
کہ بن گئی ہے مرکھنی گائے
اٹھا جو کرتی تھی بھیگی بلّی
قسم مجھے گورکی کی ساتھی
ادب کو رہنے ادب نہ دوں گا
قسم مجھے ایلیا کی ساتھی
میں شاعری تو نہیں کروں گا
لگاؤں گا میں ادب میں نعرے
کہ آ رہا ہے نیا سویرا
کہ شاعری ختم ہو چکی ہے
درانتیاں گیت گا رہی ہیں

غالب۔ ع یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ کوئی شاعر نظم سنانے کو تیار نہیں (تفتہ سے) اچھا بھئی تفتہ مائیک پر اعلان کر دیجئے کہ اگر کوئی صاحب نظم سنانا چاہتے ہیں تو اسٹیج پر آ جائیں۔

تفتہ۔ ہاں صاحب۔ ہے یہاں کوئی نظم گو شاعر؟

شعراء۔ کوئی نہیں کوئی نہیں۔ ہم سب اب غزل گو ہو چکے ہیں۔

تفتہ (غالب سے) تو پیر و مرشد آپ ہی کچھ ارشاد فرمایئے۔

غالب۔ حضرات! ادھر چند دنوں سے دو ترقی پسند نظمیں کہی ہیں انہیں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

شعراء ارشاد قبلہ!

غالب۔ عرض کیا ہے ؎

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
کس کی حاجت روا کرے کوئی

شعراء۔ سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے۔

غالب۔ آداب عرض۔ شعر ہے ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

---

[1] ایک غیر ملکی شہر کا نام

اور ؎ بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

شعر ہے ؎ موت کا ایک دن معین ہے
اور درویش کی صدا کیا ہے

اور صاحب آخری شعر ہے ؎

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت کسی کا گلہ کرے کوئی

تفتہ ۔ جواب نہیں حضور اس ترقی پسندی کا، قبلہ اب دوسری نظم بھی عطا فرمایئے۔

غالب۔ دوسری نظم ابھی نامکمل ہے صرف تین شعر ہوئے ہیں

تفتہ۔ ارشاد

غالب ۔ عرض کیا ہے ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

شعراء ۔ واہ وا کیا بے نظیر شعر ہے

غالب ؎ اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تفتہ ۔ واللہ کہاں تان توڑی ہے قبلہ، کیا نازک خیالی ہے

غالب ۔ اور تیسرا شعر ہے ؎

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تفتہ ۔ مرحبا، یہ آپ کا ہی حصہ ہے مرزا صاحب، ندرتِ بیان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

غالب ۔ آداب عرض — تو حضرات اب مجلس برخاست کی جاتی ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کافر کے علاوہ سب کفار مسلمان ہو چکے ہیں یعنی غزل گوئی کی طرف لوٹ آئے ہیں اور خاکسار جب سے جنت آشیانی ہوا ہے۔ غزل کہنے یا سننے کی تاب نہیں لا سکتا (تفتہ سے) بھئی تفتہ مائیک پر اعلان کر دو کہ سامعین اور شعراء تشریف لے جا سکتے ہیں۔

تفتہ ۔ خواتین و حضرات! پیرومرشد کا ارشاد آپ نے سن ہی لیا۔ آپ آرام کیجئے۔ خاکسار اور مرزا بھی مزارِ غالب پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔ ہو سکا تو سیکنڈ شو میں فلم "مرزا نوشہ" بھی دیکھیں گے۔

الوداع

شب بخیر

ابتدائی اسکولوں میں سائنس کی تعلیم

ابتدائی اسکولوں میں سائنس کی تعلیم میں اصلاح و ترقی کی غرض سے مرکزی وزارتِ تعلیم کی طرف سے ایک آزمائشی پروجیکٹ جاری کرنے کی تجویز ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت استادوں کے لئے ماہرانہ رہنمائی کا انتظام کیا جائے گا۔

اس آزمائشی پروجیکٹ کا نام "سائنسی مشیر کی سروس" ہوگا اور پنجسالہ پلان کی باقی ماندہ مدت میں اس پروجیکٹ پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ ابتداء میں یہ پروجیکٹ ہر ریاست کے منتخبہ علاقوں میں رائج کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت ایک سائنسی مشیر کو ایک ایسے چھوٹے سے علاقے کا نگران بنا دیا جائے گا جس میں تقریباً ۱۰۰ ابتدائی اسکول ہوں گے اور اس کے سپرد یہ کام ہوگا کہ وہ اپنے علاقے کے اسکول میں سائنس پڑھانے کے طریقے میں عملی طور پر اصلاح و ترقی کرے۔ یہ اصلاح و ترقی نئے طریقوں اور تجربات، بحث و تحقیق، بہتر تکنیک کے مظاہرے، تعلیم کے وسائل اور مواد میں ترقی کے ذریعے کی جائے گی۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ابتدائی مرحلے پر سائنس کے ان مشیروں کا ایک "مرکزی سیمینار" منعقد کیا جائے گا تاکہ موضوع تک رسائی میں یکسانیت پیدا ہو۔

بلونت سنگھ

صابن کی ٹکیہ

شوبھا مجھ سے خفا تھی — اور میں بے حد پریشان تھا۔۔۔۔۔ اس کا خفا ہونا بھی جائز تھا اور میرا پریشان ہونا بھی برحق۔

بات دراصل یہ تھی۔۔۔۔۔ اب کیسے بتاؤں! آپ مرد کی فطرت یا کمزوری سے واقف تو ہیں ہی۔۔۔۔۔۔ وہی پرانا قصہ تھا، کہ محبت کا دعویٰ تھا شوبھا سے لیکن دیکھے گئے لتا کے ساتھ۔۔۔۔۔ بیچاری شوبھا خفا نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھے پیار شوبھا ہی سے تھا یوں کبھی کبھی لتا سے دوچار میٹھی 'بتیاں' بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ اسی لئے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔

چناں چہ ایک بہت لمبا چوڑا کچا چٹھا لکھ کر شوبھا کی خدمت میں روانہ کیا جس میں اپنی صفائی کے لئے نہ صرف ہر ممکن اور ناممکن دلیل سے کام لیا گیا بلکہ کان پکڑ کر ناک سے لکیریں نکالیں۔۔۔۔۔ صرف ایک ملاقات کے لئے درخواست کی گئی۔ یہ بھی لکھا کہ لتا کو تمہاری جوتی صاف کرنے کے قابل نہیں سمجھتا بے شک چاہو تو یہ چٹھی اُسے دکھا دو۔ اگر ہمارے تعلقات ہیں بھی تو لتا جل کر خود انھیں ختم کر دے گی۔

اس چٹھی کے جواب میں ملاقات والی درخواست ایک فقرے میں قبول کی گئی تھی۔

ملاقات کے لئے جگہ تھی پارک کے ایک خاص گوشے میں بوسیدہ بنچ۔ اٹھارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا یہ۔ پارک اس کی موسی کے مکان سے بہت دور تھا۔ وہ یہاں پڑھنے کے لئے آئی تھی اور موسی کے ہاں مقیم تھی۔

موسم سرما میں دن بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ساڑھے چھ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہوا تھا لیکن میں اس قدر پریشان تھا کہ وقت سے پون گھنٹہ پہلے پہونچ گیا۔ اس وقت بھی تاریکی نے پر پھیلا دیئے تھے۔ جلد پہنچنے میں ایک مصلحت بھی تھی وہ یہ کہ اپنی پسندیدہ بنچ پر پہلے ہی سے قبضہ جما لیا جائے۔

یوں تو اس طویل و عریض پارک میں بیسیوں بنچیں بچھی تھیں لیکن ہماری محبوب بنچ سب سے الگ تھلگ ایک گھنے پیڑ کے تلے بچھی تھی یا زمین میں گڑی تھی۔ دور سے دیکھا تو ایک بزرگ کو اپنی بنچ پر تشریف فرما پایا۔ انھیں دیکھ کر زیادہ کوفت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ابھی شوبھا کے آنے میں پون گھنٹہ باقی تھا اور مجھے اس بات کا بھی پختہ یقین تھا کہ یہ بزرگ اس قدر سردی میں زیادہ دیر تک بیٹھے نہ رہیں گے۔ چناں چہ میں ان کے پہلو میں جا بیٹھا۔ حضرت میری موجودگی سے کچھ ناخوش سے نظر آنے لگے۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر کھانستے بھی جا رہے تھے۔ غالباً برانکائٹس کے پرانے شکار تھے۔ میری باچھیں کھل گئیں۔ ایسے آدمی کے لئے ٹھنڈی نمدار ہوا قطعاً نقصان دہ تھی۔

میرا خیال درست نکلا۔ حضرت سات آٹھ منٹ بعد اُٹھنے کے لئے اپنی لاٹھی سے کشمکش کرنے لگے۔ میں نے ان کی کہنی کو سہارا دے کر اُٹھنے میں مدد دی تو کھرکھراتی آواز میں غرّا کر بولے "تھینک یو۔"

انھیں رخصت ہوتے دیکھ کر بڑی روحانی خوشی حاصل ہوئی۔ جب تنہا رہ گیا تو شوبھا کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہ آئے تو مجھے کیسی صورت بنانی چاہیئے۔ کیا کہنا چاہیئے اور کیا نہیں کہنا چاہیئے۔ یوں تو اس طویل چٹھی کے بعد کہنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا اور اس کے مجھ سے ملنے پر آمادہ ہو جانے کے بعد خفگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا یا کم از کم یہ سوال بہت حد تک حل ہو چکا تھا پھر بھی معاملہ نازک تھا۔۔۔۔۔ ہاں اگر وہ آتے ہی مسکرا دے۔ یا

میری کسی حرکت یا بات پر اس کی بتیسی نکل پڑے تو پو بارے۔ بہرحال
عقلمندوں کا کہنا ہے کہ ہر کام میں تصویر کے تاریک پہلو پر نگاہ رکھنی چاہیئے
اس لئے میں نے کل تفصیلات کا جائزہ لیا اور اپنے آپ کو ہر حالت
کے لئے تیار کر لیا۔

پارک کی فضا بڑی بوجھل سی ہو رہی تھی۔ ایک تو یوں بھی یہ گوشہ
شور و غل سے دور تھا دوسرے شہر کا دھواں دب کر زمین کے سینہ سے
سینہ ملا کر رہ گیا تھا۔ البتہ اس گھٹن میں بھی دور بازار کی تیز روشنیاں
اور آسمان کے تارے دیکھ کر دماغ کو ہلکی سی فرحت محسوس ہو رہی تھی۔۔
۔۔۔۔۔ اسی کیفیت میں ملی جلی کیفیت غمِ جاناں کی بھی تھی غرضیکہ ان
سب جانی اور ان جانی کیفیتوں نے باہم دگر ہو کر عجیب کسک کی صورت
اختیار کر لی تھی۔

عین اُسی وقت ایک صاحب نپے تلے قدموں سے ادھر آتے دکھائی
دئے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ہماری بنچ پر ہی آ کر براجمان نہ ہو جائیں
لیکن وہ تو بیچ بیچ میری جانب بڑھے چلے آ رہے تھے۔ نوجوان اور خوش پوش
کندھے پر اوورکوٹ، ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ، شُو ضرورت سے زیادہ
چمکدار۔

میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ حضرت آئے اور دھماک سے میرے
پہلو میں بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی سگریٹ پرے پھینک دیا۔ حالانکہ سگریٹ آدھے سے
زیادہ باقی تھا۔ پھر بے اختیار 'اُف' کہہ کر نیا سگریٹ جلایا۔ دو تین کش لے کر پھر
'اُف' کہا اور سگریٹ پرے پھینک دیا۔ سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ہونٹ دانتوں تلے دبایا
پھر اُف کے بعد نیا سگریٹ نکالا لیکن نہ جانے کیا خیال آیا اُسے جلانے سے
پہلے سگریٹوں کا ڈبہ میری طرف بڑھایا "شوق فرماتے ہیں ؟"
نفری کیپسل کا ڈبہ تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ "شکریہ! میں نے
ابھی پیا ہے۔"
"خوب " اس نے جیسے بے خبری میں کہا۔ اپنا سگریٹ جلایا۔ دھواں
آسمان کی جانب چھوڑا اور ستاروں سے آنکھیں لڑاتے ہوئے بولے
"گڈ گاڈ! اب کیا ہوگا ؟"
اداکاری کے جوہر بھی دکھا رہے تھے اور اپنے آپ سے باتیں بھی کئے
جا رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے متوجہ کرنا چاہتے تھے لیکن میں متوجہ ہونے کے
موڈ میں قطعاً نہیں تھا۔ میں انھیں وہاں سے بھگا دینے کی فکر میں تھا۔
وہ بڑے بے چین بلکہ پریشان نظر آ رہے تھے یا پریشان دکھائی دینے
کی کوشش کر رہے تھے۔ دیکھنے میں خاصے معقول انسان دکھائی دیتے تھے۔
لیکن یہ ساری دنیا چھوڑ کر میرے پہلو میں آ بیٹھنے میں کیا مصلحت تھی ان کی؟
خیر میں چپ رہا۔ سوچا خود ہی بک جھک کر دفع ہو جائیں گے۔ لیکن کچھ دیر
کے بعد جب انھیں یقین ہو گیا کہ میں ان کی ذات سے دلچسپی کا اظہار کرنے
سے بے زار ہوں تو خود ہی بول اُٹھے "معاف کیجئے گا حضرت! آپ کے
روبرو اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ بے وقوف شخص بیٹھا ہے۔"
میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بے وقوفوں کی صحبت سے پہلے ہی تنگ آ چکا
ہوں لیکن میں چپ رہا۔
بھلا وہ کب پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ "جانتے ہیں آج میری کیسی
گت بنی ہے ؟"
وہ یہ سوال میری ناک سے ناک بھڑا کر کر رہے تھے۔ اب جاؤں تو کہاں
جاؤں۔ مجبور ہو کر سر ہلا دیا۔
انھوں نے بار بار مصنوعی پسینہ پونچھتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا:
"حضرت! غضب ہو گیا۔۔۔۔ لیکن یہ حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا
تھا۔۔۔ یعنی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی پھر بھی مصیبت تو مصیبت
ہی ہے۔۔۔۔"
میں نے از حد بے کیف لہجے میں پوچھا "آپ تو اچھے بھلے دکھائی دے
رہے ہیں آخر کیا مصیبت ہے ؟"
"اجی مصیبت سی مصیبت ہے۔۔۔۔ لیجئے کلیجہ تھام کر بیٹھئے۔"
کلیجہ تو میں نے پہلے ہی تھام رکھا تھا۔
"ہوا یہ کہ میں آج ہی گاڑی سے اُترا ہوں۔۔۔۔"
"کہاں سے آ رہے ہیں آپ ؟"
"کلکتے سے۔۔۔۔۔"
"بہتر۔ آگے بڑھئے"
"اسٹیشن پر ایک ہوٹل کا گائیڈ ملا۔ اس نے ہوٹل کا کارڈ دکھایا۔ میں اس
کے ساتھ ہو لیا۔ ہوٹل پہونچ کر میں نے سامان کمرے میں رکھا اور چند ضروری
چیزیں خریدنے کے لئے بازار چلا آیا۔"

" تو کیا جیب کٹ گئی ؟"

" نہیں، صاحب! آپ سنیئے تو .... بازاروں میں گھومتا پھرتا ادھر نکل آیا۔ پہلے میں نے صابن کی ٹکیہ خریدی۔ اس کے دام دے دیے تو پتہ چلا کہ میری جیب میں چند آنے بچے ہیں دوسری چیزیں خریدنے کے لئے دام نہیں۔"

" تو کیا آپ گھر سے روپیہ لے کر نہیں چلے تھے ؟"

" کیوں نہیں۔ روپے کی ہمارے یہاں کمی نہیں ہے ... بات یہ ہوئی کہ سارا روپیہ میرے سوٹ کیس میں پڑا تھا ...... اور سوٹ کیس ہوٹل کے کمرے میں ......"

" خوب تو آپ ہوٹل جا کر روپیہ لا سکتے تھے اس میں پریشانی کی کیا بات تھی ؟"

" جی صاحب یہی خیال میرے دل میں بھی آیا لیکن اب میری حماقت ملاحظہ ہو، میرے ذہن سے ہوٹل کا نام غائب تھا اور اب بھی غائب ہے ..... اس شہر میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔ نہ شہر سے واقف نہ کسی سے جان پہچان ....."

مجھے ان کی یہ اٹکل پچو کہانی سُن کر ہنسی آ گئی۔ وہ بولے :

" خوب ہنسیئے پردیسی کی پریشانی پر ...."

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا " نہیں دراصل میں آپ کا مذاق نہیں اڑانا چاہتا، لیکن آپ کا قصہ ہی ایسا ہے کہ یقین نہیں آتا۔"

" یہ تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کو اس حادثے کا یقین ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ ہی پر کیا موقوف ہے کوئی بھی معقول آدمی مجھ ایسی حرکت کرنے والے کو پرلے درجے کا احمق سمجھے گا۔"

" نہیں نہیں آپ تو ناحق اپنے آپ کو گالیاں دینے پر اُتر آئے۔ ایسا مت کیجئے ...."

" شکریہ مجھے ایسے ہی حسن پُرسش کی ہی تلاش تھی۔"

یہ سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

" اب میری مصیبت یہ ہے کہ سامان پاس نہیں، ہوٹل کا نام یاد نہیں جیب میں دام نہیں ..... بتائیے میں پردیس میں رات کہاں کاٹوں ؟"

وہ میرے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن میں کیا جواب دیتا، اس پر انھوں نے بمنت تمام کہا۔ " دیکھئے آپ میرے لئے اجنبی ہیں میں آپ کے لئے۔ مگر آپ نے دُنیا دیکھی ہے اس لئے بڑے بھلے آدمی میں تمیز بھی کر سکتے ہیں ...... مجھے آپ پندرہ روپے دے دیجئے، میری آج کی رات کٹ جائے کل دن بھر میں یہاں ہر ہوٹل میں گھوم کر پتہ لگاؤں گا اور آپ کے روپے واپس کر دوں گا۔ آپ اپنا پتہ مجھے لکھا دیجئے۔ ہو سکتا ہے مجھے آج ہی ہوٹل کا پتہ لگ جائے ...... لیکن سوال یہ ہے کہ آج پتہ نہ لگا تو رات کہاں کاٹوں گا ... کھانا کیسے کھاؤں گا ؟"

مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا اس لئے روپیہ دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا دراصل ان کی اداکاری کچھ حد سے زیادہ بڑھی چڑھی نظر آتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے وہ اوّل درجے کے دھوکے باز دکھائی دے رہے تھے۔

وہ مجسّم سوال بنے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیسے مجھے ایک بات سوجھی۔ میں نے کہا " اگر آپ سچے ہیں تو صابن کی وہ ٹکیہ ہی دکھا دیجئے جو آپ نے ابھی ابھی خریدی تھی۔"

اس پر انھوں نے پھر اداکاری دکھاتے ہوئے جیبوں پر ہاتھ مارا۔ پھر اوورکوٹ (جو اُن کے گھٹنوں پر رکھا تھا) کی جیبیں ٹٹولیں۔ لیکن حضرت کی صورت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ بڑے جھینپے۔ فوراً کپڑے جھاڑ کر جدھر سے آئے تھے ادھر کو چلے گئے۔

میں نے سوچا حضرت مجھے بے وقوف بنانے آئے تھے خود ہی احمق بن گئے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو، اپنی ذہانت کو اور اپنی حاضر دماغی کو داد دی۔

اب پھر بنچ خالی تھی۔ میں نے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور دُور بازار میں گھستے ان حضرت کو دیکھتے ہوئے ماچس کی ڈبیا کے لئے بنچ پر ہاتھ پھیرا۔ دھیان دوسری طرف ہونے کی وجہ سے ڈبیا نیچے جا گری۔ میں جھک کر اُٹھانے لگا تو معاً پاس ہی ایک چھوٹا سا بنڈل دکھائی دیا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھایا تو پتہ چلا کہ باقاعدہ پیک کی ہوئی صابن کی ٹکیہ ہے۔

ٹکیہ میرے ہاتھ میں تھی اور میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی شوبھا کے آنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ یوں بھی اگر وہ مجھے وہاں نہ پاتی تو انتظار کرتی۔ لیکن میں یہ سوچ کر دوڑ پڑا کہ وقتِ مقرّر سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔

بازار میں گھس کر میں دائیں بائیں دیکھتا چلا گیا۔ لیکن اس شخص کا

کہیں پتہ نہ تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد میں مایوس ہو کر لوٹنے ہی کو تھا کہ اچانک وہی حضرت دکھائی دیئے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ کھسکنے کو ہی تھے کہ میں نے جا دبوچا اور لجاجت آمیز لہجے میں کہا "بھائی صاحب! غلطی معاف کیجئے۔ آپ کی صابن کی ٹکیہ بنچ کے نیچے گری پڑی تھی۔ یہ لیجئے میں نے ناحق آپ کو شرمندہ کیا۔ واقعی زیادہ چالاکی بھی اچھی چیز نہیں۔ مجھے سچ مچ بہت عمدہ سبق ملا ہے آج۔ یہ لیجئے پندرہ روپے۔ یہ رہا میرا کارڈ مع پتے کے۔ چاہیں تو بے شک صبح میرے یہاں چلے آئیں۔ ہوٹل تلاش کرنے میں آپ کی مدد کردوں گا —— اب میں رخصت چاہتا ہوں کیونکہ مجھے ایک صاحب سے اسی وقت ملنا ہے۔"

اب ہم نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور دو اچھے دوستوں کی طرح جدا ہوئے۔ لوٹتے وقت میں نے سوچا کہ یہ دل چسپ قصہ شوبھا کو سناؤں گا تو وہ ضرور خوش ہوگی۔

وقت ہو چکا تھا۔ ادھر میں بنچ کے قریب پہنچا اُدھر شوبھا بھی آ گئی۔ یوں تو وہ خوب بنی ٹھنی تھی اور بہت پیاری لگ رہی تھی لیکن منہ پھولا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ منہ کا یہ پھلاؤ اصلی نہیں بناوٹی ہے۔

میں نے اس کے بازو کو سہارا دے کر بنچ پہ بٹھانا چاہا تو اس نے بازو جھٹک کر پرے ہٹا لیا۔ خشک لہجے میں بولی۔ "رہنے دیجئے خود ہی بیٹھ جائیں گے۔"

چھوٹتے ہی میں نے کہا۔ "ارے شوبھا! آج بڑے مزے کی بات ہوئی۔ تم سنوگی تو حیران بھی ہوگی اور خوش بھی۔"

اس تمہید کے بعد میں نے خوب مصالحہ لگا کر سارا واقعہ کہہ سنایا لیکن وہ نہ حیران ہوئی اور نہ خوش۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ گھاؤ زیادہ گہرا ہے۔ معمولی مرہم سے کام نہیں بنے گا۔ بھلا اب کس جتن سے روٹھی رانی کو منایا جائے۔

میں اسی ادھیڑ بُن میں تھا کہ پھر ایک سایہ اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ بڑی کوفت ہوئی کہ اب معاملہ بالکل کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

وہ حضرت ادھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ پھر مجھ سے دریافت کیا:

"کیوں صاحب! آپ نے یہاں صابن کی ٹکیہ تو نہیں دیکھی؟ .... بالکل نئی .... پیکٹ میں بند ...."

اب میں نے پہچانا۔ حضرت وہی پہلے والے بوڑھے تھے۔ یہ سن کر میں سر سے پاؤں تک شل ہو گیا۔

انھیں صابن کی ٹکیہ نہیں ملی۔ جس طرف سے آئے تھے اُسی طرف کو واپس چلے گئے۔

میں نے شوبھا کی جانب دیکھا۔ اب وہ حیران بھی تھی اور خوش بھی!

ضروری اطلاع

پاکستان میں جو حضرات 'آج کل' کے خریدار بننا چاہتے ہیں وہ 'آج کل' کا سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے ہندوستانی ہائی کمشنر مقیم کراچی کے دفتر میں جمع کرا کے رسید بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸ کو بھیج دیں۔ 'آج کل' اُن کے نام باقاعدہ جاری کر دیا جائے گا۔

فضا ابن فیضی

غمِ مُعتبر

ہجومِ شوخیٔ فکر و ہُنر سے گزرا ہوں
میں کتنی بار خود اپنی نظر سے گزرا ہوں

ہر ایک مرحلۂ خیر و شر سے گزرا ہوں
ترے خیال میں تیری نظر سے گزرا ہوں

یہ موڑ راہ کے گم کر سکے نہ منزل کو
ترے قریب سے گزرا جدھر سے گزرا ہوں

تری خوشی کو بھی اس کی خبر نہ ہو جائے
بہ احتیاط غمِ معتبر سے گزرا ہوں

نہ اب وہ کیفِ طلب ہے نہ وہ نشاطِ سفر
اُداس اُداس تری رہگزر سے گزرا ہوں

بڑی طویل ہے روداد میرے جلوؤں کی
میں حُسن کی نگہِ مختصر سے گزرا ہوں

یہ ذوقِ رشک ہے یا سعیٔ پردہ داریٔ شوق
چھپا کے تجھ کو بھی تیری نظر سے گزرا ہوں

ہے حادثاتِ طلب آہ! عشق کی فطرت
میں بن کے موج خود اپنے ہی سر سے گزرا ہوں

غمِ شگفتہ نفس! تیرے بانکپن کی قسم
میں پھول بن کے صبا کی نظر سے گزرا ہوں

کہیں نہ گردشِ دوراں کی آنکھ کھل جائے
بہت سنبھل کے تری رہگزر سے گزرا ہوں

اسی طرف سے زمانہ بھی نغمہ خواں گزرا
میں لے کے تیرا تصور جدھر سے گزرا ہوں

ملی ہے تیرہ شبی تا حدِ نگاہ فضاؔ
میں یوں بھی جلوۂ موجِ سحر سے گزرا ہوں

گوبردھن داس چندن

پیاس نہیں بجھتی

آج کائنات پر پھر یاس اور افسردگی کے جذبات نے غلبہ پا لیا۔

اس نے سوچا۔ " میں کب تک اس گوشۂ تنہائی میں پڑا رہوں گا ؟ کب تک برش اور رنگ کا زندانی بنا رہوں گا ؟ کب تک اپنی ان بے جان تصویروں کے کمال پر مسرور ہوتا رہوں گا ؟ کب تک اس ویرانے میں ایک خیالی بہار کا نظارہ کرتا رہوں گا ؟ میں نے اپنے آرٹ کی پرورش کے لئے شہر کی پر رونق زندگی کو چھوڑا۔ اہلِ ذوق کی ظرافتِ طبع کے لئے دن رات کام کیا۔ حسن پروری کی روایت کے لئے ان تھک محنت کی۔ لیکن ان سب کے صلے میں مجھے کیا ملا ؟ لوگوں کی نظر میں میں بدستور ایک بدصورت شخص رہا۔ آج بھی وہ مجھے آنکھ بھر کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ پچھلے ماہ جب میری تصویروں کی نمائش ہوئی اور مجھے اپنے مداحوں کے ہجوم میں رہنے کا موقعہ ملا تو اکثر لوگ یہ کہتے سُنے گئے ' اتنے اچھے آرٹسٹ کو خدا نے کتنا بدصورت چہرہ دیا ہے ' گویا اہلِ ذوق اور اہلِ نظر بھی فن اور تخلیق کے حسن سے زیادہ فن کار کی صورت کو پیشِ نظر رکھتے ہیں ! لیکن کیا ایک فن کار کا ریاض، اس کی محنت، اس کی لطافتِ طبع ایسے ہی جملوں اور داد کی مستحق ہے ؟ کیا ایک فن کار کی قدر کا معیار اس کی اپنی صورت ہے ؟ کیا اس کے تخیل اور تخلیق کا انجام یہ ہے کہ اسے بدصورت کہہ کر اس پر ترس کھایا جائے ؟ . . . . . . فن کار کی زندگی بھی محرومیت کا کیسا نمونہ ہے ! وہ زندگی کی حسین جھانکیاں پیش کرتے کرتے اوب جاتا ہے۔ لیکن حقیقی زندگی میں اسے کسی جاذب نظر شخصیت سے مل بیٹھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا . . . . . . میری آنکھیں ہمیشہ منتظر رہی ہیں۔ میری روح ہمیشہ بے چین رہی ہے میرا دل ہمیشہ بے کل رہا ہے . . . میں چاہتا ہوں کہ کسی شام میری اس چترشالا کے پچھلے دروازے سے کوئی میرے گھر میں داخل ہو جائے۔ جیسے کوئی چھم سے تصور میں آ جاتا ہے جیسے خواب میں منہ مانگی مراد پوری ہو جاتی ہے جیسے سیاہ بادلوں میں چاند نکل آتا ہے۔ کوئی دھیرے دھیرے اور چپکے چپکے یہاں آ جائے۔ بالوں کی لٹیں اُلجھی ہوں، آنکھوں میں کاجل ہو، ہونٹوں میں رس ہو، سینے میں دھڑکن ہو، وہ چپ چاپ یہاں آ کر پیچھے سے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دے، کان پر چٹکی بھر لے۔ پوچھے — ' بتاؤ کون ہے ' اور میں جھٹ کہہ دوں ' تم ہی ہے جس کا مجھے انتظار رہا ہے، جس کے ساتھ بیٹھ کر میں جی بھر کر باتیں کروں گا، جس کے ہمراہ میں باغ اور دریا کی سیر کروں گا، جس کے ساتھ میں چاند کی چاندنی کا رس پیوں گا، ستاروں کی آنکھ مچولی دیکھوں گا، فضاؤں کے سکوت کو محسوس کروں گا . . . . . ' میں چاہتا ہوں کہ یہ حسینہ چاند کی چاندنی تک میرے ساتھ رہے، پھولوں کے شباب تک میرے ہمراہ رہے برسات کے زور تک میرے پاس رہے۔ وہ میری مدہوش تمنا کو پہچانے، میرے دل کی آواز کو سُنے اور پھر اُسے اپنی ہی آواز قرار دے دے . . . . میں بارش کی رم جھم میں اس کا نظارہ کروں، تاروں کی جھلمل میں اسے دیکھوں نور کے تڑکے میں اسے آنکھوں پہ بٹھاؤں۔ اس کے گیسوؤں سے وارفتگی لے لوں، اس کے سینے سے حرارت چرا لوں، اس کی آنکھوں سے شوخی اُٹھا لوں اور پھر بہتے آبشاروں اور جھومتے پیڑوں کے اس منظر میں اس کی تصویریں بناؤں۔ اس کے چہرے کی صباحت کو ایک دائمی مسکراہٹ اور فلسفے میں بدل دوں۔ اس کی کایا کو کائنات کا جادو بنا دوں . . . . . . آج تک لوگ میرے جس آرٹ سے محظوظ ہوتے رہے ہیں وہ فقط ایک مراقی تھی، اس

میں سے نہیں تھی۔ اگر مجھے ایک بھرپور مزاحی پیش کرنے کا موقع مل جائے تو یہ لوگ یقیناً میری تخلیق کے فرق کو دیکھ لیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے تصور کی سب سے بڑی تصویر کو اپنے تجربے کے سانچے میں ڈھال لوں۔ اپنے شاہکار کے خدوخال کو ایک بھرپور انداز میں پیش کروں۔ اپنے تخیل کے شعلے کو جذبے کی آگ سے روشن کر لوں۔ . . . لیکن مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں تنہا رہا ہوں اور ہمیشہ تنہا ہی رہوں گا۔ ایک ایسا ٹیلہ جسے لوگ دور سے ہی دیکھیں۔ ایک ایسا جزیرہ جہاں کوئی نہ اترے، ایک ایسی سرائے جہاں کوئی نہ آئے . . . میں احباب و اقارب کی دنیا کو چھوڑ کر یہاں آیا کہ کچھ سکون حاصل ہوگا لیکن سکون یہاں بھی نہ ملا۔ شاید زندگی میں سکون ہے ہی نہیں! روح بے چین ہی رہتی ہے۔ دل پریشان ہی رہتا ہے؛ ذہن منتشر ہی رہتا ہے اور آدمی کہیں بھی ہو، کیسے بھی ہو، تنہا ہی رہتا ہے . . . . . .

دروازے پر دستک ہوئی۔ کانت ٹھٹک گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا

ایک خوب رو، خوش پوش اور خوش ادا لڑکی داخل ہوئی۔

کانت کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے

لڑکی بولی "آپ مجھے دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں شاید؟"

"جی ہاں، جی نہیں۔" کانت نے اپنی ذہنی حالت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا نام سندری ہے۔ میں آپ سے اپنی ایک تصویر بنوانے آئی ہوں۔" لڑکی نے کانت کی طرف سے پیش کردہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کا آرٹ بہت مرغوب ہے۔ پچھلے ماہ آپ کی تصویروں کی نمائش دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔"

"حوصلہ افزائی کا شکریہ۔" کانت نے اپنی مسرت اور مستی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی تصویروں میں انفرادیت بہت پسند ہے۔ انھیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ان میں ایک روح ہے، ایک تحریک ہے، ایک شوخی ہے۔ جو زندگی کی خوشیوں پر نغمہ سرا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ وہ ایک نئی اور نفیس دنیا کی جھلکیاں ہیں، ایک نئے رواج، نئے سماج اور نئے ماحول کے پرتو ہیں۔"

کانت پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اسے بار بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے خوابوں کا پیکر اس کی حقیقی دنیا میں اتر آیا ہے۔

سندری نے کہا۔ "میری خواہش ہے کہ آپ میری ایک تصویر بنائیں جو بہت دلآویز ہو، دلگداز ہو اور آپ کے آرٹ کا شاہکار ہو۔"

کانت کے دل و دماغ مچل اٹھے۔ ایک حسینہ، اس کے خوابوں کی حسینہ بنفسِ نفیس کتنا محبوب مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کے جذبات بے قابو ہو رہے تھے اور بار بار یہ آرزو ہو رہی تھی کہ وہ اس سے اپنی خواہش، اپنی مدہوش تمنا کا اظہار کر دے۔ لیکن بات کس طرح شروع کرے، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ذہن موضوع کی شدت سے دہک رہا تھا لیکن زبان اخلاق کے احساس سے گنگ تھی۔

سندری نے اسے خاموش دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ مضطرب نظر آتے ہیں۔"

"جی نہیں" کانت نے بھڑک کر کہا۔ "میں تو آپ کی شخصیت کا اپنے تصور سے جائزہ لے رہا تھا۔ دراصل میں اپنے برش یا پنسل سے خطوط بنانے پر ہی قانع نہیں ہوتا بلکہ اپنے موضوع کو اپنے دل میں بسا کر اس کا نظارہ کرتا ہوں اسے روح میں اتار کر اس میں گھل مل جاتا ہوں۔ اسے سینۂ تخیل سے لگا کر اس کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ آرٹ محض ڈرائنگ یا صناعی نہیں۔ اس میں یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی یہاں آئے اور میں کسی آلے یا پیمانے سے اس کی شبیہ اتار لوں۔"

سندری جو ہمہ تن گوش تھی، چونک پڑی۔ اس کی دلچسپی تجسس میں بدل گئی۔

"آرٹسٹ کی خواہش یہ ہوتی ہے۔" کانت کہہ رہا تھا کہ "اس کی ہر تخلیق ایک شاہکار ہو لیکن جب اس کا ماڈل خود ایک شاہکار بننے کا مطالبہ کرے تو آرٹسٹ کا مشکل کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ آخر آرٹسٹ کوئی معمار یا بڑھئی تو نہیں ہوتا کہ نقشہ مل جانے کے بعد ایک پوری عمارت کھڑی کر دے اسے اپنے ماڈل کے تصور سے ایک وجدانی کیفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اسے اپنی آنکھوں میں سپنوں کی طرح بسا لینا ہوتا ہے۔ اس کے ہمرکاب کہیں گم ہو جانا ہوتا ہے۔ اس کی صحبت میں دنیا و مافیہا کو بھول جانا ہوتا ہے . . . . ."

"میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" سندری نے کانت کی بات کاٹتے ہوئے حیرت اور سراسیمگی سے پوچھا۔

کانت اس استفسار سے چونک پڑا اور بولا "معاف کیجئے۔ میں کچھ

اُلجھ گیا تھا۔ دراصل میں کچھ پریشان ہوں۔ آیئے ذرا ادھر دریا کی سیر کر آئیں۔"
اور اس نے سندری کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

سندری نے گھبراتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا اور اپنے غصہ کو دباتی ہوئی بولی۔ "کیا آرٹسٹ ایسے ہوا کرتے ہیں؟ میں تو اس عقیدے سے یہاں آئی تھی کہ ہمیشہ عورتوں کی تصویریں بنانے والا فنکار زندگی کے مادی تقاضوں سے بلند ہوگا۔ وہ عورت کی روح کا قدردان ہوگا۔ اس کی نسائیت اور اس کے وجود میں رچی ہوئی رجائیت کا پاسبان ہوگا اور اپنی ایک مداح کے لئے اپنے فن کا ایک شاہکار تیار کر سکے گا۔"

"میں آپ کے لئے اپنا بہترین شاہکار تیار کروں گا۔" کانت نے اپنی ذہنی صلاحیت کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ آپ پہلی عورت ہیں جو میری حقیقی زندگی میں داخل ہوئی۔ آپ کو پاکر مجھے خیال ہوا کہ میری زندگی میں جو کمی ہے اُسے پورا کروں۔ دم بھر کے لئے آپ کی رفاقت حاصل کر لوں۔ رعنائی، جمال اور نفاست کے جس تصور کو میں نے فروغ دیا ہے اُسے حقیقت کے سانچے میں ڈھال کر دیکھ لوں۔"

"گویا آپ اقرار کر رہے ہیں۔" سندری نے کہا "کہ آپ کا آرٹ آپ کی ذہنیت کی چغلی کھاتا ہے۔ آپ کی عورتوں کی نشیلی آنکھوں، رسیلے ہونٹوں، پھولے ہوئے گالوں اور پریشان بالوں کی اشاریت کوئی بشارت نہیں بلکہ ایک شرارت ہے۔ آپ کی تصویروں کے عنوان ہی کتنے محدود ہیں: 'غسل'، 'آرائش'، 'جمال'، 'ادا'، 'انتظار'، 'جھلک'، 'لمس'، 'وصل'۔

"آرٹ پرورشِ حُسن ہے۔" کانت نے بحث کو طول دیتے ہوئے کہا۔ "اور عورت حسن کی بہترین مظہر ہے۔ میں نے اپنی تصویروں میں اسی حُسن کا اظہار کیا ہے جو انسانی جذبے کی ترسیل ہے اور جذبہ انسان کا ضمیر ہے۔"

"لیکن آپ کی نگاہِ انتخاب اور انداز فکر جیسی تنگ نگ ہی کیوں محدود رہتے ہیں؟ آپ کی لڑکیاں یا تو کسی کو بلا رہی ہوتی ہیں، کسی کے انتظار میں ہوتی ہیں یا ملاقات کے بعد کی تسکین سے سرشار ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ کسان کا ہاتھ بٹانے والی عورت میں بھی ایک حسن ہے۔ کھیت میں کام کرنے والی عورت میں بھی ایک حسن ہے۔ اسپتال میں کام کرنے والی نرس میں بھی ایک حُسن ہے اور سماجی کام کرنے والی گرام سیوکا میں بھی ایک حُسن ہے۔"

"یہ تو اپنے اپنے موضوع کی بات ہے۔ میرے تصور میں عورت کا جو روپ ہے میں نے ہمیشہ اسی کی عکاسی کی۔ آج تک کوئی ایک آرٹسٹ عورت کے سب روپ نہیں پیش کر سکا۔ البتہ ہر آرٹسٹ نے جمالیاتی حس کو آسودہ کیا اور اس باب میں میرے کام کا اعتراف ہر خاص و عام نے کیا۔"

"معاف کیجئے گا آپ مخلص آرٹسٹ نہیں ہیں۔" سندری نے حتمی طور پر کہا اور کانت کی چیرہ دستی سے نکل گئی۔

کانت کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے ایسے محسوس ہوا جیسے سندری اس کے منہ پر طمانچہ لگا کر چلی گئی ہے، اس کے فن کی تذلیل کر گئی ہے، اس کی محنت کو بیکار قرار دے گئی ہے۔ "نادان لڑکی" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "جوانی کی مستی میں مجھے سبق دینے چلی تھی۔ کیا تو خود اپنی ایک ایسی ہی تصویر بنوانے نہیں آئی تھی جیسی کہ میں روز بنا رہا ہوں؟ کیا تو خود میری تصویروں پر فریفتہ نہیں رہی ہے؟ آخر عورت ہو نہ۔ جب جی چاہا کسی کو اُٹھا لیا، جب جی چاہا اسے گرا دیا اور پھر جو جی میں آیا کہہ دیا۔ تم پر اور تمہاری جستجو پر تو پریشان ہونا ہی بے کار ہے کیونکہ تم تو ایک طرح ہو جو 'اپنی خوشی سے آئے اور اپنی خوشی چلے' کی مصداق ہے۔" کانت نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اسی وقت اس کے اندر چھپے ہوئے ایک مرد نے کہا:

"تم سندری کو فراموش مت کرو۔ تمہارے پاس تمہارا فن ہے جس کے ذریعے سے تم اس سے اپنی شکست کا بدلہ لے سکتے ہو۔ تم ایک تصویر بناؤ 'آخری داؤں'۔ اس میں ایک ہرنی ہو۔ مست رَو، مست چشم، مست خرام یہ ہرنی مچلتی، بھاگتی ایک سادھو کے آشرم میں داخل ہو جائے۔ سستانے کے لئے، دلچسپی کے لئے اور سادھو اس کے داخل ہونے کے فوراً بعد اپنے آشرم کا دروازہ بند کر دے اور پھر اس کی گھات میں بیٹھ جائے۔"

"آخری داؤں"۔ کانت نے ذہن میں عنوان کو دہرایا لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ یہ اس کی بدتہذیبی ہوگی، مصوری کے فن لطیف کی ہتک ہوگی۔ گھر آئے مہمان سے ناشائستگی ہوگی، قدرت کی امانت میں خیانت ہوگی۔ "نہیں میں یہ نہیں کروں گا۔" اس کے آرٹسٹ نے صدائے احتجاج بلند کی۔ "میں اپنے آرٹ کی تذلیل نہیں کروں گا، اپنی زندگی کی کمائی کو ضائع نہیں کروں گا، اپنی شرافت کا گلا نہیں گھونٹوں گا، آرٹ ثقافت کا نقیب ہے۔

تہذیب کا داعی ہے، نفاست کا مبلغ ہے۔ اسے زیب نہیں دیتا کہ دنیاوی تسکین کے لئے اپنا توازن کھو بیٹھے۔"

لیکن اس کے اندر چھپے ہوئے مرد کی آواز بلند نہ ہوئی۔ اس نے کہا "کانت تم بے کار فلسفہ بگھار رہے ہو۔ سندری کو بھولنا آسان نہیں۔ وہ ایک حقیقت ہے، ایک منزل ہے، زندگی کا پیکر ہے۔ اب تم اس کے بغیر اپنے آرٹ کی کوئی پرورش نہیں کر سکتے۔ اس کے بغیر اب تمہیں کوئی سکون نہیں مل سکتا۔ تمہیں اسے حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ہی ہوگی۔"

"نہیں" اس کے آرٹسٹ نے پھر صدائے احتجاج بلند کی۔ "تم اپنے جذبات سے مغلوب ہو گئے ہو۔ انتقام پسند ہو کر بھٹک رہے ہو۔ کس قدر بھونڈا عنوان سوچ رہے ہو 'آخری داؤں'۔ اس اظہار کی تکمیل تم کو کہیں کا نہ چھوڑے گی۔ حق تو یہ ہے کہ تم شروع سے ہی فنِ مصوّری کی تذلیل کرتے رہے ہو۔ تمہاری پرواز ہمیشہ جہانِ رنگ و بو تک رہی۔ تمہاری تخیل ہمیشہ ناز و ادا پر ہی صرف ہوئی۔ تمہارے ذوق نے ہمیشہ جنسی تسکین کا سامان ڈھونڈا۔ اور اب تو تمہاری نیت فاسق ہو چکی ہے۔ تمہاری گراوٹ، تمہاری ذلت، تمہارے تنزّل کے لئے اب کوئی ٹھکانا نہیں۔ اب تو تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ تم اپنے آرٹ سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ اپنے فن کو بھول جاؤ اور اس ترک میں اپنی گراوٹ کا کفارہ کرو۔ تمہارے دل و دماغ میں اب جو ہلچل رچ چکی ہے اس سے نجات پانے کا یہی راستہ ہے۔ اپنی بھوک کے ہاتھوں واقع ہونے والی برہنگی سے پردہ پوشی کا یہی طریقہ ہے اور اس معصوم لڑکی کی یاد کو بے داغ رکھنے کا فقط یہی ایک ڈھنگ ہے۔"

وقت گزرتا گیا لیکن سندری کے ذہن سے اس واقعے کی یاد نہ گئی بلکہ اس کے اندر چھپی ہوئی ایک پشیمان عورت روز بروز طاقت ور ہوتی گئی۔ یہ پشیمان عورت نوجوان لڑکی سے کہتی "سندری تم نے بڑی غلطی کی۔ اتنے بڑے آرٹسٹ کا دل توڑ دیا۔ تم نے نہ صرف اس کی رفاقت سے انکار کیا بلکہ اس کے دل کش و دل پذیر آرٹ پر بھی حرف گیری کی۔ بھلا تمہیں آرٹ کی خوبیوں کا علم ہی کیا ہے؟ وہ تو تمہارے فانی چہرے سے ایک غیر فانی شاہکار بنا سکتا تھا۔ اور تم دو پل کی شوخی کے لئے اس کے جہانِ تخیل کو ہی روند آئی ہو۔ یہ تو تمہاری خوش بختی تھی کہ ایک آرٹسٹ نے تمہیں اپنا ماڈل بنانا پسند کیا اور نہ صرف پسند کیا بلکہ تمہاری رفاقت کے لئے خواہش ظاہر کی۔ اور تمہارے سر پر کیا سوار ہوا کہ وہ مرد ہے کیا آرٹسٹ مرد نہیں ہو سکتا؟ حسن کی جھلکیاں دکھانے والا مصوّر کیا حسن کو حاصل کرنے کی تمنا نہیں کر سکتا؟ ذرا سوچو کہ اس نے کس خلوص سے اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دیا تھا۔ تمہیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ اس کی حقیقی زندگی میں آنے والی تم پہلی عورت ہو اور تم نے حسن کے اس پرستار، جمال کے اس محسن، عورت کے اوصاف پر اپنی روح نچھاور کرنے والے اس صاحبِ فن کو عورت کے بارے میں کیا خیال دیا؟ یہی کہ وہ تندمزاج ہے، زودرنج ہے اور ذوقِ سلیم سے عاری ہے؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ اس کے بعد اس کی تصویروں میں ظاہر ہونے والی عورتوں پر وہی رعنائی، وہی مستی، وہی کشش نظر آئے گی جو تم نے اس سے ملنے سے قبل دیکھی تھی؟ اس کے خداداد تخیل سے پیدا ہونے والی ہر عورت دل فریب، سکون بخش اور خیال افروز تھی لیکن حقیقی دنیا سے جو تو واحد عورت اس کے ہاں گئی تو اس کے اعتقاد کی ہر کڑی کی نفی ثابت ہوئی۔ یہ بڑی زیادتی تھی اور یاد رکھنا کہ اس سے معذرت کئے بغیر تو کبھی چین نہیں پائے گی۔"

ایک دن یہ عورت اس کے سر پر بُری طرح سوار ہو گئی۔ کہنے لگی "سندری۔ آج شام تم اس کے یہاں جاؤ اور اپنی حرکت کے لئے معذرت کرو۔"

سندری نے کہا۔ "لیکن اب تو بات بہت پُرانی ہو گئی اور وہ مجھے بالکل بھول گیا ہوگا وہ تو مجھے شاید پہچان ہی نہیں سکے گا۔"

عورت بولی۔ "وہ تمہارے ان بالوں کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ تمہاری نگاہوں کی یہ چمک اس کے ذہن سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ تمہاری موہنی صورت اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ تم سادگی اور پُرکاری کا نمونہ بن کر اس کے ہاں جاؤ۔ اُٹھو اپنا دہ نیا چست محرم پہنو، آنکھوں میں کاجل کرو، پلکوں کے خم کو اُبھارو، ہونٹوں کا رنگ اور نوک پلک درست کرو۔ وہ ادھ کھلے پھولوں والی ساڑھی پہن لو، بالوں کی لٹیں اُبھاؤ اور اپنے سارے سراپا پر عطر چھڑکو۔ وہاں اس کے پچھلے دروازے سے داخل ہو جانا۔ وہ غالباً اپنے تصوّر میں بیٹھا ہوگا۔ تم دھیرے دھیرے قدم رکھتی ہوئی اس کے قریب پہنچ جانا۔

پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دینا، اس کے کان پر چٹکی بھرنا۔ پوچھنا "بتاؤ تو بھلا کون ہے؟" جب وہ اپنا جواب سوچ رہا ہو تو تم ہنستی مسکراتی اس کے سامنے ظاہر ہو جانا۔ اسے حقیقت پر خواب کا شبہ ہوگا۔ تم اسے چھونا اس کا ہاتھ پکڑ لینا۔ وہ تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ اس وقت اس کا چہرہ کیسا ہوگا۔ حیرت زدہ، مسرت بھرا، باچھوں کھلا۔ کیسی ساعت ہوگی۔ کیسی زندگی ہوگی کیسی راحت ہوگی!!!"

سُندری انگ انگ جل گئی۔

وہ اسی لمحہ اپنے ڈریسنگ روم میں گئی اور اپنے اندر کی عورت کی ہدایت کے مطابق تیار ہو کر کانت کی جیز شالا کو چل دی۔

پچھلے دروازے پر پہنچ کر اس نے سوچا کہ وہ ذرا دستک دے دے لیکن پھر اسے اپنی عورت کی ہدایت یاد آئی اور وہ چپ چاپ اندر داخل ہو گئی۔ سامنے برآمدے میں چارپائی پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ سندری نے سوچا کہ وہ کانت کی ماں ہوگی یا شاید اس نے کوئی خادمہ رکھ لی ہو۔ اس نے قدم بڑھایا اور اس بڑھیا سے پوچھا:

"کانت بابو اندر ہیں؟"

"کون کانت بابو؟" بوڑھی عورت نے سندری کے پاس آکر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"وہی جو یہاں رہتے ہیں — وہ جو تصویریں بناتے ہیں۔"

"ان کو تو یہ جگہ چھوڑے قریب تین سال ہو گئے۔" بوڑھی عورت نے سندری کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

فرحت القادری گیاوی

غزل

وہ فسانۂ دلِ بے خبر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا
وہ تمام عہدِ جنوں اثر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

لبِ آتشیں، نگہِ حسیں، وہ مثالِ بدر تری جبیں
وہ سیاہ گیسوئے نا کمر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

وہ غرور و نازِ خرد شکن، وہ خرامِ مست چمن چمن
وہ پیامِ شوق نظر نظر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

وہ عنایتیں، وہ نوازشیں، وہ ادا و ناز کی بارشیں
وہ تکلفات سے دور تر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

وہ بیک نظر قدحِ طرب، وہ سرور و کیف بیک طلب
وہ ہماری لغزشِ معتبر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

شبِ ہجر ہر نفسِ گراں، شبِ وصل ہجر کی داستاں
ہیں غریقِ درد تمام تر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

کبھی چشمِ ناز میں برہمی، کبھی التفات کی چاشنی
کبھی شامِ غم تو کبھی سحر مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

شبِ ماہ میں لبِ آبجو، وہ مثالِ آئینہ رو بہ رو
وہ فریبِ خلد زمین پر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

وہ ادا ادا میں حلاوتیں، وہ قدم قدم پہ قیامتیں
وہ حیا میں ڈوبی ہوئی نظر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

وہ حیاتِ عشق کا ماحصل، وہ حسین ساعتِ بے بدل
جسے اک زمانہ ہوا مگر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

نہ غمِ زمانۂ کم نظر، نہ خیالِ سود و زیاں اثر
وہی دورِ فرحتِ مختصر، مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ

عبدالمجید سالک مرحوم

"زندگی کی شاہراہ حوادث کے آفتاب کی تمازت سے تپ رہی ہے۔ آہ اے موت کی سایہ دار سرزمین تو کہاں ہے کہ راہِ حیات کے مسافر تیری ٹھنڈی چھاؤں میں آرام پا سکیں اور ان گئے گزروں سے جا ملیں جو اپنی خوش نصیبی کی وجہ سے اس تیرہ خاکدان سے نجات پا کر جا چکے ہیں۔"

بخاری کی موت پر سالک اتنے غمگین ہوئے کہ بے اختیار موت کی آرزو کرنے لگے۔ نہ جانے کس خلوص سے انھوں نے یہ دعا کی کہ قبول ہو گئی۔ آج وہ ہم میں نہیں تو بذلہ سنجی، خوش مذاقی اور ادب و شعر کی دنیا سونی نظر آتی ہے۔ اگر موت زندگی ہی کی ایک منزل کا نام ہے تو حافظ کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے کہ "سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا۔"

مارچ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے مجھے اپنے حالاتِ زندگی خود لکھ کر بھیجے تھے۔ پہلا فقرہ یہ ہے "میرے حالات کیا ہوتے۔ خام بُدم پختہ شدم سوختم۔"

مولانا عبدالمجید سالک بٹالہ ضلع گورداسپور میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۴ء میں فانوسِ خیال ایک ماہنامہ جاری کیا۔ ۱۹۱۵ء میں تہذیبِ نسواں اور پھول کے ایڈیٹر ہوئے۔ پھر زمیندار کے ایڈیٹر ہوئے۔ ترکِ موالات کے زمانے میں ایک سال جیل میں بھی رہے۔ ۱۹۲۷ء میں مولانا مہر کے ساتھ انقلاب جاری کیا۔ افکار و حوادث میں اپنی بذلہ سنجی کا ثبوت دیتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں یہ اخبار بند ہوا۔ اس کے بعد متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سرگزشت، ذکرِ اقبال، یارانِ کہن، مسلم ثقافت ہندوستان میں قابلِ ذکر ہیں۔ بچوں کے لئے بھی متعدد کتابیں آپ کی تصنیف سے ہیں۔

۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء کو لاہور میں بوستانِ ادب کا یہ چہکتا ہوا بلبل خاموش ہو گیا۔ سیاسی نظریوں سے قطعِ نظر باعتبارِ علم و فن ان کے عقیدت مندوں کی تعداد ہندوستان اور پاکستان میں بہت ہے۔ اور ان میں سے ایک ایک اس وقت زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

جائے دارد کہ خویش را نازم   کہ ظہورِ تو در زمانِ من است

عرش ملسیانی

وزیراعظم کا دَورۂ افغانستان و ایران

پنڈت نہرو تہران میں وزیراعظم ایران کے ساتھ

پنڈت نہرو کابل میں ایک جلسے سے خطاب کر رہے ہیں

درگاپور

کے

فولاد کے

کارخانے کا

ایک منظر

درگاپور بیرج
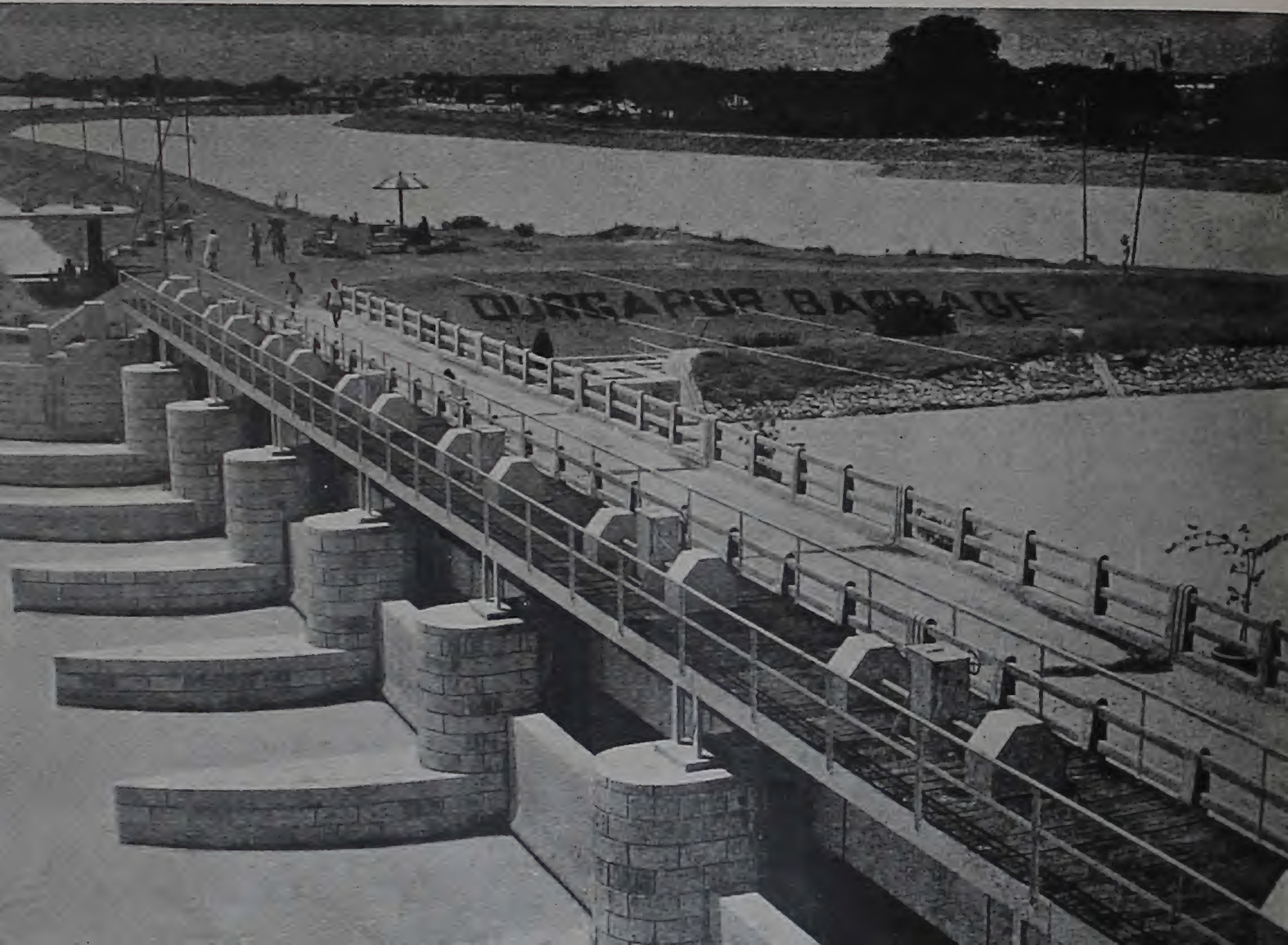
ہمارے

لکھنے

والے

علی عباس حسینی

کنہیا لال کپور

شمیم فرحت
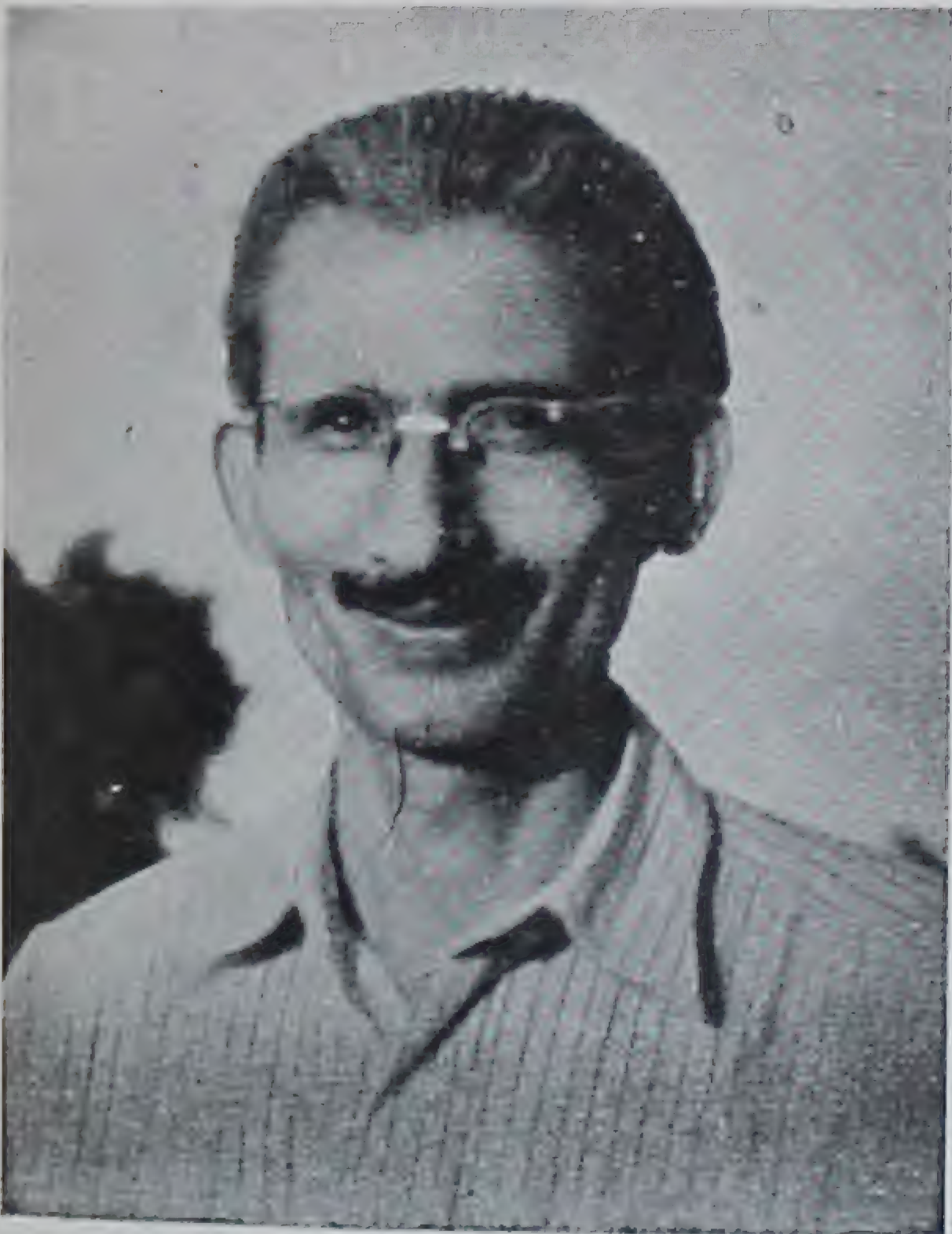
زندگی، تجربہ اور کتابیں

اے کتابوں کی سیاہی میں بھٹکنے والے
یہ کتابیں تو ہیں الفاظ کی بے جاں لاشیں
حال کے علم کا رس ان میں نہیں مل سکتا
یہ تو ہیں بیوۂ ماضی کی فسردہ قاشیں

ان کتابوں میں جو اذکار ہیں وہ 'کل' کے ہیں
'آج' کا صدق مگر ان میں نہیں مل سکتا
عہدِ ماضی بھی تھا اک پھول کہ جو سوکھ چکا
اب وہی پھول دوبارہ تو نہیں کھِل سکتا

فلسفہ کیا ہے ؛ خیالات کی افراتفری
جو کہ نظروں سے حقائق کو ہٹا دیتا ہے
زندگی محنت و انساں کا سہانا رشتہ
تجربہ جس کے مقامات بڑھا دیتا ہے

تجربے وقت کی راہوں پہ جلاتے ہیں چراغ
زندگی جن کے اُجالوں میں چلا کرتی ہے
زندگی لفظوں کی بکھری ہوئی تصویر کہاں
زندگی صرف "کتب" میں پلا کرتی ہے

اب ارسطو کے خیالوں کا فسوں ٹوٹ چکا
جس کی دنیا میں شہنشاہ تھے جمہور نہیں
اب ہیں اوزاروں میں محنت کے کرشمے ظاہر
اب عصاؤں میں کوئی معجزہ مستور نہیں

سچ یہ ہے، وقت کے ہاتھوں سے ملاتے ہوئے ہاتھ
زندگی 'کل' کی طرف دوڑ رہی ہے کب سے
اپنی بہتی ہوئی موجوں کے جواں دھاروں کو
آنے والوں کی طرف موڑ رہی ہے کب سے

زندگی نام ہے اِک نت نئی پرواز کا نام
ایسی پرواز کہ جو صید نہیں ہو سکتی
یہ ہے آزاد فضاؤں کی حسیں رقّاصہ
جو کتابوں میں کبھی قید نہیں ہو سکتی

چندر کرن سون رکسا

دو پھول

مکان اُن کا تین منزلہ ہے، نئے اسٹائل کا۔ ابھی پار سال بنوایا ہے۔ اس سے پہلے وہ میر گنج میں رہتے تھے اپنے پُرانے مکان میں۔ اُسے اب کرایے پر اُٹھا دیا ہے۔ گذشتہ سال فیٹن لی تھی اس سال کار خریدلی۔ پُرانے مکان میں دو نوکر تھے اور ایک باورچی۔ اس سال دو اور بڑھ گئے ہیں۔ اوناش سے دولت کی دیوی خوش ہوگئی ہے۔ اگر وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگائے تو سونا بن جائے۔ پچھلے دو برسوں میں اس نے نہ صرف اپنی خاندانی جائداد کو رہن سے چھڑا لیا تھا بلکہ اتنا بڑا مکان بھی تعمیر کر لیا تھا۔ شہر میں کئی دوکانیں خریدلی تھیں اور بھی نہ جانے کیا کیا کر لیا تھا۔

پاس پڑوس، ذات برادری کے تمام لوگ سُنیتا کی قسمت پر رشک کرتے تھے ایسا شوہر کسی قسمت والی کو ہی ملتا ہے۔ اس اکیلی کے لئے مہری، باورچی، نوکر لگے ہوئے ہیں۔ شادی کو آٹھ سال ہوئے مگر سُنیتا کی گود خالی ہی رہی۔ اوناش نے کبھی دوسری شادی کا نام تک نہ لیا۔ اگر سُنیتا مہینے میں پانچ سو روپے کے کپڑے خرید لائے تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ بیس روپے کے پان چبا ڈالے تو اُسے فکر نہیں۔ سینما کے دو شو روزانہ دیکھے تو بھی نہیں روکتا اور ہر مہینے ایک نیا زیور گھڑ والے تو ناراض نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اُسے جورو کا غلام بھی کہتے ہیں حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ وہ پانچ چھ گھنٹے سے زیادہ گھر پر نہیں رہتا۔ سنیتا کی فرمائشوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے ذاتی ملازم بھولا کو سونپ رکھی تھی۔ اُسے تو اپنے کاروبار اور دوست احباب سے ہی فرصت نہ ملتی۔ سنیتا کی قسمت پر بھی رشک کرتے تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کے منہ سے کسی نے اوناش کی تعریف نہیں سنی اور نہ اتنے عیش و آرام کے باوجود وہ کبھی تندرست نظر آئی۔

ہر ماہ ڈاکٹر بنرجی کے تیس چالیس روپے بن ہی جاتے ہیں ہنستی بولتی بھی کم ہے۔ نہ جانے کیسا مزاج پایا ہے اس نے۔ صندوق کپڑوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہر ماہ خریدی بھی جاتی ہے مگر پہنتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اتنے رسالے منگاتی ہے۔ چاند، تارا، دنیا، مریادا۔ مگر وہ سب کے سب پڑوسی اور رسیر کی صاحب زادی کے پڑھنے میں آتے ہیں۔ ۔ زیورات کے کئی نئے سیٹ ہیں مگر ہولی دیوالی پر بھی چند ہلکے زیوروں کے علاوہ کچھ نہیں پہنتی۔ عجیب عورت ہے سُنیتا۔ ۔ ۔ ۔

اس کی مہری (خادمہ) کیسر و تقریباً اُسی کی ہم عمر ہے، بڑی مصیبتوں کی ماری۔ ساس سسر بہت سا قرض چھوڑ گئے تھے۔ دونو میاں بیوی مل کر یہ قرض ادا کر رہے ہیں۔ شوہر اس کا ایک بزاز کے یہاں چھ روپے ماہوار پر ملازم ہے۔ اور وہ بھی تین چار گھروں کا چوکا برتن کرتی ہے۔ تمام دن ایک گھنٹے کی مہلت نہیں ملتی۔ مگر جب دیکھو مانگ سیندور سے بھری، ماتھے پر چوڑی ٹکلی، ہرے دریس کے لہنگے پر گلابی اوڑھنی ڈالے نظر آتی۔ اس تنگ دستی میں بھی اس کا منہ ہمیشہ پان سے بھرا رہتا اور چاندی کے نہ سہی تو گلٹ کے لچھوں ہی سے پیر بھرے رہتے۔ دن بھر اس کے دانت نکلے ہی رہتے، جب دیکھو ہنستی ہی ملے گی اور باتیں تو بس پوچھو مت۔ سارا دن باتیں کر سکتی ہے۔ مگر ہاں گفتگو زیادہ تر اپنے شوہر کے متعلق کرے گی۔

سُنیتا بھوجی اُسے بہت اچھی لگتی ہیں۔ وہ بھی اُسے چاہتی بہت ہیں اس گھر کا اُسے بہت سہارا ہے۔ اس لئے اور گھروں کا کام دھام جلدی جلدی ختم کر کے یہاں آجاتی اور یہاں کے کام میں گھنٹوں لگا دیتی۔ اُسے اپنی بھوجی کی ایک ہی بات بری لگی کہ وہ ہر دم اداس مرجھائی سی رہا کرتی

ہیں بھگوان کی دیا سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ دھن، مان، سہاگ سب کچھ تو ہے۔ بہو کا سنبھالنے کے دو مہینے بعد جب وہ سُنیتا سے ہل مل گئی تو اس نے پوچھا بھی تھا۔ "بہو جی تم سدا اداس کیوں رہتی ہو؟ تمھیں تو رام جی نے رانی بنایا ہے تمھیں کاہے کی چنتا! اور یہی عمر تو کھیلنے کھانے کی ہے۔ ارے بالک نہیں ہوا تو نہ سہی۔ کبھی تو بھگوان سُنے گا ہی، تمھاری عمر تھوڑے ہی نکل گئی ہے۔" تو سُنیتا ایک پھیکی ہنسی ہنس کر رہ گئی تھی۔ کیسرو نے آگے نہیں پوچھا۔ نئی نئی ملازم تھی۔ تین روپے کی بھری، زیادہ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ مگر یہ فکر اُسے رہتی ہے کہ بہو جی کو کیا دُکھ ہے....

اس دن ایک عطر فروش آیا۔ کئی قسم کے عطر تھے اس کے پاس۔ باہر مردانہ بیٹھک میں ادناش بیٹھا تھا، کچھ دوست احباب بھی موجود تھے۔ شطرنج کی بازی بھی ہوئی تھی۔ مذاق مذاق میں کئی شیشیاں کھلوا ڈالیں۔ دو دو پھریریاں لگانے میں دوستوں نے شیشیاں آدھی کر دیں۔ ان آدھی شیشیوں کو اندر بھجوا دیا گیا۔ عطر فروش کے آٹھ روپے پیدا ہو گئے۔

بھری چائے کے برتن اُٹھانے آئی تو اس کے ہاتھوں میں شیشیاں دیتے ہوئے ادناش نے کہا۔ "اپنی بہو جی سے کہہ دیجیو۔ عطر فروش ابھی بیٹھا ہے کوئی سینٹ وغیرہ لینا ہو تو لے لیں۔"

کیسرو نے ہنستے ہوئے ساری شیشیاں سُنیتا کے سامنے قطار میں لگا دیں پھر آنکھیں نچا کر بولی۔ "بہو جی، بابو صاحب کہتے ہیں کہ اگر کوئی سینٹ پسینٹ لینا ہو تو لے لیں۔ عطر والا ابھی بیٹھا ہے۔"

سُنیتا نے اداس نگاہیں اُن آدھی خالی شیشیوں پر ڈالتے ہوئے کہا "میں کیا کروں گی۔"

کیسرو نے پھر کہا۔ "اجی واہ! وہ بچارے تو اتنے پیار سے پوچھ رہے ہیں اور تم انکار کر رہی ہو بہو رانی۔"

سُنیتا نے اپنی پیاسی نظروں سے بھری کو دیکھا اور چونکتے ہوئے کہا۔ "اچھا اپنی پسند سے ایک اچھی لونڈر کی شیشی لے لیں۔"

"اچھا" کہہ کر بھری چلی گئی۔ دو منٹ بعد آ کر بولی۔ "بہو جی، ادھر کے پھاٹک پر عطر والا کھڑا ہے، پسند کر کے لے لو۔ بابو جی تو شطرنج میں لگے ہوئے ہیں۔ کہہ دیا ہے کہ اپنی پسند سے لے لیں۔ دام دے دئے جائیں گے۔"

"اس سے کہہ دے کہ جائے۔ میں نہیں لوں گی۔" سُنیتا نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا اور کرسی پہ نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ بھری حیران ہو کر کھڑی ہو گئی اور پھر چلی گئی۔

مہاراج دو بار پکار چکا تھا۔ "بہو جی کھانا کھا لو، رسوئی نپٹا لوں۔" دونوں بار سُنیتا نے کہہ دیا۔ "مصر تم کھا لو اور رسوئی اُٹھا دو۔ میں ابھی نہیں کھاؤں گی۔" بے چارہ مہاراج عجب پس و پیش میں تھا۔ نہ بابو صاحب کھانے آئے نہ بہو جی آتی ہیں وہ خود کیسے کھالے..... ڈیڑھ بج گیا تو ہار کر مہاراج نے اپنا کھانا نکالا۔ باہر سے کیسرو کی آواز سنائی پڑی۔ صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی وہ اپنا پیارا گانا گنگنا رہی تھی "سیّاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی"۔ مصر نے دل میں کہا۔ "آ گئی چڑیل"۔ وہ بچے ہوئے کھانے کو نعمت خانے میں رکھنے لگا۔

"مصر تمھارا کام ابھی نپٹا ہی نہیں"۔ کیسرو نے رسوئی دیکھ کر بھنبھناتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی تک چوکا نہیں اُٹھایا میں تو اپنے تینوں گھر کے کام کر کے آ گئی۔"

"میئی تو ٹھری جوان چھریا۔" مہاراج اُسے خاموش کرنے کے ارادے سے بولا۔ "ہم بوڑھے آدمی ہیں ہماری تمھاری کیا برابری۔ آج بہو جی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میرا کام کیسے پورا ہوتا؟"

"بہو جی نے کھانا نہیں کھایا؟" کیسرو کا دل بھر آیا

"ہائے دوپہری ڈھلنے کو آئی۔ اچھا تو تم جلدی جلدی کھا ڈالو تب تک میں بہو جی کے پاس بیٹھتی ہوں۔"

"جا مر۔" مصر نے پہلا لقمہ اٹھا کر کہا۔ "ڈیڑھ گھنٹہ سے پہلے تو تیری باتیں ختم ہونے سے رہیں۔"

کیسرو ہنستی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ سُنیتا بیٹھی ہوئی لٹھے پر کشیدہ کاڑھ رہی تھی۔ "سیّاں تیری گودی میں...... بہو جی!" کیسرو نے گیت ادھورا چھوڑ کر پکارا۔

کیسرو کے چہرے پہ سُنیتا کو رونق دکھائی پڑی۔ کروشیا میز پر رکھ کر اس نے پوچھا۔ "اری مصر سے کیوں جھگڑ رہی تھی۔ کیا آج بھرا سے لڑ کر آئی ہے؟"

"اُن کی ہمت ہے کہ مجھ سے لڑیں۔" کیسرو نے طشتری سے سرپوش اُٹھا، ڈلی کا ایک ٹکڑا کاٹ کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تین دن ڈٹی

نہ دوں۔"

"اوہو!" سنیتا مسکرا کر بولی۔ "ہاں بھئی تُو تو لفٹنٹ ٹھہری۔ تجھ سے جھگڑ کر کہاں ٹھور پائے گا۔"

"یہ تو ہے ہی بھوجی۔" کیسرو نے نہ جانے کس لہجے میں کہا۔ "وہ میرے بغیر چار دن بھی نہیں رہ سکتے۔ میرے ہی کارن تو کسی لالہ کی دوکان کے چھ روپیوں پر پڑے ہیں۔ اگر اکیلے ہوتے تو دیس پردیس نکل جاتے اور تین تاگے کا جنیؤ پہن کر دس بارہ روپے کی روٹی پیدا کر لیتے ـــــ مجھے تو چھوڑ ہی نہیں سکتے۔"

"تم نے اس پر جادو کر دیا ہے۔" سنیتا نے ہنس کر کہا۔ مگر اس کی ہنسی میں ایک درد پنہاں تھا۔

کیسرو ذرا شرما گئی مگر دوسرے ہی لمحے ڈلی کا ٹکڑہ کاٹتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "اپنی تو کہو۔ بابو صاحب کو مینڈھا بنا رکھا ہے۔ کالا کرو یا سفید۔ بیچارے نکلتے تک نہیں۔ میرا مہرا تو پھر بھی جب کبھی ترنگ میں آتا ہے تو ایک آدھ دھول جما کر دھول جھاڑ دیتا ہے، پر بابو صاحب تو بیچارے اتنے سیدھے ہیں، اتنے سیدھے ہیں..."

"ہاں اتنے سیدھے ہیں کہ دوسروں کے دل کی باتیں بھی نہیں سمجھتے۔" سُنیتا نے درد بھرے لہجے میں کہا مگر فوراً سنبھل کر بولی۔ "کچھ تو سیدھی کچھ تیرے بابو صاحب۔"

"اور کیا۔" کیسرو بات بدل کر بولی۔ "بھوجی آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔"

"بھوک نہیں تھی۔"

"ہاں بھوک نہیں تھی، چلو کھا لو بھوجی، بابوجی کو تو کام کے مارے فرصت نہیں کہ گھر پر کھانا کھائیں۔ مگر تم کیوں بیلا کو بلا کر کے دیہی کا پنجر کئے ڈالتی ہو۔ اور بھوجی تمہیں درد نہیں لگتا" اتنے روپے یونہی ڈاکٹر کے پیٹ میں اُتر جاتے ہیں۔"

"درد کیوں ہو۔" لاپروائی سے سُنیتا نے جواب دیا۔ "جب مجھے یہی پتہ نہیں کہ تیرے بابو صاحب کی کمائی محنت کی ہے یا مفت کی تو مجھے درد کیوں ہو۔"

کیسرو دنگ رہ گئی۔ کیا بابو صاحب انھیں آنا بھی نہیں بتلاتے۔

"کیسرو!" باہر سے مسر نے پکارا "چوکا خالی ہو گیا۔"

"چلوں بھوجی برتن مانجوں۔ آج ذرا سنبھر جاؤں گی۔"

"بیٹھ بھی، چلی جانا"

"نہیں بھوجی، تمہارے مہرا کے پاس دھوتی نہیں ہے اور سلوکا بھی پھٹ چلا ہے، تم جانو جاڑے کے دن ویسے ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ کئی دنوں میں سی پاؤں گی۔"

"تو اس کی دھوتی تُو لینے جائے گی؟ خود ہی لے آئے گا۔" سُنیتا نے انگڑائی لے کر کہا۔ "تیرے لہنگے کی چھینٹ تو وہ لے آیا تھا۔ اپنے لئے دھوتی نہ لا سکے گا۔"

"یہی تو بات ہے۔" کیسرو نے مسرّت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "بنا میری پسند کے اپنے لئے ایک ناگا تک نہ لا دیں گے۔"

"تو یوں کہہ کہ اکٹھے لینے جائے گی۔"

"ہاں" کیسرو نے اپنی بھیگی اوڑھنی کا کونا سر کا کر کہا۔ "چلو نا بھوجی کھا لو ایک پھُلکا۔"

لیکن سُنیتا پر رنج اور غصہ طاری ہو رہا تھا۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔ "تو اپنا کام کر۔ میں کھا لوں گی۔"

کیسرو اپنا پرانا گانا گنگناتی باورچی خانے کی طرف چلی۔ "سیّاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی"...

سنیتا کا دل کسی نامعلوم درد سے کراہ اُٹھا۔ پاس پڑے ہوئے شال کو گلے تک کھینچ کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ کیسرو نے برتن سمیٹتے سمیٹتے گنگنانا شروع کیا۔ "بیلا چمبیلی گل مہندی بن جاؤں گی سیّاں تیری ...."
سُنیتا نے پلنگ کی باٹ میں منہ چھپا لیا۔

بڑی مشکل سے سُنیتا نے ہاں کی۔ اس کی طبیعت کہیں آنے جانے کو نہیں چاہتی تھی۔ نہ سینما نہ تھیٹر نہ سیر، نہ کسی سکھی سہیلی کے یہاں جسے وہ چاہتی تھی وہ اس کے قریب رہتے ہوئے بھی بہت دُور تھا۔ اس کی تکلیف اندرونی تھی بیرونی نہیں، جو دوسرے دیکھ سکیں۔ نئی نئی فلمیں آتیں مگر شاید ہی وہ کبھی دیکھنے جاتی۔ کئی سینما گھروں کے منیجر اونا سش کے دوست تھے۔ فری پاس بھی بھیج دیتے تھے مگر وہ فری پاس بہار اج، بھولا اور کبھی کبھی کیسرو کے کام آتے تھے۔ کیسرو تو کبھی کبھار ہی جاتی تھی کیونکہ اس کا

شوہر دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ اگر کیسرو اُسے سامنے بٹھا کر کھانا نہ کھلائے تو وہ ٹکڑا بھی نہیں توڑتا۔ کیسرو صاف باتیں کرنے والی تھی۔ "بہو جی عادت خراب نہ کرنی چاہیئے۔ آج تم ہو تو بائیسکوپ دکھا دیا۔ کل کو پاس نہ ملے تو۔ سینما دیکھنے کی لت بھی بُری ہوتی ہے۔ دن بھر جان توڑ کر محنت کرتے ہیں۔ پھر کہیں شام کو روکھی سوکھی کھا کر ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ پھر گھڑی آدھ گھڑی بیٹھ کر دُکھ سُکھ کی باتیں کرتے ہیں۔ سچ جانیؤ بہو جی، مجھے تو بڑا غصہ لگے ہے۔ تمہارا مہرا جب یار دوستوں کی بیٹھ میں آ کر تاڑی واڑی پی کر باہر پڑا رہے ہے۔ میں تو پھر چار دن تک سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ آپ ہی خوشامد کرتا ہے۔"

کل نہ جانے کیوں سُنیتا کا جی چاہ گیا شاید اس لئے کہ اونامش خود پاس لایا تھا اور کیسرو بھی سر ہو گئی تھی۔

"بہو جی جلدی کرو"۔ کیسرو کی بے صبری کا ٹھکانا نہ تھا۔ آج وہ بہو جی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر سینما جائے گی۔ کار پر بیٹھنے کا اس کے لئے یہ پہلا موقع تھا۔ بس پر اگرچہ وہ سفر کر چکی تھی۔ شال اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "دوسری چادر بھی لے لوں۔"

"کیا کرے گی؟" رسٹ واچ پر نظر ڈال کر وقت دیکھا۔ "ساڑھے پانچ بج گئے۔ ابھی تک تو آئے نہیں۔"

کیسرو بھی بولی۔ "بابو صاحب کی یہی عادت تو بُری ہے بہو جی۔ کھلانے کو سونے کا نوالہ کھلاتے ہیں مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا ہوگا۔" سنیتا نے اُسے روک کر کہا۔ "جا بھولا سے کہہ دے بازار والے کمرے میں انھیں دیکھ آئے۔"

کیسرو ایک سانس میں دوڑی گئی۔ دس منٹ بعد بھولا نے آ کر بتایا کہ بابو جی نہ جا سکیں گے۔ مہاراج اور کیسرو کو لے کر آپ چلی جائیں۔

سنیتا کا چہرہ اُتر گیا۔ شال رکھ کر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کیوں نہ جا سکیں گے؟"

"بہو جی کیا بتائیں قصور اُن کے یار دوستوں کا ہے۔ کوئی آئی ہے اس کا گانا ہوگا۔"

"جا ڈرائیور سے کہہ دے۔ کار گیرج میں رکھ دے میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں نہ جا سکوں گی۔"

کیسرو نے ایک بار پھر زور لگایا۔ مگر سُنیتا نہ گئی۔

"دو روپے دے دو بہو جی!" کیسرو کے شوہر نے دروازے پر کھڑے ہو کر شش و پنج میں پڑ کر کہا "اگلے مہینے اس کی تنخواہ میں سے کاٹ لینا۔"

"کیا ہوگا روپوں کا، مہرا؟" سنیتا نے اپنے بیمار جسم کو تکیہ کے سہارے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیسرو کی طبیعت کیسی ہے؟"

"تھوڑا فرق تو ہے بہو جی، پر ابھی پورا آرام نہیں ہوا۔ روز رات کو حرارت ہو جاتی ہے۔ اسی لئے روپے مانگ رہا ہوں۔ ویدنے بھی دانہ اور دودھ بتایا ہے۔"

"اچھا میرا منی بیگ اُٹھا دو۔ وہ سامنے الماری میں رکھا ہے۔" سُنیتا نے کہا۔ "آج رات کو ایک بار کام اور دیکھ جانا۔ اُن کے دوستوں کی دعوت ہے۔"

"اچھا۔" مہرا نے عاجزی سے پوچھا۔ "کے بجے برتن خالی ہوں گے؟ ذرا جلدی کرا دینا۔"

"تجھے کوئی اور کام ہے کیا؟"

"جی کام تو کچھ نہیں ہے۔" مہرا کچھ سوچ کر بولا "اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بہو جی۔ اس کی عادت بڑی خراب ہے۔ سردی میں بیٹھی رہتی ہے۔ میرے سوا کسی کی ہمت نہیں جو اُسے روک سکے۔ میں بھی بڑی خوشامد سے روکتا ہوں۔ زیادہ بیمار پڑ گئی تو ہم ٹھہرے غریب آدمی۔ دوا کے پیسے کہاں سے لائیں گے۔"

سنیتا کا چہرہ نہ جانے کیوں فق ہو گیا۔

"بہو جی کے بجے آؤں؟"

"جا، سویرے ہی آ جائیو۔" سنیتا نے تکیے پر سر رکھ کر کہا۔

مہرا خوش ہو کر چلا گیا۔ سنیتا چپ پڑی رہی۔ اس بیماری سے کبھی کبھی اس کا دم پھولنے لگتا۔ مگر کیا کرے؟ ڈاکٹر نے چلنے پھرنے کو منع کیا تھا۔ کل نرس بھی آ گئی ہے۔ اُسے پورا آرام کرنا چاہیئے کیونکہ وہ بیمار ہے۔ اچھی رہنے پر بھی اُسے کوئی کام نہیں رہتا۔ چوکا برتن مہری کرتی ہے کھانا مِسر پکاتا ہے۔ اوپر کے کاموں کے لئے بچو اور بھولا ہیں۔ اُسے ہر وقت فرصت رہتی ہے چاہے دن بھر ساڑھیاں بدلے یا کریم پاؤڈر لگائے یا کار پر بیٹھ کر سیر کرے۔ وہ کچھ بھی خرچ کرے۔ اونامش کبھی منع نہیں کرتا کہ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرو۔ وہ کیا کماتا ہے، کیسے کماتا ہے، دن بھر کہاں کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ سُنیتا

ان باتوں کو نہیں جانتی تھی۔ کسی بات کی فکر اُسے نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پھر بھی وہ سُکھی نہیں تھی۔ وہ سوچتی تھی۔ "میں کیا ہوں، کھلونا ہوں"۔ اس کا دل نہ جانے کیا چاہتا تھا۔ وہ ہمیشہ افسردہ رہتی ——— ہمیشہ بیمار رہتی ———

اوناش بارات میں گیا تھا۔ اس کے دوست گوپی چند کی دوسری شادی تھی۔ بارات بنارس گئی تھی۔ گھر میں سُنیتا اکیلی تھی اور بیمار ——— لیکن اوناش ڈاکٹر تو نہیں ہے۔ وہ کیا کرے اس کی بیماری کا؟ دو ڈاکٹر بدل چکے ہیں۔ نرس بھی رکھ دی گئی ہے۔ اس سے زیادہ وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ پورا انتظام کر کے گیا ہے۔ نرس بڑی قابل ہے۔ وقت پر دوا دیتی ہے۔ تین تین گھنٹے بعد ٹمپریچر لیتی ہے دو دو گھنٹے بعد سنگترے کا رس پلاتی ہے مکمل آرام دیتی ہے پھر بھی سنیتا کی پیشانی پر بل پڑے ہی رہتے ہیں۔ حد درجے کی چڑچڑی ہو گئی ہے۔ نوکروں سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ نرس کو تنگ کرتی ہے۔ بار لی پینے کے وقت منہ چھپا کر سو رہتی ہے۔ کل اُس نے دن بھر ایک بوند دودھ نہیں پیا۔ بارات میں جانے سے پہلے اوناش تیار ہو کر خود کمرے میں آیا تھا۔ "دوا پینے میں گڑبڑ نہ کرنا۔ پرہیز جاری رکھنا"۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے دن بھر دودھ نہیں پیا۔ نرس جب زیادہ بضد ہوئی تو بولی۔ "میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تم جاؤ، میری بیماری بالکل معمولی ہے۔" اسے نرس بھی جانتی ہے۔ لیکن اُسے بابو صاحب نے مقرر کیا ہے۔ وہ کیونکر جا سکتی ہے۔ اس نے دہیرے سے کہا۔ "مسٹر اوناش کہہ دیں گے تو آپ کو اور تنگ نہ کروں گی۔ اور جب تک وہ نہیں ہیں میں کیسے جا سکتی ہوں۔"

سنیتا نے اور کچھ نہ کہا۔ دانتوں میں ہونٹ دبا کر پڑ گئی اور پھر سسک کر رونے لگی۔

جاوید وششٹ

غزل

متبسم ذرہ پاسِ وفا رہتے ہیں
ورنہ ماتم تو بہت دل میں بپا رہتے ہیں

دوڑ پڑتا ہے جنوں بانگِ درا سے پہلے
بے خبر منتظرِ بانگِ درا رہتے ہیں

تیرے دیوانوں کو دنیا سے تعلق کیا ہے
تیرے دیوانے تو دنیا سے جدا رہتے ہیں

کوچۂ دوست ہے، رکھ پاؤں سنبھل کر کہ یہاں
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وفا رہتے ہیں

لالہ و گُل کے نشیمن سے اُتر کر بھی دیکھ!
خارزاروں میں ترے آبلہ پا رہتے ہیں

تیری دنیا کے لئے ہوش و خرد ہیں درکار
ہم مگر ہوش و خرد ہی سے خفا رہتے ہیں

فصلِ گُل ہو کہ خزاں، کوئی بھی رُت ہو جاوید
ہم بہر رنگِ چمن نغمہ سرا رہتے ہیں

امرتا پریتم

دُھواں اور شعلہ

ہردیو نے جب نہ بند اُتار کر پتلون پہنی اور گلے میں نکٹائی لپیٹ کر اُسے گانٹھ دینے لگا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے سات دن پہلے کا ہردیو کوئی اور ہی تھا اور آج کا ہردیو وہ ہردیو نہیں۔ سات دن پہلے کے ہردیو کو اس نے گہرا کر آواز دی "دیو"۔ دیو کے نام سے اس نے اس لئے پکارا تھا کیونکہ ہفتہ بھر برہمی اس کو دیو کہہ کر ہی پکارتی رہی تھی۔ پورا نام لینا اس کے لئے مشکل تھا۔

"ہاں ہردیو"۔ دیو کی آواز آئی۔

"مجھ سے یوں جدا ہو جاؤ گے دوست!"

"شاید ہونا ہی پڑے ہردیو! یوں بھی تو ہم ایک ہی دنیا کے رہنے والے نہیں معلوم ہوتے۔"

"کیوں میں کوئی ایسا غیر ہوں؟"

"غیر؟ ہاں غیر ہی تو کہہ سکتا ہوں۔ مجھ سے تو اب تم پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

"لباس کی تبدیلی اتنا فرق ڈال سکتی ہے؟"

"نہیں ہردیو، محض لباس کی بات نہیں۔ تم ایک مصنف ہو اور مصنف بھی ایسے، جس کا نام ہزاروں انسانوں کی زبان پہ ہے اور میرا نام...... میرا نام تو شاید برہمی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

ہردیو کو اس بات پہ دھکا سا لگا۔ اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے "دیو...... دیو میرے دوست! تم مجھ سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہو، ہزاروں لوگ میرا نام لیتے ہیں مگر مجھے کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کوئی مجھے جانتا ہے تمہارا نام کوئی نہیں جانتا صرف ایک ہفتہ تک برہمی نے ہی تمہیں تمہارے نام سے پکارا اور تمہیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ برہمی تمہیں جانتی ہے"۔ مگر ہردیو نے کچھ نہ کہا۔

"ہردیو! ایسی بھی کیا مایوسی! ہر جگہ تمہارے لئے پلکیں بچھائی جاتی ہیں ہر کالج میں تمہیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کل دھرمسالہ گورنمنٹ کالج کی طرف سے تمہارا استقبال ہونے والا ہے۔ کتنے لڑکے اور لڑکیاں تمہارے گرد منڈلائیں گی، کتنے دلوں میں تم سے دو باتیں کرنے کی تمنا ہوگی، کتنے لوگ آٹوگراف لینے کے لئے تمہارے گرد جمع ہو جائیں گے، کتنی ہی حسینائیں جب اپنے محبوبوں کو خط لکھیں گی تو تمہارے گیتوں کی زبان میں اپنے دل کی باتیں کہیں گی۔ تمہیں شاید یاد نہیں رہا کہ ایک مرتبہ جب تم اپنی سیٹ بک کرانے کے لئے کھڑکی پہ پہونچے تو تمہارا نام سن کر بکنگ کلرک کا چہرہ چمک اُٹھا تھا پلیٹ فارم پر گھومتے ہوئے لوگوں نے جب ڈبے کے باہر تمہارا نام دیکھا تو تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے تمہارے ڈبے کے سامنے اکٹھے ہو گئے تھے۔"

"کچھ نہ کہو دیو! یہ سب ٹھیک سہی، مگر اس سے دل کے خلاؤں کو تو نہیں بھرا جا سکتا۔"

"پھر؟"

"تم بھی میرے ساتھ چلو، جہاں میں رہوں، وہیں میرے ساتھ رہنا۔ مجھے اپنی مصروفیات سے جب بھی فرصت ملے گی، تم سے باتیں ہوا کریں گی میں تنہا ہوں، بالکل تنہا — ہزاروں انسانوں کے ہجوم میں تنہا میں تمہارے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ سکوں گا۔"

"مجھے تمہارا شہر، تمہاری تہذیب اور تمہارا تمدن برداشت نہیں کر سکے گا ہردیو! تم کبھی ہندوستانی شاعری کی باتیں کرتے ہو، کبھی انگریزی شاعری

اور کبھی روسی شاعری کی باریکیاں بیان کرتے ہو۔ تم انھیں مختلف ناموں سے پکارتے ہو۔ کبھی رومانی شاعری کہتے ہو کبھی کبھی حقیقت پسندانہ یا اشتراکی اور کبھی ترقی پسند اور کبھی روایتی۔ مجھے ان باتوں کا کچھ پتہ نہیں۔"

ہردیو نے سر جھکا لیا۔ بیتے دن اُسے یاد آگئے۔ برسوں سے اس کے اندر ایک آگ سی سُلگ رہی تھی، ایک دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ مگر پچھلے کچھ مہینوں سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ دھرمسالہ کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل نے اسے دعوت دی تھی کہ وہ ان کے کالج میں تین لیکچر دے۔ ایک، قدیم شاعری پر، دوسرا جدید ہندوستانی شاعری پر، اور تیسرا ہندوستانی شاعری کا دوسرے ممالک کی شاعری سے موازنہ ۔۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی تھی۔

آٹھ دن تک وہ کتابوں کے مطالعے میں غرق رہا اور اس دوران میں اس نے کتنے ہی مسودے تیار کر لئے تھے۔ پھر پندرہ دن کی فرصت نکال کر وہ دہلی کے شور و غل سے نجات پانے کے لئے دھرمسالہ کے گوشۂ تنہائی میں آ بیٹھا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دس بارہ دن تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل میں دفن افسانوں کو دہرائے، اپنے دل میں مچلنے والے جذبات کو گیتوں کا روپ دے اور پھر کالج میں تین لیکچر دے کر واپس دہلی چلا جائے۔ یہ تھا اس کا پروگرام۔

لیکن دھرمسالہ کے ہوٹل کی تنہائی میں بھی اس کو وہ سکون میسر نہ ہوا جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ اس لئے اب وہ روزانہ صبح کو کسی بس میں سوار ہو جاتا اور جہاں جی چاہتا اُتر جاتا۔ اس کے ساتھ صرف ایک چھوٹا سا تھیلا ہوتا جس میں وہ ایک ڈبل روٹی، مکھن، انڈے اور کچھ پھل رکھ لیتا۔ تھرمس میں چائے ہوتی، سیگرٹ کی دو ڈبیاں جیب میں ڈال لیتا۔ کھدر کی ایک نیلی چادر اور ہوائی تکیہ کو تہ کر کے تھیلے میں رکھ لیتا۔ جہاں جی چاہتا گھومتا، جہاں جی میں آتا اپنی نیلی چادر پھیلا کر تکیہ میں ہوا بھر کر لیٹ جاتا۔ اس طرح دن گذارتا۔ شام کے وقت کسی گاؤں کے نزدیک پہونچ جاتا اور کسی گذرتی ہوئی بس میں سوار ہو کر رات گئے تک اپنے ہوٹل میں لوٹ آتا ۔۔۔۔ اس طرح کوئی تین دن گذر سکتے اور چوتھے دن جب وہ سارا دن ایک گاؤں کے لہلہاتے کھیتوں میں گذار کر واپس لوٹنے والا ہی تھا کہ اچانک ایک پتھر پر سے اس کا پاؤں کچھ اس طرح پھسلا کہ سنبھلتے سنبھلتے بھی موچ آ گئی اور دیکھتے دیکھتے اس کی ایڑی سوج گئی۔ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا رہ گیا ۔۔ سائے ڈھل چکے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں آگے بڑھنے کی سکت نہ تھی۔

اب وہ کسی راہگیر کا انتظار کرنے لگا۔ اندھیرا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف سے کچھ آہٹ سنائی دی۔ بانس کے پیڑ کے پاس ایک لڑکی پتے توڑ رہی تھی وہ سوچنے لگا اس لڑکی کی بجائے اگر کوئی مرد ہوتا تو وہ اس سے مدد مانگتا۔ اس کے سہارے کچھ دور چل لیتا۔ لڑکی نے پتوں کا گٹھا باندھ لیا اور سر پر رکھ کر چل دی جب اس کے پاس سے ہو کر گذری تو کہنے لگی "کیوں بابو، راستہ بھول گئے ہو کیا؟"

اگرچہ لڑکی کی زبان پہاڑی تھی مگر اس کو سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوئی۔ ہردیو نے اس کو بتانے کی کوشش کی کہ اس کے پاؤں میں چوٹ آگئی ہے اور وہ چل نہیں سکتا۔ پھر اس سے کہا کہ وہ گاؤں پہونچ کر کسی آدمی کو بھیج دے۔ جس کے کندھے کا سہارا لے کر وہ گاؤں تک پہنچ سکے۔ لڑکی نے پتوں کا گٹھڑ زمین پر رکھ دیا اور ہردیو کے تھیلے کو اپنے پانی کے برتن پر لٹکا کر اس سے بولی کہ وہ اس کے کندھے کا سہارا لینے کی کوشش کرے۔ کوئی تنومند شخص بھی ہوتا تو ہردیو اس کے سہارے اتنی آسانی سے نہ چل سکتا جتنا کہ وہ اس دوشیزہ کے کندھے پر ہتھیلی رکھ کر چل رہا تھا۔ ہر قدم پر اُسے اس بات کا خیال رہتا کہ کہیں وہ زیادہ دباؤ نہ ڈالے اور دل ہی دل میں اپنے لنگڑاتے پاؤں سے جیسے عرض کرتا جا رہا ہو ۔۔ کچھ تو صبر سے کام لے۔

جب ہردیو گاؤں کے حدود میں داخل ہوا تو اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا، لڑکی اُسے اپنے گھر لے گئی۔

"میں تمھیں کیا کہہ کر پکاروں؟" ہردیو نے پوچھا۔

"میرا نام برہمی ہے بابو؟"

"تم مجھے بابو کیوں کہتی ہو؟ میرا نام تو ہردیو ہے۔"

"تمھارا نام بڑا مشکل ہے بابو۔"

"مشکل ہے، تو آسان بنا لو ۔۔۔ کہو تو بھلا دیو!!"

"دیو" برہمی نے آسانی سے کہہ دیا۔

"برہمی ۔۔ اس گاؤں میں کوئی سرائے تو ہوگی یا پھر کوئی مندر ...... میں وہیں پڑا رہوں گا۔"

برہمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کو دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا کر کے اندر چلی گئی ۔۔ کچھ دیر بعد برہمی کے باپ نے آ کر ہردیو کا بازو تھام لیا۔

" کوئی فکر نہ کرو بابو - رات ہیں یہیں ٹھہر جاؤ - تمہارا پاؤں سینک دیں گے - کل تک ٹھیک ہو جاؤ گے - "

وہ 'کل' جلدی نہ آئی - ہردیو کے پاؤں کی سوجن کوئی تین دن تک رہی برہمی کا باپ روزانہ اس کے پاؤں پر گرم تیل کی مالش کرتا اور پھر کس کر باندھ دیتا - اس دوران میں ہردیو کو یہ خیال بھی ہوا کہ وہ کسی بس والے کے ہاتھ رقعہ بھیج کر اپنے ہوٹل میں خبر دے اور کسی ڈاکٹر کو بُلوائے یا ہوٹل سے کچھ ضروری چیزیں ہی منگوائے - مگر پھر سوچا کہ ایسا کرنا برہمی کے جذبۂ خدمت کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہوگا - وہ جس چارپائی پر پڑا تھا وہیں پڑا رہا -

اپنی نیلی چادر کا اس نے تہمد بنا لیا تھا - برہمی روزانہ اس کی قمیض دھو دیا کرتی تھی - خالص اُون کے دو ٹّو برہمی کے باپ نے اس کی چارپائی پر بچھا دئے تھے برہمی کی ماں اس کے لئے چاول اُبالتی تھی ، دال پکاتی تھی اور بیٹھے کی سبزی تیار کرتی تھی - پھر بھی برہمی کو جیسے کوئی کمی محسوس ہوتی - وہ پڑوسیوں سے دھان اور مّکی کے بدلے تھوڑا سا گیہوں کا آٹا بھی لے آتی تھی اور اس کے لئے ہلکی پھلکی چپاتیاں سینکنے کا اہتمام کرتی -

چوتھے روز ہردیو کے پاؤں میں اتنی سکت آ گئی کہ وہ چارپائی سے اُٹھ کر برہمی کے چولہے کے قریب بیٹھنے لگا - گیلی لکڑیاں بار بار دھواں چھوڑتیں ، ہردیو لکڑیوں کو پھونکوں سے سلگانے کی کوشش کرتا اور برہمی چپاتیاں سینکتی جاتی -

دیوالی قریب آ رہی تھی - برہمی کی ماں اپنے کچّے مکان کی لپائی کرنے کے لئے تمام چیزیں مہیا کر چکی تھی - ہردیو کو پہلی بار پانی میں بھیگی ہوئی مٹّی کی سوندھی سوندھی سگندھ اتنی بھلی معلوم ہوئی کہ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس خوشبو کے آگے دنیا کی تمام خوشبوئیں ہیچ ہوں - آنگن کی لپائی کرتے وقت برہمی کی ماں گیرو اور رنگ گھول کر سارے آنگن میں پاؤں کے نشان بنانے لگی تو اس نے پوچھا :-

" یہ کیا برہمی ؟ "

" ماں کہتی ہے کہ یہاں پاؤں رکھ کر لچھمی آئے گی - " برہمی نے اُسے بتایا -

ہردیو کے دل میں اُس کے اِس معصوم اعتقاد کے لئے تعظیم کے جذبات اُبھر آئے - اس نے ہنس کر پوچھا :-

" سچ برہمی ، لکشمی آئے گی تو مجھے دکھاؤ گی ؟ "

" واہ لچھمی بھی کبھی دکھائی دیتی ہے - " برہمی ہنس کر بولی -

" کبھی کبھی تو دکھائی دے ہی جاتی ہے - "

" کب ؟ "

" جب وہ دکھائی دیتی ہے تو اس کا نام بدل جاتا ہے - "

برہمی اس کا منہ تکتی رہ گئی -

" کبھی کبھی اس کا نام برہمی بھی ہو جاتا ہے — " ہردیو نے کہا

برہمی کے چہرے پر حیا کی سُرخی دَوڑ گئی - اس کا چہرہ تمتما اُٹھا - ہردیو کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں - اگرچہ اُسے دنیا بھر کے مشہور مصوّروں کے شاہکار دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے - مگر ایسا پاک حُسن اس نے کبھی نہ دیکھا تھا -

برہمی کے باپ نے اپنے 'بابو' کی خاطر مدارات کے لئے ایک دن شہر سے ڈبل روٹی اور انڈے منگوائے - ہردیو لاکھ کہتا رہا کہ اب اسے مکّی کی روٹی اور اُبلے چاولوں کے سوا اور کچھ اچھا نہیں لگتا - مگر برہمی اور اس کے گھر والوں کو مہمان نوازی میں ابھی کچھ کسر معلوم ہو رہی تھی -

برہمی نے آگ جلائی - ہردیو نے توا رکھ کر برہمی کو انڈے تلنے کا طریقہ بتایا - برہمی چائے تیار کر رہی تھی - لکڑیاں بجھ بجھ جاتی تھیں - ہردیو نے کتنی ہی پھونکیں ماریں مگر لکڑیوں نے آگ نہیں پکڑی - برہمی نے زور سے ایک پھونک ماری تو دھوئیں کے بادلوں میں سے ایک شعلہ لپکا - چولہے پر جھکی ہوئی برہمی کا چہرہ منوّر ہو گیا -

ہردیو کو پہلی بار یوں لگا کہ برسوں سے اس کے دل میں جو آگ سلگ رہی تھی اور دھواں گھُٹ رہا تھا آج اُس میں کسی نے ایسی پھونک مار دی کہ وہ روشن ہو گئی - ایک شعلہ لپکا جس کی روشنی میں برہمی کا چہرہ منوّر ہو اُٹھا - اس کے لئے برہمی اب محض ایک لڑکی نہیں تھی - انسان کی پاک محبت کی زندۂ جاوید تصویر تھی -

اگلے دن برہمی نے ایک عجیب بات کی - اچانک وہ ہردیو سے مخاطب ہو کر بولی :-

" دیو بابو ، تم نے کہا تھا نا کہ لچھمی جب دکھائی دیتی ہے تو اس کا نام بدل جاتا ہے ؟ "

" ہاں "

" کیا لچھمی کبھی کبھی مرد بھی بن جاتی ہے ؟ "

یہ پہلا موقع تھا کہ ہردیو لاجواب ہو گیا تھا - وہ برہمی کا منہ تکتا رہ گیا -

ہردیو کے ہوائی تکیہ میں برہمی بڑے شوق سے منہ لگائے ہوا بھرتی تھی جب وہ بھر جاتا تھا تو ہردیو اس کے ساتھ اپنا چہرہ یوں لگا دیتا جیسے اس میں سے برہمی کی سانسیں آ رہی ہوں۔

انھیں خیالوں میں غلطاں ہردیو نے سر اُٹھایا۔ دیو اس کے پاس کھڑا تھا۔ ہردیو نے گرم سلیٹی پتلون پہن رکھی تھی اور دیو نے اپنی کمر کے گرد نیلی تہمد۔

"دیو!"

"ہاں دوست!"

"تم میرے ساتھ نہیں چلو گے؟"

"میرے لئے اور کوئی جگہ نہیں رہی ہردیو، میں یہیں رہوں گا۔"

"یہاں؟ برہمی کے گھر؟"

"میں کسی کو دکھائی تھوڑی دوں گا جو مجھے غم ہو!"

"تم یہاں کیا کرو گے؟"

"برہمی جنگل میں چشمے پر اکیلی پانی بھرنے جاتی ہے میں اس کے ساتھ جایا کروں گا۔ وہ کھیتوں میں جا کر دھان کاٹتی ہے میں اس کا گٹھڑ اٹھوایا کروں گا۔ وہ چولھے کے سامنے روٹیاں پکاتی ہے میں آگ سلگایا کروں گا۔"

"وہ کچھ عرصے کے بعد جب اپنی سسرال چلی جائے گی۔ پھر؟"

"میں اس کی ڈولی کے ساتھ ساتھ جاؤں گا۔ وہ اپنا گھر بسائے گی تو میں اُسے آراستہ کروں گا، سجاؤں گا۔"

"مگر دیو تمہارا اس کے ساتھ رشتہ کیا ہوگا؟"

"یہی تو دنیا والوں کی بُری عادت ہے کہ وہ ہر انسان کا دوسرے انسان سے رشتہ جاننا چاہتے ہیں۔ وہ انسان کو بعد میں دیکھتے ہیں اور رشتہ پہلے۔ کیا عورت کا چہرہ عورت کا چہرہ نہیں ہوتا؟ کیا وہ ضرور ماں کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ بہن کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ بیٹی کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ بیوی کا چہرہ ہونا چاہیئے؟ صرف عورت کا چہرہ کیوں نہیں رہ سکتا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو دیو! میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔"

"کم از کم تمہیں تو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیئے!"

"میں کچھ نہیں پوچھتا۔"

"آج تم نے اپنے ہوائی تکیے کو خالی نہیں کیا ہردیو؟"

"اس کو برہمی نے اپنی سانسوں سے بھرا ہے۔"

"تو پھر؟"

"جب تک ممکن ہوگا اس کی سانسوں سے ملا کر سانس لوں گا۔"

"مگر کتنے دن ہردیو! تیری دنیا کی ہوا اس دنیا سے مختلف ہے۔ وہ تہذیب و تمدن کی دنیا ہے اُس میں ہر گھڑی نفرت اور جنگ کے جراثیم پرورش پاتے ہیں اور یہ تہذیب و تمدن کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والی دنیا ہے اس میں مونج اور مکی کے خوشے سانس لیتے ہیں —— تیری دنیا کی فضاؤں میں تو برہمی کا دم گھٹ کر رہ جائے گا۔"

ہردیو نے کچھ جواب نہ دیا۔ تکیے کا پیچ کھول دیا۔

ایک لمحے میں برہمی کی سانسیں ہردیو کی سانسوں سے آزاد ہو گئیں اور مونج اور مکی کے کھیتوں سے آنے والی ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔

آب رسانی کے لئے زیر زمین پانی کی تلاش

بھارت سرکار نے زیر زمین پانی کی تلاش سے متعلق پروجیکٹ کو دوسرے پنجسالہ پلان کے خاتمہ تک جاری رکھنے کی منظوری دے دی ہے۔ اس وقت تک ملک بھر میں ۱۶ منتخب علاقوں کے ۲۸۰ مقامات پر متذکرہ قسم کا پانی تلاش کرنے کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا ہے اور اس دوران میں زیر زمین آبی وسائل کے متعلق بہت سی ایسی قابل قدر معلومات حاصل ہوئی ہیں جن کی بدولت ریاستی حکومتیں آب پاشی کی سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لئے مزید کنوئیں لگانے کا پروگرام جاری کر سکتی ہیں۔

دیش چترکار

نئی زندگی

بحرِ خیالات میں ایک لمبی ڈبکی لگانے کے بعد امجد میاں نے جب حقیقی دنیا میں آنکھ کھولی تو کالکا میل کے اس تھرڈ کلاس کے ڈبّے میں اس نے دیکھا کہ وہی یکسانیت اب بھی بالکل اسی روپ میں موجود ہے جیسی کہ ایک گھنٹہ پہلے تھی — وہی گاڑی کی تیز رفتار، وہی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور بھرے ڈبّے میں اس کے وہی بے مروّت ہم سفر جو اپنی اپنی جگہ پہلے کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے درمیان اس کی اپنی قابلِ رحم حالت — بے چارگی کا سا عالم — جیسے وہ اس خیال سے درگذر کئے جا رہا تھا کہ شاید کسی بے نیاز ہم سفر کے دل میں اس کے لئے انسانی ہمدردی کا جذبہ عود کر آئے اور اسے بیٹھنے کی جگہ نصیب ہو سکے۔ دراصل اُسے الٰہ آباد کے اسٹیشن سے گاڑی میں جگہ حاصل کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑی تھی — آدھی رات کا وقت تھا۔ منّت سماجت کرنے کے باوجود کوئی اُسے کہیں کسی ڈبہ میں بھی پاؤں تک نہ رکھنے دیتا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے ایک خدا ترس مسافر نے رحم کھا کر اُسے ڈبّے میں چڑھ آنے کی اجازت دے دی۔ لیکن ڈبّے کی اندرونی حالت دیکھ کر اُسے اور زیادہ کوفت ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ چار برتھ کے اس چھوٹے سے ڈبّے کی تینوں برتھوں پر تین بھاری بھرکم اور عظیم الجثہ حضرات لمبی تانے سوئے پڑے تھے اور چوتھی برتھ پر، جہاں کہ وہ کھڑا تھا، اگرچہ ایک اور لمبا تڑنگا مسافر دراز تھا مگر پھر بھی کونے میں تین بالشت جگہ ایسی بچ گئی تھی کہ وہاں ایک برقع پوش عورت اپنے بارہ سالہ لڑکے کے ہمراہ دُبکی بیٹھی تھی۔

امجد میاں اپنی عمر کی پچیس بہاریں پار کر چکے تھے اور برابر ایک گھنٹہ کھڑے رہنے کے باعث اب ٹانگوں میں کافی تکان محسوس کر رہے تھے۔ بے اختیار ان کا دل اپنی قابلِ رحم حالت کے سبب قریب ہی بیٹھے مسافر کی بے رُخی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرنے کو تیار ہو گیا — آہستہ سے اس مسافر کا پاؤں ہلا کر بولے — "اتنے سارے مسافر جہاں کافی دیر سے کھڑے چلے آ رہے ہیں تو آپ کو لگ بھگ ساری سیٹ پر پاؤں پسار کر لیٹے رہنا زیبا نہیں دیتا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو......"

لیکن بیشتر اس کے کہ وہ اپنی التجا پورے طور پر کہہ پاتے انھیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ کہیں بجلی کے ننگے "تار" کو چھونے کی غلطی کر بیٹھے ہیں وہ حضرت اُلٹی سیدھی باتوں کا ایک طوفان لے کر ٹوٹ پڑے اور آخر انھوں نے چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑے رہنا ہی غنیمت سمجھا۔

ٹرین پوری رفتار سے فرّاٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔ کسی جوان دل رُومان پرور مسافر کے لئے ممکن ہے باہر آسمان کے "تارے" آپس میں مسکرا مسکرا کر سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے۔ لیکن امجد میاں کے لئے گاڑی کے باہر اور اندر کا ماحول یکساں طور پر انتہائی درجہ نفرت انگیز محسوس ہو رہا تھا۔

عین اسی وقت اچانک امجد میاں کی چھپٹتی ہوئی نظر قریب ہی کونے میں دُبکی ہوئی برقع پوش عورت اور اس کے سہارے بیٹھی نیند میں کھوئے ہوئے اس کے بچّے پر پڑی جو ابھی ابھی تیز رفتار گاڑی کے ہچکولے سے سیٹ سے نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔ اگر ماں کی ممتا بھری باہیں اسے بروقت سنبھال نہ لیتیں تو یقیناً وہ نیچے گر جاتا۔ بے اختیار یہ منظر

امجد میاں کو ان کے بیتے ہوئے دنوں کی ایک سونی یاد کی طرف دھکیل لے گیا ـــــ آج سے لگ بھگ بارہ برس پہلے اگر اس کی زندگی میں ایک نامراد حادثہ ظہور پذیر نہ ہوا ہوتا تو کس قدر جدا ہوتا اس کی آج کی زندگی کا طرزِ عمل، اس کی زندگی کا وہ منحوس دن اپنی پوری نحوست کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا جبکہ اس دن بہت زیادہ شراب پی جانے کے باعث وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا ـــــ یہاں تک کہ اسی شراب کے نشے کی انتہائی بدحواسی کی حالت میں اس نے اپنی رفیقۂ حیات کو اتنا زد و کوب کیا تھا کہ اس کی بیوی ـــــ رضیہ کو ـــــ ہاں رضیہ ہی نام تھا اس کا ـــــ اسے اسی نیم پاگل پن کی حالت میں چھوڑ کنارہ کشی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بے چاری کا گناہ فقط یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسے اس بُری لت سے بچانے کی کوشش کیا کرتی تھی اس وقت اس کی گود میں چھ ماہ کا ننھا اصغر بھی تھا ـــــ اُف! کتنا بڑا ہو گیا ہوگا اب وہ! ـــــ حالانکہ چند دن بعد جب اس کے سر سے جنون اُتر گیا تو اُسے اپنی غلطی پر از حد نادم ہونا پڑا تھا اور ہر چند کوشش کرنے کے باوجود وہ اپنے خزاں رسیدہ جیون میں پھر سے بہار لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ رضیہ اصغر کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی اور اس کے میکے والے اُسے اس کوفت کدہ میں واپس بھیجنے کو ہرگز تیار نہ تھے ـــــ وہ دن اور آج کا دن ـــــ اس نے زندگی کے پچھلے بارہ برسوں کے انتہائی مایوس کن اور گھٹے گھٹے ماحول میں کبھی ایک لمحہ کے لئے مسرت کے ایک جھونکے کی سرسراہٹ تک نہ محسوس کی تھی۔ اپنے ماضی کے اس گناہِ عظیم کا خیال آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، جسم کے ایک ایک عضو میں ارتعاش سا کوند جاتا۔

وہ خیالات کی انھیں شاہراہوں پر بھٹک رہا تھا کہ اچانک اس برقع پوش کے پاس سے وہ لڑکا اُٹھ کر اس کے قریب آ کر بولا ـــــ "آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے، آیئے میری جگہ پر بیٹھ جایئے۔"

"ارے چھوٹے میاں، بھلا میں تمھاری جگہ پر کیسے بیٹھ جاؤں" امجد نے برقع پوش عورت کی طرف شکر گزار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "چھوٹا کھڑا ہے اور میں بوڑھا کھوسٹ بیٹھ جاؤں، بھلا یہ کیسے زیب دے گا مجھے!"

اور اس دوران میں اسے ایسا لگا جیسے چہرے پر پڑے نقاب میں سے اس عورت کی نگاہیں متواتر اس کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہوں۔

اور پھر نہایت ہی حلیم اور دھیمی آواز میں وہ عورت بولی۔ "آپ تھوڑی دیر سستا لیں، بچہ آپ کی گود میں بیٹھ جائے گا۔"

یہ الفاظ اس عورت نے کچھ ایسی انکساری کے ساتھ کہے تھے کہ امجد میاں انکار نہ کر سکے اور چپکے سے اس کے قریب بیٹھ کر بچے کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔

"بڑا ہونہار لڑکا ہے"۔ گھٹنوں پر بیٹھے ہوئے بچے کے گالوں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے امجد میاں بولے۔ "کیوں کیا نام ہے تمھارا صاحبزادے؟"

"جی" "اصغر ہے میرا نام"۔ لجاتے ہوئے وہ لڑکا بولا

"اصغر" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا

اور اس کے ساتھ ہی چہرے سے نقاب ہٹاتی ہوئی وہ برقع پوش عورت اُن سے مخاطب ہوئی ـ "ہاں ہاں، یہ آپ کا اصغر ہی ہے!"

"کون ـــــ؟ تم! ـــــ رضیہ!" امجد حیران و ششدر رہ گیا۔ "یا اللہ! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟" اور اس نے دیکھا کہ رضیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان پھوٹ نکلا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوتے لگا کہ وہ آنسوؤں کی خاموش زبان سے کہہ رہی ہے ـــــ "جاؤ، جس ابلا عورت پر تم نے ناحق ظلم ڈھایا تھا، اس نے تمھیں معاف کر دیا"۔ اور دوسرے لمحہ ہی شرمساری نے امجد میاں کی نگاہیں جھکا دیں۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگا۔ رہ رہ کر اسے خیال آتا۔ "کیا میں بھی اتنا خوش قسمت انسان ہو سکتا ہوں، پروردگار! کہ میری کھوئی ہوئی زندگی مجھے پھر واپس مل گئی۔ کتنا کارساز ہے تو!...." اس نے فرطِ محبت سے گود میں بیٹھے ہوئے اصغر کو کلیجے سے لگا لیا۔

لیکن خدا کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ اچانک گاڑی کو ایک ایسا شدید جھٹکا لگا کہ گھبرا کر اس نے اصغر کو مضبوطی سے باہوں میں بھینچ لیا اور آن کی آن میں اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اُسے کچھ دھیان نہ رہا۔ ہاں فقط اتنا یاد تھا کہ ہوش و حواس باختہ ہونے سے پہلے، ایک جھٹکے کے ساتھ رضیہ کی باہوں نے اُسے جکڑ لیا تھا ـــــ گاڑی ایک ہولناک حادثے کا شکار ہو گئی تھی!

امجد میاں کو جب ہوش آیا تو ان کے اوپر نیچے لوہے اور لکڑی کا ملبہ ہی ملبہ تھا۔ اصغر اب بھی اس کی باہوں کی قید میں تھا اور رضیہ کی گرفت بالکل اُسی طرح تنگ۔ اس نے محسوس کیا کہ ان دونوں کی سانسیں بدستور قائم ہیں۔ تب سہمی سہمی آواز میں اس نے اصغر سے پوچھا:

"اصغر، بیٹا! ٹھیک تو ہو ؟"

"جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اور پھر رضیہ سے مخاطب ہوا ۔" رضیہ! کہیں چوٹ تو نہیں آئی ؟"

شکر ہے اللہ تعالے کا!" جواب ملا ۔" آپ تو خیریت سے ہیں نا ؟"

" ہاں، لاکھ لاکھ شکر ہے اُس پروردگار کا — بال بال بچ گئے!"

اس کے بعد جب امجد میاں بڑی احتیاط سے اصغر اور رضیہ کو ملبے سے باہر نکالنے کا کام سرانجام دے چکے تو ایک حسرت بھری نگاہ گاڑی کے اس وجود پر ڈالی جو اب کوٹا کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا۔ خود اس کے اپنے ڈبے میں اس کے ہمراہ سفر کرنے والے مسافروں میں سے سوائے ان تینوں کے کوئی بھی موت کے خوفناک پنجے سے نہ بچ سکا تھا۔ نیتوں برتھوں پر قابض وہ لمبے تڑنگے مسافر اب بھی آرام سے سوئے پڑے تھے۔ لیکن اب ان کی نیند وقتی نہ تھی بلکہ ایک ایسی ابدی نیند میں منتقل ہو چکی تھی جس سے دنیا کی کوئی ہستی انھیں بیدار نہ کر سکتی تھی۔

رات کافی جا چکی تھی۔ آسمان پر اب بھی اکا دکا تارے ٹمٹما رہے تھے اور وہاں کا ماتمی سکون کبھی کبھی زندگی اور موت کے درمیان جدوجہد کرتے ہوئے کسی زخمی کے کراہنے کی آواز سے ٹوٹ جاتا۔

اب تو قریب کے اسٹیشن سے ریلیف ٹرین بھی پہنچ چکی تھی اور ریلیف کا کام سرعت سے ہو رہا تھا۔ سانجھی مصیبت میں انسان اپنے ذاتی تفرقات کو بھول کر ایک دوسرے کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا ہے جس کسی سے جو کچھ بن پڑا اس نے ضرورت مند کی مدد کی۔ خود امجد میاں اب مصیبت زدہ مسافروں کی مدد کرتے کرتے ہار گئے تھے۔ اتنے میں اچانک لاؤڈ سپیکر سے انھوں نے کسی کو یہ کہتے سنا۔" جو مسافر آگے سفر جاری رکھنا چاہیں اور اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہوں وہ ریلیف ٹرین میں بیٹھ جائیں۔"

" چلو، بیگم!" تب امجد میاں رضیہ سے بولے ۔" جلدی کرو، کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔"

رضیہ نے حسرت بھری نگاہ سے اپنے ڈبے کے ملبے کی طرف دیکھا اور بولی — " میرے ٹرنک اور کپڑوں کی پوٹلی کا کیا ہوگا ؟ میری سبھی قیمتی چیزیں ان میں پڑی ہیں۔"

" میں تو کہوں گا، بیگم! چھوڑو ان چیزوں کو، اچھا ہو کہ اپنی پچھلی بے کیف زندگی سے وابستہ سبھی چیزوں کو یہیں چھوڑ، ہم پھر سے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔"

جواب میں رضیہ کے لبوں پر ایک ایسی دلکش مسکراہٹ کھیل اُٹھی جو اپنا کھویا ہوا اثاثہ اچانک پا جانے کے بعد کسی کے ہونٹوں پر ناچنے لگتی ہے اور وہ چپکے سے اصغر کی اُنگلی پکڑ امجد کے ساتھ ہولی۔

ایشیا میں فولاد تیار کرنے کے کارخانے کی سب سے بڑی عمارت

سارے ایشیا میں فولاد تیار کرنے کے کارخانے کی بڑی عمارت روڑکیلا میں بن کر تیار ہو گئی ہے۔ اس کارخانے کی عمارت ۱۸ مہینوں کے مختصر عرصے میں ہی مکمل کر لی گئی ہے۔ عمارت کا رقبہ ۲۲۵۰۰۰ مربع میٹر ہے۔ اس کی لمبائی ۹۲۸ میٹر اور چوڑائی ۲۳۶ میٹر ہے۔ کارخانے کی چھت اور کرینوں کے راستے ۵۱۰ ستونوں پر قائم ہیں اس کی تعمیر کو مقررہ وقت کے اندر مکمل کرنے کے لئے جدید ترین قسم کا سامان اور فولاد کے بہت بڑے ڈھانچے استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک ہزار سے زائد وزنی آلات و اوزار اور بیک وقت ۱۱۰ ٹن تک وزن کے فولادی ڈھانچوں کو اُٹھانے کے قابل مشینیں بھی جرمنی سے منگا کر اس کارخانے کی تعمیر میں لگائی گئی تھیں۔

ملیپ چند

عورت تیری کہانی

"وقت کی بات ہے" پنڈت جی نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" برسات نہ ہوتی تو بڑے میاں تم مُفت بیں لے جانے کے لئے بھی منّتیں کرتے۔ کہ چلو اور نہ سہی تو احسان ہی سہی۔"

" ہوں وقت کی ہی بات ہے پنڈت جی! اُس وقت یہ ندی بھی ایک پتلی سی لکیر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اب سمندر دکھائی دیتا ہے سمندر، آٹھ آنے سے کم نہ ہوں گے۔ آگے آپ کی مرضی" بوڑھے ملاح نے جواب دیا اور عجب بے رُخی سے اپنا حقّہ گڑگڑانے لگا۔

"ٹھیک ہے روپیہ مانگو روپیہ دیں گے، اب تیر کر تو جانے سے رہے!" یہ کہہ کر پنڈت جی نے کندھے پر پڑے ہوئے لال رنگ کے انگوچھے کی گرہ کھولتے ہوئے آٹھ آنے کے سکّے ملاح کے آگے بڑھا دیئے۔ ملاح کی ننھی ننھی آنکھیں اپنی اس فتح پر گویا مُسکرا اٹھیں۔ اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا" آپ سے کچھ زیادہ نہیں لیا پنڈت جی۔ چار سواری اور بھی بیٹھی ہیں۔" پنڈت جی نے ان سواریوں کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔"دیکھیئے یہ پانچواں مظلوم، زمانے کا تو نہیں پر برسات کا مارا ہوا فرور، حاضر ہے۔"

پنڈت جی کے اس ٹولی میں شامل ہوتے ہی کھدر پوش نوجوان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ملاح کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔" چلیئے بڑے میاں اب دیر نہیں کرنی چاہیئے۔" ملاح نے مُرغے کی طرح گردن اُٹھا کر جواب دیا" بس۔ ایک آدھ سواری اور...." یہ فقرہ اس کے حلق میں ہی تھا کہ ایک جوان جوڑا آن پہنچا عورت کے سر پر کپڑوں کی گٹھڑی اور بغل میں دو ڈیڑھ برس کا تیر تو اربچہ تھا۔ مرد صرف اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ ملاح کے دام بتانے پر اس نے کپڑے کے میلے سے بٹوے میں سے مُسلا ہوا ایک روپے کا نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ملاح نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا" تو لے جا بیٹا۔ جلدی کر۔" پنڈت جی یہ سُنتے ہی یوں گھبرا کر اُٹھے جیسے کسی بچھو نے کاٹ کھایا ہو۔ اور تلملا کر بولے" یہ کیا۔ ایک تو چھوٹی سی ڈونگی پر بیٹھنے کو کہتے ہو۔ جوان آدمی انگڑائی لے تو کشتی اُلٹ جائے۔ اور اس پہ طُرّہ یہ کہ بغیر داڑھی مونچھ کا لونڈا چپو سنبھالے گا۔ نا بھائی نا۔ جان بوجھ کر موت کے منہ میں کودنا ہیں نے نہیں سیکھا" ملاح نے ہمت بڑھاتے ہوئے جواب دیا" گھبرایئے نہیں پنڈت جی! بڑی کشتی پر دوسرا لڑکا سامان لاد کر پار لے گیا ہے۔ اور یہ لونڈا، اللہ خیر رکھے، یہ تو ماں کے پیٹ سے ہی کشتی کھینا سیکھ کر آیا ہے۔" پنڈت جی نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے ساتھی مسافروں پر ڈالی اور ایک اطمینان کی جھلک اُن کے چہروں پہ دیکھ کر کھسیانے ہو کر بیٹھ گئے۔ کم سن ملاح نے چپو سنبھالا۔ اور اُونچی تان میں کوئی دیہاتی راگ چھیڑا۔ کشتی لہروں سے گلے ملنے لگی۔ ہوا کی سائیں سائیں، پانی کے شور اور چپو کی چھپا چھپ میں ایک انوکھا سا نغمہ اُٹھا۔ کشتی میں بیٹھے مسافروں کے سر کٹھ پتلیوں کی طرح ہلنے لگے۔ وہ عورت کچھ ڈری سی، کچھ سہمی سی، سر جھکائے اپنے مرد کے پہلو سے چپٹی بیٹھی تھی۔ بچّہ اس کی گود میں تھا۔ ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ عورت کا جی متلانے لگا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں کچھ دیر تو اس نے برداشت کیا آخر رہا نہ گیا۔ مرد کا شانہ ہلا کر دھیمی آواز میں بولی۔" دل ڈوب رہا ہے۔ چکّر آ رہا ہے۔" مرد نے یُوں گھور کر اس کی طرف دیکھا جیسے بھری برادری میں اُس نے اُس کی پگڑی اُچھال دی ہو۔ اور غُرّا کر

بولا۔"دل گھبراتا ہے تو آنکھیں بند کر لو۔ سو جاؤ۔" عورت نے بچہ مرد کے حوالے کیا اور خود اوڑھنی لپیٹ گھٹنوں میں سر دیئے گٹھڑی سی بن کر کشتی کے پیندے میں لڑھک گئی۔ کشتی کے ہچکولے پنگھوڑے کے ہلارے بن گئے۔ ذرا سی دیر میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پنڈت جی نے مرد کو مخاطب کرتے ہوئے پُوچھا۔"کیوں بھئی چودھری کیا طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں، چکر آ گیا ہے۔" چودھری نے جواب دیا۔

"اوہو۔ سچ ہے سمندر سا دکھائی دیتا ہے۔ دل گھبرا گیا ہوگا۔" پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"عورت ذات ہے، ڈر گئی ہوگی۔" بوڑھے فوجی حوالدار نے بھی فقرہ چُست کیا۔

"اجی، ان عورتوں کی بھی کچھ نہ پُوچھو۔ اتنی کمزور دل مخلوق تو شاید ہی کوئی اور ہو۔ بس چوہے نے ذرا صورت دکھائی اور اُن پر فالج گرا" نیرنگ خان پٹھاری نے بھی چونچ کھولی۔

"جناب! اگر عورتیں بھی مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرتیں۔ تو آج دُنیا کا نقشہ ہی اور ہوتا۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اسی لئے آج ہم ان کی تعلیم و تربیت کی طرف زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ علم کی روشنی ہی انھیں بے خوف و بے دھڑک بنائے گی" کھدر پوش نے لیکچر جھاڑ دیا۔

"آپ کی تعلیم کیا خاک کرے گی۔ اس کے لئے تو دھرم کا گیان چاہیئے جسم فانی ہے اور رُوح کو کوئی فنا کر نہیں سکتا۔" پنڈت جی نے بھی پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ ان کے سامنے گیان دھیان کچھ نہیں چلتا۔ خوف تو پیدا ہی عورت ذات سے ہوا ہے۔ ورنہ مرد بچہ کی کیا بات ہے۔" حوالدار نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔"کیوں پٹھاری جی؟"

"ٹھیک ہے حوالدار صاحب۔ کبھی کبھی دورے پر جانا پڑتا ہے۔ تو لاکھ سمجھانے پر بھی اس اللہ کی بندی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ڈرنے کی کیا بات ہے بے خوف ہو کر رہو۔ اللہ نگہبان ہے۔ پر کہاں جی، کبھی چوکیدار کی منتیں کرو اور کبھی پڑوسی کی خوشامدیں۔ اجی صاحب، ان کے مارے تو نہ جانے کہاں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔" خان صاحب نے جواب دیا۔

"آپ دوسرے کی بات کہتے ہیں۔ پٹھاری جی۔ پچھلی جنگ سے جب میں لوٹا۔ تو گھر آ کر ماں کو میدانِ جنگ کا حال سُنانے لگا۔ کہ اماں اولوں کی طرح گولی برس رہی تھی، کہ صاحب نے دھاوے کا حکم دیا۔ ہم سنگینیں تان کر دشمن کے مورچوں پر کچھ اس طرح ٹوٹے جیسے گِدھ مُردار پر۔ بس منٹوں میں ہی خُون کی اتنی کیچڑ ہو گئی کہ پیر جمانا مشکل ہو گیا اور ابھی ساری بات نہ سُنا پایا تھا کہ اماں بے ہوش ہو گئی۔" حوالدار صاحب نے فرمایا۔

"پچھلے جیٹھ کی بات ہے۔ نہر کے پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ بس وہ لٹھ چلا کہ کچھ نہ پُوچھو۔ سر کھل گئے اور لٹھ پھٹ گئے۔ باہر مرد تو کھنڈرے کی دھار پر چل رہے تھے اور عورتوں کو اندر دیکھ دیکھ کر ہی دورے پڑ رہے تھے۔ گنڈا سنگھ کا چھوٹا لڑکا سینے پر برچھی کھا کر تو صرف ایک مہینہ ہسپتال رہا پر اُس کی ماں کا دل کا دورہ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔" دیہاتی کسان نے جو ابھی تک خاموش تھا دُون کی ہانکی۔ اور چودھری کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔"کیوں چودھری لڑکا ہے یا لڑکی؟"

چودھری نے فخر سے پگڑی ٹیڑھی کرتے ہوئے جواب دیا۔"لڑکا۔"

بچہ ان باتوں سے بے نیاز اب تک باپ کی باہوں میں جُھول رہا تھا۔ کہ اسے حاجت ہوئی۔ باپ نے بچّے کو کمر تک پانی میں لٹکا دیا کہ اپنے آپ دُھل جائے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بچّے کو اچھا لگا اور وہ کلکاریاں مار کر کھیلنے لگا۔ کچھ دیر تک تو چودھری جُھکا ہوا اُس کی ان حرکتوں سے لُطف اندوز ہوتا رہا پھر آخر جب اُس نے بچّے کو اُوپر اٹھایا تو اُٹھایا نہ گیا۔ جیسے کسی چیز نے پکڑ لیا ہو۔ دو تین بار زور لگایا تو وہ درد سے بلبلانے لگا۔ اب تو چودھری گھبرا گیا۔ پاس بیٹھے ہوئے فوجی حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔"دیکھنا تو حوالدار صاحب بچّے کو کیا ہو گیا ہے جیسے کسی چیز نے پکڑ لیا ہو۔" حوالدار پانی میں ہاتھ ڈالنے ہی کو تھا کہ کھدر پوش نوجوان بولا۔"سنبھل کر کہیں کوئی خطرناک جانور ہی نہ ہو برسات کا موسم ہے۔" نیرنگ خاں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔"دریائی سانپ نے کہیں لپیٹا تو نہیں کس لیا۔" سانپ کا نام سُنتے ہی حوالدار نے ہاتھ یُوں اُوپر کھینچا جیسے دہکتے انگارے کو پکڑنے جا رہا ہو۔

"سانپ کی پکڑ ایسی نہیں ہوتی، کہیں تیندوا نہ ہو۔ کبھی کبھی اس ندی میں آ جاتا ہے۔ کسان بولا۔"ایں، تیندوا!" نام سُنتے ہی پنڈت جی کے ماتھے پر

پسینے کی ننھی ننھی بوندیں کچھ ایسے نمودار ہو گئیں۔ جیسے آنچ پر رکھی دیگچی کے ڈھکنے پر بھاپ کے قطرے۔ خان صاحب نے فرمایا "بڑا موذی جانور ہے، جال پھیلائے رہتا ہے۔ بس یونہیں شکار اُس کے جال میں پھنسا کہ اُس نے دبوچا اور کم بخت کا تار ایسا ہے کہ کسی دھار سے نہ کٹے یا اللہ" اور وہ جل تُو جلال تُو آئی بلا کو ٹال تُو کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ کم سن ملاح نے جسے کشتی کا تجربہ زیادہ مگر زندگی کا کم تھا۔ گھبرا کر کشتی روک لی۔ کسی کی بھی ہمت پانی میں ہاتھ ڈالنے کی نہ پڑ رہی تھی۔ بچہ بدستور رو رہا تھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ جھٹکا لگے اور کشتی ہی اُلٹ جائے۔" گھبرا کر کھدر پوش نوجوان نے کہا۔ "اور کیا ہوگا۔ بچے کو اوپر اٹھا نہیں سکتے۔ جانور مار نہیں سکتے بچے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کشتی نہ اُلٹے گی تو اور ہوگا کیا۔ ابھی میں کہتا ہوں ہم سب کی جانیں کیا اتنی سستی ہیں۔" پنڈت جی نے ایک ہی سانس میں ہانپتے کانپتے سب کچھ کہہ ڈالا۔ "ہاں ہاں چودھری تم ندی میں کود پڑو۔ تیرنا تو تم جانتے ہی ہو۔۔۔۔۔۔" بیچ میں بات کاٹ کر کسان بول اٹھا۔ "ایک ساتھ جانور دو پر حملہ نہیں کرتا۔" "یہی تو میں کہہ رہا تھا، ہم کنارے سے مدد لے کر آتے ہیں، اُس کی ذات پر بھروسہ رکھو تو گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی بال بیکا نہیں ہوتا۔" مولا داد نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ پر چودھری کے ہاتھ کانپ رہے تھے

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والی بات تھی۔ پانی میں کودنا تو کجا ہاتھ تک تو ڈالا نہ جاتا تھا۔ اس ہنگامے نے عورت کو جگا دیا۔ وہ بوکھلا کر اٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مرد کو دیکھنے لگی۔

"بچے کو کسی جانور نے پکڑ لیا ہے۔ دھلانے کے لئے میں نے ندی میں لٹکایا تھا۔" ہکلاتے ہوئے چودھری نے کہا۔ یہ سنتے ہی عورت کا رنگ پہلے تو ہلدی کی طرح زرد ہو گیا اور پھر تپے ہوئے تانبے کی طرح سُرخ۔ اُس نے لپک کر اپنے دونوں ہاتھ پانی میں ڈال دیئے۔ سب نے سانس روک لی۔ دوسرے لمحہ بچہ اُس کی گود میں تھا۔

"ایں یہ کیا۔" پنڈت جی نے پوچھا، عورت نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ کشتی کے ساتھ لگی ہوئی ایک زنجیر سے بچے کا پاؤں اُلجھ کر رہ گیا تھا۔" ملاح نے چپّو سنبھالا۔ کشتی پھر لہروں سے گلے ملنے لگی۔ بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے لگا ہوا دودھ پی رہا تھا۔ چودھری نے پگڑی سیدھی کر لی۔ عورت کا سر اب بھی جھکا ہوا تھا۔ کٹھ بیلیوں کے سر پھر سے ہلنے لگا۔ انوکھا ساز اب بھی گونج رہا تھا۔ اور چپّو کی چھپا چھپ میں ماں کی تھپکیوں اور ہوا کی سائیں سائیں سے ماں، ماں کی آواز آنے لگی۔

کشمیر کے سونہ واری علاقے میں ترقیاتی سرگرمیاں

وزیر اعظم کشمیر کی ذاتی رہنمائی میں پُرجوش نوجوان افسروں کی ایک جماعت عوام کے تعاون کے ساتھ اس علاقے کی ترقی کے کام میں مصروف ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ سونہ واری کا ترقیاتی بلاک شاندار کامیابی حاصل کرے گا۔

اس بلاک کا گذشتہ سال اکتوبر میں افتتاح ہوا تھا اس کا بڑا کام یہ ہے کہ بے کار زمین کو زرعی فارم کی صورت میں بدل دیا جائے۔ یہ کام ریاست کے پنج سالہ پلان میں بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ نئے اسکول قائم کرنے، ترکاریوں کی کاشت، پھلوں کی پیداوار، موسم سرما کی کاشت کاری ڈیری فارم اور مچھلیوں کی پرورش کی اسکیمیں بھی چل رہی ہیں۔

گرام پنچایتوں کو پھر سے سرگرم عمل بنا دیا گیا ہے اور امداد باہمی کے ذریعے کسانوں کو قرضہ اور اجناس کی فروخت کے لئے سہولتیں پہنچائی جا رہی ہیں۔

نئی کتابیں اور رسالے

انتخاب دیوانِ مومن

حامد حسن قادری۔ ناشر انجمن ترقیٔ اردو (ہند) علی گڑھ۔ مع شرح قیمت ۵۰ء۳ روپے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، ضخامت ۲۰۸ صفحات، کتابت طباعت، جلد، جلدپوش عمدہ

کتاب کے آخر میں قادری صاحب نے قطعۂ تاریخِ تالیف لکھا ہے۔ اس سے کتاب کی شانِ نزول پر روشنی پڑتی ہے ؎

جو شعر نکلے شایانِ مومن — جن میں نمایاں تھی شانِ مومن
سب لکھ کے میں نے تاریخ لکھ دی — "خاص انتخابِ دیوانِ مومن"
۱۹۵۴

مومن کے دیوان کا ایک ستھرا انتخاب ہے۔ اشعار کی شرح و تنقید سے مومن کے کلام کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔ قادری صاحب رموزِ شعر اور فنِ شاعری کے ماہر ہیں۔ انھوں نے مومن کی نکتہ آفرینیوں کو بڑی سلیس اور سادہ زبان میں جگہ جگہ اجاگر کیا ہے مثلاً

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

"اس مطلع کا جواب نہیں۔ مومن خاں کا نشتر ہے 'کس بیکسی سے' نہ کہتے جب بھی مطلب پورا تھا مگر بیکسی کہہ کر کیا درد بھر دیا۔ یعنی ہمارا کون ہے جس سے ہنسیں بولیں۔"

انجم کدہ

عزیز لکھنوی مرحوم کی غیر مطبوعہ غزلیات کا مجموعہ۔ شائع کردہ انجمن ترقیٔ اردو ہند علی گڑھ۔ قیمت ۳ روپے۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت اچھی، کاغذ اوسط، جلد اوسط، جلدپوش عمدہ۔ طباعت اچھی

عزیز مرحوم کا نام اردو شاعری کے دلدادگان کے لئے نیا نہیں۔ دورِ متاخرین کے بعد ایک زمانے تک لکھنؤ کی بزمِ سخن ان سے آراستہ رہی۔ جوش ملیح آبادی، اثر لکھنوی، جگت موہن لال رواں، گوپی ناتھ امن عزیز مرحوم کے شاگردانِ عزیز ہیں۔ ایسے قادر الکلام اُستادِ سخن کے غیر مطبوعہ کلام منظرِ عام پر آگئے یہ بڑی غنیمت بات ہے۔

کیمیاگر

پروفیسر محمد مجیب کے افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۱۵۲ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت طباعت عمدہ۔

مجیب صاحب کے آٹھ افسانے اس کتاب میں شامل ہیں۔ مصنف کا قول ہے کہ معمولی گفتگو اور معمولی واقعات کے ذریعے سے قصے کے اشخاص کی سیرت پر روشنی ڈالی جائے اور ان کی زندگی کا ایک ہی واقعہ اس طرح بیان کیا جائے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں ان کی پوری زندگی کی تصویر پھر جائے۔ ان کے اس معیار پر یہ افسانے پورے اُترتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ حسبِ سابق یہ حسنِ قبول کی دولت سے مالامال ہوں گے۔

دیا جلے ساری رات

خواجہ احمد عباس کے نو افسانوں کا مجموعہ۔ پبلشر مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت عمدہ۔ خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے متعدد مجموعے

اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی روسی، جرمن اور چیک زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اس مجموعے کا افسانہ 'دیا جلے ساری رات' 'آج کل' ہی میں شائع ہوا تھا۔

تلوک چند محروم

مرتب جگن ناتھ آزاد، ناشر ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ۔ ضخامت ۲۷۶ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت، طباعت، کاغذ، اوسط، جلد، جلد پوش عمدہ۔ قیمت چار روپے۔

محروم صاحب کا نام اردو شعراء کی فہرست میں بہت اونچے مقام پر ہے۔ نصف صدی سے بھی زیادہ مدت سے آپ اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے اردو نظم کے گیسو کو ہر انداز سے سنوارا ہے۔ نظم، غزل، رباعی، قطعہ جملہ اصنافِ سخن میں آپ نے دادِ سخن دی ہے۔ اس کتاب میں آپ کے فن اور تخلیقات سے متعلق مختلف اصحاب کے ۴۳ مضامین شامل ہیں۔ ان میں سر عبدالقادر، برج موہن دتاتریہ کیفی، جوش ملسیانی، دیا نرائن نگم قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب میں محروم صاحب کی چار تصویریں بھی شامل ہیں۔ ۱۹۰۷ء کی ایک تصویر بڑی نادر ہے۔

سحرِ غزل

ساحر ہوشیارپوری کا مجموعۂ غزلیات۔ ناشر حلقۂ اربابِ ادب ۸۲۸ پل بنگش دہلی۔ ملنے کا پتہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی۔ قیمت تین روپے کاغذ، کتابت، طباعت، جلد عمدہ۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

ساحر ہوشیارپوری جناب جوش ملسیانی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ شروع میں جوش صاحب نے دعائیہ کلمات تحریر فرمائے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ابتدائیہ میں ساحر کی زندہ دلی اور خوش وقتی پر رشک کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں سبک جذباتی مٹھاس اور بے ساختگی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے ساحر کو داغ اور جوش ملسیانی کی شاعری کی ارفع و صالح روایات کا امانت دار بھی قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ساحر کی غزلوں میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی بڑی فن کارانہ آمیزش ہے۔ جوش ملیح آبادی جو 'معرکۂ غزل' میں پہلنے کے باوجود غزل کو غیر فطری صنفِ شاعری قرار دیتے ہیں ساحر کی غزل گوئی کے معترف ہیں۔ لیکن بیس صفحے کے طویل دیباچے میں بسمل سعیدی صاحب نے کچھ اس انداز سے سحرِ ساحر کی داد دی ہے کہ خود ہمیں رشک آتا ہے ؎

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیما را

ساحر نے لکھا ہے ؎

پرواز پہ دل کی متحیر ہیں مہ و مہر
کیا تو نے اس طائرِ بے پر نے دکھائے

روسی راکٹ چاند تک جا پہنچا۔ چاند کا نور سورج کا مرہونِ منت ہے اس لئے چاند کے تسخیر کے ساتھ سورج کا تسخیر بھی وابستہ ہے۔

ساحر کا کلام زندگی اور اس کی کیف آفرینیوں کا مرقع ہے۔ بلکہ یوں کہیئے ساحر کی زندگی ہی ساحر کا کلام ہے۔ اس عشق گزیدہ شاعر کی زندگی کیا ہے اس کی کیفیت کون جانے۔ لیکن خطرہ تو یہ ہے کہ ساحر کا ذوقِ عشق ابھی تشنہ ہے ؎

ساحر جہاں ملا تھا خرد کو جنوں کا درس
جی چاہتا ہے پھر اسی محفل میں جا رہوں

کتاب میں تصویریں بھی ہیں اور ہر صفحہ دو رنگ میں چھپا ہے۔

گنگ و جمن

نذیر بنارسی کا مجموعۂ کلام۔ ضخامت ۲۵۶ صفحے۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کی تقطیع۔ قیمت ۴ روپے ۵۰ نئے پیسے۔ ناشر غالب اکادمی، مدن پورہ بنارس، کتابت کاغذ، طباعت، جلد عمدہ۔

نذیر بنارسی جانے پہچانے شاعر ہیں۔ احتشام حسین اور فراق گورکھپوری نے تعارف اور دیباچہ لکھا ہے۔ نذیر کی شاعری کا جزوِ اعظم اس کا خلوص ہے وطنی نظموں میں خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے بڑا جوش و خروش دکھایا ہے۔ نذیر بنارس کے رہنے والے ہیں۔ ہندی کے میٹھے اور پیارے الفاظ انھوں نے بکثرت استعمال کئے ہیں

ہنستا پربت ہنس مکھ جھرنا
پاؤں پسارے گنگا جمنا
گودی کھولے دھرتی ماتا

میرا تو اس استھان یہی ہے   پیارا ہندوستان یہی ہے

بے موت نہ جانے کتنوں کو اس لال پری نے مارا ہے
مورکھ نہ جلا جیون سمپت یہ دارا نہیں اگنی دھارا ہے

غزلوں میں ان کے بڑی سادگی ہے۔ یہ شعر میر کے رنگ کا ہے

ماہ وشوں کی بھیڑ لگی ہے
وہ بھی اسی میں ہو تو عجب کیا

اور اس میں مومن بول رہے ہیں

خفا ہوتے ہو کیوں ذکرِ وفا پر
کسی نے کہہ دیا ہے بے وفا کیا

نذیر کا کلام زیادہ تر خلوص پر مبنی ہے۔ فنّی اعتبار سے کہیں کہیں اگر اسقام نظر آ جائیں تو اس سے شاعر کی خوش گوئی پر حرف نہیں آتا بلکہ وہ اس کا مظہر ہے کہ ؎

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست

موصولات

دکھ سکھ۔ چندر کانت جوشی کے گیتوں کا مجموعہ۔ ناشر وجے کانت جوشی بھرآنا پیر مٹھا جموں توی۔

شرارے۔ پنڈت خوشدل دہرہ دون کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ۔ پنڈت خوشدل ایڈیٹر دلیش سیوک دہرہ دون۔

کیمپ فائر کی نقلیں حصہ اوّل و دوم۔ قیمت ہر ایک حصے کی بارہ آنے،

انوکھا عجائب خانہ حصہ اول، دوم، سوم، چہارم قیمت ہر ایک حصے کی پچاس نئے پیسے۔ سوائے دوسرے حصے کی جس کی قیمت ۴۰ نئے پیسے ہے۔

چنبیلی۔ قیمت پچاس نئے پیسے

لال مرغی۔ قیمت پچاس نئے پیسے

(مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی بچوں کے لئے دل چسپ اور مفید کتابیں)

بہار و خزاں۔ جناب غیرت مورانوی کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔ یہ کتابچہ مصنف سے معرفت لکھنؤ زردہ اسٹور ساہجی بازار جمشید پور مل سکتا ہے۔ سیّد عبد العزیز صاحب عزیز اور سیّد شاہ محمد عمیر صاحب نے مقدمہ اور تعارف لکھا ہے۔ خوبیٔ کلام کے اعتبار سے مجموعہ قابلِ التفات ہے۔

رسالے

دلّی کالج میگزین۔ دلّی نمبر۔ ۳۸۴ صفحوں پر مشتمل یہ شمارہ دلّی سے متعلق نہایت دل چسپ معلومات پر مشتمل ہے۔ لکھنے والوں میں ڈاکٹر عبدالحق، ملاّ واحدی، آغا اشرف، مرزا محمود بیگ، آغا حیدر حسن مرزا، خواجہ احمد فاروقی، برجموہن دتاتریہ کیفی، قاضی عبد الودود، خواجہ حسن نظامی اور بہت سے ادیب شامل ہیں۔ تاریخی، سماجی اور ادبی موضوعات پر بڑی گراں قدر تحریریں اس شمارے میں شامل ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔

خیال۔ فیض انصاری صاحب کی ادارت میں یہ ادبی رسالہ کامٹی (ناگ پور) سے بڑی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔ چندہ سالانہ ۶ روپے۔ ملک کے ممتاز ادباء اور شعراء کی تخلیقات اس میں شائع ہوتی ہیں۔

سریتا۔ ایڈیٹر وشوناتھ، یہ مصوّر رسالہ حال ہی میں جاری ہوا ہے۔ ملنے کا پتہ۔ دلّی پریس جھنڈے والاں اسٹیٹ رانی جھانسی روڈ نئی دہلی قیمت فی جلد ایک روپیہ، سالانہ چندہ دس روپے۔ کتابت و طباعت بہت اچھی۔ اگست کا شمارہ ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مضامین، افسانوں، فیچرز اور نظموں میں کافی تنوع ہے۔ عام دل چسپی اور بقول خود سماجی تعمیر نو کا ترجمان یہ رسالہ افقِ صحافت پر ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح اُبھرا ہے۔

کشمیر ٹوڈے (ٹورسٹ نمبر) Kashmir Today (Tourist Number)

انگریزی زبان کا یہ مصوّر رسالہ سری نگر سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ملنے کا پتہ لالہ رُخ پبلیکیشنز سری نگر، کشمیر۔ قیمت یا چندہ رسالے پر درج نہیں۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھیے۔

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ اُن کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

زرعی زمین میں اضافے کی مہم

بھارت سرکار کے اعداد و شمار کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ ۱۹۵۴ء میں ملک کی ۱۱ کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ زمین ایسی ہے جسے قابلِ کاشت بنایا جا سکتا ہے۔ اس میں وہ زمین شامل نہیں ہے جس پر پہلے کاشت کی جاتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے بنجر پڑی ہے۔ لیکن ملک کے کم وسائل کی وجہ سے اس کا بہت تھوڑا سا حصہ ہی کاشت کے قابل بنایا جا سکے گا۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ اس زمین کو قابلِ کاشت بنانے پر جو خرچ آئے کم سے کم آسانی سے حاصل کیا جا سکے گا یا نہیں۔ اس کا یہ اندازہ تھا کہ کل ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ زمین ہی قابلِ کاشت بنائی جا سکتی ہے

۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ایکڑ زمین بہت ہوتی ہے حالانکہ وہ موجودہ کاشت کی زمین کا ۱۲واں حصہ ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس زمین پر پہلے کبھی کاشت نہیں کی گئی اس لئے وہ زمین ہماری اس زمین سے جس پر ۳۰ صدیوں سے لگاتار کاشت کی جا رہی ہے زیادہ زرخیز ثابت ہوگی۔ یہ نئی زمین کسی طرح کے قانون کی پابندی میں بھی نہیں ہوگی جیسا کہ ہماری موجودہ قابلِ کاشت زمین ہے۔ بھارت کے اناج کے مسئلے پر فورڈ فاؤنڈیشن کے ماہرین نے حال ہی میں اپنی ایک شائع شدہ رپورٹ میں اس طرح لکھا ہے "یہ کہا جا سکتا ہے کہ کئی کروڑ ایکڑ زمین جسے زرخیز بنایا جا سکتا ہے آج استعمال میں نہیں آ رہی ہے۔ اس طرح کی زمین ملک کے زیادہ تر حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ وہ زمین قابل کاشت بنا کر کسانوں کو دے دی جائے اور اس طرح ملک کے پیچیدہ اناج کے مسئلے کو سلجھانے میں مدد مل جائے۔"

"ساتھ ہی زمین کی اصلاح و ترقی کے نئے منصوبوں اور گاؤں کی زمینوں کی چک بندی کے ذریعے بھی ہمیں سہولتیں حاصل ہوئی ہیں جس سے کہ ہم سنچائی کے پانی وغیرہ کا صحیح انتظام کر سکیں گے اور اس طرح ہماری پیداوار میں کافی اضافہ ہو سکے گا۔ اس منصوبے کے تحت کھیتوں کی حد بھی نئے ڈھانچوں کے مطابق رکھی جا سکے گی۔" یہ رپورٹ ۱۹۵۹ء میں لکھی گئی تھی لیکن بے کار زمین کو قابلِ کاشت بنانے کی اہمیت کو ہم نے بہت پہلے ہی سمجھ لیا تھا اور پہلے پنجسالہ پلان کے کاشت سے متعلق پروگرام کے مطابق زمینی اصلاح کے پروگرام کو خاص جگہ دی گئی تھی۔ اس کام کو پورا کرنے کے لئے ایک سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن اور ریاستی ٹریکٹر آرگنائزیشن بنائی گئی تھی۔

پہلے منصوبے میں ۷۱ لاکھ ایکڑ زمین کو کھیتی کے قابل بنانے کا پروگرام تھا جس میں سے لگ بھگ ایک تہائی سے کچھ زیادہ کام سرکاری ٹریکٹر آرگنائزیشنوں کو کرنا تھا اور باقی نجی زمین مالکوں کو۔ نجی زمین مالکوں نے کتنی زمین قابلِ کاشت بنائی اس کے اعداد و شمار مہیا نہیں ہیں لیکن سرکاری ٹریکٹر آرگنائزیشن اپنے نشانے سے کہیں آگے بڑھ گیا یعنی اس نے ۲۷ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ زمین کو قابلِ کاشت بنایا۔

دوسرے منصوبے میں ٹریکٹر آرگنائزیشن نے پہلے جیسی کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر ٹریکٹر اب بیکار ہو چکے تھے اور ان کی جگہ نئے ٹریکٹر خریدے نہیں گئے تھے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن نے جس زمین کو قابلِ کاشت بنایا اس میں زیادہ تر زمین میں کانس کھڑی تھی۔ ٹریکٹروں سے کچھ جنگل بھی صاف کئے گئے۔ پچھلے سال بھاری گڑھوں اور کھنڈراؤں والی زمین کو قابلِ کاشت بنانے کا کام بھی شروع کیا گیا۔ سنٹرل ٹریکٹر آرگنائزیشن جون ۱۹۵۹ء میں بنائی گئی تھی۔ اس نے جون ۱۹۵۸ء سے اب تک ۱۶ لاکھ ایکڑ کانس والی زمین اور ۶۱ ہزار ایکڑ جنگلی زمین قابل کاشت بنائی۔ اس میں ریاستی ٹریکٹر آرگنائزیشن کا کام بھی شامل ہے۔

زمینی اصلاح کے اس کام کے بارے میں خاص بات یہ ہے کہ قابلِ کاشت بنائی گئی زمین میں سے ۹۵ فی صدی میں کاشت شروع کر دی گئی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس زمین سے ہر سال ڈھائی لاکھ ٹن سے کم اناج حاصل نہیں ہوتا۔

مِل جُل کر کام کرنے کا معجزہ

ایک دُوسرے کی مدد کرنے کا جذبہ اور کام کی دُھن ہو تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ اُتر پردیش کے میہانی گاؤں میں چار عورتوں نے کنوّاں کھود کر کمال ہی تو کر دیا ہے۔

اِس گاؤں میں پانی کی بڑی قلّت تھی۔ عورتوں کو میلوں دُور سے پانی لانا پڑتا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے مِل جُل کر اپنے گھروں کے قریب کنوّاں کھودنے کا پروگرام بنایا۔ مردوں نے اسے ناممکن سمجھ کر ٹال دیا لیکن چار دُھن کی پکّی اور لگن کی سچّی عورتیں کام میں جُٹ گئیں۔ ساٹھ فٹ کی گہرائی پر جب کہیں جا کے پانی مِلا تو عورتوں کے چہرے مارے خوشی کے چمک اُٹھے اور مرد ہکا بکّا رہ گئے۔

میہانی کی عورتوں کے اس کارنامے سے آس پاس کے گاؤں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

پلان کی مدد اپنی مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجئے

میل جول اور تعاون سے نہ صرف جیون سُکھی بنایا جا سکتا ہے بلکہ سماجی فلاح کے کام بھی کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے قوم کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے۔

ترتیب

سرورق :۔ کانگڑہ فنِ مصوری کا ایک شاہکار
رسالے کی پشت پر :۔ وادیٔ کلو کی ایک دوشیزہ۔

اگرہائن شک سمت ۱۸۸۱

دسمبر ۱۹۵۹ء

جلد ۱۸ - نمبر ۵

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ:— { ہندوستان میں - چھ روپے / پاکستان میں - چھ روپے (پاک)

غیر ممالک سے :— نو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ :— { ہندوستان میں ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں - آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر آج کل اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

۲۴- اکتوبر کو دنیا بھر میں یومِ اقوامِ متحدہ منایا گیا۔ مجلسِ اقوامِ متحدہ اور اس کے خصوصی اداروں نے اقوامِ عالم کی مجموعی فلاح و بہبود کے لئے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابلِ ستائش ہے۔ امنِ عالم کے لئے اقوامِ متحدہ کی مساعی بہت حد تک بار آور ہوئی ہیں اور آج خیال و فکر میں تضاد ہوتے ہوئے بھی اقوامِ عالم میں ایک دوسرے سے قریب آنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہندوستان شروع سے ہی بقائے باہمی اور عالمی امن کا حامی رہا ہے اور اسی راستے پر مضبوطی سے گامزن ہے۔ صدرِ جمہوریۂ ہند نے اس موقعہ پر اپنے پیغام میں کہا ہے کہ ہم حتی المقدور اس عالمی تنظیم کو مستحکم کرنے کے لئے اپنی جد و جہد جاری رکھیں گے۔ اور اس کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ کامیابی کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہیں گے۔

پچھلے دنوں ہند و پاکستان کی مشرقی سرحد کے بارے میں دونوں ملکوں کے رہنماؤں میں کامیاب گفتگو ہوئی۔ دونوں طرف سے جذبۂ خیر سگالی کا مظاہرہ ہوا اس گفتگو کے بعد ہندوستان اور مشرقی پاکستان کے تین خاص سرحدی تنازعوں پر متفقہ فیصلے ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی سرحدی پہرہ داروں کے ضابطۂ کار کی بھی تفصیلات طے ہو گئی ہیں۔ مشترکہ اعلان میں دونوں ملکوں کے اخباروں سے کہا گیا ہے کہ وہ صبر سے کام لیں اور دونوں ملکوں کے دوستانہ تعلقات کو بڑھائیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان دیگر مسائل مشترکہ وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر 'لین دین' کے جذبے سے طے ہو جانا چاہئیں۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ دونوں ملکوں کے مسائل خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو جائیں گے۔

امسال بھی آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے "سنگیت سمیلن" کا انعقاد ہوا۔ یہ سمیلن گذشتہ چھ سال سے ہو رہے ہیں جن کی وجہ سے ملک میں موسیقی کو مقبول عوام بنانے میں بڑی مدد ملی ہے اس طرح نہ صرف ماہرینِ موسیقی کی بلکہ نوخیز موسیقاروں کی بھی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ عام لوگ بھی اچھی موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے صحیح ذوق کی تربیت ہوتی ہے۔ جیسا کہ صدرِ جمہوریہ نے سنگیت سمیلن کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا۔ سنگیت نہ صرف افراد کے لئے مفید ہے بلکہ یہ سماج کے لئے بھی فائدہ مند ہے۔ دورِ حاضر کو سماج کا عہد کہا جا سکتا ہے اور آج ہر قسم کی سرگرمیوں میں اجتماعی کوششوں سے ہی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سنگیت ان اجتماعی کوششوں کو قوت بخشنے کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔

تبت میں سیاسی حالات کی تبدیلی کے بعد چین اور ہندوستان کی سرحد کے متعلق متعدد پیچیدگیاں رونما ہوئی ہیں جن کی عام طور پر ذمہ داری چین ہی پر ہے۔ شمال مشرقی سرحدی ایجنسی (نیفا) سے لے کر لداخ تک دو ہزار میل لمبی سرحد دشوار گزار بلکہ ناقابل گزر علاقوں پر مشتمل ہے۔ چین نے میک ماہن لائن کو ماننے سے انکار کر کے بین الاقوامی معاہدات کی اساسی حیثیت پر ضرب لگائی ہے۔ لداخ میں تو ہندوستانی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اُتار کر چینی سپاہیوں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ان تمام ہنگاموں کے باوجود حکومتِ چین یہ اعلان کر رہی ہے کہ وہ سرحد کے معاملے میں گفت و شنید سے مصالحت کرنے پر ہر وقت آمادہ ہے۔ حکومتِ ہند کا رویہ تو ہمیشہ مصالحانہ رہا ہے۔ ان اشتعال انگیز حادثوں کے باوجود بھارت سرکار نے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جس سے جھگڑا بڑھے۔ ان حالات میں ہمیں امید رکھنا چاہیئے کہ وقتی جھگڑوں کے فیصلے کے بعد ہندوستان اور چین کی دوستی صرف بحال ہی نہیں رہے گی بلکہ استوار تر ہو جائے گی اور یہ دونوں عظیم ملک ایشیائی ملکوں کی ترقی و بہبود میں شریکِ کار رہیں گے۔

فراق گورکھپوری

غزل

نہ وہ رنج ہی ہے نہ وہ سرخوشی ہے
فقط مقصدِ زندگی پختگی ہے[1]

زمانے میں جس کو تری یاد کہیے
وہ کچھ عمر میں زندگی سے بڑی ہے

غم آپس میں ہم رشتگی کا ہے باعث
حیاتِ بشر آنسوؤں کی لڑی ہے

وہ مقصد نہ وہ ہے جو ہے نا مکمل
ارے مقصدِ عشق بے مقصدی ہے

جہاں منتقل وہ ہوئی حسن کے نام
وہیں دوستی دشمنی بن گئی ہے

نہ بھٹکائے کیوں سب کو شہرِ نگاراں
کہ یہ شہر نزدیک بھی دور بھی ہے

زہے یادِ جاناں مرے دل میں غم کی
گھٹا چھا رہی ہے غزل ہو رہی ہے

کسی نے کبھی اس کو ہنستے نہ دیکھا
یہ واعظ بھی یارو عجب آدمی ہے

محبت کی تفسیر کیا پوچھتے ہو
رہائی بھی ہے اور زنجیر بھی ہے

بڑے انقلاب آئے عالم میں لیکن
ترا اے غمِ عشق عالم وہی ہے

جو مشہور ہے نام سے اس نظر کے
وہی زندگی ہے وہی موت بھی ہے

اسے بھی تو دیکھو سرِ بزمِ ہستی
وہ اک شمع جو آج تک جل رہی ہے

کبھی کھوئی کھوئی کبھی سوئی سوئی
تری انکھڑیوں کی بھی کیا زندگی ہے

جو ممکن ہو یارو غزل میری سن لو
کہ فنِ غزل کا یہ دورِ آخری ہے

اسے خود کو پہچاننے میں لگا دو
فراقؔ اب جو کچھ زندگی بچ رہی ہے

[1] Ripeness is all — Shakespeare

فیض الرحمٰن اعظمی

فانی میری نظر میں

فانی کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابھی تک صحیح معنوں میں ان کے شاعرانہ مرتبے کا تعین نہیں ہو سکا ہے اور ان کی شاعری پسند اور ناپسند کی ذاتی گورنج ہی میں مقید ہو کر رہ گئی ہے۔ اس حد تک تو کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ فانی کی شاعری کا محور غم ہی تھا۔ لیکن اس غم کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اس کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کہاں تک اس کا تعلق زندگی سے تھا اور کہاں تک یہ محض رسمی اور روایتی تھا۔

بظاہر فانی کے غم جاوداں کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی زندگی کے حالات میں بھی جہاں تک وہ روشنی میں آ سکے ہیں کوئی ایسا نشان نہیں ملتا ہے جسے ہم ان کی مستقل افسردگی کا باعث سمجھیں۔ پھر یہ سوال بھی اپنی جگہ پہ غور طلب ہے کہ کیا کوئی نشان مستقل افسردگی کا باعث ہو بھی سکتا ہے۔ زخم اگر کریدا نہ جائے تو بھر جاتا ہے لیکن مسلسل کریدنے سے اچھی جگہ بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں فانی کی زخم کاری دوسرے ہی قسم کی تھی۔ مجھے یہ اکتسابی معلوم ہوتی ہے۔

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

لیکن اکتسابی ہونے کی وجہ سے کسی چیز کی قدر و قیمت کچھ کم نہیں ہو جاتی اور نہ ہی کسی بنیادی محرکانہ جذبے کی اصلیت و جوش پر بعد کے تجربات کا دار و مدار ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شخصیت کی نشو و نما کے لئے خارجی محرکات کی ضرورت ناگزیر ہے، لیکن کچھ دور جانے کے بعد انھیں کی موجودگی سے شخصیت کے ارتقا میں مزاحمت بھی ہونے لگتی ہے۔ بعد کی منزلوں کو سر کرنے کے لئے داخلی محرکات ہی کی احتیاج ہوتی ہے اور یہ محرکات خارجی محرکات سے آشنا بھی رہ سکتے ہیں اور بیگانہ بھی۔ میر کے عشقیہ اشعار میں اس محبت کی ناکامی کا اظہار نہیں ہے جس سے انھیں کبھی جوانی میں دوچار ہونا پڑا تھا۔ یہ دل کے اس سوز و گداز اور ذہن اور روح کی ان عظمتوں اور گہرائیوں کا نتیجہ ہے جو میر کا اپنا اکتساب ہے۔ میر کے جگر میں جو خراش ہے وہ انھیں کے ناخنوں کی مرہونِ منت ہے۔ انھیں داخلی محرکات کے فقدان کی وجہ سے اردو کی جدید عشقیہ شاعری اپنے ابتدائی لوازم سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے، اس کو وہ آفاقیت نہیں نصیب ہو سکی ہے جو کبھی کبھی میر اور غالب کے یہاں مل جاتی ہے۔ جوش، مجاز اور اختر شیرانی سے لے کر ساحر اور خلیل الرحمٰن اعظمی تک کسی کے یہاں بھی حقیقی معنوں میں جنسی اضطراب کو انسانی قدروں میں مدغم نہیں کیا جا سکا ہے۔

غالب کی شاعری کی عظمت کا باعث بھی خارجی محرکات کی موجودگی کے ساتھ ساتھ وہ اندرونی کشمکش تھی جو اپنی شدت اور وسعت کے اعتبار سے اردو کے کسی اور دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہو سکی، اگر فانی کے یہاں غالب کی طرح حکیمانہ اشعار کہنے کے باوجود غالب کی عظمت نظر نہیں آتی تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر اس بصیرت کا فقدان تھا جو داخلی محرکات اور ان کے جوابات Response کے تہہ در تہہ رشتوں کی پیداوار ہوتی ہے۔ خود غالب کی شاعری بھی اس اندرونی کشمکش کی کمی کے باعث وہ عظیم شاعری نہ ہو سکی جو یہ ہو سکتی تھی۔ انھیں زمانے نے کبھی اتنی فرصت ہی نہ دی کہ وہ خارجی محرکات کے جوابوں سے آگے بڑھ کر ان حدود کی بھی سیر کر سکیں جہاں شخصیت ہی اپنی محرک بھی ہوتی ہے، اپنا جواب بھی اور اپنی جولانگاہ بھی۔ ان کی روح کی سلگتی ہوئی طاقتوں کو پرواز کی فضا نہیں ملی، اپنی محرومی جاوید سے گھبرا کر وہ اس اندرونی کشمکش کی شمع کو فروزاں کرنے کی بجائے کسی "دل لگی" کی آرزو

میں بے چین رہنے لگے لیکن پھر بھی انھیں کسی ادر بلندی کا احساس ضرور تھا جس پر ایک منظر بنانے کے لئے ان کی شخصیت مضطرب رہی، وہ تادم آخر اس حسرتِ تعمیر کو اپنے سینے میں چھپائے رہے، اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غم و آلام کی مسلسل یورشوں کی وجہ سے وہ اپنی تعمیر کی صلاحیتوں پر خود مشکوک ہو گئے تھے، انھیں اس کا احساس ہونے لگا تھا کہ ظلمتوں کے عادی ہو جانے کی وجہ سے شاید وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکیں،

خوش ہوتے ہیں پہ وصل میں یوں مر نہیں جاتے　　آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

حسرتِ تعمیر کی یہ شدید خلش، یہ اپنی شخصیت کی عدمِ تکمیل کا بے پناہ احساس اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے نظر آتا ہے۔

فانی کی شاعری اس خلش اور ناآسودگی سے بیگانہ ہے۔ ان کے یہاں نہ میر کی انسانیت اور دردمندی کا نشان ملتا ہے نہ غالب کی شکست کا احساس اور نہ اقبال کے اضطراب کا پتہ۔ یعنی نہ اپنی شخصیت کی عدمِ تکمیل ہی کی کوئی خاص خلش ہے اور نہ ہی نوعِ انسان کے جمود و تنزّل کا کوئی درد ہے، ان کے یہاں ایک ناآسودگی سی ضرور ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کے غم کے اندر بھی ابہام ہے۔ مجھے اس غم کی فلسفیانہ تاویلات دُور از کار معلوم ہوتی ہیں کیونکہ نہ فانی کوئی مفکّر تھے اور نہ انھوں نے کبھی حیات اور کائنات کے مسئلوں پر سوچنے کی زحمت اُٹھائی، ان کے لئے یہی ایک حقیقت کافی تھی کہ ہر چیز پروردۂ فنا ہے بس اسی حد تک وہ محرمِ راز تھے۔ اس حقیقت کی لازوال صداقت پر کسے گمان ہو سکتا ہے مگر اسی احساس کے اوپر ایک بڑی شاعری کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی، اور فانی کے یہاں تو اس احساس کی ترجمانی بھی اپنی ابتدائی صورت میں ملتی ہے۔ اس میں وہ پیچیدگی نہیں ہے جس کی اس عصرِ جدید میں ہم توقع رکھتے ہیں۔ فانی کے غم میں نظامِ حیات کی ابتری کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ ان کے غم میں عشق کی ناکامی کا سراغ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کا غم بظاہر غمِ مطلق معلوم ہوتا ہے، نہ اس کے وجود کے اسباب ہیں نہ علاج کی کوئی دریافت ہے۔

یہ زندگی کی ہے رودادِ مختصر فانی　　وجودِ دردِ مسلّم علاج نامعلوم

اسی عدمِ تخصیص کی وجہ سے فانی کا غم غیر واضح اور موہوم ہے، اس میں وہ شدّت نہیں پیدا ہو سکی جو غالب کے حزن میں تھی اور نہ اس کے علاج کی کوئی صورت ہی نظر آ سکی، اور شاید اسی وجہ سے وہ ان پر ساری عمر مسلّط بھی رہا۔ فانی مجھے کچھ اعصاب زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں حزن و ملال کے خیالات کا جیسے ایک آبسیشن Obsession ہو گیا ہے۔ وہ بیک وقت اس سے بیزار بھی ہیں اور لطف اندوز بھی، اسی اعصاب زدگی کی وجہ سے فانی جہاں ایک طرف حیات کے دوسرے مظاہر سے منحرف ہو گئے وہاں ان کی شاعری کی پہلے ہی سے تنگ فضائیں اور تنگی آ گئی، یعنی وہ اپنے جذبات کی تعمیم نہیں کر سکے اور اس طرح ان کا غم نہ شخصی ہی بن سکا اور نہ غیر شخصی، اس میں نہ غالب کے غم کی وہ شدّت ہی ہے اور نہ میر کے غم کی وہ آفاقیت جسے مجنوں نے 'نشاطِ غم' سے تعبیر کیا ہے۔

میں جب فانی کی قنوطیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس کا اوّلین سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانے سے اپنی مطابقت نہیں کر سکے، انھیں اس کا پورا شعور نہیں معلوم ہوتا، لیکن اسی غیر مطابقت پذیری کی وجہ سے ان کی حساس طبیعت میں کچھ منفی اور مریضانہ رجحانات پیدا ہو گئے، پہلے سے بھی ان کے مزاج کو غم سے مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ پھر اردو شاعری کی روایت درفتہ رفتہ اس کے لئے اور بھی سازگار ثابت ہوئی۔ ردیف اور قافیوں کی کمی نہیں تھی، مشکل سے مشکل زمینیں موم کی طرح نرم کی جا چکی تھیں، شاعری کے لئے بنے بنائے غالبوں میں صرف تھوڑی سی اپنی پسند کے مطابق رنگ آمیزی کی ضرورت تھی، فانی اطمینان کے ساتھ اپنی بے چینیوں کی تشریح و تخلیق کرنے لگے، اگر غور سے دیکھا جائے تو فانی کا غم حالات سے زیادہ خود شاعری کا آفریدہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے تخلّص سے اتنا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ اس حد تک تو بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ غزل خود بھی ایک زوال آمادہ سماج کی پیداوار ہونے کی وجہ سے جدید تنقید نگاری کی مشکل سے متحمل ہو سکتی ہے۔ اسے انھیں مروّجہ معیاروں سے پرکھنے میں دُور اندیشی بھی معلوم ہوتی ہے (اور اس کی بقا کی ضمانت بھی) لیکن پھر بھی نقّاد عام انسانوں کی طرح اپنے حالات سے مجبور ہے کہ محض قافیہ اور ردیف کے التزام ہی کو شاعری نہ سمجھے۔ اسے عروض و قوافی کی مہارت سے گذر کر ان جذبات کی صداقت اور ان خیالات کی آفاقیت کو تلاش کرنا پڑتا ہے جن کی ترسیل کے لئے خود عروض و قوافی بھی وجود میں آئے۔ فانی کے بعض ناقد ان کی فنّی مہارت کے بڑے معترف ہیں۔ لیکن ایک شاعر محض فنّی لوازمات ہی پر اپنی تعمیر کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔ الٰہ دین کے چراغ کی روشنی دور تک ساتھ نہیں دے سکتی، اسے سورج کی

روشنی ہی میں آگے بڑھنا اور دوسروں کو بڑھانا ہے، فانی کی شاعری کیا واقعی زندگی کے متعلق کسی صداقت کی دریافت کی کوشش ہے یا محض چند رسمی عنوانوں سے رسمی سی چھیڑ ہے، وہ غم واندوہ سے بریز شاعری کہیں محض ایک ذاتی گونج ہی تو نہیں یا ان جذبات اور رجحانات کی حامل بھی ہے جو شاعر، میرے اور ہر شخص کے اندر مشترک ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ سوال کہ کیا ان غزلوں کو پڑھنے سے میرے تجربات کچھ گہرے بھی ہوئے، میرے شعور میں کچھ وسعت بھی آئی اور میرے حواس میں کچھ تبدیلی بھی رونما ہوئی یا اس کی اپیل محض ایک ساعت کے لئے تھی۔ شاعری اور آرٹ اپنے مختلف النوع طریق کار کے باوجود تہذیبی اور انسانی قدروں کے تحفظ اور بقاء کا ذریعہ بھی ہیں، اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل کا میڈیم عام شاعری کے میڈیم سے کچھ جداگانہ ہوتا ہے تاہم تغزل کے چند روایتی پیمانوں سے ہر شعر کو ناپنے کی نہ وجہ سمجھ میں آسکتی ہے نہ سمجھائی جا سکتی ہے، مثلاً سہل ممتنع ہونے کی بنا پہ کوئی شعر بڑا شعر نہیں ہو سکتا، کیا فانی کے ان اشعار کو ہم عظمت کا حامل کہہ سکتے ہیں۔

ضبط کا حوصلہ نکل جاتا — کچھ ستم اور بھی کئے ہوتے

کچھ سمجھ کر قفس میں اے صیاد — چار تنکے ہی رکھ دئے ہوتے

میری سمجھ سے تو عظیم ہونا ایک طرف، انھیں شعر ہی کہنا درست نہیں، کیونکہ سوائے تُک بندی کے مجھے تو اس میں کوئی اور خوبی غور و خوض کے بعد بھی نظر نہیں آئی۔ اسی طرح صاف اور شستہ الفاظ کے استعمال سے کسی شعر کو اچھا نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ یہ بات اگر تسلیم بھی کرلی جائے کہ کچھ الفاظ دوسرے الفاظ سے نسبتاً شیریں اور فصیح ہوتے ہیں تو بھی کسی لفظ کو اپنے مقصد کے پس منظر میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعری کے اندر درست الفاظ وہی ہیں جو اشارہ پذیر بھی ہوں اور چونکہ اسے تخیل ہی کو اپیل کرکے اپنے تاثر کو قائم کرنا ہوتا ہے اس لئے ڈکشن کا کامیاب استعمال وہی ہے جو تخیل کو برانگیختہ کردے۔ ہر لفظ کے ساتھ کوئی نہ کوئی تصور وابستہ ہوتا ہے، جب تخیل میں ہیجان ہوتا ہے تو یہ تصورات بیدار ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ایک ایسے بھرپور تصور کی تشکیل کرتے ہیں جو مکمل ہونے کی وجہ سے کہیں زیادہ حسین و شاداب ہوتا ہے۔ اس خیال کی مزید وضاحت کے لئے فانی ہی کے ایک شعر کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے،

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

اس شعر کو پڑھنے کے ساتھ ہی ہم ان تصویروں کو دیکھنے اور خیالوں کو سوچنے لگتے ہیں جن کی ترسیل شاعر کا اصلی مقصد تھا۔ لیکن جب کسی اثر کو زبردستی قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو نتیجہ مہلک ہی نہیں مضحکہ خیز بھی ہوتا ہے مثلاً فانی کا یہ شعر

کفن اے گردِ لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے

آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کر بدلے

اپنے اندر کوئی تاثیر نہیں رکھتا۔ اسے پڑھ کر ہمارے تخیل میں کوئی ہیجان نہیں ہوتا۔ "گردِ لحد" اور "کفن" اشارہ پذیر الفاظ ہونے کے باوجود بے جان اور ریگ دہنسا رہ جاتے ہیں۔ ان سے کسی بڑے تصور کی تشکیل نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس شعر میں بھی

کیا چارہ گر اب بھی تجھے امیدِ شفا ہے

یہ زخم ہے یہ دل ہے یہ پیکانِ تمنا

کوئی جذباتی فضا نہ ہونے کی وجہ سے زخم، دل، پیکان اور چارہ گر، اینٹ اور پتھر کی طرح لفظوں کے بے جان انبار معلوم ہوتے ہیں، ان سے کسی تعمیر کا صرف نہیں لیا گیا، یہی حال دوسرے معیاروں کا بھی ہے مثلاً اسی روایتی معیار تغزل کو نرمی، گھلاوٹ اور سوز و گداز کا مترادف سمجھا گیا۔ چنانچہ جن اشعار میں نرم و شستہ اور فصیح و شیریں الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، ان کی اہمیت بھی اسی بنا پر دوبالا ہو جاتی ہے۔ میر کے اس شعر کا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے

دل ہے گویا چراغ مفلس کا

اردو کے شدید ترین اشعار میں شمار ہوتا ہے یہ شعر اپنی جگہ پر دشنہ و نشتر ہی لیکن غالب کے اس شعر کے متعلق کیا رائے قائم کی جاسکتی ہے،

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا

کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

کیا یہ بات کسی طرح کہی جاسکتی ہے کہ اس میں میر کے شعر کی بہ نسبت شعریت کم ہے حالانکہ اس میں جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں نسبتاً بھاری اور رعب دار ہیں اسی طرح غالب کے اس شعر میں

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں

وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

اسد اللہ خاں جیسے ثقیل اور غیر شاعرانہ لفظوں کے باوجود تاثیر میں کوئی کمی نہیں ہوئی بلکہ یہاں نظم میں شخصی عنصر آ جانے کی وجہ سے بے پناہ شدت آ گئی ہے۔ مواد اور ہیئت میں ربطِ باہمی کا ہونا تو بہرحال ایک ناگزیر سی بات ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غم و درد کا اظہار صرف نرم و شیریں الفاظ ہی میں ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے الفاظ نرم و شیریں ہوں لیکن ہمارے اندر کوئی جذباتی تاثر نہ پیدا کر سکیں اور شاعری اپنے مقصد میں بالکل ناکامیاب رہے، اس کے برخلاف مشکل، بھاری، رعب دار اور کسی قدر ثقیل الفاظ بھی تخیل میں ہیجان برپا کر کے وہ جذباتی تاثر قائم کر دیں جو شاعری کی اصل غرض و غایت ہے۔ تغزل اور شعریت کا تعلق اتنا الفاظ سے نہیں ہوتا جتنا اس جذباتی فضا سے جو ان بے جان لفظوں میں روح پھونک کر اس کے سارے روابط کو بیدار کر دیتی ہے، یہاں الفاظ دھندلا جاتے ہیں اور ان کی ذہنی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں۔ چونکہ یہ عمل ہمارے ہی ذہنوں میں ہوتا ہے اس لئے شاعری کی تخلیق کے اندر ہم خود بھی شریک ہو جاتے ہیں یعنی با الفاظ دیگر شاعر کا تجربہ ہمارا بھی ذہنی تجربہ بن جاتا ہے اور شاعری اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہو جاتی ہے، غالب کی عظمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ایک بھرپور جذباتی فضا ملتی ہے جو سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی شدید بھی ہے کہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہو سکی، یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام دقت پسندیوں کے باوجود ان کے اشعار ہمارے تخیل کو سب سے زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعر

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کبھی کا بھلا دیا گیا ہوتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور فانی اپنی ساری زمینوں اور گھلاوٹوں کے باوجود عمر بھر کوئی اتنا شدید شعر نہیں کہہ سکے۔

کچھ لوگوں کو فانی کی شاعری، غالب کی حکیمانہ نظر اور میر کے سوز و گداز کا ایک مرکب نظر آتی ہے لیکن مجھے یہیں فانی سب سے زیادہ ناکام نظر آتے ہیں۔ شاعری کیمسٹری کا فارمولا نہیں ہے کہ دو چیزوں کو ملا کر تیسری چیز پیدا کر لی جائے فانی کی شخصیت میں نہ میر کی آفاقیت اور سچی درد مندی ہی نظر آتی ہے اور نہ غالب کی بصیرت ملتی ہے، اس لئے میر اور غالب بننے کی کوشش میں وہ فانی بھی نہ ہو سکے۔ ان کی اس قسم کی تمام غزلیں منظوم خیالات کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہی جا سکتیں، اپنی ساری ادبی صناعیوں اور سنجیدگیوں کے باوجود ان کا خطاب صرف عقل ہی سے ہوتا ہے، یہ پوری انسانیت سے مخاطب نہیں ہو سکتی، ان کی صداقت منطق کی صداقت ہے شاعری کی نہیں، یہاں ایک ہی مثال کافی ہے، غالب کا ایک شعر ہے

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

فانی اس سیدھی سی بات کو اور زیادہ باریکیوں اور زبان و بیان کی لطافتوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

لیکن اس کو کیا کہئے کہ یہ شعر ہمارے اندر کوئی تاثر پیدا کرنے سے قاصر اور اس لئے اپنے مقصد میں بالکل ناکامیاب ہے، مشاہداتِ آب و گل کو تجلیاتِ وہم بنا کر اور ہستی کو خیال کے بجائے خواب کا خیال کہہ کر فانی نے اور باریکی پیدا کرنی چاہی تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ شاعری کی اپیل تخیل سے ہوتی ہے عقل سے نہیں، یہ باریکیاں ان کے حق میں اور مہلک ثابت ہو گئیں۔ غالب جو بات کہنی چاہتے تھے اسے انھوں نے پورے طور پر کہہ دیا ہے، یہاں ایک تصور کی تعمیر کا بھرپور احساس ملتا ہے لیکن فانی کے یہاں کسی تصور کی تشکیل نہیں ہو پاتی، وہ نقش و نگار بنانے میں اس قدر مشغول ہو گئے کہ خود تعمیر ہی کو بھول گئے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے یہاں غالب کی طرح احساس اور اظہار میں ہم آہنگی نہیں، وہ اپنے احساس کی کمی کو اظہار کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نتیجہ منظوم خیالات کی پیداوار میں ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن غالب کی طرح شدید بلیغ شعر نہ کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ فانی نے اچھے شعر نہیں کہے ہیں، ان کا اعتراف ان کے معترضین بھی کرتے ہیں۔ اردو کے دوسرے غزل گو شعراء کی طرح ان کے یہاں زیادہ نشیب و فراز نہیں ملتا اور ان کے بیشتر اشعار پر ان کی شخصیت کی چھاپ بھی نظر آتی ہے، اگرچہ یہ شخصیت شدید اور جاندار ہونے کی بجائے موہوم اور مجہول سی ہے، لیکن پھر بھی کسی قدر ایک انفرادیت کی حامل بھی ہے، اسی انفرادیت نے انھیں ایک اپنا لب و لہجہ عطا کیا ہے، وہ پُر درد اور بھرائی ہوئی سی آواز جو شاید کچھ دنوں تک ہمارے ایوانِ شاعری میں گونجتی رہے، ان کا اپنا اکتساب ہے، اسی آواز سے ان کی کچھ غزلوں میں ایک ایسی جذباتی فضا پیدا ہو گئی ہے جس سے ہمارے تخیل میں ہیجان سا ہو جاتا ہے اور ہم بھی شاعر کی طرح کچھ دیر کے لئے دلگیر ہو جاتے ہیں۔ اس درد مندی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے جذباتی نظام کی صحت مندی کے لئے غم و درد کے جذبات کی بھی احتیاج ہے۔ اس حد تک میں فانی کی یاس انگیزی کو مریضانہ نہیں سمجھتا اور نہ ہی ان کی شاعری کی اپیل کو محدود سمجھتا ہوں لیکن فانی کی ناکامی کی ایک وجہ جہاں یہ ہوئی کہ وہ اس شاعرانہ صداقت کے اصول کو نہیں

سمجھ سکے جس کے بغیر تخلیقی ادب کے اندر تمام انسانی قدروں کا زوال ہو جاتا ہے کیوں کہ نوعِ انسان کی بقاء و دوام کے لئے جذبۂ نشاط سب سے مقدم ہی نہیں، سب سے ناگزیر شرط بھی ہے اور اس جذبے کی تسکین ہی کے بغیر کوئی فن کار بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا — وہاں دوسری وجہ خود اس دردمندی کی حیرتناک کمی میں دیکھی جا سکتی ہے جس کے لئے وہ اس قدر بدنام بھی ہوئے۔ اگر ان کے یہاں درد و غم کا واقعی اتنا احساس بھی ہوتا جتنا اس کا ذکر ہے تو بہت ممکن تھا 'عرفانیاتِ فانی' ہماری ادبی تاریخ میں کسی اساطیری المیہ کی طرح زندۂ جاوید ہو جاتی لیکن یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ دس بیس اشعار کو چھوڑ کر باقی فانی کے تمام سرمایۂ سخنوری میں صرف ایک روایتی غم کا ناتواں اظہار ملتا ہے جو اپنی تنگی اور یکسانیت کی وجہ سے ناقابلِ برداشت ہے، اسے پڑھ کر مسرت ملنی تو کجا اُلٹے اور طبیعت منغّض ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر فانی کی وہ اپنی آواز بھی نہیں ہے جس کی تھرتھراہٹ ہم کچھ دیر کے لئے اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں۔ کوئی ایسی صناعی بھی نہیں جو کچھ ہی دیر کے لئے ہی مگر اپنی طرف کھینچ لے، دوسرے غزل گو شعراء کے دواوین اور عرفانیاتِ فانی میں اگر کوئی وجہِ امتیاز ہے تو یہی کہ یہاں صرف ایک غم ہی کی تکرار ہے اور اسی کی مناسبت سے اسلوبِ بیان بھی کچھ سنجیدہ ہے، مگر اس سنجیدگی کو ہم اس گمبھیرتا Serenity کے مترادف نہیں کہہ سکتے جس کے لئے صرف فن کارانہ صداقت ہی نہیں کچھ اونچی سطح اور وسیع فضا بھی درکار ہوتی ہے، غالباً اسی فضائی تنگی کی وجہ سے فانی کی شاعری ہمارے لئے انتہائی پریشان کن ہو جاتی ہے اور اس بات کے سمجھنے میں بھی زیادہ دشواری نہیں رہ جاتی کہ کیوں فانی کی غزلوں میں مضمون کی یکسانی کی وجہ سے نظموں کا سا تسلسل پیدا ہو جانے کے باوجود غزل کی ساری روایتی پراگندگی موجود ہے، اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو اردو کے تقریباً سارے غزل گو شاعروں کے جذبات اور خیالات قافیہ اور ردیف کے تابع رہے ہیں۔ مضامین کے اختلافات اور لب و لہجہ کی انفرادیت کے باوجود وہ ایک اندھے کی لاٹھی کی طرح اس کے سہارے کے محتاج معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں جیسے اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ عروض و قوافی وغیرہ کی حیثیت تو محض ضمنی ہے، اگر کچھ کہنے کی باتیں نہ ہوں تو محض ان کی مشق و مہارت سے شاعری کی تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ یہی وہ تجربات کی حیرت ناک کمی ہے جس کی وجہ سے اردو غزل گوئی زبان و بیان کی پاکیزگی کے پردے میں بھی اپنی ریاکاری کو نہیں چھپا سکتی۔ اس کی چاندنی چند ہی لمحوں کے بعد مکر چاندنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ کیا یہ بات قابلِ حیرت اور افسوس نہیں کہ ہزاروں اور لاکھوں عشقیہ اشعار کے انبار میں سے سچی اور صحت مند عشقیہ شاعری کے دس صفحات بھی نہیں نکالے جا سکتے۔

فانی کی غزلوں کو ان کے مخصوص رجحانات کے باوجود ہم عام غزلوں سے جدا نہیں کر سکتے۔ دوسرے غزل گو شعراء ہی کی طرح ان کے یہاں تجربات کی افسوسناک کمی ملتی ہے اور انہیں کی طرح اس کمی کو اپنی سخنوری کے ذریعہ پورا کرنے کی سعی کا احساس بھی ہوتا ہے وہ کہیں کہیں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے ہیں جیسے ان سے پہلے بھی اور شاعر ہوئے ہیں اور بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کبھی کبھی صرف سخنوری کی بدولت ہی کچھ خوبصورت نظمیں یا اشعار لکھے جا سکتے ہیں لیکن ایلیٹ کی اصطلاح میں ان کی اہمیت انتخابی ہیں Anthology Piece سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے انتخاب کی زینت بن سکتے ہیں اور فرصت کے اوقات میں ہم انہیں گنگنا بھی سکتے ہیں لیکن ان کے اندر نہ ہمارے ذہنی اُفق کو وسیع کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے نہ جذبات کو مستقل طور سے متاثر کرنے کی، ان کا جذباتی تاثر موسیقی کے تاثر سے زیادہ دیرپا نہیں ہو گا۔ ان کی غزل حواس سے آگے نہیں، موسیقی ہی کی طرح ان کا ابہام بھی ان کی اپیل کا سبب بن جاتا ہے، لیکن شاعری موسیقی ہی نہیں مفہوم بھی ہے۔ عروض و قافیہ کی مشق ہمیائی ہی نہیں سماج میں ان قدروں کی ترقی و تسلسل کا ذریعہ بھی ہے جن کے بغیر تمدن کے چراغ گُل ہو جاتے ہیں اور انسان حیوانی سطح پر گر جاتا ہے۔ ممکن ہے فانی کی کچھ غزلیں عرصہ تک پڑھی جائیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری شاعری کی تاریخ میں اُن کا کوئی تاریخی مقام باقی رہ جائے لیکن ان کے غم میں جو انسانی اقدار و عظمت کی کمی ہے اس کے باعث شاید ان کی شاعری کو تہذیبی سرمایے کی حیثیت سے محفوظ نہ رکھا جا سکے۔

'آج کل' اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ 'ہندوستانی مصوّری نمبر' ہو گا۔

سید حسن

محمد الف خاں حباؔب

اردو ڈراما نگاری کی تاریخ و تنقید کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ جو کچھ لکھا بھی گیا ہے وہ مفصل اور معتبر نہیں ہے۔ بعض ڈراما نگار ایسے ہیں جن کے سوانح حیات کے متعلق ہم کو صحیح علم نہیں اور جن کے کارناموں کا سراغ نہیں ملتا۔ ایک ایسے ہی انجان اور گمنام ڈراما نگار محمد الف خاں حباؔب ہیں۔ وہ اردو کے پرانے ناٹک نگاروں میں سے ہیں۔ ان کا عہدِ زندگی انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ ہے۔ انھوں نے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے لئے ناٹک لکھے تھے۔ یہ کمپنی ۱۸۷۰ء میں قائم ہوئی تھی اور غالباً پہلی باضابطہ پیشہ ور کمپنی تھی جس نے اردو ڈرامے اسٹیج کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن اردو ڈراما کی تاریخ لکھنے والوں نے حباب کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اُن کی تصانیف سے روشناس کرانا تو درکنار نورالٰہی و محمد عمر، بادشاہ حسین اور رام بابو سکسینہ صاحبان نے اپنی تالیفات میں اُن کا نام نہیں لیا، یہاں تک کہ احسن لکھنوی نے اپنے مفید اور پُر از معلومات مضمون 'نامۂ احسن' میں بھی اُن کا ذکر نہیں کیا ہے، حال آنکہ اس مضمون میں انھوں نے اپنے دَور کے کئی ناٹک کاروں کے کچھ حالات بیان کئے ہیں اور اُن کے فن کے باب میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ حباؔب کا نام سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون 'اندر سبھا' 'امانتے[1]' میں لیا ہے۔ اس کے بعد اُن کا تذکرہ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے اپنے مضمون 'آغا حشر اور اُن کے معاصرین[2]' میں کیا ہے۔

محمد الف خاں حباب کو ڈاکٹر عبدالعلیم نامی نے رامپوری لکھا ہے، لیکن اُن کا اصلی وطن رام پور نہ تھا بلکہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ستمبر ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں کسی مشہور تھیٹریکل کمپنی (الفریڈ کمپنی) کے ساتھ رامپور آئے تھے۔ اس زمانے میں ریاست رام پور کی عنانِ ولایت نواب حامد علی خاں اشک مرحوم کے ہاتھوں میں تھی، نواب صاحب مرحوم تھیٹر کے بڑے شوقین تھے۔ انھوں نے زرِ کثیر صرف کرکے رام پور میں بڑی شان اور اہتمام سے ایک تھیٹر قائم کیا تھا اور اس کے لئے ایک عمارت بنوائی تھی۔ تھیٹر کے لئے دُور دُور سے ڈراما نگار، پینٹر اور باکمال ایکٹر بلا کر ملازم رکھے گئے۔ حباب بھی اس زمانے میں اس تھیٹر میں ملازم ہوئے اور اُسی تھیٹر کی عمارت میں جو کلب گھر کے نام سے مشہور ہے اور آج بھی موجود ہے، ایک کمرے میں رہنے لگے۔ حباب نے یہاں پانچ چھ ناٹک لکھے جو اسٹیج نہیں کئے گئے شاید پسند نہ کئے گئے ہوں۔ رام پور کے سرکاری تھیٹر میں وہ کبھی کبھی پرامپٹر Prompter کا کام بھی کرتے تھے۔ افیون کھانے اور پینے بھی تھے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے ماہ جنوری یا فروری میں رام پور میں زوروں کا پلیگ ہوا اسی وبا میں حباب نے بھی انتقال کیا اور وہ رام پور ہی میں مدفون ہوئے۔ ان کا حلیہ یہ تھا۔ قد میانہ، قوی الجثہ، رنگ گورا اور داڑھی خشخشی[1]۔

حباب آخر عمر میں رام پور پہنچے تھے۔ یہاں مسکن گزیں ہونے سے پہلے وہ اوریجنل تھیٹریکل کمپنی بمبئی سے منسلک تھے۔ اس کا کچھ پتہ نہیں کہ حباب

---

[1] مطبوعہ 'اردو ادب' جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

[2] مطبوعہ 'نوائے ادب' بمبئی جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

[1] خط جناب محمد علی خاں اثر رام پوری مورخہ ۱۳ - اپریل سنہ ۱۹۵۴ء

کب اور کہاں پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کہاں گذاری۔ اپنے ایک ناٹک[1] کا انھوں نے جو دیباچہ لکھا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بگھیل کھنڈ کی سابق ریاست جیتپور میں مہاراج بیجا کے بھائی شری مہاراج کمار بابان شمشیر جنگ بابو رام راج سنگھ کی خدمت میں وکالت کے عہدے پر مامور تھے۔ مہاراج کمار نے ۲۱ مئی ۱۸۸۱ء کو انتقال کیا[2]۔ اس حادثے کے بعد حباب کا دل دنیا سے اُچاٹ ہوگیا اور وہ اس سال جبل پور سے چلے آئے یہاں ان کو اوریجنل وکٹوریا تھیٹریکل کمپنی کے تماشے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ پردہ اُٹھتے ہی ان کی آنکھوں میں چکاچوند سی لگ گئی، کمپنی کے باکمال ایکٹروں کے ہنر نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ جو ناٹک اس کمپنی نے اسٹیج کئے ان کے تماشے سے حباب محظوظ تو بہت ہوئے لیکن ناٹکوں کی زبان ان کو پسند نہ آئی۔ دیباچۂ مذکور میں حباب نے ان ناٹکوں کی زبان کی کمزوریوں پر تبصرہ کیا ہے اور اصولِ فن کی تشریح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مالکانِ کمپنی سے ناٹکوں کے متعلق شکایت اور ناٹک کاری کے بارے میں اپنے اصول کی وضاحت کی ہوگی۔ مالکانِ کمپنی نے حباب سے ناٹک لکھنے کی فرمائش کی۔ اس فرمائش پر حباب نے جو ناٹک لکھا وہ مالکانِ کمپنی کے نزدیک مقبول ہوا۔ چنانچہ وہ اس کمپنی میں ناٹک نویسی پر مامور ہو گئے۔ حباب نے مذکورہ بالا دیباچے میں مالکانِ کمپنی کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کمپنی میں ملازم تھے۔

حباب نے کتنے ناٹک لکھے، معلوم نہیں۔ حضرت رحمانی نے اپنے مضمون "اردو ڈراما کی ایک صدی"[3] میں اردو ڈرامانگاروں کے زمرے میں حباب کا نام تو لیا ہے لیکن 'فٹ نوٹ' میں یہ تحریر کیا ہے کہ ان حضرت کے ڈراموں کا کوئی پتہ نہیں، تمام نایاب اور گمنام ہو گئے۔ مجھے حباب کے صرف چار ناٹکوں کے نام معلوم ہیں اور وہ یہ ہیں: 'شررِ عشق یا طلسم ارض الحمان' 'افسانۂ ارژنگ حیرت یا تنبیہ الغرور' 'جشنِ کنورسین' اور 'نیرنگِ قاف عرف غزالہ ماہرو'۔ اوّل الذکر دو ناٹک میرے پاس موجود ہیں۔ 'جشنِ کنورسین' کا ایک نسخہ

---

۱ شررِ عشق یا طلسم ارض الحمان
۲ تواریخ بگھیل کھنڈ (قلمی) مصنفہ خان بہادر مولوی رحمان علی (بتوسط پروفیسر اختر حسین نظامی)
۳ مضمون مطبوعہ 'ہمایوں' لاہور

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کے پاس ممبئی میں ہے، 'نیرنگِ قاف عرف غزالہ ماہرو' کے دو نسخوں کا مجھے علم ہے۔ ایک نسخہ ڈاکٹر نامی کے پاس ہے اور دوسرا پروفیسر سید مسعود حسن رضوی لکھنؤ کے کتب خانے میں۔ 'جشنِ کنورسین' کو راقم السطور نے بالکل نہیں دیکھا ہے۔ 'غزالہ ماہرو' کے ایک سین اور اس کے دیباچے کی نقل پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کی مہربانی سے راقم الحروف کو حاصل ہوئی ہے۔ 'غزالہ ماہرو' حباب کا بہت مقبول ڈراما ہے، یہ ناٹک غالباً پہلی مرتبہ مصنف کے حین حیات دسمبر سن ۱۹۰۱ء میں مطبع گلزارِ محمدی لکھنؤ میں طبع ہوا تھا۔ اس کا حق اشاعت مصنف نے مطبع کو ہبہ کرکے چھاپنے کی اجازت دی تھی۔ طباعت کے وقت مصنف نے ایک نیا سین بھی لکھا تھا وہ بھی کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ سین اُس وقت تک اسٹیج پر دکھایا نہیں گیا تھا۔ اس تماشے کو سیٹھ نوروزجی مالک اوریجنل وکٹوریا کمپنی بہت اہتمام سے دکھاتے تھے[1]۔ 'غزالہ ماہرو' واجد علی شاہ کی مثنوی 'دریائے تعشق' کا ڈراپا نثر ہے، ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے کہ اس میں جا بجا اصل مثنوی کے اشعار جوں کے توں نقل کر دئے گئے ہیں[2]۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ میری درخواست پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے اس ناٹک کا مثنوی 'دریائے تعشق' سے مقابلہ کیا تو یہ حقیقت کھلی کہ ڈرامے میں مکالمہ جگہ جگہ مثنوی کے دو چار شعروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ مگر یہ شعر خود حباب کی تصنیف ہیں، 'دریائے تعشق' سے نہیں لئے گئے ہیں[3]۔

'شررِ عشق یا طلسم ارض الحمان' اور 'افسانۂ ارژنگ حیرت یا تنبیہ الغرور' یہ دونوں ناٹک گجراتی رسم الخط میں ہیں۔ ان دونوں ناٹکوں پر مصنف کا نام اور جس کمپنی کے واسطے یہ لکھے گئے تھے اس کا نام درج ہے 'شررِ عشق' کی تاریخ اشاعت ۱۰ ستمبر ۱۸۸۳ء ہے اور اسے کاؤس جی لیسٹن جی نے الائنس پرنٹنگ پریس میں چھاپا ہے۔ یہ ناٹک مالکان اوریجنل وکٹوریا کمپنی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اس ناٹک کا پلاٹ آفتاب الدولہ خواجہ اسد علی خاں قلق کی مثنوی 'طلسمِ الفت' کی داستان سے ماخوذ ہے۔ کمپنی کے مالکوں نے حباب سے

---

۱ دیباچۂ غزالہ ماہرو (نقل مرسلہ پروفیسر مسعود حسن رضوی)
۲ مضمون مطبوعہ 'اردو ادب' جولائی ۱۹۵۰ء
۳ خط مرقومہ پروفیسر مسعود حسن رضوی مورخہ ۶ نومبر ۱۹۵۵ء

فرمائش کی تھی کہ وہ مثنوی مذکور کا روپا نثر تیار کر دیں۔ دیباچے کے بعد گجراتی زبان میں طلسمِ الفت، کے قصے کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ خلاصہ مصنّف کے قلم سے نہیں بلکہ کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔ اسٹیج کی ضرورت کے مطابق یا تماشہ بینوں کی پسند و ناپسند کا خیال کر کے اصل قصے میں کہیں کہیں تبدیلی بھی پیدا کر دی گئی ہے اس ناٹک میں دو مزاحیہ سین بھی ہیں جو اصل پلاٹ سے قدرے علٰحدہ ہیں۔ اس ناٹک کے ایک سین کا کچھ حصہ اردو رسم الخط میں بطور نمونہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

باب دوسرا ۔ پردہ پانچواں

شعلہ کا دیوان خانہ

شعلہ اور جان جہاں بیٹھے ہیں]

"کسی مست کے آنے کی آرزو ہے" طرز

شعلہ۔ ہمیں نام اپنا بتا دیجئے گا　　جو قصہ ہو اپنا سُنا دیجئے گا
کہاں ہے وطن تیرا اے ماہرو　　حسب اور نسب کا پتا دیجئے گا
جو رہئے گا گھر میں مرے چار دن　　ہمیں بھی دلاسا ذرا دیجئے گا
جو پوچھے کوئی غیر کچھ ماجرا　　مرا راز سارا چھپا دیجئے گا

غزل

جانِ جہاں :۔

کیا حال پوچھتی ہے بہار! تو مرا لقا　　مجھ سا نہیں ہے غمزدہ دنیا میں دوسرا
بیکس بھی ہوں غریب بھی ہوں بے وطن بھی ہوں　　ہیں نام میرے اور بھی اس نام کے سوا
عاجز، بلا رسیدہ، ستم دیدہ، ناتواں　　دیوانہ کہہ کے لوگ بلاتے ہیں جا بجا
دریا کی آفتیں نہیں، صحرا کی ٹھوکریں　　کس کس طرح کے رنج سے ہیں بے حیا بچا

پیلو

"کون جنجال میں جا تو پھنسا رے"۔ طرز

شعلہ۔ عشق نے کیسی کٹاری ماری　　بیٹھی تپٹ بن کے دکھیاری
کرم کے اچھّر باچن نہ جانے　　پنڈت اگیانی اور اَچاری
مجھ پر کرپا راکھو پیارے　　میں چیری ہوں جی سے تمھاری

کلیان

جانِ جہاں۔ جانے دے ہم کو اے شعلہ پری　　اس غم سے مجھ کو کر دے بری
ہم سے بھروسہ رکھو نہ دل میں　　ہوگی نہ ہم سے تمری دلبری
ہم بیٹھے یاں رنگ مچا دیں　　تڑپے وہاں عالم آرا مری

"میں وہ نہیں ہوں کہ تجھ بُت سے دل مرا پھر جائے"۔ طرز

شعلہ۔ گلے پہ پھیر جا تلوار سخت جاں ہوں میں
نثار ہونے پہ تیار دلستاں ہوں میں
جو مانگا بوسۂ لب کج مزاج کہتا ہے
سناؤں گا تجھے سیدھی کہ بدزباں ہوں میں
مسافرانِ عدم ہاتھ تھام لو میرا
غبار ہوں اٹھ نہیں سکتا وہ ناتواں ہوں میں
نہیں ہے وصل جو منظور تجھ کو جانِ جہاں
شراب پی لے ترا ارمان میری جاں ہوں میں
جہاں میں زندگی انسان کی ہے مثلِ حباب
جب آئی سیلِ فنا پھر یہاں کہاں ہوں میں

[شراب پلاتی ہے]

جانِ جہاں ۔ اے شعلہ، ہم کو شراب پینے کی کہاں فرصت ہے، اگر تو نے میری مہمانداری بہت کی ہے۔ اس لئے مجھ کو تجھ سے محبت ہے، لا جام شراب

[شراب پی کے سو جاتا ہے۔ شعلہ نگہبانی میں سونپتی ہے اور جاتی ہے۔]

"تنبیہ الغزور یا افسانۂ اردنگ، شرر عشق، کے تقریباً ایک مہینہ بعد یعنی ۸۔ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو اُسی پریس میں شائع ہوا اور یہ بھی اوریجنل وکٹوریا کمپنی ہی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس ناٹک کا ایک اور نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ یہ نسخہ بھی گجراتی رسم الخط میں ہے اور اس کا بھی سن طباعت ۱۸۸۱ء ہے۔ غالباً میرا نسخہ اور برٹش میوزیم کا نسخہ دونوں ایک ہی اشاعت کے ہیں۔ یہ ناٹک دیو، پری اور انسان سے معمور ایک خیالی داستان پر مبنی ہے جس میں عمرو عیار کا نمایاں رول ہے۔ اس کا پلاٹ خود مصنّف کے دماغ کی پیداوار ہے۔ شاہنناز، والئ طلسم اردنگ حیرت کی معشوقہ ماہ پرور، دختر بہزاد بخت والی شہر مغرب، کو پرستان کے دیووں کا سردار عقرب دیو اپنے خادموں کے ذریعہ پکڑوا منگاتا ہے اور اس کو اپنے ساتھ شادی کرنے کے لئے کہتا ہے۔ ماہ پرور کے انکار کرنے پر وہ اسے قید کر دیتا ہے۔ شاہنناز

اپنے دوست عمرو عیار کی مدد سے نہ صرف ماہ پرور کو بلکہ ایک پری سرو آزاد نامی کو بھی دیووں کی قید سے رہا کرا لیتا ہے اور عقرب دیو کو گرفتار کر کے کنوئیں میں ڈال دیتا ہے، آخر میں سب ملتے ہیں اور یوں قصہ شادمانی پر تمام ہو جاتا ہے۔

'تنبیہ الغرور' میں 'شرر عشق' کی بہ نسبت اشخاص اور سین زیادہ تعداد میں ہیں، مکالمہ اور ایکشن بھی زیادہ ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس ناٹک میں تخیل کو آزادی ہے، مصنف کو کسی محدود پلاٹ کی پابندی نہیں کرنا ہے اور نہ کسی معلوم داستان کی پیروی منظور ہے۔ اس میں مزاحیہ عنصر بھی زیادہ ہے۔ عمرو عیار کی باتوں اور حرکتوں سے ہنسانے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ طرز گفتگو میں 'اندر سبھا' کا اثر اکثر جگہ نمایاں ہے۔ شاہناز کے دربار میں جب کوئی رقاصہ مجرا کو آتی ہے تو اپنا نام گا کر بتاتی ہے۔

طاؤس جوگن:

طاؤس میرا نام ہے مسکن طلسم ناز	غمزہ پہ دلبری پہ لیاقت پہ اپنی ناز
گلزار دہر میں میرا یہ رنگ ہے جما	کس کی مجال ہے جو کرے میرا سامنا
لیکن کنیز آپ کی جی سے نثار ہے	لونڈی در حضور پہ بس خاکسار ہے

شاخِ نشاط:۔

شاخِ نشاط لونڈی کا مشہور نام ہے	آدم ربا طلسم ہمارا مقام ہے
عابد فریبِ حسن پہ میرا حضور ہے	عشوہ پہ اپنے مجھ کو بہت سا غرور ہے
جنات مجھ کو دیکھیں تو کھو بیٹھیں جان کو	بولیں تو بات کہنے میں کاٹیں زبان کو
لیکن قدم پہ آپ کے جی سے نثار ہوں	ارشاد ہو حضور کی امیدوار ہوں

سفاکِ حسن:

آقا مرا سلام حضوری میں ہو قبول	دیدار کے حضور کی دولت ہوئی حصول
میں وہ حسین ہوں کہ زمانے میں نام ہے	انساں جو مجھ کو دیکھے تو جینا حرام ہے
چھل بل غضب ہے فرادا، چتونِ بلا	غفلت میں کوٹ کوٹ کے میری بھری جفا
سفاکِ حسن دنیا میں کہتے ہیں مجھ کو لوگ	لاکھوں فقیر پھرتے ہیں میرا جائے روگ
لیکن ہزار دل سے ہوں درگاہ کی کنیز	ارشاد ہو اگر تو نہیں جان بھی عزیز

اس ناٹک کے ایک سین کا کچھ حصہ بطور نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

باب دوسرا - پردہ پہلا

[شاہناز کا مکان ۔ شاہناز اور عمرو]

ضلع کافی - " ایک پری نے مارا مو ہے ایک پری نے" طرز

شاہناز۔ جان سے جاتا ہوں میں جان سے اپنے جاتا ہوں
خونِ جگر اب کھاتا ہوں میں جان سے اپنے جاتا ہوں
کوئی نہیں ہے ہمدم میرا کوئی نہیں ہے مونس اب
چین کی صورت اے میرے بھائی کوئی نہیں پاتا ہوں

[عمرو انگوٹھی دیکھ کر بولتا ہے]

عمرو۔ ہاہا۔ کیا اچھی انگوٹھی ہے۔

شاہناز۔ (وہی طرز) ہووے بُرا اس عشق کا یارب جس نے آفت لائی ہے
اب سوچا ہے اپنے جی میں اب زہر منگا کے کھاتا ہوں
جان سے ۔۔۔

عمرو۔ اچھی شراب منگانا تھا، مزا ہوتا۔

شاہناز۔ ہم سے بھی عیاری! کب سے بک رہا ہوں، میرا کہنا نہیں سنتا۔ کیا دیوانہ ہے؟

عمرو۔ حقیقت میں ایسی نہیں سنتا۔ دیوانہ تو ہوں مگر بکارِ خود عاقل ہوں (دُور نظر کر) خدا خیر کرے۔ میری پسلی پھڑکتی ہے۔ کوئی آدمی دوڑتا آتا ہے پر گھبرایا ہوا ہے۔

شاہناز۔ (گھبرا کر) نامہ بر! دیکھیں کیا ظاہر ہوتا ہے

(قاصد داخل ہوتا ہے)

کلیان - " کہوں کیا فلک کا ستایا ہوا ہوں" طرز

قاصد۔ کہوں کیا حال شاہ عالی مقام	عجب رنگ آمیز ہے اک پیام
ہمارا جو ہے شاہ بہزاد بخت	تباہی میں اس کا پڑا ملک تخت
جو تھی دختر شاہ عالی ہمم	ہوا اُس کے اوپر یہ بھاری ستم
کوئی دیو عقرب ہے بیداد گر	اڑا کے اُسے لے گیا اپنے گھر
مدد آپ کی اس میں منظور ہے	بہت شاہ صدمے سے رنجور ہے

حباب طبعاً شاعر تھے اور ان کو ابتدائے عمر سے شعر و سخن کا شوق اور مضامین رنگین کا ولولہ تھا۔ اس فن میں انھوں نے منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے فیضِ تربیت حاصل کیا تھا۔ ڈراما تنبیہ الغرور میں انھوں نے اپنے استاد کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل تین شعر بھی نقل کئے ہیں۔ یہ

شرفِتنہ پری کی زبان سے سنوائے گئے ہیں

مست باغوں میں لئے پھول کی بوتل آئے   پھر بہار آگئی پھر جھوم کے بادل آئے

مین گرمی میں گرجتے ہوئے بادل آئے   حکم دو سنوئیے کی جلدی کوئی بوتل آئے

ایک یاری نہیں ملتے ہیں کبھی دو مطلب   باغ کا قاعدہ ہے پھول گئے پھل آئے

حباب نے جا بجا اپنی غزلیں بھی اپنے ڈراموں میں شامل کی ہیں۔ شرر عشق میں جو غزلیں ہیں ان میں حباب کا تخلص بھی موجود ہے لیکن تنبیہہ الغرور' کی غزلوں میں تخلص موجود نہیں۔ ان غزلوں کی بندش سست ہے اور ان میں فن کی خامیاں بھی ہیں۔ دراصل حباب پہلے ناٹک کار اور تھیٹر کے منشی تھے اور شاعر لبعد کو۔ تھیٹر سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کو علمی مجلسوں اور ادبی صحبتوں میں وہ جگہ حاصل نہ تھی جو ایک شاعر کو مل سکتی تھی۔ اس زمانے میں تھیٹر والوں کا سوسائٹی میں کوئی درجہ نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ حباب کو رام پور کے حلقۂ شعر وسخن میں شہرت نہ ملی۔ یہاں تک کہ منیر کے رامپوری شاگردوں کے دائرے میں بھی حباب کو کوئی نہیں جانتا۔ خود رام پور کے ادبی کارکنوں کو حباب کا علم نہ تھا۔ محمد علی خاں اثر بھی، جنھوں نے شعرائے رام پور کا تذکرہ مرتب کیا ہے حباب سے بے خبر تھے۔ راقم السطور نے سفارش حسین رضوی کو حباب کے حالاتِ زندگی کی تفتیش کے لئے خط لکھا تو انھوں نے بھی اثر رامپوری کو حباب کے نام اور حالات سے مطلع کیا۔ راز یزدانی نے حال ہی میں 'نگار' میں شعرائے رام پور کے متعلق ایک طویل مضمون[۱] تحریر کیا ہے اس میں بھی حباب کا کہیں تذکرہ نہیں۔ حال آنکہ انھوں نے منیر شکوہ آبادی کے رامپوری تلامذہ کی ایک مفصل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں ایک صاحب نصیر احمد خاں سحاب کا نام بھی آتا ہے۔ معلوم نہیں سحاب اور حباب میں روحانی رشتہ کے علاوہ اور بھی کوئی تعلق تھا یا نہیں!

رامپور میں حباب کا قیام تین سال کے قریب رہا۔ اس مدت میں انھوں نے رامپور کے مشاعروں میں بھی شرکت کی تھی۔ چناں چہ ان کی غزلیں پرانے گلدستوں میں ملتی ہیں۔ 'تصویر مشاعرہ' جلد ا بابت ماہ مارچ ۱۹۰۶ء مرتبہ سید اللہ خاں عیش سے مندرجہ ذیل غزل نمونہ کے طور پر نقل کی جاتی ہے[۲]

یوں اُن سے نہ احوالِ دلِ زار کہوں گا
پوچھیں گے جو وہ مجھ سے تو سو بار کہوں گا

اے لذّتِ آزار خدا را وہیں سے چل
کچھ آج میں حالِ دلِ بیمار کہوں گا

بے شک قفسِ آدم تو ہے دیوارِ عناصر
پر اس سے نکل جانے کو دشوار کہوں گا

افضل ہے حبابؔ احمدِ مختار کی اولاد
یہ کلمۂ حق پڑھ کے سرِ دار کہوں گا

ناٹک نویس کی حیثیت سے حبابؔ اہم مرتبہ کے مالک ہیں۔ اُن کی اہمیت دو لحاظ سے ہے۔ پہلے تو یہ کہ وہ اردو کے دَورِ اوّلین کے ڈراما نگاروں میں سے ہیں اور اس میدان میں پیش رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رونق[۱] کی طرح انھوں نے بھی اپنی کوشش سے ڈرامے لکھے جو اُن کی اپنی تخلیق ہیں۔ مابعد ڈراما نگاروں نے ان ہی استادانِ فن کی بنیاد پر اپنی عمارتیں کھڑی کیں۔ دوسرے یہ کہ حباب غالباً پہلے ڈراما نگار ہیں جنھوں نے ڈراما کی زبان پر تنقید کی ہے۔ 'شررِ عشق' کے دیباچے میں انھوں نے گانوں کی زبان اور مکالموں کی زبان دونوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے اور یہ رائے بہت پُر ارزش ہے۔ جبل پور میں جیسا کہ تذکرہ ہو چکا ہے اوریجنل وکٹوریا تھیٹریکل کمپنی نے جو ڈرامے اسٹیج کئے تھے اُن کی زبان کی خامیوں کو دیکھنے کے بعد ہی حباب نے خود ناٹک لکھنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ 'جدید طرز' کا ناٹک لکھیں جو زبان کی کمزوریوں سے پاک ہو۔ جدید طرز سے مراد یہ بھی ہے کہ اس کے مکالمے فطری ہوں۔ اندر سبھا اور اُس کی نقلوں کی طرح نہیں کہ ہر فرد کی گفتگو سر سے پا تک غزل اور گیت میں ہے۔ اس لحاظ سے اوّلیت کا سہرا حباب کے سر ہے کہ انھوں نے مکالمے کی زبان کو فطری بنانے کی کوشش کی۔

حباب کا خیال ہے کہ ڈرامے کی زبان مستند اُردو ہونی چاہیئے۔ وہ اردو جو لکھنؤ اور دہلی میں بولی جاتی ہے۔ چناں چہ وہ خود لکھتے ہیں:

"اب شائقین باریک بین کی خدمت میں التجا ہے کہ سند ہر زبان کی اہلِ زبان سے ہے۔ اسی طرح اردو کے شاعروں کے واسطے

---

[۱] مضمون 'رام پور کا ماحول شعر وسخن' بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۸ء

[۲] خط سفارش حسین رضوی مورخہ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۵۳ء

[۱] ملاحظہ ہو راقم السطور کا مضمون 'محمود میاں رونق' مطبوعہ 'نوائے ادب' بابت جولائی ۱۹۵۴ء

بیروی زبان فصیح لکھنؤ اور اردوئے معلیٰ دہلی کی چاہیئے - علاوہ اس کے شاعری ایک علم ہے جس کے واسطے پابندی قاعدے کی چاہیئے، اوّل پختگی گرامر کی، دوئم خوش بیانی، تیسرے عروض وقافیہ[1] "

حباب کی یہ رائے بہت ہی صائب ہے کہ " ناٹک میں بلاغت کو زیادہ دخل نہیں ہے، لیکن فصاحت اور شیریں کلامی تو ضرور چاہیئے - ہر چند ناٹک ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ جب سخنور جوہر پہچاننے والے سُنیں تو ہنسیں اور غلطی فاش ثابت ہو یعنی ٹھمریوں میں ترکیب اضافت فارسی کی نہ ہو اور غزل میں متروک الفاظ نہ آئیں ۔"

حباب سے پہلے ٹھمریوں میں فارسی کی ترکیب اضافی استعمال کرنا ڈراما نگاروں کا عام دستور تھا - رونق اور اس کے ہم عصروں میں کثرت سے اس خصوصیت کے نمونے ملتے ہیں - چند نمونے ملاحظہ ہوں :

رونق کا ڈراما 'خواب محبت' (عرف نادان کی دوستی اور جی کا جنجال)

باب پہلا - پردہ پہلا

کالنگڑا - ٹھمری " ٹوپی والے سانوریا " طرز

نورجہاں - میرے ذی شان آقا، رہو قائم سدا، تم پر ہیں ہم قربان آقا،
عادل ہو دریا دل ہو، جگ کے سلطان آقا، شاہانِ عالم ہیں تیرے ہر دم
زیرِ فرمان آقا۔

ظریف کا ڈراما نتیجۂ ستم عرف ظلم الظلم - باب پہلا - پردہ پانچواں

ٹھمری - غریبوں پہ ظالم جو تو نے جفا کی
خبر کیا نہ تھی تجھ کو روزِ جزا کی

اسی طرح غزلوں میں بھی متروک الفاظ عام طور پر استعمال ہوتے تھے، حباب نے ان دونوں باتوں کے خلاف عمل کیا اور اصلاحی قدم اُٹھایا۔

حباب کا دوسرا اصلاحی قدم مکالمے کے میدان میں اُٹھا - انھوں نے کوشش کی ہے کہ اشخاص کی زبان اُسی لحاظ سے ہو جس طبقہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں یہ بہت بڑی تبدیلی تھی کیونکہ جو روایت 'اندر سبھا' نے قائم کی تھی اب تک اُسی کی پیروی ہو رہی تھی - حباب اپنے مذکورہ الصدر دیباچے میں لکھتے ہیں :

---

[1] دیباچۂ 'ثمرِ عشق'

" اب سے ناٹک جدید طرز پر ہو، جس میں جوہر شناسوں کو مذاقِ شاعری و لطفِ محاورہ اور زبان کی صفائی ظاہر ہو، یہ بھی معلوم ہو کہ زبان بیگمات سلطان کی کیا ہے اور روزمرہ عورت درباری کی کیا ہے، اور بول چال غمزہ گرانِ بازاری کی کیا ہے اور سلطان کے دربار میں آدابِ گفتگو کیا ہے[1] "

اپنے بیان کردہ اصول کی جہاں تک حباب نے خود پیروی کی اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

ناٹک 'تنبیہہ الفرد' باب دوسرا - پردہ تیسرا

فتنہ - (درخت کے اندر شاہناز کی صورت دیکھ کر چونک پڑتی ہے) آئے اوئی گلاب
دیکھ تو اس درخت کی آڑ میں کون آدم زاد دکھائی دیتا ہے - جا بُلا لا

خواص - ایں بی بی - مجھ کم بخت نگوڑی کو آپ مار کیوں نہ ڈالیں، لونڈی نہ جائے گی۔
نہیں معلوم وہ مرد وا عورت سمجھ کر کیوں کر پیش آئے - آپ میری بے عزتی
چاہتی ہیں تو لونڈی آدھ سیر آٹا اور کڑاھی مانگ کھائے گی۔

دایہ - چل ہٹ کیا ٹوٹے بناتی ہے - روٹی کو ٹوٹی، پانی کو بُلا، خاوند کو بھیا
خدا جھوٹ نہ بلوائے تو دربار، بازار، سرکار، جوتی پیزار، تجھ سے کچھ
نہ بچا ہوگا - آٹا مانگ کھائے گی، نمک حرام جہاں جائے گی خشکہ
کھائے گی۔

خواص - دُور، تیرا کالا منہ، ایسی بڑھیا ڈائن کے مُنہ کون لگے۔

(دایہ شاہناز کے پاس جا کر کہتی ہے)

دایہ - او میاں نوجوان! کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاؤ گے؟ چلو ہماری
مالکہ تم کو یاد کرتی ہیں۔

شہناز - سُن بی بی پُرانی بڑھیا! ملکِ وفا سے آئے ہیں، سرائے فانی کی سیر
کرتے ہیں - ایک دن شہر خموشاں آباد کریں گے - تیری مالکہ نے مجھے
یاد کیا ہے - مگر میں اس کو بالکل بھولا ہوا ہوں۔

ڈراما کے گانوں اور مکالموں کی زبان کے بارے میں جو بحث پہلی مرتبہ حباب نے چھیڑی تھی اور اس سلسلے میں جو اصلاحی قدم اُٹھایا تھا مابعد کے ناٹک کاروں اور نقادوں نے اس کو مستقل موضوع بنا لیا اور اس پر بڑی

---

[1] دیباچۂ 'ثمرِ عشق'

معرکہ آرائی ہوئی۔ ایسے نقادوں کی فہرست میں برجموہن کیفی اور احسن لکھنوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کے مضمون 'نامۂ احسن'[1] میں گانوں کی زبان اور مکالموں کی طرز پر خاصی لمبی بحث ہے۔ ان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں جن میں حباب کا اثر صاف طور پر نمایاں ہے۔

" طبقات انسانی کے لحاظ سے زبان جدا جدا ہے۔ قمار خانہ والوں کی زبان، مکاروں، دغابازوں کی زبان، مظلومانِ ستم کش کی زبان، شرابیوں کی زبان، نبرد آزما بہادروں کی زبان، غربت نصیبان آوارہ وطن کی زبان، اپنے لئے الفاظ خود بخود تجویز کرتی ہے، ہر طبقہ کے اصطلاحات و محاورات جدا جدا ہیں اور گانے کی زبان ان خصوصیات کی پابند ہے[2]۔ "

اس لحاظ سے جناب احسن لکھنوی کا یہ دعوی کہ

" ہندوستان کی اسٹیج پر ڈراماز کی اسٹائل بدلنے کا فخر میرے ناچیز قلم کو حاصل ہے[3]"

بڑی حد تک ناقابلِ قبول ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ڈراما نگاری کی اسٹیج پر جناب احسن کے نمودار ہونے سے ایک نیا باب شروع ہو جاتا ہے لیکن اصلاح و تجدید کی داغ بیل حباب مرحوم کی ڈالی ہوئی ہے۔ اور ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کا احسان مانیں۔

حباب اپنے دور کے باکمال ہنرمندوں میں سے تھے۔ لہٰذا یہ یقینی ہے کہ ان کے فن کا اثر دوسرے نوجوان ناٹک نگاروں پر پڑا ہوگا۔ جو ناکافی معلومات ہم کو حاصل ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ احسن لکھنوی اور آغا حشر کاشمیری دونوں نے ان کا زمانہ دیکھا ہے اور ان سے استفادہ کیا ہے۔ سید امتیاز علی تاج کا یہ خیال ہے کہ حباب کے ناٹکوں کو دیکھ کر ہی احسن کو ڈراما نگاری کا شوق پیدا ہوا[4]۔ ڈاکٹر نامی لکھتے ہیں کہ " زمانۂ طفلی میں احسن اپنے گھر کے قریب والی عمارت 'افضل محل' جس میں اکثر تھیٹریکل کمپنیاں قیام کرتی تھیں تماشے دیکھتے تھے۔ ان کو منشی حباب کے ڈرامے 'غزالۂ ماہرو' اور 'جشنِ کنور سین' بے حد پسند تھے۔ انھوں نے ایک بار حباب رام پوری سے درخواست بھی کی تھی کہ وہ ان کو اپنی شاگردی میں قبول کرلیں لیکن انھوں نے منظور نہیں کیا[5]۔ " اگرچہ خود احسن لکھنوی نے حباب کے اثر کا کہیں اعتراف نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے منشی کریم الدین کو اپنا استاد روحانی تسلیم کیا ہے اور منشی صاحب کے فن اور کمال کی بڑی تعریف کی ہے[6]۔ گانے اور مکالمے دونوں کے لحاظ سے احسن نے حباب کی پیروی کی ہے۔ حباب کا ناٹک 'غزالۂ ماہرو' واجد علی شاہ کی مثنوی 'دریائے تعشق' کا روپانتر ہے۔ احسن لکھنوی نے حباب کی تقلید کرتے ہوئے اپنے پہلے ناٹک 'دستاویزِ محبت' کے پلاٹ کی بنیاد اپنے نانا شوق لکھنوی کی مشہور مثنوی 'زہرِ عشق' کی داستان پہ رکھی۔

جہاں تک حباب اور حشر کا تعلق ہے ڈاکٹر نامی کا قول ہے کہ " حباب جنھوں نے آغا حشر سے کہا تھا کہ ڈراما نویس بننا ہر ایک کا کام نہیں ۔۔۔۔ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آغا حشر کی منزل کہاں ہے[7]"۔ آغا حشر میں نہ جانے کون سی بات دیکھی کہ حباب نے انھیں اپنی شاگردی میں لینے سے انکار کر دیا۔ ورنہ شاگرد بنانے سے اُن کو اجتناب نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے ایک شاگرد رستم علی خاں نامی تھے۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے تھے اور رمضان علی خاں کے بیٹے تھے۔ رستم علی خاں انڈین امپریس ڈرامیٹک کمپنی آف بنارس میں کام کرتے تھے۔ ان کا ایک ناٹک میرے پاس موجود ہے جس کا نام 'چمنستانِ قدرت معروف بہ آئینۂ حیرت' ہے۔ اس ناٹک کا قصہ ایک دوسرے ناٹک 'گنجینۂ جنت یا طلسم الفت' مؤلفہ حافظ عبداللہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس کو طرزِ جدید سے تصنیف کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں رستم علی خاں کی قلمی تصویر بھی ہے۔

مضمون ہذا کی تیاری میں مندرجہ ذیل حضرات نے میری امداد فرمائی؛
پروفیسر سید مسعود حسین رضوی صاحب ، محمد علی خاں صاحب اثر رام پوری
سفارش حسین رضوی صاحب ، پروفیسر اختر حسین نظامی صاحب
سید امتیاز علی تاج صاحب

---

[1] مطبوعہ رسالہ 'بہارستان' لاہور بابت جنوری فروری ۱۹۲۷ء
[2] مضمون 'نامۂ احسن' [3] مضمون 'نامۂ احسن'
[4] خط سید امتیاز علی تاج مورخہ ۔ ستمبر ۱۹۵۶ء

[5] مضمون مطبوعہ نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۳ء
[6] مضمون 'نامۂ احسن'
[7] مضمون 'آغا حشر اور ان کے معاصرین' مطبوعہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی ۱۹۵۳ء

عبدالرزاق قریشی

منشی دیا نرائن نگم

اگست (۱۹۴۱ء) کا مہینا تھا۔ ایک دن شام کے وقت میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا۔ کہنے لگے "اچھا ہوا تم آگئے۔ ماموں جان (پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی) آنے والے ہیں۔" چنانچہ چند ہی منٹ بعد وہ تشریف لائے۔ آتے ہی کہا۔ "چلو تم لوگوں کو آج ایک 'عجیب چیز' دکھاؤں۔" ہم نے پوچھا کہ وہ کیا چیز ہے؟ کہنے لگے "کچھ بولو مت۔ چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ ---" فلورا فاؤنٹن کے قریب پہنچ کر وہ تو ساری بلڈنگ تلاش کرنے لگے۔ ہم نے پھر پوچھا کہ آخر بات کیا ہے؟ اپنے مخصوص لہجے میں بولے "کچھ نہیں۔ تم لوگوں کو ایک "نادر چیز" دکھانا چاہتا ہوں۔" تو ساری بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ڈاکٹر بناجی کا نرسنگ ہوم ہے۔ ندوی صاحب اور ان کے پیچھے ہم دونوں ایک کیبن میں داخل ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک لمبا چھریرے جسم کا انسان ایک پلنگ پر اس طرح لیٹا ہے کہ دائیں بائیں کروٹ بھی نہیں لے سکتا۔ اس کی دونوں آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ ندوی صاحب نے اس "شخص" کو آداب عرض کیا اور کہا "میں نجیب اشرف ہوں۔" سخت تکلیف اور بے چینی کے باوجود اس "مریض" نے بڑی خوش مزاجی سے تسلیمات عرض کی اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اب ندوی صاحب نے ہم لوگوں کو بتایا کہ یہ زمانہ کے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم ہیں۔ یہ تھی میری اور نگم صاحب کی پہلی ملاقات۔

نگم صاحب کو Detachment of Retina کی شکایت تھی۔ اسی کا علاج کرانے وہ بمبئی آئے تھے۔ ڈاکٹر بناجی نے آپریشن کیا جو کامیاب رہا۔ تقریباً دو ہفتے وہ نرسنگ ہوم میں رہے۔ یہاں ہر دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ پٹی کھل جانے کے بعد وہ سنتا کروز[1] اپنے ایک ملتانی دوست کے یہاں منتقل ہو گئے۔ جب میں وہاں پہلی بار گیا اور اپنا نام بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "آپ سے ملاقات تو کئی بار ہو چکی ہے لیکن دیکھ پہلی مرتبہ رہا ہوں۔" سنتا کروز میں وہ تقریباً ایک مہینا رہے۔ یہاں بھی کئی بار میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتنی محبت سے ملتے اور ایسی شفقت آمیز باتیں کرتے کہ وہاں سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا۔ انھیں دنیا سے اٹھے ہوئے ۱۵ برس ہو چکے ہیں لیکن ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک انداز آج بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے اور میرا یقین ہے کہ یہی حال ان کے دوسرے دوستوں اور عقیدت مندوں کا ہوگا۔ آرزو لکھنوی نے ان کی وفات پر بالکل صحیح کہا تھا کہ

دلوں میں اہلِ صفا کے اب تک دیا نرائن نگم ہیں زندہ

وہ اس وقت بھی زندہ تھے، آج بھی زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہیں گے۔

دیا نرائن نگم ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو اپنے آبائی وطن کان پور میں پیدا ہوئے۔ وہ قوم کے کائستھ تھے۔ ان کے دادا منشی سیو سہائے نگم شہر کے ایک مشہور وکیل تھے۔ ان کے والد شیو پرشاد نگم بھی ایک کامیاب وکیل تھے۔ رسمِ زمانہ کے مطابق دیا نرائن کی ابتدائی تعلیم اردو، فارسی سے گھر ہی پر ہوئی۔ پھر گھر ہی پر انگریزی شروع کی۔ ۱۸۹۴ء میں کان پور گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں انٹرنس کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اس کے بعد کرائسٹ

---

[1] مضافاتِ بمبئی میں ایک پُر فضا مقام

چرچ کالج میں داخل ہوئے۔ اور ۱۹۰۳ء میں بی۔اے کی ڈگری لی۔ اب بزرگوں کا اصرار ہوا کہ وہ وکالت کا امتحان دیں اور دولت کمائیں۔ لیکن خود انھیں ادب سے لگاؤ تھا چنانچہ سارے خاندان کی خواہش اور اصرار کے باوجود وہ وکیل نہیں بنے اور ادب کی خدمت کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دیا۔

۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے لاہور سے 'مخزن' جاری کیا۔ شیخ صاحب بڑے زمانہ شناس، دوراندیش اور ترقی پسند خیالات کے بزرگ تھے۔ مخزن کے مضامین معیاری ہوتے تھے اور اندازِ فکر مغربی تھا۔ نگم صاحب نے ۱۹۰۲ء سے اس میں لکھنا شروع کیا۔ اس زمانہ میں وہ بی۔اے میں پڑھتے تھے۔ حسرت موہانی کی بھی سیاسی و ادبی زندگی کا آغاز اسی سال سے ہوتا ہے۔

بی۔اے ہونے کے بعد نگم صاحب نے زمانہ کی ادارت سنبھالی۔ زمانہ ۱۹۰۱ء سے بریلی سے نکلتا تھا۔ نگم صاحب اس کا دفتر کانپور لائے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک یعنی تقریباً چالیس سال وہ اس رسالہ کے اڈیٹر رہے۔ اس مدت میں اُردو کے بیسیوں رسالے نکلے اور بند ہوئے۔ لیکن 'زمانہ' زمانے کی ناسازگاریوں کے باوجود نکلتا رہا۔ یہ دراصل نگم صاحب کے لگاؤ، لگن اور ایثار و قربانی کا نتیجہ تھا۔ بقول ان کے صاحبزادہ سری نرائن صاحب نگم "خاندانی جائداد رسالہ کی نذر ہو گئی، ہزاروں روپے کے قرض کا بار ہو گیا۔ لیکن والد مرحوم نے ادبی خدمت سے منہ نہ موڑا .... شوق کا یہ عالم تھا کہ دو دو بجے رات تک کام کرتے تھے۔"[4]

ایک زمانہ میں نقصان زیادہ ہوا اور قرض کا بار بہت بڑھ گیا۔ سری نرائن صاحب ہی کا بیان ہے کہ

> "ہندی کے ایک رئیس قدردان نے یہ پیشکش کی کہ اگر رسالہ آئندہ بجائے اردو کے ہندی میں نکالا جائے تو وہ نہ صرف سابقہ نقصانات کی تلافی کر دیں گے بلکہ اس کے آئندہ اخراجات کے بھی کفیل ہوں گے۔ لیکن مرحوم نے اس پیشکش کو شکریہ کے ساتھ نامنظور کر دیا۔"

نگم صاحب کو ادب اور زندگی کے تعلق کا احساس ابتداء ہی سے تھا۔ وہ زمانے کی رفتار کو خوب پہچانتے تھے۔ وہ نہ آئینِ نو سے ڈرتے تھے اور نہ طرزِ کہن پر اڑنا ان کا شیوہ تھا۔ وہ پرانی قدروں کے پرستار ہونے کے باوجود نئی قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی صحیح ترقی پسندی ہے۔ جدّت پسند قدیم چیزوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ قدامت پسند اور جدّت پسند میں یہ فرق ہے کہ قدامت پسند پُرانی قدروں سے چمٹا رہتا ہے اور نئی قدروں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ جدّت پسند پُرانی قدروں کے ساتھ نئی قدروں کا بھی احترام کرتا ہے۔ سرور نے ٹھیک کہا ہے کہ "نقاد اپنے کو خانوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ اُسے قدیم و جدید دونوں کے ساتھ رہنا اور چلنا ہوگا۔"[1] زمانہ نے ہر حیات بخش اور ترقی پسند ادبی تحریک کا خیر مقدم کیا۔

جس زمانے میں زمانہ وجود میں آیا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے آغاز کا زمانہ تھا۔ ۱۹۰۶ء میں تلک کی سرکردگی میں سیاست نے تجویزوں سے گزر کر عمل کے دائرہ میں قدم رکھا۔ کانگرس کے سالانہ اجلاس (کلکتہ) میں آزادیٔ کامل کا مطالبہ پیش ہوا۔ نگم صاحب نے اسی زمانے میں یعنی ۱۹۰۶ء میں زمانہ کا قومی نمبر نکالا۔ سالانکہ سیاسیات میں وہ اعتدال پسند تھے۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے پھر زمانہ کا قومی نمبر نکالا۔ دوسرے نمبر کی تیاری کے موقع پر شاقب کانپوری نے ان سے اختلاف رائے کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ زمانہ ایک ادبی رسالہ ہے۔ اسے سیاست سے تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ نگم صاحب نے جواب دیا کہ "آپ سیاست کو کہتے ہیں، میں تو کہتا ہوں کہ زمانہ میں مصوری، موسیقی اور رقص و سرود کو بھی جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ تمام چیزیں ہماری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارا ادب اُن سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔"[2] "زمانہ" کا چارج لینے کے بعد جب انھوں نے رفتارِ زمانہ کے تحت سیاسی مباحث پر بھی لکھنا شروع کیا تو شیخ عبدالقادر نے ان سے اختلاف رائے کیا اور انھیں اس سے باز رکھنا چاہا۔ اس سلسلہ میں دونوں حضرات میں خط و کتابت ہوئی۔ آخر شیخ صاحب کو ان کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا۔ ان کی وفات پر شیخ صاحب نے جو مضمون لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ

> "مخزن کی سب خصوصیات اس میں (زمانہ) جمع تھیں اور اکثر مضمون نگار مشترک تھے۔ مگر ایک چیز اس میں زاید تھی۔"[3]

---

[1] "تنقیدی اشارے (دیباچہ)

[2]۔ نقوش، شخصیات نمبر۲ [3] زمانہ نگم نمبر

[4] زمانہ، نگم نمبر

یہ زاید جیز رفتار زمانہ تھی۔ لیکن ہر مہینہ سیاست پر لکھنے کے باوجود نگم صاحب نے زمانہ کے صفحات کو سیاسی دنگل نہیں بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے مزاج میں حق گوئی کے ساتھ صلح جوئی بھی تھی۔

نگم صاحب نے اپنی زندگی کا مقصد اردو ادب کی خدمت قرار دیا تھا۔ اس مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ زمانہ تھا۔ اس لئے وہ انھیں جان کی طرح عزیز تھا۔ وہ اپنے وقت کے تقریباً تمام اچھے ادیبوں اور شاعروں سے زمانہ کے لئے مضامین اور نظمیں حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ مضامین اور نظمیں حاصل کرنے کے انھیں ڈھنگ بھی خوب آتے تھے۔ بقول شیخ عبدالقادر "کہیں اصرار سے، کہیں منّت سے، کہیں معاوضہ دے کر مضامین اطرافِ ملک سے حاصل کرنے اور شائع کرنے میں کامیاب ہوتے رہے[1]"

ان کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حالی، اکبر، لاجپت رائے، عزیز مرزا، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، اقبال، پریم چند، نوبت رائے نظر، سرور جہاں آبادی وغیرہ کے مضامین، نظمیں اور غزلیں زمانہ میں شائع ہوتی تھیں۔

وہ نئے مضمون نگاروں کی بہت ہمّت افزائی کرتے تھے۔ یہ ہمّت افزائی محض زبانی نہ ہوتی۔ خطوط کے ذریعہ ہوتی۔ معاوضہ دے کر ہوتی۔ یہاں میں مثالاً صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں۔ ایک بار انھوں نے احتشام حسین سے ایک مضمون کا ترجمہ کرایا۔ احتشام لکھتے ہیں کہ

"ترجمہ انھیں بہت پسند آیا۔ تعریف میں ایک سے زیادہ خط لکھے۔ ہدیہ بھیجا اور اس سے زیادہ قیمتی وہ ہمّت افزائی کے الفاظ تھے جو موصوف کی محبت کے آئینہ دار تھے[2]۔"

اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ نئے نئے مضمون نگار بناتے۔ ان کے حوصلہ افزا الفاظ میں کچھ ایسا جادو ہوتا کہ آدمی لکھنے پر مجبور ہو جاتا۔ ان کی اصلاح اور ہمّت افزائی اسے ترقی دیتی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسِ خام کندن بن جاتا۔

ہندوستان کی تاریخ میں سید برادران بادشاہ گر کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہر ملک میں بادشاہ گر ہوئے ہیں۔ ان بادشاہ گروں کے بنائے ہوئے

---

[1]، [2] زمانہ، نگم نمبر

بادشاہوں کے نام صرف تاریخ کے صفحات میں باقی رہ گئے ہیں لیکن منشی دیا نرائن نگم ادیب گر اور شاعر گر تھے۔ ان کے بنائے ہوئے ادیب اور شاعر اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اردو زبان زندہ ہے۔ ان ادیبوں اور شاعروں کے نام ہماری زندگی سے وابستہ ہیں۔ برج نرائن چکبست، جگت موہن لال رواں، پریم چند، سرور جہان آبادی، سدرشن کے حیات بخش ادبی کارناموں کو بھلا دینا آسان نہیں۔

مرحوم کو زمانہ کا ہر وقت اور ہر حال میں خیال رہتا تھا۔ مجھ سے پہلی ہی ملاقات میں پوچھا کہ آپ کچھ لکھتے بھی ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ لکھتا ہوں مگر بہت کم۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت آپ جو کچھ لکھ رہے ہوں اُسے زمانہ کو دیجئیگا، حالانکہ صرف ایک دن پہلے ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا اور اس وقت انھیں خاصی تکلیف تھی۔ سنتا کروز کے دورانِ قیام میں میں نے کئی بار دیکھا کہ وہ زمانہ میں شائع ہونے والے مضامین کی تصحیح کروا رہے تھے۔ ان کے اسسٹنٹ چندر بھوشن سنگھ مضمون پڑھتے جاتے اور وہ جہاں جہاں ضرورت سمجھتے تبدیلی کرتے۔ ایک ایک جملہ پر غور کرتے، بار بار غور کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ کا معیار کبھی گرنے نہ پایا۔ ان کے صاحبزادہ سری نرائن صاحب نگم کا بیان ہے کہ

"زمانہ میں ایک سطر بھی ان کی نظرِ ثانی کے بغیر شائع نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک مشہور اہلِ قلم نے ان کی اصلاح پر اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اڈیٹر ہوں، محض پرنٹر نہیں۔ اس لئے اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو سکتا[1]۔"

آخری جملہ سے مرحوم کی حق گوئی و اصول پرستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بیتاب بریلوی کے اس بیان سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مرحوم کو زمانہ کس قدر عزیز تھا۔

"..... مرحوم اس وقت سفر میں تھے اور منصوری سے بریلی آئے تھے اور بہت جلد مراجعتِ وطن کے متمنی تھے۔ پھر بھی زمانہ کی اگلی اشاعتوں کے متعلق مضامین کا پلندا اپنے سینے سے لگائے تھے اور ان کی گفتگو کا موضوع بھی یہی زمانہ تھا[2]۔"

اُردو کی ترقی کا خیال انھیں ہر وقت رہتا۔ وہ اس کی ترقی کے ذرائع سوچا

---

[1]، [2] زمانہ، نگم نمبر

کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر ان سے اپنی آخری بار کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جتنی ملاقاتیں ان سے ہوئیں ان میں کوئی وقت بھی ایسا نہ تھا جب اردو ادبیات کی ترقی کی تجاویز کے سوا کوئی اور تذکرہ انھوں نے کیا ہو۔[1]"

الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی قائم ہوئی تو انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا اور شیخ عبدالقادر کے قول کے مطابق "حکومت سے بار بار اس کی امداد کی استدعا کی اور آخر ایک معقول سالانہ امداد" حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے وہ صوبہ بہار و اڑیسا کی سرکاری اردو ہندی کمیٹی کے ممبر تھے۔ حیدرآباد کی نستعلیق ٹائپ کانفرنس کے ممبر تھے۔ الہ آباد یونی ورسٹی کورٹ، آگرا یونی ورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل وغیرہ کے وہ مدتوں رکن رہے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے وہ ایک سرگرم رکن تھے۔

اردو کے ساتھ ساتھ وہ ہندی کے بھی بہی خواہ تھے۔ اُردو، ہندی کے متعلق ان کی رائے تھی کہ

"دونوں زبانوں میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ بول چال میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو بہت ہی خفیف اور قابل نظر انداز مگر دونوں کو ملانے یا دو کے بجائے صرف ایک زبان کو باقی رکھنے کے خیال اور کوشش کا نتیجہ معکوس ہو رہا ہے...... دونوں میں قدرتاً جس قدر اتحاد ہے اس کو باقی رکھنا ہمارا ملکی فرض ہے...... ہم کو انگریزی اصطلاحات سے بھی نان کوآپریشن کی حاجت نہیں ہے۔ اسکول، اسٹول، اسٹیشن وغیرہ جو الفاظ اردو، ہندی میں داخل ہو گئے ہیں ان کے بجائے اب دوسرے لفظوں کی تلاش فضول ہے۔

"محبانِ وطن کو ہندی، اردو کی باہمی رقابت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور دونوں میں سے ہم کسی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔[2]"

ہندی، اردو کو ترقی دینے کے لئے مرحوم نے مندرجۂ ذیل ذرائع اختیار کرنے کی سفارش کی تھی :

۱۔ تعلیم دیسی زبان میں دی جائے۔
۲۔ گورنمنٹ اور عوام کی مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے۔
۳۔ ایک ہندستانی اکیڈمی کے قیام کی کوشش کی جائے۔
۴۔ ملک کے قابل انشاپردازوں اور مترجموں کو اس اکیڈمی کی سرپرستی و نگرانی میں ادبی خدمت کا پورا موقع دیا جائے۔
۵۔ ہر مضمون پر معقول معاوضے کر کتابیں تصنیف کرائی جائیں۔
۶۔ دیگر زبانوں کے قابل قدر سرمایہ کو اردو ہندی میں منتقل کیا جائے۔
۷۔ بچوں کے لئے لٹریچر تیار کرایا جائے
۸۔ لغات، انسائیکلوپیڈیا، فرہنگ اصطلاحات، ہر شعبہ کی فہرست کتب وغیرہ کی ترتیب و تدوین کی جائے۔
۹۔ تصنیفات پر انعام دئے جائیں
۱۰۔ ادبی خدمت بھی پیشہ کی حیثیت سے اختیار کی جاسکے۔
۱۱۔ اردو کتابوں کی چھپائی میں ٹائپ استعمال کیا جائے۔[3]

مرحوم نے کتابوں کا ایک بہت اچھا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ وہ اس ذخیرے کو قوم و وطن کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے۔ زمانہ کو اپنے بعد جاری رکھنے کی وہ یہ صورت نکالنا چاہتے تھے کہ ایک لمیٹڈ کمپنی بنائیں جس کے کئی حصہ دار ہوں اس اسکیم کے ابتدائی مراحل انھوں نے طے کر لئے تھے۔ خاص خاص دوست احباب سے اس میں شریک ہونے کا وعدہ بھی لے لیا تھا۔ لیکن افسوس کہ اسکیم کو عمل میں لانے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا اور زمانہ زمانے کی "بدنیتی" کا شکار ہو گیا۔ اس طرح ایک محسن اُردو کی ایک اچھی یادگار مٹ گئی۔

نگم صاحب کی کامیابی کا راز ان کی میانہ روی مستقل مزاجی، اصول پرستی اور انصاف پسندی میں تھا۔ ان کی شخصیت میں رنگا رنگی تھی۔ اس رنگا رنگی نے ان کی شخصیت کو دل کش بنا دیا تھا۔ ان میں ایک طرف گہری محبت تھی، دوسری طرف حق گوئی و بیباکی۔ ایک طرف مروت و رواداری تھی، دوسری طرف خود داری۔ ایک طرف ہمت افزائی تھی، دوسری طرف اصول پرستی۔ اخبار نویسی کا پیشہ ان کی نگاہ میں ایک مقدس پیشہ ہے اور اخبار نویس ایک بلند مرتبہ شخصیت ہے وہ اخبار نویس کو بڑے سے بڑے مدبر، نامور سے نامور محب وطن اور مشہور سے

---

[1] زمانہ نگم نمبر
[2-3] زمانہ، قومی نمبر ۱۹۲۵ء

مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کمتر نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں اس پیشہ کے لئے ایثار نفس ضروری ہے۔ اچھے اخبار نویس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تحریر میں وزن اور متانت ہو۔ اس کی نکتہ چینی ذاتیات سے بالاتر ہو۔ حمایت ہو یا مخالفت دونوں صورتوں میں اُسے تعصب سے بری رہنا چاہیئے۔ ایک کامیاب اخبار نویس کو "اپنے ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے[1]۔" یہ تمام باتیں نگم صاحب کی رائے میں "جبھی ممکن ہیں جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہِ راست پر چلتے رہیں[2]۔"

مرحوم بڑے جفاکش تھے۔ زمانہ کے علاوہ "آزاد" ہفتہ وار بھی ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ دونوں کی کاپیوں کی تصحیح وہ خود کرتے تھے۔ ہر روز ڈاک میں خطوط کا انبار لگ جاتا۔ لیکن ہر خط وہ خود پڑھتے اور اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے۔ محض انتہائی مجبوری کی حالت میں کسی اور سے لکھاتے۔ آنکھ کے آپریشن کے بعد انھیں زیادہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود اکثر خطوط وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے۔ ان کی جفاکشی سے متعلق حسن نظامی نے لکھا ہے کہ

"جب پنجاب کے اخبار نویس دہلی اور لکھنؤ کے اخبار نویسوں پر
اعتراض کرتے کہ وہ کاہل اور کام چور ہوتے ہیں تو میں منشی دیا نرائن نگم
کی مثال دے کر کہتا تھا کہ غیر پنجابی لوگ بھی محنت کر سکتے ہیں[3]۔"

سیاست میں نگم صاحب اعتدال پسند تھے مگر اظہار رائے میں بے لاگ تھے۔ حق بات کہنے سے کبھی نہ چوکتے۔ حکومت کی قابلِ اعتراض پالیسی پر ضرور اعتراض کرتے۔ اکثر کہا کرتے کہ "ملک کا ہر فرد بشر کم از کم اس کا مستحق ہے کہ معمولی طریقہ سے اپنی گذر بسر کر سکے اور اگر کسی نظامِ حکومت میں یہ ممکن نہیں تو ایسے نظام کو زندہ رہنے کا بھی حق حاصل نہیں[4]۔"

مرحوم ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ مسلمانوں سے انکے خلوص و محبت کا ایک بڑا ثبوت ان کا ہفتہ وار اخبار "آزاد" ہے۔ ثاقب کان پوری کا بیان ہے کہ

"اس کے (آزاد) کے اجراء کی تحریک مسجد مچھلی بازار کی شہادت
سے ہوئی۔ دیا نرائن مسلمانوں کو ان کا حق دلانا چاہتے تھے۔ انھوں نے
بڑی بے باکی سے برطانوی شہنشاہیت کی سنگینوں تلے اپنی رائے کا
اظہار کیا[5]۔"

انگریزوں کے آخری دورِ حکومت میں ہندوستان میں جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے۔ کان پور بھی اس بربریت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ لیکن نگم صاحب کی کوششوں سے ان کے محلہ میں ہمیشہ امن رہا۔ ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۹ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں کان پور میں جو مصالحتی بورڈ بنا تھا، مرحوم اس کے سکریٹری تھے اور بقول سری نرائن صاحب "باہمی کشیدگی رفع کرنے میں قابلِ قدر خدمات انجام دی تھیں[6]۔"

۱۹۳۱ء کے بلوے کے سلسلہ میں سری نرائن صاحب لکھتے ہیں کہ

"ان کے مکان میں تخمیناً دو سو سے زاید مرد عورتیں پناہ گزیں
تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محلہ کے غریب مسلمان روزانہ جنس لینے کے عادی تھے۔
ان کے لئے انھوں نے آٹے کی بوریاں خاص اہتمام سے فراہم کرائیں۔
محلہ کے چند مفسدین قریب کے مندروں کے چیلوں کی خبر سے مشتعل
ہو کر محلہ کی ایک مسجد پر دھاوا بولنے کی نیت کر رہے تھے۔ یہ حال
معلوم ہونے پر مرحوم نے ان کو سخت لعنت ملامت کی اور کہا کہ
جب تک میرے دم میں دم ہے میں مسجد پر آنچ نہ آنے دوں گا۔
چنانچہ پھر ان لوگوں کو حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی[7]۔"

نگم صاحب اس تہذیب کے پروردہ یافتہ تھے جو ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ تھی۔ میں نے اس لئے کہا کہ یہ متاعِ عزیز زمانہ کے ہاتھوں تقریباً تباہ ہو چکی ہے۔ بزرگوں کا احترام، دوستوں سے خلوص، چھوٹوں سے شفقت اب مہمل الفاظ بنتے جا رہے ہیں۔ نگم صاحب محبت و مروت اور اخلاص کا پیکر تھے۔ ایسے پُرخلوص لہجے میں باتیں کرتے کہ رائے میں ان سے اختلاف کے باوجود ان کی بات بُری نہ لگتی۔ حسن نظامی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اکبر الہ آبادی کہا کرتے تھے کہ

"وہ (نگم صاحب) ایسے معقول ہندو ہیں جن کی شرافت کی قدر
ہوتی ہے اور جو دوسروں پر احسان کر کے خوش ہوتے ہیں[8]۔"

---

[1] [2] خطبۂ صدارت، بحوالہ زمانہ، نگم نمبر
[3] [4] زمانہ، نگم نمبر

[5] نقوش، شخصیات نمبر
[6] [7] [8] زمانہ، نگم نمبر

خود حسن نظامی کی ان کے متعلق یہ رائے تھی کہ

"ان کے دل میں بڑی وسعت تھی اور وہ سب کا بھلا چاہتے تھے[1]"

حسرت موہانی نے نگم نمبر میں جو مضمون لکھا ہے اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

"فقیر کے قید و بند کے زمانے میں مرحومہ بیگم حسرت موہانی کی زبانی مجھ کو رہائی کے بعد معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ مرحوم نے میری غیبت میں ان کے ساتھ برادرانہ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ قائم رکھا[2]"

سری نرائن صاحب نگم کا بیان ہے کہ

"وہ مخالف کی خوبیوں کا اعتراف کرنا جانتے تھے اور مخالفت میں بھی اصول اور آئین کو ملحوظ رکھتے تھے[3]"

جوش ملیح آبادی نے بڑی محبت سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

"میری ایک نظم بے جا ازدواج کے خلاف ہے انھوں نے مجھے ملامت کی تھی کہ ایسی نظمیں سماج کے اخلاق کو بگاڑ دیں گی[4]"

اُستاذ محترم پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے 'شبلی اور بمبئی' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ یہی مضمون آگے چل کر وحید قریشی کے قلم سے 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' بن گیا۔ ایک دن اتفاق سے اس کا ذکر آ گیا۔ نگم صاحب نے بڑے بزرگانہ اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ "نجیب اشرف صاحب کو یہ مضمون نہیں لکھنا چاہیئے تھا۔" زندگی کی قدریں اس قدر بدل چکی ہیں کہ نگم صاحب کی یہ باتیں نئی پود کو شاید کچھ عجیب سی معلوم ہوں۔

مرحوم کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ اس وسعت میں رنگا رنگی بھی تھی ادیب، شاعر، افسانہ نگار ان کے مخلص دوست تھے۔ سیاست داں اور لیڈر سے ان کا یارانہ تھا۔ انگریز اور ہندوستانی کی ان کی بزم میں تمیز نہ تھی۔ انگریز پرست اور انگریز دشمن دونوں ان کی محفل میں بار پاتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں انھیں عزیز تھے۔ سرمایہ دار اور مفلس و قلاش سے ان کا یکساں میل جول تھا۔

[1] تا [4] زمانہ، نگم نمبر

عالم اور جاہل دونوں کے وہ شدائی تھے۔

نگم صاحب فطرتاً متین و سنجیدہ تھے لیکن زاہدِ خشک نہ تھے۔ طبیعت میں زندہ دلی و ظرافت بھی تھی۔ ان کے صاحبزادہ سری نرائن صاحب نگم نے ان کی زندہ دلی و ظرافت کی چند مثالیں لکھی ہیں۔ میں انھیں یہاں نقل کرتا ہوں۔

"ایک بار آمدنی میں ایک نئے ذریعے کے اضافے کے ساتھ ساتھ ایک سابقہ مد میں کمی ہو گئی تو فرمایا 'خدا بھی میرے ساتھ حساب کرتا ہے۔ اگر ایک در کھولتا ہے تو دوسرا بند کر دیتا ہے۔'"

"رسالہ (زمانہ) کا دفتر عارضی طور پر ایک مسجد کی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ ایک ملاقاتی نے اس کی بابت کچھ کہا تو بولے 'جی ہاں، مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے'۔"

"ایک صاحب نے ایک مرتبہ پوچھا کہ کیا آپ کو شاعری سے کچھ شوق ہے تو فرمایا کہ خدا نے میرے ساتھ ایک یہی تو احسان کیا ہے کہ مجھے اس غم سے آزاد پیدا کیا ورنہ رسالہ کی بجائے دیوان شائع کرتا۔"

"ڈاکٹری علاج سے تنگ آ کر ایک دن کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی علاج ہے کہ سوئیوں سے جسم چھدوائیے، کڑوی دوائیں پیجئے۔ یونانی علاج کو دیکھئے کہ دواؤں کے نام ہی سے دل کو فرحت ہوتی ہے۔ گل قند، شربت بنفشہ، شربت نیلوفر، خمیرۂ گاؤزبان عنبری کا نام سن کر کس کا جی کھانے کو نہ چاہے گا۔"

"زمانۂ علالت میں ایک دوست عیادت کو آئے اور پوچھا 'مزاج کیسا ہے؟' بولے حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ۔ دیدہ تو پار سال ہی نذر کر چکا ہوں اب دل کی باری ہے[5]"

میں جس دن پہلی بار مرحوم سے ملا ہوں انھیں خاصی تکلیف تھی۔ اس تکلیف کی حالت میں بھی انھوں نے پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کو مخاطب کر کے کہا "نجیب اشرف صاحب ہمارے شعراء کے دیوان بھرے پڑے ہیں کہ ہم ہجر میں لوٹتے ہیں اور تڑپتے ہیں۔ لیکن یہاں تو لوٹنے اور تڑپنے کی بھی اجازت نہیں۔" ڈاکٹری سرجری کو لطیف شاعرانہ حدود تک پہنچا دینا ایک ذہین

[5] زمانہ، نگم نمبر

اور خوش طبع آدمی ہی کا کام ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں مرحوم پر مایوسی چھا گئی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی رفیقِ زندگی نے رفاقت ترک کی۔ دو ہفتے بعد جوان بیٹی کی موت کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اس کے ڈیڑھ سال بعد بھائی کی جدائی کا غم سہنا پڑا۔ پھر خود اُن کی صحت بھی کچھ بہت اچھی نہ رہی تھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے ان میں زیست سے بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ آخری دنوں میں غالباً خرابیٔ صحت کی وجہ سے ان میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ بمبئی کے دورانِ قیام میں میں نے دیکھا کہ وہ چندر بھوشن سنگھ کو بہت ڈانٹا کرتے تھے۔ چندر بھوشن سنگھ کی سعادت مندی کی داد دینی چاہیئے کہ کبھی ان کے ماتھے پر بل نہ آیا۔

نگم صاحب کی زندگی کو بہ حیثیتِ مجموعی کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا تھا، اردو زبان و ادب کی خدمت۔ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے جو دیا جلایا تھا اُسے زمانے کی ہوا کے تند جھونکوں نے بجھا دیا مگر اس کی لو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہے اور منشی دیا نرائن نگم کا نام اردو زبان کی تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ زمانہ اسے نہیں مٹا سکتا۔ بچوں کی تربیت بھی نگم صاحب نے بہت اچھی کی۔ ان کے تینوں لڑکے کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ سری نرائن نگم صاحب کا بیان ہے کہ

"وہ (دیا نرائن نگم صاحب) اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ بس ایک بار ملک کو آزاد دیکھنے کی آرزو باقی ہے[1]"

یہی ایک آرزو تھی جس کا داغ وہ دل میں لے کر گئے۔

نگم صاحب کے ادب و انشاء سے متعلق میں اس مضمون میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ یہ نقاد کا کام ہے۔ ان کی کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ ان کے مضامین زمانہ کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں جمع اور مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ مضامین سے زیادہ اہم ان کے خطوط ہیں۔ یہ خطوط تقریباً چالیس برس کے لمبے عرصہ میں لکھے گئے ہیں۔ اس عرصہ میں ہماری سیاست میں بہت کچھ اتار چڑھاؤ آیا ہے۔ اس کا اثر اردو ادب پر بھی گہرا پڑا ہے۔ نگم صاحب ترقی پسند تھے۔ انھوں نے نئے اور تو انا رجحانات کو اپنانے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ اگر ان کے خطوط چھپ جائیں تو بہت سے ادبی گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔ یہ خطوط ادب و انشاء کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ نگم صاحب کا اسلوبِ تحریر دلکش اور جاندار ہے۔ ان کی عبارت میں رعنائی و برنائی ہے۔ اگر یہ خطوط شائع ہو جائیں تو اردو کی ایک اچھی خدمت ہوگی۔

---

[1] زمانہ، نگم نمبر

درج فہرست قبیلوں کے لئے تعلیم کا انتظام

بھارت کی مختلف ریاستوں میں درج فہرست قبیلوں کی بنیادی تعلیم کے لئے ایک ہزار سے بھی زیادہ ادارے چل رہے ہیں یہ ادارے دو قسم کے ہیں یعنی آشرم اور سیوا آشرم۔ آشرم اسکول رہائشی ادارے ہیں جن میں عام تعلیم کے علاوہ بڑھئی، کپڑا بننے، لوہار، کپڑا بننے اور کھیتی باڑی جیسے مختلف کاموں کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ ان آشرموں کے تمام اخراجات سرکار برداشت کرتی ہے۔

سیوا آشرم وہ اسکول ہیں جو صرف دن میں چلتے ہیں اور جن میں عام تعلیم کے ساتھ ساتھ سوت کاتنے اور باغبانی کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ طلباء کو پہننے کے کپڑے، کتابیں اور کاتنے کا سامان وغیرہ بلا قیمت مہیا کیا جاتا ہے۔

پہلے پنجسالہ پلان میں مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتوں نے درج فہرست جاتیوں اور قبیلوں کی تعلیمی ترقی پر ۱۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے خرچ کئے۔ یہ رقم پس ماندہ جماعتوں کی بہبود کے لئے پہلے پنجسالہ پلان کے لئے رکھی گئی کل ۴۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی رقم کا ۳۲ء۶ فیصد تھی۔

درج فہرست جاتیوں اور قبیلوں کی تعلیمی ترقی کے لئے دوسرے پنجسالہ پلان میں ۳۲ کروڑ ۳ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ پلان کے دائرے سے باہر ریاستی حکومتوں نے اس سلسلے میں جو رقم مخصوص کی ہے اس کے علاوہ ہے۔

طلسم لکھنؤ

نمبر ۱ | ۲۲ شہر ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۲۵ ماہ جولائی سنہ ۱۸۵۶ عیسوی روز جمعہ | جلد ۱

اشتہار

اس اخبار کی طبع کا ہر جمعہ کو بدستور ہی اور خبر کی تصحیح کا التزام
تا بمقدور ہی مدح و ذم کا انداز نہیں کیا باں سچ لکھنی سی قلم کو باز
نہیں رکھا ہے قیمت ماہواری ہی ع سالیانہ پیشگی ہے
جو لوگ بعد سال تمام عنایت فرمائینگے روپیہ کی حساب سی للعہ بھجوائین
اگر مطبع محمدی مین خاکسار محمد یعقوب کی پاس مرقوم آئیگا انشاء اللہ تعالی
بروز معہود بلا توقف صحیفہ اخبار خدمت مین بھیجا جائیگا اگر درمیان مین
موقوف کرنا مد نظر ہو دوسری پرچی کی روانگی سی پہلی راقم کو خبر ہو ورنہ
حسب دستور اخبار جاری رہیگا اور زر قیمت دینا پڑیگا

لکھنؤ

جیسی اخبار خانہ قدیم مین انگریزی اسپتال مقرر ہوئی ہی پیدائش
ایک نئی بیماری کی گھر گھر ہوئی ہی ہر ایک باشندہ ایسا رنجور رہوا
کہ وہان سی نقل مکان کرنا ضرور ہوا یعنی حکم ہی کہ مکانات خام و پختہ
رعایا کی گراکر میدان ہو اور گڑھا کہ پہلو مین واقع ہی اوسکے
پاٹنی کا سامان غرہ ذیقعدہ سنہ ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۴ جولائی سنہ ۱۸۵۶ عیسوی

کو جمعی کی ان صاحب بارک ماسٹر نی وہان جاکر کھوٹی کا حکم دیا اور
مہلت ایکساعت کی رعایا کو ندی اونکی زار نالی پر التفات نکیا آخر
چند مرد عورت بیرانی سی مضطر ہوکر تاری والی کوٹھی مین حاضر ہوئی
اور کشنر میجر بنکس صاحب بہادر اور ڈپٹی کشنر سمس صاحب بہادر کی حضور مین
حال خراب کی مظہر ہوئی لیکن جو وہان سی پہلا حکم جاری ہو اٹھا
ان صاحبون نی کچھ نفرمایا اور بیشتر اون لوگون کا بستی سی اوج پر نہ آیا

ایکدن کئی تھیلیان روپی کی تنخواہ بانٹنی کو مزدورون کی سرپر
آٹھ تلنگون اور ایک حوالدار سرکاری کی حفاظت مین تاری والی کوٹھی کو
تحویلدار کی پاس جاتی تھین قریب پہونچکر نیم کی نیچی لبجا مزدور بوجھ
اوتار کر پانی پینی لگی اور تلنگی بہی پیاس بجھانی مین کچھ غافل ہوگئی
ناگاہ ایک نئی آگ لگی کچھ روپی پر پانی پہر گیا یعنی کسی تیز دست چیلی
اپنا لوٹا کیسہ زر کی صورت کپڑی مین باندہ کر اونہین تھیلیون مین رکھدیا
اور ایک تھیلی کو جسمین گیارہ سو تیرانوی روپی تھی پہرے والون کی نظر
بچا کر اوٹھا لیا عجیب چالاکی سی تھوڑی پر لوٹا لوٹا رکھکر تھیلا لوٹا
غرض جب بیا خزانی مین داخل کرنی کی نوبت آئی وہ تھیلی اور بستہ

اخبار ”طلسم لکھنؤ“ کے پہلے صفحے کا عکس

اس سے متعلق فرحت فاطمہ کا مضمون صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں

بسوہلی

قدیم پہاڑی آرٹ کا مشہور ترین مرکز

بسوہلی کے کھنڈر

راجستھان

یونیورسٹی

کی

لائبریری

وزیراعظم پنڈت نہرو نے ۲۰ اکتوبر کو جے پور میں اس لائبریری کا افتتاح کیا

۱۴۔ اکتوبر کو نئی دلّی میں ہندوستان اور عراق کے درمیان ایک تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے۔ یہ تصویر اُسی موقعے کی ہے۔

ہند و پاک مشرقی سرحد سے متعلق مذاکرات میں شریک ہونے والے پاکستانی اور ہندوستانی وفود کے لیڈر لفٹیننٹ کرنل کے ایم شیخ وزیر داخلہ پاکستان اور بہار کے مرکزی وزیر سردار سورن سنگھ۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر ڈوائٹ، ڈی آئزن ہاور

صدر ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور

ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے پہلے صدر ہیں جو ماہ رواں میں ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کے دورے پر آئیں گے۔ ۱۹۵۳ء میں جب سے آپ نے امریکی صدارت کا برگزیدہ ترین عہدہ پہلی بار سنبھالا تو اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری حکومت پائیدار عالمی امن کے لئے وقف ہوگی۔ اس مقصد کے لئے آپ اب تک آٹھ دفعہ دوسرے ملکوں کے دورے کر چکے ہیں۔ حال ہی میں آپ نے کہا ہے کہ عالمی امن کے مفاد میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں جانے کو تیار ہوں۔ چنانچہ حالیہ دورہ بھی آپ کی اسی بنیادی پالیسی کا حصہ تصور ہونا چاہیئے۔

آپ نے ہی پہلی بار ۸۔ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ادارۂ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایٹم کے پُرامن استعمال کی تاریخی تجویز پیش کی تھی۔ ان دنوں شریمتی وجے لکشمی پنڈت اتحادی سبھا کی صدر تھیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایٹم کو تباہی کے بدلے تعمیرو ترقی کے لئے استعمال کئے جانے کی تحریک کامیابی سے جاری ہے۔ اسی طرح تخفیفِ اسلحہ کے سلسلے میں آپ نے فوجی ٹھکانوں کے کھلے آسمانی معائنے اور فوٹوگرافی کی تجویز جنیوا میں 'چار بڑوں' کی 'چوٹی کانفرنس' میں پیش کی تھی یہ تجویز بھی اب عملی صورت اختیار کرنے والی ہے۔

ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور ۱۸۹۰ء میں ڈینی سن ٹیکساس میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی آپ دو ہی برس کے تھے کہ آپ کے والدین ابی لون (کنساس) میں منتقل ہوگئے۔ وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم پائی اور کھیتی باڑی کا کام کرتے رہے۔ آخر ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکادمی میں داخل ہوکر فوجی تربیت پائی اور سیکنڈ لفٹیننٹ کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ آپ ابھی سیکنڈ لفٹیننٹ ہی تھے کہ انھیں دنوں آپ کی ملاقات میمی جنیوا ڈاوڈ سے ہوئی اور کچھ وقت کے بعد آپ نے اس سے شادی کرلی۔ دو بچے ہوئے۔ ایک کا انتقال تین برس کی عمر میں ہی ہوگیا دوسرا فوج میں میجر ہے اور آج کل آپ کے ذاتی عملے میں متعین ہے۔

۱۹۴۲ء میں آپ یورپ میں کمانڈنگ جنرل کے طور پہ مقرر ہوئے اور اسی برس آپ کو افریقہ میں اتحادی فوجوں کا کمانڈر ان چیف اور دسمبر ۱۹۴۳ء میں تمام اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر بنایا گیا۔ آپ نے فرانس کے راستے ۶ جون ۱۹۴۴ء کو نازی اور فسطائی عسکریت کے خلاف جوابی حملہ شروع کیا جس کا نتیجہ اتحادی طاقتوں کی فتح کی صورت میں نکلا۔

۱۹۵۲ء میں امریکہ کی ری پبلکن پارٹی نے آپ کو امریکی صدارت کے عہدے کے لئے نامزد کیا اور آپ امریکہ کے صدر منتخب ہوگئے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ دوبارہ صدر چنے گئے اور اب ۱۹۶۱ء میں اس کی میعاد ختم ہوگی۔

صدر آئزن ہاور تلوار کے علاوہ قلم اور مُو قلم کے بھی دھنی ہیں۔ آپ کی تصنیف 'کروسیڈ ان یورپ' کافی مقبول ہوئی ہے اس میں آپ نے دوسری عالمی جنگ کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اپنے مُو قلم سے آپ نے مصوری کے کئی شاہکار تیار کئے ہیں اور بہت ہی عظیم ہستیوں کی دستی تصویریں بنائی ہیں۔

وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو سے آپ کی یہ دوسری اہم ملاقات ہوگی۔ دونوں ملکوں میں جو دوستانہ تعلقات اور مراسم پائے جاتے ہیں، صدر آئزن ہاور کی آمد سے اور بھی استوار ہوں گے اور اس طرح دنیا کی دو عظیم جمہوری حکومتیں ایک دوسرے کے قریب تر ہو جائیں گی۔

فرحت فاطمہ

طلسمِ لکھنؤ

لکھنؤ کی صحافت کی تاریخ میں طلسم لکھنؤ کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس کا پہلا نمبر ۲۲ ذی قعد ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۸۵۶ء کو جمعہ کے دن شائع ہوا۔ اس اشاعت میں سب سے پہلے ایک 'اشتہار' ہے جس سے اس اخبار کے متعلق ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں :

(۱) اس اخبار کی طبع کا ہر جمعہ کو دستور ہے

(۲) اور خبر کی تصحیح کا التزام تا بمقدور ہے[1]

(۳) چندہ ۱/۲ ۱ ماہوار یا دس روپیہ ششماہی یا ۱۳ روپیہ سالیانہ پیشگی

(۴) اس کے اڈیٹر مولوی محمدؐ یعقوب تھے اور یہ لکھنؤ کے مطبع محمدی محلہ فرنگی محل سے شائع ہوتا تھا۔

لکھنؤ صرف ایک خطّۂ زمین کا نام نہیں۔ وہ ایک تہذیب، ایک تمدّن کی نشانی ہے۔ نفاست اور رنگینی اس کے ذرّے ذرّے میں سمائی ہے۔ اس وقت واجد علی شاہ کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور وہ کلکتہ میں سکونت پذیر تھے۔ لیکن پھر بھی 'بوئے یاسمن' باقی تھی۔ طلسم لکھنؤ اسی گلستانِ خزاں منظر سے شائع ہوا تھا اسی لئے اس کی عبارت میں زبان کا چٹخارہ اور بیان کی چاشنی ہے۔ بقول عبدالباسط خلف نواب ظہرالدولہ بہادر :

"(۱/۲ ۱) یہ تو کاغذ اور چھپوائی کی قیمت مشہور ہے ورنہ عبارت انمول ہے۔ اس کا کیا مذکور ہے۔ فقرے چست، روزمرہ درست زبان صاف، بیان شفاف، اگرچہ کوئی حاسد، حسد سے نہ مانے لیکن دو فقرے ایسے لکھے تو جانے۔ خبر اسے کہتے ہیں اخبار کے یہ معنی ہیں[2]"

طلسمِ لکھنؤ کو اسی زمانہ کے معیار سے دیکھنا چاہیئے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ پورے اخبار میں از فرق تا بقدم، یہی دل آویزی اور ادبی شان ہے۔ پہلے شمارہ میں اشتہار کے بعد لکھنؤ کی خبریں درج ہیں۔ لکھا ہے :

(انگریزوں کا) "حکم ہے کہ مکانات خام و پختہ رعایا کے گرا کر میدان ہو اور گرد صبا کہ پہلو میں واقع ہے اوس کے پاٹنے کا سامان ہو۔ ۴۔ جولائی ۱۸۵۶ء کو جمعے کے دن .... وہاں کھودنے کا حکم دیا اور مہلت ایک ساعت کی رعایا کو نہ دی اون کی زار نالی پر التفات نہ کیا...... ایک پٹی ہوئی بلند مسجد کو انگریز افسر ملیٹن ..... نے اپنی سکونت کا مکان ٹھہرا کر تینوں دروں میں دروازے لگائے ...... دوسری قناتی مسجد.... بالکل ... پٹ گئی فقط پشت کی جانب سے نشان معلوم ہوتا ہے ......"

نواب علی نقی خاں کے متعلق لکھا ہے :

"جولائی کی سولھویں ۱۸۵۶ء کو آدھی رات کے وقت نواب علی نقی خاں مع مصاحبین داخل دعیال ڈاک بگھی پر کان پور کو

---

[1] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۱ ۔ ذخیرہ ڈاکٹر خواجہ احمدؐ صدیقی

[2] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۹ ص ۴

روانہ ہوئے۔ رتھیں گاڑیاں ڈاک کی عزیزوں اور مصاحبوں کی سواری میں ہمراہ تھیں۔ وہاں سے سترھویں کو جانبِ کلکتہ مسافر ہوئے۔ جب حضور بادشاہ جم جاہ (واجد علی شاہ) میں حاضر ہوں گے تب جوہرِ رفاقت ظاہر ہوں گے[1]۔"

واجد علی شاہ کی معزولی میں نواب علی نقی خاں نے جو بادشاہ کے مدارالمہام اور خسر تھے، انگریزوں کے ساتھ سازش کی تھی اور ان کی اس بے وفائی اور نمک حرامی پر رعایا کو بڑا غصہ تھا:

"دمِ رخصت مسافر کو خدا اور رسول کو سونپتے ہیں۔ ان لوگوں نے سپردِ دشنام کیا جو جو منہ میں آیا بے تکلف سنایا۔ نواب نے بارِ ندامت سے دب کے سر نہ اٹھایا[2]"

تاریخِ اودھ میں بھی لکھا ہے کہ "آزاد آدمی اس (علی نقی خاں) پر تف اور لعنت کے آوازے کستے تھے اور نہایت سخت الفاظ میں تعریض کرتے تھے[3]۔"

۱۴ جولائی کو نواب معشوق محل کے یہاں چوری ہوئی۔ اس کی خبر طلسمِ لکھنؤ میں اس طرح درج ہے۔ رعایتِ لفظی ملاحظہ ہو۔

"شب ۱۴ جولائی کو نواب معشوق محل صاحبہ کے خواجہ سرا مسمی امام بخش نے اپنے ہاتھوں دیوارِ اعتبار میں رخنہ ڈالا۔ کس طرح محلِ اعتماد باقی نہ رہا۔ یعنی محل سرائے خاص میں سیندھ لگا کر ایک بار بہت سا مال و اسباب چرا لے گیا۔ . . . . . . ہنگامِ تلاش چالیس تولہ چاندی کا پتر اور چونسٹھ تولے سونا اس کی کمر سے نکلا[4]۔"

واجد علی شاہ کے متعلق لکھا ہے:

"حکم نامۂ خاص کرامت اختصاص حضرت بادشاہ جم جاہ اس مضمون سے بندہ علی خاں کے نام صادر ہوا کہ فوراً بارہ گھوڑیاں تیز رو اور دو بگھیاں عمدہ کلکتہ کو روانہ کرے چنانچہ ساز و سامان

[1] طلسمِ لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۲ [2] طلسمِ لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۲
[3] تاریخِ اودھ ج ۵ صفحات ۲۳۶ و ۲۶۲
[4] طلسمِ لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۲

گھوڑیوں اور بگھیوں کا طیار ہوتا ہے[5]۔"

اس کے بعد حضرت بادشاہِ جم جاہ کے عنوان سے علیحدہ لکھا ہے:

"راقم اخبار انگریزی لکھتے ہیں کہ بالفعل قصد بادشاہ جم جاہ معاودت لکھنؤ کا ہے۔ اسی واسطے گھوڑیاں اور بگھیاں طلب فرمائیں مگر خط ایک شفیق کا کلکتے سے آیا، اوس کی تحریر سے واضح ہوا کہ غرہ ذی قعدہ کو حضرت بادشاہ نے کلاہِ قیصری کئی مصاحبوں کو مرحمت فرمائی اور جناب عالیہ متعالیہ و جرنیل صاحب بہادر و مرزا ولی عہد بہادر کے انگلینڈ پہونچنے کی خبر کا انتظار رکھتے ہیں[6]۔"

اس کے بعد انتزاعِ سلطنت لکھنؤ کے ذیل میں برطانوی پارلیمنٹ کی اس بحث کا ذکر کیا ہے جو اودھ کی غیر منصفانہ ضبطی کے سلسلے میں ہوئی۔

"تحقیق ہوا کہ پچھلے مہینے کے دربارِ پارلیمنٹ شاہی میں ممبرانِ ذی شان پارلیمنٹ لندن نے حضرت شاہ جم جاہ لکھنؤ کی مظلومی پر رحم فرما کر تقریریں شائستہ اور دلیلیں روشن پیش کیں۔ کہتے ہیں کہ ایک صاحب عالی شان ممبر دربار پارلیمنٹ نے سرو قد کھڑے ہو کر یہ سوال کیا کہ انتزاعِ ملک اودھ سرکار کمپنی سے بجا ہوا یا بے جا، سب اہالیان پارلیمنٹ نے متفق اللفظ جواب دیا کہ کوئی اس ضبطی کو نہ اچھا کہتا ہے اور نہ کہے گا بلکہ ہماری رائے یہ ہے کہ اگر سلطنتِ انگریزی میں الموادِ بیجا سرزد ہوں تو شاہ فرانس کو بھی واجب ہوتا ہے کہ اس بہانے سے چشم بد دور ممالکِ انگریزی پر قبضہ کرے اور اگر شاہ ایران بدچلن ہو تو کیا لازم ہے کہ ہم اوس کا ملک چھین لیں۔ بعد اس کے وہ عہدنامے کہ شاہ لکھنؤ اور شاہنشاہِ انگلستان کے درمیان میں ہوئے تھے حرف بحرف پڑھے گئے۔ صاحب خبر لکھتے ہیں کہ جب عہدنامے پڑھے جاتے تھے دانا دور بین انگشتِ حیرت دانتوں میں

[5] طلسمِ لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۳
[6] طلسمِ لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۴

دیا گئے تھے۔ اتنے میں ممبران پارلیمنٹ نے کہا اے صاحبو!
لارڈ ڈلہوسی کی کارروائی ضبطی ملک لکھنؤ کے باب میں قابل منظوری
ہے یا نہیں۔ سبھوں نے جواب دیا کہ جب تک تنقیح عہدناجات کی
تحقیقات قرار واقعی نہ ہو، اس باب میں حکم ناطق نہیں
ہو سکتا۔[1]"

طلسم لکھنؤ آگے چل کر لکھتا ہے:

"سنا جاتا ہے کہ اس دربار میں لارڈ ڈلہوسی بہادر
گورنر جنرل سابق کا دیر تک ذکر رہا۔ مسٹر جی فیل صاحب
ممبر پارلیمنٹ نے بہت کچھ ان کا ذکر کر کے فرمایا۔ ملک یورپ
میں روسیوں نے جو قیصر روم پر زیادتی کی، شاہ لندن اور شاہ فرانس
نے تائید رومیوں کی کیسی کیسی کی۔ اب کہ سرکار کمپنی نے ملک لکھنؤ
کو بے وجہ ضبط کر لیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کارروائی ناجائز
کو جائز نہ ہونے دیں اور انصاف پر متوجہ ہوں۔[2]"

دہلی کی خبروں میں مرزا فخرو کے انتقال کی خبر بڑے رنج اور افسوس کے
ساتھ درج کی ہے:

"عجب سانحۂ ماتم افزا پیش آیا۔ دلوں کو صدمۂ جانگزا
پہونچا۔ قیامت صغریٰ نمودار ہوگئی، روح بدن میں بے قرار
ہوگئی۔ ... نور ناصیۂ خلافت، شمع دودمان سلطنت
فتح الملک میرزا محمد فخرالدین بہادر ولی عہد حضرت بہادر شاہ
بادشاہ دہلی خلد اللہ سلطنتہ دفعتاً ۷ ذی قعد شب پنجشنبہ
کو گیارہ بجے مبتلائے ہیضہ جانستاں ہوئے۔

ہر چند طبیبوں نے جاں لڑا دی دوا نے اثر نہ کیا۔ شب جمعہ
کو سات بجے نہضت فرمائے روضۂ رضواں ہوئے۔ تین برس
گیارہ مہینے ولی عہد رہے۔ چالیس برس کے سن میں دار الملک
بقا کو تشریف لے گئے۔ بادشاہ سلامت کہ علاوہ درد فرزندی
ان سے کمال انس رکھتے تھے بہت بے قرار ہیں۔ رات دن
اس چوٹ کے صدمے سے مصروف گریہ و زاری ہیں۔ محلوں میں کہرام

[1] و [2] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۵

ہے۔ کسی کو نہ چین ہے نہ آرام ہے[1]"

۸۔ اگست ۱۸۵۶ء کے طلسم لکھنؤ میں بھی دہلی میں ہیضہ کی شدت کا
ذکر ہے:

"ہیضہ وہاں بے طور ہے، ملک الموت کا دور ہے خصوصاً
یکم اگست سے یہ شدت ہوئی کہ ہزاروں آدمیوں کی جان گئی۔ ہر
ایک کو ہراس ہے، جینے سے یاس ہے۔[2]"

قلعۂ معلیٰ دہلی کی خبروں میں ہے:

"حضرت ظل سبحانی (بہادر شاہ) خیریت سے ہیں دو سو
روپیے پنکھے کی تیاری کو مرحمت ہوئے ہیں۔ پانچویں ذی الحجہ سے
پھول والوں کا میلا ہے شگفتہ خاطر ہر رنگین البیلا ہے۔"

ولی عہدی کے مسئلہ نے سارے دہلی والوں کی توجہ جذب کر لی تھی۔ ذیل کے
واقعہ سے ان کی ذہنی اور نفسیاتی حالت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ دلی کی پرانی
عظمت مٹ چکی تھی لیکن اب بھی اہلِ قلعہ کے دماغ وہی تھے:

"امر ولی عہدی ابھی ظہور میں نہیں آیا۔ کسی پر قرار نہیں پایا۔
حضرت خواہاں ولی عہدی مرزا جواں بخت کے ہیں۔ مرزا قویاش
صاحبزادۂ کلاں محروم رہتے ہیں جو وارث تخت کے ہیں۔[3]"

اس کے بعد بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے:

"دہلی عجیب شہر ہے۔ خصوصاً قلعہ معلیٰ کے رہنے والوں کا
کچھ حال نہ پوچھو۔ جو حلال خوری سے بھی پیدا ہوا، اس کو اور
قسم کھانا حرام ہے۔ یہی کہتا ہے کہ اگر جھوٹ بولوں تو تخت نصیب
نہ ہو۔ گویا یہ کلام ہے۔ ہر ادنیٰ اعلیٰ کو درباداری کی تمنا ہے
ولی عہد بہادر کی وزارت کا حوصلا ہے۔ ایک دوست ...
کسی صاحب سے کتاب لکھواتے ہیں۔ ان دنوں جو تقاضا کیا تو
کاتب یہ فرماتے ہیں کہ بندے کو چینے معاف کیجئے۔ دو چار روز
مہلت دیجئے۔ بالفعل مرزا قویاش بہادر کا دربار دار ہوں۔[4]"

[1] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۱ ص ۶ [2] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۳ ص ۶، ۷
[3] طلسم لکھنؤ ج ۱ ش ۳ ص ۷، آٹھویں اگست ۱۸۵۶ء
[4] ایضاً

ستیش بترا

روشنی

شیلا دیر تک اشوک کا بدن سہلاتی رہی۔ اشوک کا سر اس کے زانوؤں پر تھا۔ اس نے جھک کر آہستہ سے اشوک کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ دو گھنٹے تک مسلسل درد سے تڑپنے کے بعد اب سو گیا تھا۔ اس کا معصوم چہرہ دن کی ڈھلتی ہوئی روشنی میں اب بھی بہت پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ شیلا نے کمرے کی دیوار پر نظر ڈالی۔ روشن دان میں سے دھوپ چھن کر آ رہی تھی جو دھیرے دھیرے اوپر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شیلا نے اشوک کا سر آہستہ سے تکیہ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ماں کی ممتا پگھل کر آ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے آٹھ سالہ بچے کو پیار کر لے۔ مگر وہ اس کے جاگ جانے کے خیال سے رُک گئی۔ اشوک کو نہ جانے یہ درد کے دورے کیوں پڑا کرتے تھے۔ شیلا اور اس کا شوہر مدن کئی بار اُسے بجلی کمپنی کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ وہ ہر بار اُسے ایک مکسچر دیتا جس سے درد کو افاقہ ضرور ہو جاتا لیکن کچھ ہی مہینوں کے بعد پھر کسی دن درد کا دورہ پڑ جاتا۔ شیلا نے کئی بار مدن سے ڈاکٹر متل کو دکھانے کے لئے کہا تھا لیکن اُسے یونین کے کام سے ہی کب فرصت ملتی تھی۔

مدن آج بھی دوپہر سے ہی آس پاس کے مزدوروں کو اکٹھا کر کے بجلی کمپنی کے سامنے والے میدان میں میٹنگ کر رہا تھا۔ وہ بجلی گھر میں سپروائزر تھا اور مزدور یونین کا سیکرٹری بھی۔ اس کی عمر پینتیس چھتیس سال کی تھی۔ وہ پیدائشی لیڈر تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب تک اس کی وجہ سے مزدوروں میں ہلچل پیدا نہ ہوگی افسرانِ بالا کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔ ہلچل کی ہر لہر اس کی خودی کو تسکین دیتی۔ وہ ہمیشہ ہلچل پیدا کرنے کی فکر میں رہتا۔

یکایک شیلا کو باہر میدان سے ایک شور اُٹھتا ہوا سنائی دیا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر باہر بالکونی میں آ گئی۔ مزدوروں کی کچھ اور ٹولیاں نعرے لگاتی ہوئی میدان کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ "ہماری مانگیں پوری کرو"، "کھنہ شاہی نہیں چلے گی"، نعرے ہواؤں میں گونج رہے تھے۔ کھنہ صاحب بجلی کمپنی کے جنرل منیجر تھے اور یہ صدائے احتجاج انھیں کے خلاف تھی۔

شیلا کے پاس پڑوس کی عورتیں اور بچے بھی اپنے اپنے دروازے سے منہ نکالے میدان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر بجلی گھر کی چمنیاں شام کی ارغوانی روشنی میں سیاہ دھواں اُگل رہی تھیں۔

سننے میں آیا تھا کہ مزدوروں کی یونین تین مہینے کا بونس مانگتی ہے اور دس گھنٹے کی بجائے آٹھ گھنٹے کام، تفریح کے لئے کلب اور شفٹ میں کھانا مفت۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بجلی کمپنی اس سال خسارے میں رہی تھی تو پھر یہ مانگیں کیسے پوری ہو سکتی تھیں۔ کمپنی کے مالک بونس کے سوا باقی تمام مانگیں پوری کرنے کو تیار تھے۔ یہ درست تھا کہ بجلی کمپنی کئی سالوں سے تھوڑا بہت بونس دیتی چلی آئی تھی۔ لیکن پچھلے سال کوئلے کی قیمتوں میں اضافہ ہونے اور نئی مشینیں زیادہ قیمت پر منگانے کی وجہ سے کمپنی کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اس سال بھی بونس دے سکے۔ کچھ مزدور جن کا نمائندہ جے گوپال تھا چاہتے تھے کہ بونس کی مانگ نہ رکھی جائے اور مالکوں سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے لیکن مدن کمپنی کی حالت جانتے ہوئے بھی اس کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ اس سے یونین اور اس کے ذاتی وقار کو ٹھیس پہنچتی۔ مدن کا کہنا تھا کہ بجلی کمپنی اس

سال بھی خسارے میں نہیں رہی بلکہ خسارے کا ڈھونگ مزدوروں کے
حقوق کا گلا گھونٹنے کے لئے رچا گیا ہے۔ آخر تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے
کسی نہ کسی بات کا سہارا لینا تو ضروری تھا۔

شیلا بالکونی کی دیوار کا سہارا لئے میدان میں جمع لوگوں کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ بالکونی سے میدان تقریباً دو فرلانگ دور تھا۔ آوازیں
اچھی طرح سنائی نہ دے رہی تھیں لیکن فضا میں پھیلا ہوا شور مزدوروں
کے جوش و خروش کی نشان دہی کر رہا تھا۔ اتنے میں جھنڈا لئے ایک
شخص پلیٹ فارم پر آیا۔ دفعتاً چند لمحوں کے لئے شور بڑھ گیا اور پھر
جیسے بالکل بند ہو گیا شاید۔ اس کا شوہر مدن تقریر کر رہا تھا۔

یکایک شیلا کو اندر سے ایک چیخ سنائی دی۔ اُسے اس ہنگامے
میں اشوک کی بیماری کا خیال بالکل نہیں رہا تھا۔ وہ دوڑ کر اندر آئی
جہاں اشوک چارپائی پر بیٹھا ہوا درد کے مارے دوہرا ہوا جا رہا تھا
اس نے جلدی سے مکسچر کی ایک خوراک پلائی اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر
اس کا پیٹ ملنے لگی۔ اس سے اشوک کو سکون ملا اور دھیرے دھیرے
اس کے چہرے پر سے درد و کرب کے اثرات دُور ہونے لگے اور کچھ دیر
بعد وہ پھر سو گیا۔

کمرے میں اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ شیلا نے اُٹھ کر بجلی جلائی۔
اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ مدن کو پہلی ہی فرصت میں اشوک
کو ڈاکٹر متل کے پاس لے جانے کے لئے مجبور کرے گی۔ مدن کو اپنے اشوک
سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کے لئے اکثر نئے نئے کھلونے اور کتابیں لاتا۔
شاید شیلا نے کبھی اُسے ڈاکٹر متل کو دکھانے کے لئے ٹھیک طریقے سے مجبور
بھی نہیں کیا تھا۔ وہ یہی سوچتی ہوئی پھر بالکونی پر آ گئی۔

بجلی کمپنی میں چھ بجے والی سیٹی بجی اور دوسری شفٹ کے کچھ لوگ
بجلی گھر سے باہر نکلنے لگے۔ شام کے سرمئی سایوں میں بجلی گھر کی چمنیوں میں سے
نکلتے ہوئے دھوئیں کی لکیر تاریکی میں گڈمڈ ہوتی جا رہی تھی۔ آس پاس کے
مکانوں کے دریچوں میں سے جھانکتی ہوئی روشنیاں شام کے دُھندلکوں
میں کسی پرستان کی روشنیاں معلوم ہوتی تھیں۔

بجلی کمپنی کے گیٹ کے پاس مدن اور اس کے ساتھی تیسری شفٹ
کے لوگوں کو اندر جانے سے روک رہے تھے۔ مدن خود مزدوروں کو کھلی
ہڑتال کے لئے کہہ رہا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ بار بار اقبال کا یہ شعر پڑھ رہا تھا

"بند کر دو اس بجلی گھر کو! اسی میں ہماری کامیابی ہے! بجلی گھر کے
اندھیرے میں ہی ہماری روشنی ہے!"

شیلا بالکونی پر کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ یکایک اُسے اشوک
کی چیخ پھر سنائی دی۔ آج اُسے بار بار دورہ کیوں پڑ رہا تھا۔ ایسا تو پہلے
کبھی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بھاگ کر پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پڑوس
والوں کا لڑکا مہندر باہر نکل آیا۔ وہ میٹرک میں پڑھتا تھا۔

"اشوک کو پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ مہندر جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لاؤ
اس کی حالت دوپہر سے سدھری نہیں رہی۔"

"آج کمپنی کا ڈاکٹر کہاں ملے گا، مدن بھیا کو بلا لاؤں۔"

"اُن کو آج فرصت کہاں؟ اور پھر وہ ڈاکٹر تھوڑے ہی ہیں!"
اور پھر جیسے وہ ایک دم سوچ کر بولی۔ "ڈاکٹر متل کو کیوں نہیں بلا لاتے
وہ بالکل پاس ہی تو ہے۔"

"اچھا دیدی" یہ کہہ کر مہندر جلدی سے سیڑھیوں میں رکھی ہوئی
سائیکل نیچے اُتارنے لگا۔

ذرا سی دیر میں ڈاکٹر آ گیا۔ ڈاکٹر متل اشوک کو اچھی طرح دیکھنے
لگا۔ شیلا اور مہندر کی آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں
اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر سوچنے کے
بعد ڈاکٹر بولا:

"مریض کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں
میں سوچ رہا تھا کہ آپریشن کل کیا جائے یا آج؟"

"آپریشن!" شیلا چونکی۔ اشوک کی حالت خطرناک معلوم ہوتی تھی۔

"ہاں ہاں، معمولی ہے، آپ تھوڑا پانی اُبال لیجئے۔" اس نے
شیلا سے کہا۔

"کیا بتایا آپ نے اپنا نام؟" اس نے مہندر سے پوچھا۔

"جی، میرا نام مہندر!"

"آپ میرے کمپاؤنڈر سے کہیئے کہ آپریشن کا سب سامان لے کر فوراً چلا آئے آپریشن ابھی کرنا ہوگا۔"

شیلا نے رسوئی میں جا کر اسٹوو پر پانی گرم کرنے کے لئے رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے گرم پانی کمرے میں لائی۔ ڈاکٹر نے اُسے دیکھ کر کہا:

"آپ خواہ مخواہ گھبرا رہی ہیں۔ بہت معمولی آپریشن ہے۔ ایسے آپریشن تو میں روز کیا کرتا ہوں۔"

اتنے میں کمپاؤنڈر آپریشن کا سامان لے کر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کے اوزار گرم پانی میں ڈال دیئے اور آپریشن کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اشوک کے انجکشن لگایا اور پھر مہندر سے ایک ٹیبل لیمپ لانے کو کہا۔

تھوڑی دیر میں ٹیبل لیمپ آ گیا۔ ڈاکٹر نے اُسے مناسب بلندی پر رکھ دیا۔ اگلے چند ہی لمحوں میں ڈاکٹر نے آپریشن شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ وہ واقعی ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ شیلا کا دل اندر سے گھبرا رہا تھا لیکن وہ خاموش سی تھی۔ ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں سے دل میں مضبوطی آ جاتی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی ہر حرکت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ مہندر دوسری طرف منہ کئے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر پورے دھیان کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا۔

دفعتاً کمرے کی روشنی غائب ہو گئی۔ ڈاکٹر گھبرا کر ایک دم چلّا اُٹھا۔

"یہ کیا ہوا؟ کس نے روشنی بند کر دی؟؟"

شیلا بھاگ کر بالکونی میں گئی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کہیں بھی روشنی نہ تھی۔

"روشنی! لائٹ! جلدی!" ڈاکٹر جھنجھلایا۔

شیلا بھاگ کر رسوئی میں گئی۔ اسے یاد آیا کہ گھر میں ایک آدھ موم بتی پڑی تھی۔ نہ جانے کہاں تھی۔ وہ اندھیرے میں جگہ جگہ تلاش کرنے لگی۔ اس کے دماغ پر ڈاکٹر کی آواز 'روشنی! لائیٹ!!' ہتھوڑے کی چوٹوں کی طرح برس رہی تھی۔ اتنے میں اچانک تیل کی بوتل مل گئی۔ اس نے جلدی سے تیل ایک کٹوری میں ڈالا۔ کونے میں پڑی ہوئی روئی کی بتی بنا کر اُس نے جلدی سے دیا جلایا اور آنچل سے چھپا کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے دیا میز کے قریب رکھ دیا۔

"اس روشنی سے کیا ہوگا؟" ڈاکٹر جھلّا کر بولا۔ وہ اشوک کے قریب چارپائی پر بیٹھا تھا اور ایک ہاتھ سے اشوک کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس نے اشوک کا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ پھر اس کے چہرے پر چادر ڈالتے ہوئے بولا:

"مجھے سخت افسوس ہے!"

شیلا جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی تمام طاقت سلب ہو گئی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چارپائی پر پڑی ہوئی سفید چادر کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اسی وقت سیڑھیوں پر مدن کے دھڑ دھڑ چڑھنے کی آواز آئی۔

"شیلا! شیلا!! دیکھا تم نے آج میں نے سارے شہر کی بتّیاں گُل کرا دی ہیں!"

ضروری اِطّلاع

پاکستان میں جو حضرات 'آج کل' کے خریدار بننا چاہتے ہیں وہ 'آج کل' کا سالانہ چندہ مبلغ چھ روپے ہندوستانی ہائی کمشنر مقیم کراچی کے دفتر میں جمع کرا کے رسید بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸ کو بھیج دیں۔ 'آج کل' اُن کے نام باقاعدہ جاری کر دیا جائے گا۔

سُورج سراف

بسوہلی

قدیم پہاڑی آرٹ کا مشہور ترین مرکز

بسوہلی کا نام آج دنیا بھر میں اُس کے حسین فنِ مصوّری کی وجہ سے مشہور ہے مگر اس جگہ کی دوسری ایسی خصوصیات بھی وابستہ ہیں جن کی وجہ سے بسوہلی کو بھارت کے اُن چند مقامات میں گنا جا سکتا ہے جو آرٹ کے بہترین ورثہ کے حامل ہیں۔ اس جگہ کے پتھروں سے بنے ہوئے پُرانے مندر بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار ہیں۔ بسوہلی کا فنِ تعمیر جو اس کے پُرانے محلات اور قلعوں میں نمایاں ہے اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ بسوہلی کو قلعوں کی سرزمین بھی کہا جا سکتا ہے خود قصبہ بسوہلی کا دیو ہیکل محل مشہور فرانسیسی سیاح وِین کو اتنا بھایا کہ جب وہ ۱۸۳۷ء میں کشمیر جاتا ہوا وہاں سے گذرا تو اُس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا کہ "مشرق میں میرے خیال میں یہ بہترین عمارت ہے۔" اُس وقت بسوہلی ہر چہار طرف 'پہاڑوں کا عجوبہ' کے نام سے مشہور تھا۔ موجودہ قصبہ بسوہلی سے لگ بھگ دو ہزار فٹ نیچے کی طرف دریائے راوی بہتا ہے۔ اس کے کنارے چٹانوں پر بنی ہوئی مورتیاں اور بے شمار گپھائیں بھی قابلِ دید ہیں۔ قصبہ بسوہلی کی تاریخ بھی عبرت ناک درباری سازشوں اور رنگین مزاج آرٹ کے قدردان اور جنگجو راجاؤں کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قصبہ بسوہلی کی بنیاد زمانۂ مہا بھارت کے مشہور فن کار بسوکرما نے رکھی تھی۔ آج بھی بھارت کے مختلف حصّوں میں معمار، ترکھان، لوہار وغیرہ دیوالی کے تیوہار پر اس فن کار کی پوجا کرتے ہیں۔ اُس وقت قصبہ دریائے راوی کے کنارے آباد تھا۔ موجودہ بسوہلی دریا سے لگ بھگ دو ہزار فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ پُرانے قصبہ کے کھنڈر اب بھی دریا سے کچھ اوپر جنگل میں پائے جاتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں یہاں کے راجا کا دارالخلافہ قصبہ بلاور تھا۔ اور لگ بھگ نویں صدی میں راجہ مان شنکیلہ نے بلاور کی بجائے بسوہلی کو اپنی راجدھانی بنایا۔ بسوہلی بانس اور شال کی دستکاریوں کی وجہ سے بھی بہت مشہور رہا ہے۔

موجودہ قصبہ بسوہلی کی بنیاد سولھویں صدی میں راجہ بھوپت پال نے رکھی تھی۔ بات دراصل یوں تھی کہ بسوہلی کے راجاؤں کی، راوی کے پار چمبہ، نورپور وغیرہ کے راجاؤں سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی اور چونکہ بسوہلی قصبہ دریا کے بہت نزدیک آباد تھا اس لئے اس پر آئے دن حملے ہوتے رہتے تھے۔ راجہ بھوپت پال نے اپنے وزیر کو دریا سے کافی اوپر کی طرف ایک محفوظ جگہ پر نئے قصبہ کی بنیاد رکھنے کو کہا۔ اس طرح موجودہ قصبہ بسوہلی معرضِ وجود میں آیا۔

مان شنکیلہ کے عہد میں بسوہلی راج کی حدیں دُور دُور تک پھیل گئی تھیں۔ اور راجہ بھوپت پال کے عہد میں بسوہلی راج اپنے عروج پر تھا۔ اس نے بھدرواہ کشتواڑ، بھدّہ اور چمبہ تک کے علاقے فتح کر لئے۔ اس کی بابت مشہور ہے کہ اس نے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر چمبہ میں چیل کے اور کشتواڑ میں دیودار کے درخت اُلٹے گاڑ دئے۔ نیز کشتواڑ سے وہ نیل مہادیو کی مورتی بھی لے آیا تھا۔ اس مورتی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ مہا بھارت کے وقت کی ہے اور ہر شخص اس میں اپنے پچھلے جنم کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ کشتواڑ کی ایک رانی کو دکھائی دیا کہ وہ

پچھلے جنم میں بندر رہا تھی۔ اُسے سخت غصہ آیا اور اس نے مورتی کو آگ میں پھینک دیا جس سے مورتی کالی پڑ گئی اور پچھلے جنم کے حالات بتانے کی خاصیت بھی جاتی رہی کشتواڑ میں اس کے بعد سخت قحط پڑا اور کشتواڑ راج کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

راجہ بھوپت پال گرانڈیل دیو نما شخص تھا وہ بیٹھا ہوتا تو بھی کھڑے ہوئے لوگوں سے اونچا دکھائی دیتا۔ اس نے اپنے زمانے میں بسوہلی کے مشہور محلات کی تعمیر شروع کرائی اور اس کے بعد دس راجے اپنے اپنے وقت میں ان میں اضافہ کرتے رہے۔ پھر راجہ مہندر پال نے (سمت ۱۸۶۳ تا سمت ۱۸۷۰) محل کو آخری شکل دی۔ اس نے رنگ محل اور شیش محل بھی بنوائے۔ رنگ محل کی دیواروں پر اس نے بسوہلی قلم کی خوبصورت تصاویر بنوائیں جو کہ آج سے بتیس چالیس سال پہلے تک موجود تھیں۔ بسوہلی کا مورخ ٹھاکر کاہن سنگھ "راجپوت راجگان پنجاب" (سمت ۱۹۶۹) میں لکھتا ہے: "اگرچہ اب یہ محلات گر چکے ہیں۔ مگر تصاویر اور نقش و نگار اب بھی قابلِ دید ہیں۔ رنگ محل میں ہر ایک قسم کی نائکہ کی تصویریں بمطابق کوک شاستر وستید رسنگار موجود ہیں۔" اب یہ محلات کھنڈر ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور زمانہ کی دست بُرد سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس سے ان کی پُرانی شان و شوکت کا پتہ لگتا ہے۔ اب بھی محل کی باہری دیواروں کے بعض شاندار حصے سر بلند کھڑے ہیں۔ بعض جالی دار کھڑکیاں ہیں وہ بالکونیاں بھی ہیں جن کا ذکر فرانسیسی سیاح وین نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ کھنڈروں پر سجاوٹ کے نشانات آج بھی قابلِ دید ہیں۔ وین دو دفعہ (تقریباً ۱۸۳۹ء میں) بسوہلی سے گذرا۔ ان محلات کی بابت اُس نے لکھا ہے:

"اگر بسوہلی میں پُرانے راجاؤں کے زمانے کا بہت شاندار محل نہ ہوتا تو یہ جگہ شاید ہی سیاحوں کے دیکھنے لائق ہوتی۔ بیچ مشرق میں جتنی عمارتیں دیکھی ہیں میرے خیال میں اُن میں یہ اپنی قسم کی بہترین عمارت ہے۔ اس کے مُرلی بُرج، وسیع مورچہ بند نمبرے، چینی چھتوں والی بالکونیاں اور سامنے خندق نما تالاب یہ سب ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو لکھا میل میں جائے بغیر مجھے اپنے وطن کی کچھ قدیم ترین لال اینٹوں والی عمارتوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب اس محل کو چند میل دور جموں جانے والی سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ کم اونچے سلسلے کوہ کے پس منظر میں اس شان سے اُبھرتا دکھائی دیتا ہے جو ہائیڈل برگ سے کسی صورت بھی کم نہیں اور ان پہاڑوں کے ٹھیک پیچھے سے جھانکتی ہوئی برفانی چوٹیوں کی وجہ سے اس کی خوبصورتی کا تاثر کہیں زیادہ ہو جاتا ہے۔"

ڈاکٹر ووگیل نے جو اس صدی کے اوائل میں بھارت سرکار کے شمالی سرکل کے آرکیالوجیکل سپرنٹنڈنٹ رہ چکے ہیں اپنی کتاب 'ہسٹری آف پنجاب ہل اسٹیٹس' میں لکھا ہے:

"بسوہلی میں سب سے زیادہ قابلِ دید راجاؤں کے پُرانے محل ہیں۔ ان راجاؤں کے تھوڑے سے علاقے اور محدود ذرائع کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عمارت ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس سے ان کی خوش حالی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ محل راجہ امرت پال نے ۸۲-۱۷۵۲ء میں بنوائے تھے اور یہ بھارتی مغل فنِ تعمیر کا بگڑا ہوا اسٹائل بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محل اس زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔"

ڈاکٹر ووگیل نے اس محل کی تعمیر کا جو زمانہ بتایا ہے وہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا اور وین کے سفرنامہ اور ٹھاکر کاہن سنگھ کی تاریخ بسوہلی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر ووگیل نے امرت پال کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ امرت پال نے بھی جو بہت مشہور اور عالم راجہ گذرا ہے محل کا کچھ حصہ بنوایا ہوگا۔ جیسا اوپر بتایا گیا ہے۔ راجہ بھوپت پال کے بعد دس راجاؤں نے اس میں اپنے اپنے زمانے میں اضافہ کیا۔ راجہ امرت پال بھی انھیں دس راجاؤں میں سے تھا۔ اس کے دربار میں دور دور سے علماء و فضلاء جمع ہو گئے تھے۔ بسوہلی کے محلات میں دیواروں پر بسوہلی قلم میں بنی ہوئی تصاویر یقیناً بھارت کا ایک بہترین قومی ورثہ تھیں لیکن وہ یوں ہی ضائع ہو گئیں۔

بسوہلی کا فن مصوری راجہ کرپال (۱۶۷۵-۱۶۹۳ء) کے عہد میں عروج پر تھا۔ یہ راجہ شاستروں کا عالم اور فن کاروں کا قدردان تھا۔ اس راجہ نے پہاڑی ریاستوں میں سب سے پہلے فن کاروں کی سرکاری طور پر سرپرستی کی جس کے نتیجے کے طور پر اس کے عہد میں مصوری کے شاہکار وجود میں آئے۔ پہاڑی ریاستوں میں تصویر کشی سب سے پہلے بسوہلی میں ہی

شروع ہوئی۔ اس لئے بسوہلی قلم کے متعلق نقادانِ فن کی رائے ہے کہ جہاں مغل اور
راجستھانی فنِ مصوری نے پہاڑی مصوری کے تمام دوسرے اسکولوں کو زیادہ
متاثر کیا وہاں بسوہلی اسکول ان خارجی اثرات سے بہت حد تک محفوظ رہا۔
بسوہلی تصویروں کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے شوخ رنگ اور ان میں کھینچی
گئی شکلوں کے وحشیانہ پن، تندی اور جوش نے اس اسکول کو ہندوستان کے
دوسرے مصوری کے اسکولوں کے مقابلے میں ایک انوکھی انفرادیت بخش دی۔
بسوہلی کی تصاویر اپنے اس اچھوتے پن کی وجہ سے ہر صاحبِ ذوق سے خراجِ تحسین
حاصل کر چکی ہیں۔ حال ہی میں ریاست جموں و کشمیر کے صدر ریاست سشری
یووراج کرن سنگھ یورپ کے دورے پر گئے تھے۔ واپسی پر انھوں نے بتایا کہ انھوں
نے یورپ کے کئی عجائب گھروں میں بسوہلی کی تصاویر پائیں جنھیں بڑی قدر سے دیکھا
جاتا ہے۔ آرٹ کے قدردان بسوہلی کی تصاویر حاصل کرنے کے لئے بے قرار
رہتے ہیں اور ان کی منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے۔ بسوہلی کے کچھ گھرانوں میں سینکڑوں
کی تعداد میں ایسی تصاویر موجود ہیں۔

بسوہلی کی بانس اور شال کی دستکاریاں بھی کسی زمانے میں بہت مشہور تھیں
اور کسی وقت اس قصبہ میں پشمینہ سازی کے پانچ سو مرکز تھے اور ہر مرکز میں
دس پندرہ آدمی کام کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ کام بالکل ہی ختم ہو گیا۔
حتیٰ کہ اب ان کا نشان تک باقی نہ رہا اور کاریگر دوسرے پیشوں کو اپنا کر اپنا
پیٹ پالنے لگے۔ تاہم تین چار سال قبل جموں و کشمیر سرکار نے ریاست کی
پرانی دستکاریوں کے احیاء کے لئے ایک اسکیم بنائی اور اس سلسلے میں
مختلف جگہوں پر گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے مراکز کھولے تو بسوہلی میں بھی
محکمہ صنعت و حرفت کی طرف سے بانس کی اشیاء بنانے اور پشمینہ بننے کا ایک
مرکز قائم کیا گیا۔

دریائے راوی کے کنارے چٹانوں پر ہندوؤں کے مختلف دیوی دیوتاؤں
کی مورتیاں کندہ ہوئی ہیں۔ ابھی تک ان کا کوئی باقاعدہ سروے نہیں کیا گیا۔ لیکن
یہ کافی تعداد میں ہیں۔ ان سب میں بڑا اور شاندار بُت خود راجہ بھوپت پال کا ہے
جو ایک گپھا میں چٹان کھود کر بنایا گیا ہے اور لگ بھگ ۹ فٹ اونچا ہے۔ اس میں
بھوپت پال کو ایک لمبا کوٹ اور تنگ چست پائجامہ پہنے ہوئے دکھایا گیا ہے۔
راوی کے کنارے چٹانوں میں بہت سی گپھائیں بھی بنی ہوئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بسوہلی کا فنِ مصوری ایک زمانہ سے خراجِ تحسین حاصل
کر چکا ہے۔ تاہم جموں کے دوسرے حصوں کی طرح بسوہلی کا فنِ سنگتراشی ابھی تک
گمنامی کے عالم میں ہے۔ خود قصبہ بسوہلی میں دو تین مندر بہت پرانے ہیں اور
چنڈا بھگوتی کا مندر تو بہت ہی قدیم بتایا جاتا ہے۔ لیکن ساری بسوہلی تحصیل میں
سب سے اچھا مندر بلاور کا ہے۔ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے بلاور بسوہلی
سے پہلے پال خاندان کا دارالخلافہ تھا۔ پرانے راجاؤں کے محل اور قصبے کی حفاظت
کے لئے بنے ہوئے تین برج اور صدر دروازہ کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔
لیکن بلاور میں سب سے زیادہ قابل دید مہا بلکیشور کا مندر ہے۔ اس مندر
میں پتھر کی بڑی بڑی سلیں لگی ہوئی ہیں لیکن ان میں چونا، مٹی وغیرہ کا استعمال
نہیں ہوا ہے۔ اس کے چار بڑے بڑے ستون بھی ہیں۔ مندر کے باہر کی طرف بہت سے
نقش و نگار کندہ ہوئے ہیں اور اندر پتھر کے ۱۲ اُبت پڑے ہیں جن میں سب
سے بڑی مورتی بھگوان وشنو کی تر مورتی ہے جو کالے پتھر کی ہے اور لگ بھگ ۴
فٹ اونچی ہے۔ کئی اور مورتیاں بھی کالے پتھر کی بنی ہوئی ہیں۔ مقامی روایات کے
مطابق یہ مندر پانڈوؤں کا بنایا ہوا ہے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہروں نے لکھا ہے کہ یہ مندر
فی الواقع بہت قدیم ہے۔ یہ مندر لگ بھگ ساٹھ فٹ اونچا ہے اور اس کی نیو
کوئی ۶۰ × ۶۰ فٹ ہوگی۔ ہر سال بیساکھی کے موقع پر اس مندر میں ایک بہت
بڑا میلہ لگتا ہے جس میں ہزاروں ہندو اور مسلمان دور دراز پہاڑی علاقوں سے
آکر شریک ہوتے ہیں

بلاور مندر کے باب میں ایک عجیب و غریب بات مشہور ہے۔ بیان کیا
جاتا ہے کہ جب کبھی اس کے دروازے پر اوپر سے کوئی اینٹ گرتی تھی تو کہیں
نہ کہیں کوئی برا واقعہ ضرور رونما ہوتا تھا۔ جموں کے ڈوگرہ راجاؤں نے اس بات
کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ اگر کبھی کوئی اینٹ گرے تو انھیں فوراً خبر دی جائے۔
لیکن اب تو ساری دیوار ہی گر پڑی ہے اور نئے سرے سے بنائی گئی ہے۔ بسوہلی
کا ایک اور قدیم مندر قصبہ مان پور میں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ مندر نویں صدی میں
راجہ مان شکیلہ نے بنایا تھا۔

انیسویں صدی کے شروع میں ہی جب پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ
کا اقتدار بڑھ رہا تھا اور یکے بعد دیگرے پہاڑی راج ختم ہو رہے تھے۔ بسوہلی
راج کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ ۱۸۳۲ء میں جب بسوہلی کے راجا بھوپندر پال
کا انتقال ہوا اور کلیان پال اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا اس وقت حکومت کی باگ ڈور
راجہ بھوپندر پال کی بیوہ رانی کے ہاتھ میں رہی۔ اس رانی نے خود درباری

سازشوں میں بڑا حصہ لیا جس کا نتیجہ آخر کار بسوہلی راج کے خاتمہ کی صورت میں نکلا۔ بسوہلی کے ایک دیوان لاجاں اور اس کے بھائی کو راج پروہت کی مدد سے دھوکا دے کر قید کر لیا گیا اور ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا اور اس پر ناقابل بیان وحشیانہ مظالم کئے گئے آخر کار وزیر لاجاں مرگیا۔ جالندھر کے سکھ حاکم سردار رنجودھ سنگھ نے جب بسوہلی کی اس افراتفری کا حال سُنا تو فوراً اپنی فوجیں بھیج دیں جو بغیر کسی مزاحمت کے محل پر قابض ہو گئیں اور وزیر لاجاں کے بھائی کو اس موت کے کنوئیں سے نجات دلائی۔ جس پروہت نے لاجاں کو دھوکے سے گرفتار کروایا تھا وہ پاگل ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصے بعد مر گیا۔ رانی کو بھی بد دعا لگی اور وہ جب بھی کھانا کھانے لگتی اس کو کھانے میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے۔ آخر میں اس نے لاجاں کے نام پر ایک مندر بھی بسوہلی میں بنوایا۔

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد اس کی سلطنت میں سخت بدنظمی پھیل گئی اور پہاڑی راجاؤں نے اپنی اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دئے۔

اس وقت بسوہلی کے درباریوں نے اتفاق کر کے ایک دفعہ پھر آزادی حاصل کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ چناں چہ انھوں نے محل میں سکھ فوج کو محصور کر لیا اور بسوہلی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا۔ ان کے اخراج کے بعد بسوہلی کا آخری راجا کلیان پال بطور آزاد حکمران گدی پر بیٹھا لیکن یہ آزادی بہت ہی عارضی ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے فوراً بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے جو اس وقت بھارت کے شمال میں ایک بہت بڑی ریاست جموں و کشمیر قائم کر رہا تھا بسوہلی کو بھی نئی ریاست میں شامل کر لیا۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء میں راجہ کلیان پال کے لاوارث مر جانے کے ساتھ ہی بسوہلی راج کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اب بسوہلی کا قصبہ بسوہلی تحصیل کا صدر مقام ہے اور وہاں کی آبادی لگ بھگ ، ہزار ہے۔ بسوہلی ایک موسمی سڑک کے ذریعے بائیس میل دور لکھن پور کے مقام پر پٹھان کوٹ، جموں قومی شاہراہ سے ملا ہوا ہے۔
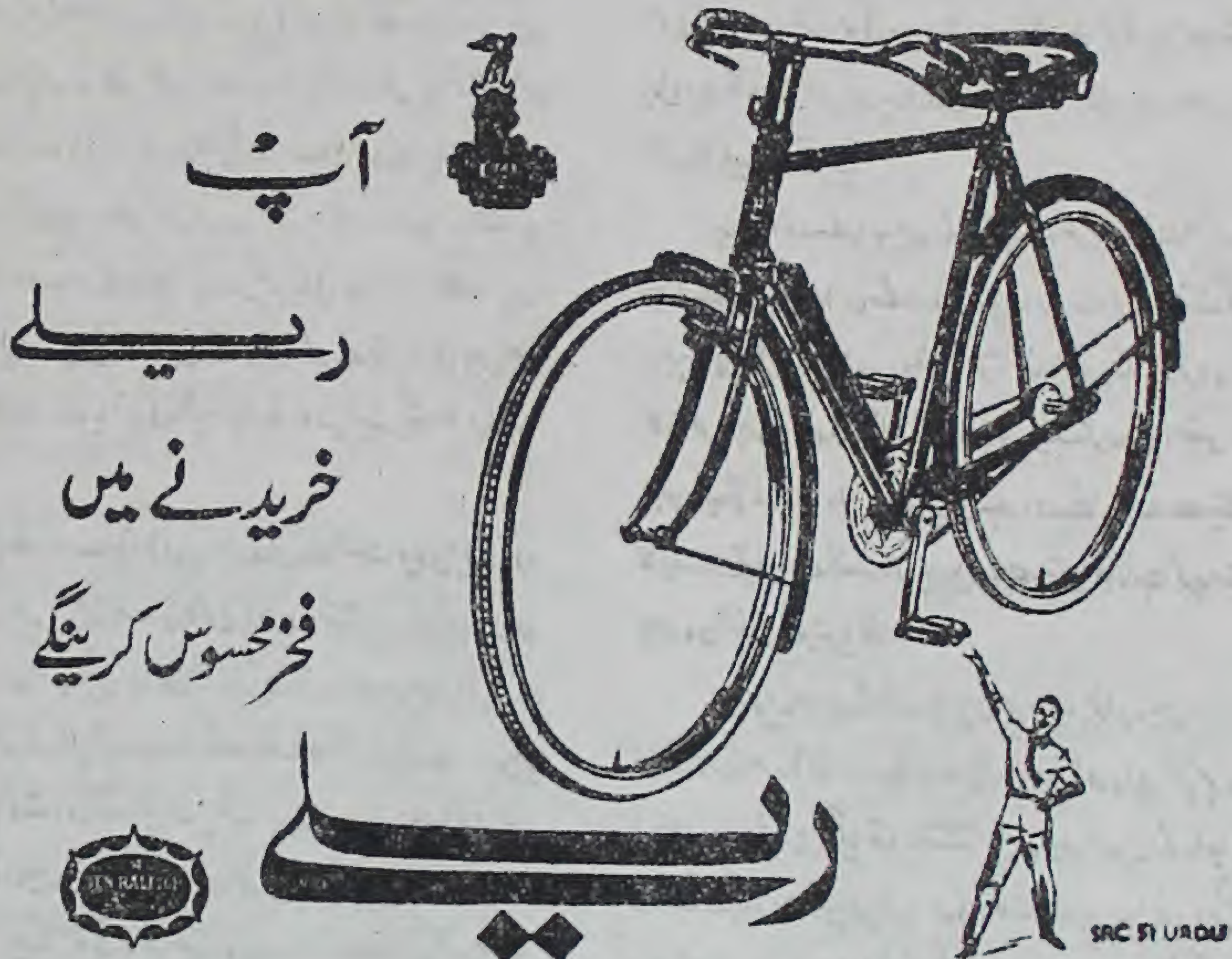
آہن خور چوہے!

(پنچ تنتر سے ایک روائیت)

ایک تھا سوداگر۔ اُس کا نام تھا نٹوکا۔ شومئی قسمت سے اپنا سارا سرمایہ گنوا کر اُسے اپنے وطن سے دُور دِساور میں ازسرِ نو دولت کمانے کے لئے جانا پڑا۔ جانے سے پہلے وہ اپنے ایک دوست لکشمن سے ملنے گیا اور اپنا ترازو اُس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔
"بھائی، یہ ترازو میرے لَوٹنے تک اپنے یہاں رکھ لو! اس کا میرا برسوں ساتھ رہا ہے، اِس لئے میں اِسے بیچنا نہیں چاہتا!"
تھوڑے ہی عرصے میں نٹوکا پھر سے امیر ہو کر واپس اپنے شہر میں آیا۔ لکشمن کے پاس جا کر جب اُس نے اپنا ترازو مانگا تو لکشمن بولا:
"تمہارا ترازو تو چوُہے کھا گئے!"
"اِتنا بڑا ترازو بھلا چوُہے کیسے کھا گئے!" نٹوکا نے حیرت سے پُوچھا "۲۵۰ سیر لوہا تھا!"
"میرے گھر میں چوُہے بھی تو کم نہیں، ڈھائی سو سیر لوہا تو وہ ناشتے ہی میں کھا جائیں!"
نٹوکا سوچ میں پڑ گیا "اچھا" وہ مُسکراتے ہوئے بولا "اس میں تمہارا کیا قصور! میری ہی قسمت خراب تھی! اب میں جا کر ندی میں نہاؤنگا ذرا اپنے بیٹے سے کہو میری چیزیں اُٹھائے چلے"
لکشمن کو یہ معمولی سی درخواست منظور کرنی پڑی!
ندی سے لَوٹتے ہوئے نٹوکا نے لڑکے کو ایک غار میں دھکیل کر، غار کا مُنہ ایک چٹان سے بند کر دیا۔ لکشمن کے گھر پہنچا تو لکشمن نے پوچھا "میرا بیٹا کہاں ہے؟"
نٹوکا نے عیاری سے جواب دیا "وہ ندی کنارے بیٹھا تھا کہ ایک باز جھپٹ کر اسے اُٹھا لے گیا"
"جھوُٹے مکار! پندرہ برس کے لڑکے کو باز کیسے اُٹھا سکتا ہے؟"
"جیسے ڈھائی سو سیر لوہا چوُہے کھا سکتے ہیں! سُنو لکشمن، اگر تمھیں اپنا بیٹا چاہئے تو میرا ترازو نکالو!"
نٹوکا کو ترازو واپس مِل گیا۔

اِس کہانی سے ہمیں یہ سبق مِلتا ہے کہ، جو سچا ہے وہ جھوُٹے کا پول کھول سکتا ہے۔ وناسپتی کو لیجئے۔ مشہور و معروف سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ وناسپتی ایک قوت بخش غذا ہے۔ تجربوں سے یہ ثابت بھی ہو چکا ہے۔

'ڈالڈا' وناسپتی، خالص وناسپتی تیلوں سے، سرکاری ہدایات کے مطابق بنایا جاتا ہے 'ڈالڈا' ہر قسم کا کھانا پکانے کے کام آتا ہے اور وٹامن 'اے' اور 'ڈی' حاصل کرنے کا ایک باکفایت ذریعہ ہے۔
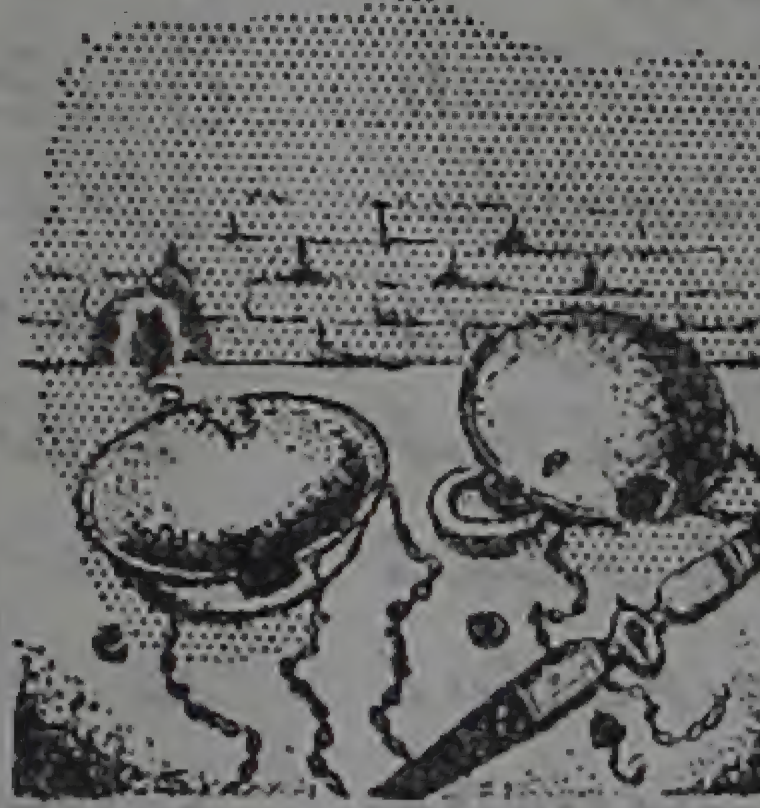
اس کے ہر اونس میں وٹامن 'اے' کے ... بین الاقوامی یونٹس ملائے جاتے ہیں۔ اِسی لئے عورتیں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ 'ڈالڈا' محض کھانا پکانے کی ایک چکنائی ہی نہیں ـــــ غذا بھی ہے!

ہندوستان لیور لمیٹڈ، بمبئی

DL. 477-X52 UD

کالی داس گپتا رضا

سعود بن سعید المعیری

(سواحلی زبان کا ایک مشہور شاعر)

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے تک برّاعظم افریقہ کو تاریک برّاعظم کے نام سے پکارا جاتا تھا مگر اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہُوا کہ نصف صدی پہلے تک اس برّاعظم سے کسی ملک نے کسی قسم کا رابطہ قائم نہ کیا تھا۔ مصری تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مارکوپولو اور ابنِ بطوطہ نے سینکڑوں سال پہلے سواحلِ افریقہ کی سیاحت کی تھی۔ یونانیوں، چینیوں، فینیقیوں، ہندوستانیوں، پرتگیزیوں اور عربوں نے بہت زمانہ پہلے افریقہ کے ہزاروں میل لمبے مشرقی ساحل سے تجارتی تعلقات قائم کر لئے تھے۔ مگر جن لوگوں نے پہلے پہل مشرقی سواحلِ افریقہ پر اپنی نوآبادیات قائم کیں وہ عرب تھے۔ اُن کی حکومت کے سینکڑوں سال پہلے کے نشانات اب بھی جا بجا پائے جاتے ہیں۔ ممباسہ سے ۸۰ میل شمال کی طرف ساحل پر عربوں کے شہر گیدی کے کھنڈر چودھویں صدی کے بتائے جاتے ہیں۔ ان نوآبادیات کی حکومت کئی چھوٹے چھوٹے سلطانوں یا سرداروں میں بٹی ہوئی تھی۔ بیشتر عرب ایک دفعہ اپنے وطن سے مشرقی افریقہ کے ساحل پر آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ حتیٰ کہ مقامی افریقی قبیلوں میں شادیاں بھی کر ڈالیں۔ ساحلی قبائل کے ساتھ عربوں کے اس میل جول نے ایک نئی زبان کو جنم دیا جسے سواحلی Swahili کہتے ہیں۔ اس پر عربی زبان کا اثر غالب ہے۔ یہ زبان اب افریقہ کی بڑی زبانوں میں شامل ہے اور سارے برٹش افریقہ میں بلا امتیاز مذہب و ملت بولی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا اصلی روپ ساحل پر رہنے والوں ہی کی بولی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سعود بن سعید المعیری ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوا۔ وہ عربوں اور سواحلی لوگوں میں معزز اور اپنے وقت کا بہترین شاعر گنا جاتا تھا۔ ہزل لکھنے میں بھی اُسے کمال حاصل تھا۔ اس کے بہت سے گیت اور نظمیں آج بھی سواحلی رقص و سُرود کی محفلوں میں گائی جاتی ہیں۔ ممباسہ پر اس وقت مزروعی خاندان کے سردار حکومت کرتے تھے اور سعود بن سعید اس خاندان کے خاص بہی خواہوں میں سے تھا۔ جب زنجبار کے سلطان نے ۱۸۳۷ء میں ممباسہ کو فتح کر کے مزروعی خاندان کے ہاتھوں سے حکومت کی باگ ڈور چھین لی تو شیخ باروک بن رشید بن سالم المزروعی نے گازی کو جو ممباسہ سے ۲۰ میل ساحل پر واقع ہے صدر مقام بنا کر سلطانِ زنجبار کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور کئی سال تک اپنی علیحدہ حکومت قائم رکھی حتیٰ کہ محمدؐ بن عبداللہ بن مبارک غشوینی قلعہ ممباسہ کا کمانڈنٹ مقرر ہوا۔ سعود بن سعید شیخ باروک کا دوست تھا اس لئے اس کی تمام تر ہمدردی شیخ باروک کے ساتھ تھی اور وہ ممباسہ میں محمدؐ بن عبداللہ کے خاص مخالفوں میں گنا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں ممباسہ میں ہر رات کسی نہ کسی جگہ ناچ گانے کی محفل ہوا کرتی تھی۔ سعود بن سعید کبھی کبھی بورا پارٹی کے لئے گیت لکھا کرتا تھا۔ یہ رقص ناٹک

اس مضمون کے تیار کرنے میں Al-akida and Fort Jesus مصنفہ مبارک علی منادی سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے۔

کی حیثیت رکھتے تھے۔ گیت اور نظمیں جو رقص کے ساتھ ساتھ گائی جاتی تھیں عام طور پر ہنگامی ہوتی تھیں! جیسے گیت فوراً زبان زدِ خاص و عام ہوکر دُور دُور تک پھیل جاتے تھے۔ سعود بن سعید نے شیخ بارُوک اور محمدؐ بن عبداللہ کے محاصرے کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

جب شیخ باروک نے گازی کے گرد و نواح میں بہت اودھم مچایا اور سلطان زنجبار کی فوجوں کو پے در پے شکست دی تو محمدؐ بن عبداللہ نے شیخ کی سرکوبی کا بیڑا اٹھایا اور خفیہ طور پر وسیع پیمانے پر تیاریاں شروع کر دیں۔ سعود بن سعید کو اس بات کی خبر ہوگئی۔ اس نے شیخ کو خبردار کرنا چاہا مگر وہ کسی طریقے سے بھی ایسا نہ کرسکتا تھا کیونکہ ممباسہ کے سب راستوں پر پہرے بٹھائے گئے تھے۔ اس نے ایک اور طریقہ اختیار کیا اور ذیل کا گیت بوراپاٹی کے ایک رقص کے لئے لکھا ؎

جیمی واتے ہے	ساحر[1] اور اس کے سب رفیقوں نے
میوآ بگارو	اب پہن لی ہے جادوئی مالا
ونگوجی واجے نی	دیو و ابلیس بن رہے ہیں جو
واڈنگو نارو	منتظر رہ تو اُن کی آمد کا
مکانگا شوجے	خوب تیار رہ تو اُن کے لئے
واجا پاونگارو	جن کو ہے اپنی تیغ کا غرّہ

تاری لی نی اندیا	ننگے خنجر سے ننگی تیغوں سے
لاواکلنڈینی	ناچتے ہیں کلنڈنی[2] والے
ہانائی کث انگیا	اجنبی ہے جو، وہ ذرا ہٹ کر
علی اے بگینی	اس تماشے پہ اک نظر ڈالے
بورا انسامیہ	بورا[3] رقاص! ہاں ذرا ہشیار
بیوسے غافولانی	کوئی تجھ کو نہ قتل کر ڈالے

بورا، اَزَی ضانی	بورا[1] رقاص! یہ خیال نہ کر
نی نادی لاجانا	یہ ہی فرسودہ ہے یہ رقص و سرود
واتانا والا خوفی	یہ نہیں ہیں وہ ناچنے والے
کولی نے ذاسانا	کر سکے جو نہ اپنا نام و نمود
توکی آ آگافی	آ! دکھا دے تو سامنے سب کے
اُپاپائے رخو ونا	نہیں بے سود اب بھی تیرا وجود

گیت اس قدر مشہور ہوا کہ صبح تک ملاحوں کی زبانی شیخ باروک تک جا پہونچا۔ مگر باوجود اس اطلاع کے شیخ خاطرخواہ تیاری نہ کرسکا اور محمدؐ بن عبداللہ کی فوجوں کی تاب نہ لاسکا اور شکست خوردہ ہوکر کہیں دور بھاگ گیا۔ ممباسہ میں مشہور ہوگیا کہ شیخ باروک لڑائی میں کام آیا۔ محمدؐ بن عبداللہ بہت خوش ہوا مگر سعود بن سعید کے لئے یہ جانکاہ خبر تھی۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد شیخ بارک پھر نمودار ہوگیا اس خوش خبری کے ملنے پر شاعر اپنی مسرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا ؎

نی سوادی داریکوا	کوئی ایسا بھی ہے جو عاقل کو
ہولی واجے نئی ہے؟	عقل کے راستے سے بہکائے؟
یدے وا سیہوکا	کٹھلو! کھائے جاؤ تم دھوکا
انئی ئے وبکونیوے	کون تم کو اب آکے سمجھائے
یووانی؟ اسے روکا	دُور اڑ کر نکل گیا ہے عقاب
کوزی ناوانا وسے	کون ہے جو اُسے پکڑ لائے؟

محمدؐ بن عبداللہ اس مذاق پر دانت پیس کر رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ باغی کو میدان میں مطیع کرنا تو مشکل ہے۔ کوئی ایسی چال چلی جائے جس سے بغیر جانی نقصان کے شیخ باروک کو گرفتار کیا جاسکے۔ چنانچہ اس نے بہت سے تحفے تحائف شیخ کو خوش کرنے کے لئے بھیجے تاکہ کسی ملاقات میں اُسے دھوکے سے گرفتار کیا جاسکے۔ مگر شیخ کسی طرح ہاتھ نہ آیا اور محمدؐ بن عبداللہ کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ سعود بن سعید نے اس سارے واقعے کو کمال خوبی سے نظم بند کیا ہے۔ نظم میں شیخ مبارک کو اژدھا حسینہ اور محمدؐ بن عبداللہ کو اس کا چاہنے والا قرار دیا ہے

ساحر[1] — محمدؐ بن عبداللہ

کلنڈنی[2] — ممباسہ کا وہ علاقہ ہے جہاں اب بندرگاہ واقع ہے۔ یہاں اہلِ ممباسہ مراد ہے

بورا[3] — شیخ باروک

بورا[1] (بائیں کالم) — شیخ باروک

الی بلیکوا	اُس کو بھیجے گئے بہت تحفے
ڈاپوزہ وزدری	قابلِ رشک و قابلِ صد دید
شالی آ موآ	شال، دوشالے، ریشمی رومال
نادیولی زادی	کوئی جن کی نہ کر سکے تردید
پوراکو دہ لیوا	عقد اس کو مگر نہیں منظور
کاموے ہکو یجری	لاکھ ہو وہ[2] شجاع و نیک[3] سعید

کوادوانا بیری	چپکے چپکے سے عاشقِ[4] جانباز
ریو دکسی انگواتا	کر نہ لینا حسینہ سے شادی
عردسی داناری	اس کو مہلت ذراسی دے دینا
کنیز دا متاتا	روزِ روشن میں رقص کرنے کی
پورا اظہیری	تاکہ تو بھی نظارہ اس کا کرے
ایا تے جو دنا	جوہر اپنا دکھا سکے وہ[5] بھی

پورا یوا سنے نا	ناز سے جوش سے افتخار سے
اکی جی نا جری	نازنیں نے یہ کر دیا اعلان
"ووے ہکو نا	"ایک بھی تو نہیں ہے مردوں میں
دا لیو دزدری	جن کی صورت پہ جاؤں میں قربان
نی کیھری تا آمنا	تا آمنا یا عمر سے کرکے عقد
نا پوارا خماری"	پورا کرلوں گی اپنا میں ارمان"

پوزد زا کیے موانا	مملی، شوخ، قیمتی کپڑے
گو او زا مالی	مجھ کو ان چیزوں سے[6] نہیں کچھ بس
الی زی قطا عا	سونے چاندی کے بے بہا زیور
کے دا جمالی	بے[7] تیز دیک، سب ہیں خار و خس
پورا ہکو سیری	اس نے ایسے[8] دلدار کے تحفے
کوا آہستالی	گن کر ایک ایک کر دیئے واپس

لہ حسینہ   ٹہ وصل چاہنے والا

کہ حسینہ   شہ چاہنے والا

پورا لاموا شا	یوں کہا نازنین نے فقرہ
انے نا ہکیری	(گو اُسے وہ پسند تھے تحفے)
لنگا جا آکاش	"لاکھ مجھ کو جہیز دو ایسا
پوزد نا ہیساری	گہنے بھیجو ہزار سونے کے
سماعیلی باشا	مجھ سی مہرو کی شان گھٹتی ہے
ہمو اوری سیری	شاہ تک سے بھی عقد کرنے سے"

ہا ادبوی ۔پورا	عقد اُس سے نہ کر سکے گا کوئی
نی سومے انگینے	نہ لے گا یونہی یہ حسن و جمال
مومیوے حضورا	شیخِ[1] بدشکل وحشت سر ہی کو
دلوانی دِ ناسنے	اب بتائے گی وہ شریک حال
پہیانی نکرا	آؤ اور آکے آزما دیکھو
کما مد بیگیے	خام لگتا ہو تم کو جو یہ خیال

اس نظم کو سُن کر محمدؐ بن عبداللہ کا جو حال ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سعود بن سعید کو گرفتار کرکے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس موقعے پر شاعر نے ذیل کے اشعار کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی۔

نی بیکوا انگو سے تا گو	میں پھنسا تھا یہاں طویلے میں
ہالی تا نگولیا زیزی	چھٹ کے ریوڑ سے میں اکیلا ہی
ہا وا تو رد کو دنا نگو	جب ہوا دور میں عزیز دل سے
نبی ہا مونا سمانزی	غم سے آنکھیں مری ہوئیں اندھی
پنڈے ہاڈ نادن زانگو	پھر سنی میں نے دوستوں کی خبر
واجی سے نا پادا زی	قید خانے میں اُن کے آنے کی
وا میتوا مانڈا کو زی	وہ چلے آرہے ہیں زنداں میں
ناکو ٹوپی دا چیانی	گردنیں بار چوب سے ٹیڑھی

سعود بن سعید میدانِ سیاست کا تجربہ کار سپاہی ثابت ہوا۔ اس نے آہستہ آہستہ قید خانے ہی سے محمدؐ بن عبداللہ کو اس طرح ہاتھوں میں لیا کہ وہ ہر بات میں سعود سے مشورہ کرنے لگا۔ اس طرح سعود موقع پاکر

لہ مرادِ شیطان

زنجبار کو بھاگ نکلا تاکہ سلطان تک رسائی حاصل کرکے محمد بن عبداللہ کو معتوب ٹھہرائے۔ اس ارادے میں بھی وہ ایک حد تک کامیاب رہا۔ محمد بن عبداللہ کو پوچھ گچھ کے لئے دوبارہ یہیں بلایا گیا مگر وہ اپنے سسر[1] کی مدد سے معافی حاصل کرکے واپس حمیاسہ[2] آگیا اور جب وہ جہاز سے اُتر کر شہر میں داخل ہوا تو اس کے کانوں نے اور ہی کچھ سنا ؎

بکلی فانیہ ماجی	اُن کی کشتی میں ہو گیا ہے شگاف
واسی کتا ہوومے	ان کو لیکن خبر نہیں کوئی
ودیشا کونا سی ہی	اور کچھ بھی نہیں انھیں معلوم
ستو نا نکو یوے	ہے خبر صرف اک معافی کی
جہازی یا نباجی	ڈوبتی جا رہی ہے باڑھ میں
اے وونڈا یا دے	ان کی ٹوٹی ہوئی سی وہ کشتی

آخر کار بہت سی کوششوں کے بعد سعود بن سعید کی بن آئی اور سلطان زنجبار کے حکم سے محمد بن عبداللہ ۱۸۷۵ء میں اپنے عہدے سے ہمیشہ کے لئے معزول ہوا۔

سعود بن سعید المعمیری نے ۱۸۷۰ء میں وفات پائی۔

---

[1] محمد بن عبداللہ اور اس کا سسر جس نے معافی دلوائی تھی۔

[2] ایک جگہ کا نام ہے۔

ضروری گزارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھیئے

۲۔ غیر طلبیدہ مضامین اسی صورت میں واپس کئے جائیں گے جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

'رقص نمبر' کے بارے میں

سید مسعود حسن رضوی ادیب

یوں تو 'آج کل' کا ہر شمارہ قدر کے قابل ہوتا ہے، لیکن اس کے خاص نمبر اپنے موضوعوں پر نہایت بیش قیمت اور جچی تُلی معلومات فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اس کا رقص نمبر بھی اسی خصوصیت کا حامل ہے۔ جو شخص فنِ رقص سے بیگانہ محض ہو وہ بھی اس نمبر کا مطالعہ کر کے اس فن کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ اس نمبر کی تصویریں سعیِ بلیغ اور حسنِ انتخاب کی شہادت دے رہی ہیں۔

پروفیسر آل احمد سرور

'آج کل' کا رقص نمبر نکال کر آپ نے بڑا کام کر دیا۔ اردو میں فنونِ لطیفہ پر اچھے مضامین بہت کم ہیں۔ اس سے پہلے آج کل کے موسیقی نمبر نے ایک ضرورت پوری کی تھی اب رقص نمبر نے ایک اور خلا کو پُر کر دیا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسی طرح مصوری نمبر، بُت تراشی نمبر اور تعمیر نمبر بھی نکالیے۔ اس طرح عام پڑھنے والوں کو نہ صرف فنونِ لطیفہ کی روح سے آشنا ہونے کا موقع ملے گا بلکہ وہ فن کے نادر نمونوں سے بھی واقف ہو سکیں گے۔

جناب پی راما کرشنا راؤ گورنر کیرالہ

مصروفیت کی وجہ سے آج کل' کا رقص نمبر جستہ جستہ دیکھ سکا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ اس نمبر میں آپ نے ہندوستان کے مختلف مکاتیبِ رقص پر خود ماہرینِ فن کے مضامین شائع کئے ہیں اور ایسے ماہرین کے جو فنِ رقص کے صرف اصولوں سے واقف ہی نہیں بلکہ عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ میری معلومات کی حد تک مضامین ہندوستان کے ہر صوبہ کے خصوصی مکاتیب پر حاوی معلوم ہوتے ہیں لیکن آندھرا کے 'کوچی پوڑی' کا تذکرہ نہیں پایا۔ امید ہے کہ جو اور بھی چھوٹ گئے ہوں ان کو بھی پورا کیا جا سکے گا۔ اس مفید نمبر پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

جناب علی اصغر آصف فیضی

'آج کل' کا رقص نمبر ایک دل چسپ نمبر ہے اور میری خواہش ہے کہ آپ اسی طرح دیگر فنونِ لطیفہ جیسے مصوری، موسیقی اور خطاطی وغیرہ کے متعلق نمبر نکالیں۔

جوش ملسیانی

رسالہ آج کل' کا رقص نمبر نظر افروز ہوا۔ اگرچہ رقص و سرود اور موسیقی سے مجھے دُور کی نسبت بھی نہیں اس کے باوجود اس خاص شمارہ میں صرف تصویریں ہی رقصاں نظر نہیں آئیں بلکہ مضامین میں بھی بیشتر مقامات ایسے نظر آئے جہاں سطروں کی سطریں اپنے مستانہ رقص میں معروف ہیں اور فنونِ لطیفہ وادبِ لطیف دونوں کے ہم دوش بلکہ ہم آغوش ہو جانے کا منظر پیش کر رہی ہیں۔

پروفیسر تلوک چند محروم

میری رائے میں 'آج کل' اردو کا پہلا جریدہ ہے جس نے رقص کی اہمیت اور اس کی رموز و جزئیات کو ایک جگہ فراہم کر دیا ہے۔ آج کل کے عام نمبر بھی نظر نواز اور دل کش ہوتے ہیں۔ خاص نمبروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ رقص نمبر اپنی روایتی ادبی سامانیوں کے ساتھ رقص کے شیدائیوں کے لئے تو نعمتِ غیر مترقبہ ہے ہی، مجھ جیسے رقص ناآشناؤں کے لئے بھی کم دلچسپی کا ذریعہ نہیں۔ اڈیٹر کی محنت اور ذوقِ فن مبارکباد کے مستحق ہیں

ڈاکٹر محمد حسن

'آج کل' نے اردو میں فنونِ لطیفہ کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ موسیقی نمبر نے موسیقی کے بارے میں اہم معلومات یک جا کر دی تھیں اب رقص پر آپ کا یہ شمارہ قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری زبان میں یوں تو فنونِ لطیفہ کے متعلق کافی کتابیں موجود ہیں لیکن فنونِ لطیفہ جیسے نازک علوم کو دلچسپ اور عام فہم انداز میں پیش کرنا آپ کا کام ہے اور قابلِ ستائش کام ہے۔

'آج کل' بلاشبہ ہمارے ملک کے معتدد رسالوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے اور اس کے معیار کو آپ نے بیک وقت مقبول عام اور خاص پسند کے درجے تک پہنچا دیا ہے۔

سیّد علی عبّاس حسینی

موسیقی و رقص میں ماہرین کی اردو دانوں میں کمی نہیں، لیکن ایسے جو واقعی ان فنون پر اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت بھی رکھتے ہوں بہت ہی کم ہیں۔ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے اتنے پُر از معلومات مضامین اس ایک نمبر میں جمع کر دئے۔ مجھے شمس کنول، سرلا سہگل، رکمنی دیوی، ارنڈیل، شرمتی بیگوڈ جی ال، ادیب اور پی، ان، کے بامزی کے مضامین خاص طور سے پسند آئے یہ سب خواتین و حضرات مستحق مبارکباد ہیں اور آپ کا ادارہ ان سب سے زیادہ کہ وہ ان کے حسین رشحاتِ قلم کو ترتیبی اور صوری خوبیوں سے آراستہ کر کے ایک جمیل گلدستہ کی طرح پیش کر سکا۔ میری طرف سے اس کامیاب نمبر پہ ہدیۂ تبریک قبول کیجئے۔

جناب مالک رام

رقص نمبر کی ترتیب میں آپ نے جو محنت کی ہے اس کا اندازہ تو فہرستِ مضامین دیکھنے ہی سے ہو جاتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں کسی فنی موضوع پر پرچہ مرتب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، کہ سنجیدہ لکھنے والے ہی کہاں رہے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف ناچوں سے متعلق جتنا مواد اور معلومات آپ نے جمع کر دی ہیں، اتنی اس فن کی معیاری بھر کم کتابوں کو چھوڑ کر شاید ہی اور کہیں ملیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خشک اصطلاحات کو چھوڑ کر۔ کیونکہ اگر اصطلاحات سے اندھا دھند کام لیا جائے تو شاید کچھ صاحبِ فن حضرات تو اس سے لطف اندوز ہو لیں، عام پڑھنے والوں کے پلے خاک نہیں پڑتا۔ آپ نے اس طرف جتنے خاص نمبر نکالے ہیں۔ سب بہت مفید اور معلومات افزا ہیں۔

سیّد اختر تلہری

'آج کل' رقص نمبر نظر نواز ہوا۔ میرے لئے یہ مضمون بالکل نیا ہے۔ میں نے اس سلسلے کے تمام مضامین شوق سے پڑھے۔ یقیناً اس سے میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ اب فنِ رقص کے متعلق پہلی سی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ آپ اس قسم کے خاص نمبر نکال کر نہ صرف اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ ہندوستانی ثقافت کے اہم عناصر کو ان یوست زدہ حلقوں میں بھی مقبول بنا رہے ہیں جنھیں ان چیزوں سے تعلق نہیں ہے۔ اس نمبر کی حسن ترتیب بھی قابلِ تحسین ہے۔

جناب مکیش اکبرآبادی

'آج کل' رقص نمبر علم و فن اور حسن و جمال کا ایک بوقلمونی مرقع اور 'آج کل' کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح بے نظیر ہے۔ دلچسپ واقعات و لطائف کے علاوہ پڑھنے والوں کو اس کے مطالعے سے فنِ رقص اور اس کے مختلف شعبوں سے اتنی بہتر معلومات بہم پہونچ جائے گی جو ایک ناواقف کو واقف کار اور واقف کار کو عالم بنانے کے لئے کافی ہے۔ میری نظر میں اس موضوع پر یہ اوّلیں اور بہترین کوشش ہے

جناب رشید کوثر فاروقی

'آج کل' 'رقص نمبر' ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا شعور حاصل کرنے کے لئے آپ کی یہ خدمتیں تحسین کے قابل ہیں 'موسیقی نمبر' کے بعد اس کی بہت کمی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ فلسفہ ہندیہ اور دوسرے فنونِ لطیفہ کے متعلق بھی اگر نمبر نکالیں اور ان کا ادبی معیار بھی اعلیٰ ہو تو 'نورٌ علیٰ نور' کا مصداق ہو گا۔

ٹیلی فون پر
آپ کا تار ہے

ٹیلی فون کے ذریعے تار زیادہ جلدی پہنچتا ہے

آپ جس کو چاہیں، اس کے ٹیلی فون نمبر پر تار بھیج سکتے ہیں

بینرجی
ٹی ایف ۳۱۱۷۰
نئی دہلی

جیسے ہی پیغام تار گھر میں موصول ہوگا مرسل الیہ کو ٹیلی فون کے ذریعے پہنچا دیا جائے گا۔ شخصی طور پر تار پہنچانے میں جو تاخیر واقع ہوتی ہے اس صورت میں نہیں ہوگی۔

ٹیلی فون کے ذریعے تار بھیجنا سستا بھی پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ٹیلی فون نمبر اور ٹی ایف کے الفاظ کو ایک ہی لفظ مان کر اس کے دام لگائے جاتے ہیں

جہاں جہاں مقامی ٹیلی فون سروس ہے وہاں وہاں یہ سہولت دستیاب ہو سکتی ہے۔
تار کی نقل اُسی روز مرسل الیہ کو بذریعہ ڈاک سے بھیج دی جاتی ہے۔

ٹیلی فون پر تار وصول کیجئے

اگر تار بھیجنے والے نے آپ کا ٹیلی فون نمبر نہ لکھا ہو، جب بھی تار آپ کو مل سکتا ہے ایسا صرف چند شہروں ہی میں ممکن ہے۔ آپ اپنا ٹیلی فون نمبر تار گھر میں درج کرا دیجئے۔ آپ کو سارے تار ٹیلی فون پر ملیں گے اور تار کی نقل ڈاک سے پہنچے گی۔ ٹیلی فون پر تار رسانی کی یہ سروس آگرہ، احمد آباد، الہ آباد، امرت سر، بنگلور، بمبئی، کلکتہ، کوئمبٹور، دہلی، اندور، کانپور، مدراس، ناگپور، نئی دہلی، سیلم اور سکندر آباد میں دستیاب ہے۔

خدمات کی بہتر انجام دہی میں ہماری مدد کیجئے

پوسٹس اینڈ ٹیلی گرافس ڈیپارٹمنٹ

DA-66/190

ترتیب

سر ورق :- دلّی میں یوم جمہوریہ کی پریڈ کا ایک منظر
رسالے کی پشت پر :- ایک کشمیری لوک کلاکار

پوسٹ نشک سمت ۱۸۸۱

جنوری ۱۹۶۰ء

جلد ۱۸ - نمبر ۶

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر 'آج کل' اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- ٹو شلنگ یا سوا ڈالر

فی پرچہ :- ہندوستان میں ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومتِ ہند
پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

ہم ہر سال ۱۴-نومبر کو "بچوں کا دن" مناتے ہیں۔ یہ دن ایک قومی تقریب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی دن ہمارے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی سالگرہ بھی ہوتی ہے جنھیں بچے بہت پیارے ہیں اور ان کی فلاح و بہبود کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ آج کے بچے کل کے شہری ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر مستقبل کا دار و مدار ہے، اس لئے بچوں کی صحیح پرورش اور ان کی ترقی کی ذمہ داری پوری قوم پر ہے، جس سے عہدہ برا ہو کر ہی ہم سرخرو ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ راشٹرپتی نے اپنے پیغام میں کہا بچے ملک کی دولت ہیں، ان کے رہن سہن تعلیم اور پرورش کے معیار کو اونچا کرنے کے لئے ہمیں بھرپور کوشش کرنی چاہیئے۔ دوسرے تعمیری کاموں کی طرح بچوں کی فلاح و بہبود کے مسئلے کو بھی ہم ایک ملک گیر تحریک کے ذریعہ اور سماجی کارکنوں اور خود بچوں میں جوش و خروش کا جذبہ پیدا کر کے ہی حل کرنے کی توقع کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی سرحد پر چین کی اشتعال انگیز جارحانہ کارروائیوں کے باوجود ہندوستان نے جس صبر و سکون سے کام لیا ہے۔ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان اپنی میانہ روی اور پُر امن بقائے باہمی کی پالیسی پر مضبوطی سے قائم ہے اور تنازعات کو گفت و شنید کے ذریعہ طے کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہی راستہ امن و سلامتی کا راستہ ہے۔ سرحد سے متعلق پنڈت نہرو کی جوابی تجاویز بھی اسی امر کی دلالت کرتی ہیں۔ اس کو ہندوستان کی کمزوری پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس مصالحانہ رویّے کے باوجود بات بگڑی تو ملک صورت حال کا ہر طرح سے مقابلہ کرے گا۔ چنانچہ لوک سبھا میں وزیر اعظم پنڈت نہرو نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوستان اپنی حدود میں کوئی مزید مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ ہندوستان اور چین کا تنازعہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے جس کا تعلق ہندوستان اور ایشیا کے حال و مستقبل دونوں سے ہے۔ اگر بدقسمتی سے جنگ لڑنی پڑی تو پھر بلاشبہ ہم اچھی طرح لڑیں گے اور اس کے لئے وہ سب کچھ کریں گے جس کی ضرورت ہوگی۔ منصوبہ بندی وغیرہ اور تمام اسکیموں کو حالات کے مطابق تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ یہ معاملہ ہماری زندگی اور موت کا ہے۔ پھر بھی حکومت کی یہی کوشش ہوگی کہ پُرامن تصفیہ ہو جائے۔ بلاشبہ تاریخ کے اس نازک دور میں ایشیا کے ان دو عظیم ملکوں کا باہمی اتحاد و اتفاق نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی امن و سلامتی کے لئے بڑا ضروری ہے۔

۴-دسمبر کو دلّی میں جمعیتہ العلماء ہند کے صدر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی اچانک وفات کو علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں سخت سانحہ قرار دیا گیا ہے۔ مرحوم آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے اور قید و بند کے مصائب برداشت کئے مرحوم گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ فصاحت و بلاغت اور خطابت میں یگانۂ روزگار تھے اسی لئے سحبان الہند کہلاتے تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ساہتیہ اکادمی کی طرف سے اردو کے نامور ادیب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کو ان کی تصنیف 'اردو ڈراما اور اسٹیج' پر پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے اس کتاب کو ۵۸-۱۹۵۶ء کی بہترین اردو تصنیف قرار دیا گیا ہے۔ ادارۂ 'آج کل' موصوف کو اس اعزاز پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہے۔

دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں بلونت سنگھ کی کہانی 'صابن کی ٹکیہ' شائع ہوئی تھی۔ اس کے متعلق بعض حضرات نے لکھا ہے کہ یہ ایچ، ایچ منرو ساکی کی کہانی ڈسک (DUSK) کا اردو روپ ہے۔ مصنف نے پہلے ہی ہمیں لکھا تھا کہ اس کہانی میں ایک پرانی مغربی کہانی کا ہلکا سا پرتو ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ کہانی کے ساتھ یہ حوالہ نہیں دیا جا سکا۔

عبدالسلام خاں

اشک رام پوری

اشک رام پوری جو رام پور میں اچھن صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے بڑی رنگا رنگ شخصیت تھے۔ سادگی، پُرکاری، بے خودی، ہشیاری کا اگر جسمانی پیکر میرے دیکھنے میں آیا تو وہ اچھن صاحب تھے۔ وہ میرے لئے کوئی اجنبی نہیں تھے۔ میرے بزرگ تھے، "میرے اُستاد تھے" میرا اُن کے ساتھ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا تھا اور بات تو یہ ہے کہ انھوں نے بھی کبھی ایسے جذبے کا اظہار نہیں کیا جس سے ان کی شانِ بے نیازی پر اور روایتی بے تکلفی پر حرف آتا ہو۔ اب جو سُنا ہے کہ کینسر کا شکار ہوئے اور منہ موڑ گئے تو ——— جی نہیں مانتا۔ وہ بے نیاز تھے لیکن اس بے نیازی میں جو خلوص تھا جو محبّت کا اظہار تھا وہ اس خبر پر یقین نہیں کرنے دیتا۔ مجھے تو برابر یہ محسوس ہوتا ہے اور یہ ہیں بھی کل کی باتیں کہ ان کے دوستوں میں سے (اور شاید سب ہی ان کے دوست تھے) کوئی پہنچا ہے اور یہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں بیٹھے بیٹھے کہہ رہے ہیں ...... یوسف آئے ہیں ان کے لئے چائے لاؤ اور ہاں پانوں کے لئے بھی کہہ دو ..... رام پور کے آزادی پسند بزرگوں، دوستوں اور چھوٹوں کا ان کے مکان پر اجتماع ہے، رام پور کے سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل زیر بحث ہیں۔ کیا ہونا چاہیئے؟ کیا کرنا چاہیے؟ لوگ سر جوڑے غور کر رہے ہیں کہ اچھن صاحب کے کسی فقرے کسی لطیفے یا کسی مصرعے نے مجلس کی تھکا دینے والی سنجیدگی کو تھوڑی دیر کے لئے درہم برہم کر دیا۔ اور مجلس مسئلۂ زیر بحث پر سوچنے کے لئے تازہ دم ہو گئی۔ رام پور میونسپلٹی کا الیکشن درپیش ہے اور اچھن صاحب کا مکان مشورہ گاہ بنا ہوا ہے رام پور کی تعلیمی پس ماندگی اور خصوصیت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی کالج کا نہ ہونا ہم سب کے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے کہ اچھن صاحب کے یہاں کوچنگ کلاسز کا کھلنا طے پا گیا ہے جس کا اہتمام رام پور اکیڈیمی کے ذمے ہے اور ایم' اے تک کی تیاری کرانے کے لئے اعزازی کام کرنے والے بزرگ شہری رنے ہی سے نہیں بلکہ کارخانوں کے مشینی ماحول تک سے تلاش کر کے جمع کر لئے گئے ہیں۔ جگہ کا انتظام ہو گیا ہے۔ اچھن صاحب بھی بے گریبان کا ململ کا کُرتا اور ہلکے پھلکے چپل پہنے مغرب کے بعد پڑھانے جا رہے ہیں — کچھ ترقی پسند نوجوانوں کا اصرار ہے کہ رام پور کے مسائل میں ایم' این رائے سے بھی مدد لی جائے۔ اچھن صاحب دلّی جانے کے لئے تیار کر لئے گئے ہیں دلّی میں ایم' این رائے اچھن صاحب پر نظریں جمائے ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب لپٹ گئے۔ ہیں! تم ایم' این رائے! میں سوچ رہا تھا کہ یہ ذاتِ شریف کون ہوں گے، کیسے ہوں گے...... "۔ حکومت رام پور کے سامنے پیش کرنے کے لئے سیاسی مطالبے مرتّب ہو گئے ہیں اور اچھن صاحب دوسرے سیاسی رہنما ساتھیوں کے ہمراہ حکومت سے بات چیت کرنے جا رہے ہیں رام پور کی عام بے کاری دُور کرنے کے لئے ایک اقتصادی بورڈ بنانے کی تجویز حکومت رام پور نے قبول کر لی ہے۔ آج کل اچھن صاحب کے یہاں اس بورڈ کے لئے مناسب کام سوچے جا رہے ہیں ——— اس وقت ایک مخصوص صحبت ہے اور دارالصناعة کے نام سے ایک صنعتی ادارہ کھولنے اور اس میں ہونے والے کام اور اس میں تربیت کی ایک مکمل اسکیم زیرِ غور ہے ——— طے پا گیا ہے کہ رضا ٹیکسٹائل دو سو بچّوں کو تربیت دے گا۔ اس کے امیدواروں کی فہرست بن رہی ہے ——— شام کا وقت ہے چائے کا دَور

چل رہا ہے۔ رام پور کے خوش گو اور منتخب شاعروں کا مجمع ہے۔ منتخب اشعار سنائے جا رہے ہیں۔ اب میاں سے فرمائش ہو رہی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے بھی تحت اللفظ غزل شروع کر دی۔ اور یہ اساتذۂ فن جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں۔ اور ایک ایک شعر کو دو دو اور تین تین بار پڑھوا رہے ہیں —— رات کے دس بجے ہیں دو چار خوش ذوق نوجوان ساتھ ہیں اور میاں کہیں سڑک پر جا رہے ہیں۔ خاموشی طاری ہے کہ اکبر الہ آبادی کا ظریفانہ کلام بات چیت کا موضوع ہے۔ اچھن صاحب نے فرمایا کہ ان کا سنجیدہ کلام بھی کم با مزہ نہیں اور مثال کے طور پر شعر پر شعر سناتے چلے جا رہے ہیں کہ منزلِ مقصود آ گئی —— اس وقت مضطر خیرآبادی پر تبصرہ ہو رہا ہے اور ان کی شاعری پر بڑی شد و مد سے میاں گفتگو کر رہے ہیں —— رام پور کے پڑھے لکھے نوجوان بیٹھے ہیں اور میاں 'پروفیسر براؤن سے متعلق لطیفے بیان کر رہے ہیں' اسی وقت کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور منطقی پروفیسر جانسن اور ان کے شاگرد رسل مشہور فلسفی کا اپنے سامنے ایک دل چسپ مکالمہ نقل ہو رہا ہے —— علامہ اقبال کے ذکر میں میک ٹے گرٹ کا تذکرہ آ گیا ہے۔ فرما رہے ہیں کہ وہ ہمارے بھی بہت شفیق اُستاد تھے —— ہم کہہ رہے ہیں کہ فلاں صاحب آج کہتے تھے کہ "انگلستان میں اچھن صاحب تو شاہانہ رہتے تھے اور یونیورسٹی کو ممنون کرنے کے لئے کبھی کبھی کالج بھی آ جاتے تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہاں کے پروفیسر اچھن صاحب کا بہت خیال کرتے تھے" فرمانے لگے "تو کیا پھر ان کا خیال کرتے؟" —— دوپہر کا وقت ہے جامعہ والے چودھری اکبر علی مرحوم سکریٹری تعلیمات آ گئے ہیں۔ چائے پی جا رہی ہے اکبر علی مرحوم انگریزی نظم کے اعلیٰ نمونے اپنے حافظے کی مدد سے گھنٹہ بھر سنا کر خاموش ہوئے ہیں کہ اچھن صاحب نے انگریزی مختصر مضمون نگاری کا تذکرہ کر دیا اور اب انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونوں کے ٹکڑے نام بنام سنانا شروع کر دئیے۔ اب یہ سلسلہ کہیں دو ڈیڑھ گھنٹے میں چودھری صاحب مرحوم کی جانب سے اچھن صاحب کے غیر معمولی حافظے کی داد پر ختم ہو رہا ہے —— دوپہر کے کھانے پہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اچھن صاحب زنانے میں ہیں۔ اچھن صاحب کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ اچھن صاحب ہمارے ہاں کے

معتقف بھی تو ہیں (ہم لوگ تعجب سے) کیا سچ؟ ہاں! ہاں! انھوں نے اپنے لئے "اٹلی" انتخاب کی تھی اور مجھے اس پر مقدمہ لکھنا تھا۔ واقعی کیا ان کی کوئی کتاب موجود ہے؟ حضرت اندر سے آ جائیں تو ان کے سامنے پوچھنا —— آج کل لاہور کے اورنٹیل کالج کے مرحوم پروفیسر اقبال کا خط آیا ہوا ہے۔ اسٹیٹ لائبریری میں کچھ کام کرنا ہے۔ ایک مقررہ تاریخ تک اپنے آنے کے متعلق ...... اچھن صاحب کے جواب کا انتظار کریں گے۔ اچھن صاحب ان کے ٹھہرانے کے انتظاموں میں منہمک ہیں۔ قریب قریب ڈیڑھ صد روپے کا سامان خرید لیا ہے ان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں فرماتے ہیں کہ بھائی میں تو لکھ رہا ہوں کہ اگر اچھی جگہ ٹھہرنا چاہو تو ریاست کے مہمان ہو اور اگر اچھا کھانا چاہتے ہو اور اچھے لوگوں سے ملنا چاہتے ہو تو میرے گھر آ جاؤ۔ ہر صبح کو خط لکھنے کے عزم کو تازہ کر لیا جاتا ہے تا آں کہ مقررہ تاریخ آ گئی اور ان کے کسی آنے جانے والے نے اب ارجنٹ تار دینے کی ذمہ داری ان پہ ڈالنا مناسب نہ سمجھی اور خود تار دے دیا۔ اب ان کی مہمانی ہو رہی ہے کہ اسی زمانے میں پٹنے کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب کو اچھن صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے مہینہ بھر سے زائد ہو گیا ہے شہر کے باذوق حضرات آ رہے ہیں اور علمی مجلسیں منعقد ہیں اچھن صاحب فرما رہے ہیں کہ ہمارے قاضی صاحب ہمیشہ سے ٹی بی میں مبتلا ہیں ماشاءاللہ ان کا ڈیل ڈول تو دیکھو قاضی جی شہر کے غم میں دُبلے ہو گئے ہیں —— کلکتہ یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے کے ہیڈ اور مدرسہ عالیہ رام پور کے پُرانے فارغ التحصیل ڈاکٹر زبیر مہمان ہیں اور خواجہ عبدالمجید کے نام کے سلسلے میں جرمنی کا لطیفہ پیش ہو رہا ہے اور ہم سب لطف لے رہے ہیں —— ریاست کی طرف سے رضا اکیڈیمی کے افتتاح کی تقریب نہایت شان دار طریقے سے منائی جا رہی ہے۔ مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی اسی تقریب کے سلسلے میں اچھن صاحب کے یہاں آ گئے ہیں شہر کے علما اور پڑھے لکھے حضرات کا مجمع ہے، احمد علی شوق قدوائی کے داماد معین الدین انصاری چیف جسٹس بشیر حسین زیدی صاحب کے فرستادہ سید صاحب کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا رہے ہیں کہ خاص باغ تشریف لے چلیے۔ وہ فرماتے ہیں۔ آپ اچھن صاحب سے کہیے۔ اچھن صاحب جواب دے رہے ہیں کہ آپ کہہ دیجیے کہ میری زندگی میں کبھی کبھار مسرت کے

کچھ مواقع نکل آتے ہیں انھیں تو آپ مجھ سے نہ چھینیں —— ابھی ابھی دروازے پر ایک کار رکی - ایک صاحب اچھن اچھن کہتے ہوئے آئے اور لپٹ گئے - بات چیت شروع ہو گئی - لوگ متعجب ہیں کہ اچھا یہ ہیں سید حسین صاحب ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما، مصر میں سفیر - رام پور آئے ہوئے تھے کہ اچھن صاحب کی والدہ مرحومہ کے انتقال کی خبر سنی تھی اس لئے برسم تعزیت آئے ہیں —— سیرت محمد علی شائع ہوئی ہے ایک نسخہ کوئی صاحب اچھن صاحب کے یہاں بھی لے آئے ہیں - ورق گردانی ہو رہی ہے کہ مولانا محمد علی کی ایک تصویر بھی سامنے آ گئی - نیچے لکھا ہوا ہے "تمہارا پرانا استاد، نیا دوست اور ہمیشہ کا بھائی محمد علی" کسی نے کہا یہ تصویر تو وہ ہے جو مولانا محمد علی نے آپ کو دی تھی - اچھن صاحب جواب دے رہے ہیں کہ ہاں جامعہ والوں نے مجھ سے مانگ لی ہے —— بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی - میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ اچھن صاحب کے سلسلے میں تعارف مجھے بڑا عجیب سا معلوم ہو رہا ہے اُن کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں - ان کی صورت میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے - ان کا چلنا پھرنا اور اس کی آہٹ جیسے میں دیکھ اور سن رہا ہوں - ان کے گھر کا ماحول اور ان کی مجلسوں کے رنگا رنگ نقشے دل و دماغ میں سمائے ہوئے ہیں اور یہ جان کر کہ سچ مچ ان کے بھی تعارف کی ضرورت ہے مجھے حیرت ہوتی ہے - کہنے کو گیارہ بارہ سال کل کی بات ہے لیکن یوں یہ اتنی بڑی مدت ہے کہ اچھن صاحب جیسی عوام و خواص میں مشہور اور ہر دل عزیز شخصیت کو بھی بھلا دینے کے لئے کافی ثابت ہوئی ہے - گزرا ہوا زمانہ کتنا مختصر معلوم ہوتا ہے اور اس سمٹے ہوئے وقفے میں کیسے بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں -

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مجھے اچھن صاحب کی شاگردی کے ساتھ ساتھ دس بارہ سال ان کی ہم نشینی کا بھی شرف حاصل رہا ہے - اس لئے مجھے ان کو سمجھنے کا بڑا اچھا موقع ملا اور اتفاق یہ کہ ان کے بہت سے پرانے ساتھیوں سے ملنے کا اور اچھن صاحب کے بارے میں ان کے خیالات سننے کا بھی اکثر اتفاق ہوا، اس لئے ان کے کردار کے جن گوشوں پر میں کچھ کہوں گا وہ بڑی حد تک میرا اپنا تجربہ ہوگا، اور ایسا تجربہ جس سے ان بزرگوں کو بھی اتفاق رہا ہے جنھیں ان کو سمجھنے کے کافی مواقع حاصل تھے -

صاحبزادہ واجد علی خاں صاحب واجد واشک عرف اچھن صاحب، مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی کے نہایت عزیز اور قابل شاگرد صاحبزادہ محمد علی خاں صاحب عرف چھٹن صاحب بہادر کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے - صاحبزادہ چھٹن صاحب صاحبزادہ کاظم علی خاں صاحب عرف چھوٹے صاحب ابن نواب محمد سعید خاں والیٔ رام پور کے سب سے بڑے لڑکے تھے - چھوٹے صاحب نواب یوسف علی خاں ناظم شاگرد غالب اور اردو کے مشہور صاحب طرز شاعر کے نہایت چہیتے بھائی تھے - بزرگوں سے سنا ہے کہ ریاست کا تمام کاروبار عملاً گویا انھیں سے متعلق تھا - ابتدا میں دلی کی بودوباش کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہیرو شاہزادہ فیروز شاہ سے لڑکپن کے تعلقات تھے، ان تعلقات کو چھوٹے صاحب نے اس طرح نبھایا کہ رام پور کے روہیلہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی مسلح جمعیت تیار کر کے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں فیروز شاہ کے ساتھ ہو کر روہیلوں کی مشہور جانبازی اور شمشیر زنی کے کرتب دکھائے - ہنگامے کے فرو ہونے پر یہ کسی نہ کسی طرح بچ کر رام پور آ گئے اور نواب یوسف علی خاں نے تدبیر سے اور اپنی وفاداریوں اور خدمت گزاریوں کی قیمت پر ان کو انگریزی حکومت کی داروگیر سے بچا لیا - چھوٹے صاحب اپنے بھتیجے نواب کلب علی خاں سے ایک واقعے کی بنا پر کشیدہ ہو کر بریلی چلے گئے - اور چونکہ چھٹن صاحب کا رشتہ نواب کلب علیخاں کی صاحبزادی سے طے پا گیا تھا اس لئے ان کو یہیں چھوڑ گئے - چنانچہ چھٹن صاحب کا پہلا عقد نواب کلب علیخاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوا - جب ان بیگم کا انتقال ہو گیا تو دوسرا عقد نواب یوسف علی خاں صاحب کی صاحبزادی سے ہوا - اچھن صاحب مرحوم انھیں دوسری بیگم صاحب کے بطن سے اواخر ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے -

اچھن صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی - قابل اتالیق مقرر کئے گئے - ان کے اُس زمانے کے خاص استادوں میں سب سے اہم نام مولانا محمد علی مرحوم کا بھی ہے - مولانا مرحوم اس ابتدائی تعلقات کی بنا پر ہمیشہ پدرانہ شفقت فرماتے تھے - غالباً ان کے اتالیقوں کے مشورے سے ہی ان کو پرانے جنرل عظیم الدین خاں میموریل ہائی اسکول، درمیانی گورنمنٹ ہائی اسکول اور جدید گورنمنٹ حامد اسکول میں داخل کر دیا گیا - مولانا محمد علی مرحوم بھی اسی اسکول کے طالب علم اور پھر ہیڈ ماسٹر تھے - غالباً اسی زمانے میں

نواب صاحب سے کچھ کشیدگی ہوگئی اور چھبّن صاحب نے کچھ دنوں کے لئے رام پور چھوڑ دیا اور مرادآباد رہنا شروع کر دیا۔ اس طرح اچھن صاحب تھوڑے دنوں مرادآباد رہے۔ عفو تقصیر پر یہ خاندان پھر رام پور آ گیا۔

اچھن صاحب غالباً ۱۹۱۳ء تک اسٹیٹ ہائی اسکول کے نہایت ہر دل عزیز طالب علم رہے۔ وہ اپنے زمانے کے فٹ بال کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں سمجھے جاتے تھے۔ اسکول کی ٹیم میں ان کا اہم مقام تھا۔ طلبا ان سے مانوس اور اساتذہ شفیق تھے اور اس میں خاندانی وجاہت اور گھر کی ریاست سے کہیں زیادہ اُن کے اپنے ذاتی عادات و خصائل کو دخل تھا۔ استادوں کی قدر و منزلت تو اُن کے والد بزرگوار کا ورثہ تھا لیکن وہ طلبہ اور خصوصیت سے ساتھیوں کی ہمدردی اور مدد میں کوئی کوتاہی نہ کرتے تھے۔

اچھن صاحب اوائل ۱۹۱۴ء میں انگلستان چلے گئے اور قریب قریب آٹھ سال تک کیمبرج کے مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہ رام پور سے اگرچہ انجینرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیجے گئے تھے لیکن وہاں وہ برابر اپنے مضامین بدلتے رہے لیکن ان کی دل چسپی کے خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات تھے۔ ابھی اچھن صاحب انگلستان ہی تھے کہ ان کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ پھر کچھ دنوں بعد ریاست نے ان کا تعلیمی وظیفہ بند کر دیا اور ایک معتد بہ رقم جو ان کے گھر سے جاتی تھی اس کا پہنچنا بھی بند ہوگیا۔ اور بقدرِ ضرورت رقم کے بغیر ان کے لئے انگلستان رہنا ناممکن ہوگیا اور وہ وہاں سے جرمنی چلے آئے۔ یہاں انھوں نے مضمون نگاری کو ذریعۂ معاش بنا کر برلن یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ جرمنی میں تقریباً چھ سال گذارے۔ وہ جرمنی میں ہی تھے کہ مولٰنا محمدؐ علی مرحوم کو ۱۹۲۰ء میں یورپ کا سفر درپیش آ گیا۔ اچھن صاحب کی والدہ کو مولٰنا کے اس ارادے کی خبر لگی تو مرحومہ نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے ساتھ ان کے اچھن کو ضرور لائیں گے۔ چنانچہ مولٰنا مرحوم نے اس وعدے کو اس طرح پورا کیا کہ برلن جا کر اچھن صاحب کو کسی کھیل کے میدان سے گرفتار کر لیا۔ اور ان کو ان کے رہائشی کمرے کی کنجی کے ساتھ ٹرکی، شام ہوتے ہوئے ہندوستان لاکر رام پور میں ان کی والدہ کے حوالے کر دیا۔ اس سفر میں اچھن صاحب کو عالمِ اسلامی کے اکابر سے ملنے کا اتفاق ہوا اور عصمت انونو اور مفتی امین الحسینی سے ملاقاتیں ہوئیں خصوصاً مؤخر الذکر سے بڑی دل چسپ اور مفید صحبتیں رہیں۔ عصمت انونو، مصطفیٰ کمال

اتاترک کے دستِ راست تھے مولٰنا محمدؐ علی کمال اتاترک سے ملنا چاہتے تھے۔ عصمت انونو نے غالباً مصطفیٰ کمال کی حسب منشا یہ عذر کیا کہ چونکہ آپ میں اور اتاترک میں نظریاتی اختلاف ہے اس لئے اس ملاقات سے بجز اس کے کہ اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہو کوئی فائدہ نہیں۔ مولٰنا کو انکارِ ملاقات سے بہت صدمہ ہوا اور وہ غصّے میں بھر گئے اور عصمت انونو سے کہہ آئے کہ آپ میری طرف سے اتاترک سے کہئے کہ انھوں نے ایسے شخص سے ملاقات پسند نہیں کی ہے جس نے ترکی کے لئے ہر ترک سے زیادہ کام کیا ہے۔ پھر میرے تربیت یافتہ جوانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مصطفیٰ کمال کی برابری کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ اپنے نصب العین میں کامیاب ہو گئے اور ہم ابھی تک ناکام ہیں لیکن اس کی وجہ ہندستان اور ترکی کے حالات کا فرق ہے لیڈروں کی نااہلیت نہیں۔

اچھن صاحب رام پور میں نواب حامد علی خاں کے آخری عہد حکومت میں آگئے تھے اور وقتاً فوقتاً نواب صاحب کی خصوصی مجلسوں میں باریاب ہونے کا بھی موقع ملتا رہتا تھا لیکن اس زمانے میں انھیں ریاست کی خدمت کا موقع میسّر نہ ہوا اور یہ بھی واقعہ تھا کہ یہ تازہ وارد رام پوری مشرقی درباداری کے اصول سے کچھ زیادہ واقف بھی نہ تھا اور مغرب کی حرّیت پسند فضا نے دل و دماغ میں ”بجا“ اور ”حضور“ کے لئے کچھ بہت زیادہ گنجائش بھی نہ چھوڑی تھی چنانچہ نواب صاحب بھی ان کو کسی اہم عہدے کے لئے کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے، بلکہ بعض موقعوں پر ان کی موجودگی میں وہ اپنے اس پُرانے خیال کو بھی دہرا دیتے تھے کہ نئی تعلیم لڑکوں کو بدتمیز بنا دیتی ہے جس کا مقصد غالباً اچھن صاحب کو اُن کے کسی خلاف مزاج عمل پر تنبیہ کرنا ہوتا تھا تاہم اس زمانے میں موجودہ اعلیٰ حضرت سے ان کے تعلقات برابر بڑھتے رہے۔

۱۹۳۰ء میں موجودہ نواب صاحب تخت نشین ہوئے اور اچھن صاحب کو پہلی مرتبہ ریاست کی خدمت کرنے کا موقع ملا اور آپ پرائیویٹ سیکرٹری کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ رام پور میں اب تک پُرانے انداز کے عمّال برسرِ اقتدار تھے۔ اچھن صاحب کے ہی مشورے پر نئے اعلیٰ تعلیم یافتہ حکّام اعلیٰ عہدوں پر مقرر ہونے شروع ہوئے۔ اچھن صاحب نے اس موقع پر اپنے دوستوں کو فراموش نہیں کیا چنانچہ اعلیٰ حکّام میں زیادہ تر ان کے ہی احباب کو موقع ملا لیکن افسوس کہ ان کے احباب نے ان کے غیر معمولی اثر اور رسوخ کو اپنے لئے

کچھ زیادہ مفید نہیں جانا اور خود بھی وہ اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے مشرقی روٴساء کی درباروادی کے زیادہ اہل ثابت نہ ہوئے اور ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں تا ایں کہ انھیں ملازمت چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اعلیٰحضرت اپنی خاص ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ دلّی کے اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تو اچھن صاحب نہایت خوشی سے خفیہ طور پر گاڑی سے اُتر گئے اور جامعہ ملیہ آ گئے۔ کچھ دنوں وہاں اپنے احباب کے ساتھ رہے۔ تھوڑے دنوں میں طبیعت اُچاٹ ہوگئی اور دلی سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوگئے اور کسی جرمن بیمہ کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ کمپنی کا کام بڑی محنت اور جانفشانی سے کیا اور کمپنی کے ہندستانی بیٹا ئنس کے سب سے بڑے سربراہوں میں شمار کئے جانے لگے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ حیدرآباد میں انھوں نے اپنی مغربی معاشرت کے ساتھ نوابوں کی سی زندگی بسر کی لیکن کچھ دنوں کے بعد اس زندگی سے بھی اکتا گئے اور لاکھوں روپیوں کے سامان سے آراستہ کوٹھی کو خیر باد کہہ کر خالی ہاتھ وہاں سے پھر رام پور آ گئے۔ اب اچھن صاحب کی زندگی نے ایک بالکل نیا پلٹا کھایا اور مغربی معاشرت اور اس میں پرورش پانے والی عادتوں سے نفرت ہوگئی اور انھوں نے صوفیانہ انداز پر مشرقی طرز کی زندگی بسر کرنی شروع کر دی اور ان کے ایک پُرانے دوست ڈاکٹر نظام الدین صاحب سیکریٹری دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اس زمانے میں انھیں پیغام بھیجا تھا کہ پیرا پہلے بھی تمھارے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اب پھر تمھارے ہی ہاتھ پر بیعت کروں گا۔

رام پور میں کچھ دنوں گمنام زندگی بسر کی یہ زمانہ ۳۴-۱۹۳۵ء کا تھا۔ اہلِ رام پور کو اپنی کس مپرسی اور اقتصادی اور تعلیمی پستی کا احساس ہو چلا تھا۔ کچھ بزرگ حقوق و اصلاحات کے لئے جدوجہد کی ابتدا کر چکے تھے اور تحریک عوامی رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ اچھن صاحب بھی ان تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے ابتداً رام پوری مصنوعات کے استعمال کی تحریک شروع کی اور پھر عوامی تحریکوں میں آزادانہ شامل ہوگئے اور ان میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا۔ غالباً ۳۷-۱۹۳۸ء میں عوامی مطالبے کے تحت اچھن صاحب پھر ریاست کی ملازمت میں بحیثیت سیکریٹری صنعت و حرفت لے لئے گئے۔

اس زمانے میں انھوں نے عوامی نقطۂ نظر سے رعایائے رام پور کی نہایت اہم اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ رام پور کا دارالصناع اس وقت تک رام پور میں اپنے اس بانی کی یاد دلا رہا ہے۔ ہمارے پُرانے مشرقی درباروں کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ عوامی نقطۂ نظر اور عوامی ہر دل عزیزی ان میں متاعِ کاسد سمجھی جاتی تھی پھر ان میں اپنے بااختیار حریفوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی بھی اہلیت نہ تھی ان کی نفرت اور مقاومت، آشتی اور سپردگی کے پردوں میں بھی جھلک پڑتی تھی چناں چہ ان کو ایک بار پھر ملازمت کو ٹھکرانا پڑا اور وہ بھی ہمیشہ کے لئے۔

ملازمت کا سلسلہ توڑنے کے بعد کچھ زمانے تک رام پور رہے۔ قادری خاندان میں باپ کے ورثے کے طور پر وہ بغداد کی درگاہِ قادری کے سجادہ صاحب کے مرید پہلے سے ہی تھے اور نئی زندگی میں یہ پُرانا ورثہ ذاتی عقیدت کا بھی مرکز بن گیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں قادری سلسلے کے مشہور بزرگ گولڑے کے پیر صاحب کی رام پور میں اپنے حلقۂ ارادت میں آمد و رفت شروع ہوئی اور اچھن صاحب سے پہلے تعارف اور پھر تعلق پیدا ہوگیا۔ پیر صاحب اچھن صاحب سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کو گولڑے رہنے پر آمادہ کر لیا اور اچھن صاحب نے خالی ہاتھوں ہمیشہ کے لئے جلا وطنی اختیار کر لی اور اُن کو وہ رام پور چھوڑنا پڑ گیا جس کے چپّے چپّے پر ان کے باپ دادا کی عظمتوں کے نشان تھے اور جس کے ذرّے ذرّے سے انھیں والہانہ محبّت تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک تقسیم نہ ہوا تھا اور ہندستان یا پاکستان نام کے خطوں سے لوگوں کے کان آشنا نہ ہوئے تھے۔

انھوں نے قریب قریب گیارہ بارہ سال گولڑے اور راول پنڈی میں گزارے اور غالباً گمنامی کے ساتھ اور از سرِ نو ایک چھوٹا سا گھر بنا کر اس کو آباد کیا۔ رام پور میں ان سے بہت سے تعلق رکھنے والوں کے دل میں پاکستان جانے کی تمنّا چٹکیاں لیا کرتی تھی اور صرف اس لئے کہ اچھن صاحب کی ہمنشینی کا ایک بار پھر لطف حاصل کر سکیں۔ اس تمنا کو برآنا نصیب نہ ہوا تھا کہ اہلِ رامپور نے ۲۸ اگست ۱۹۵۸ء کو جمعرات کی شب پاکستان ریڈیو سے اچھن صاحب سے دائمی مفارقت کا اعلان سُنا جس کو صبح کے ناظمِ مقامی اخبار نے پورے شہر میں عام کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

اچھن صاحب کی ۶۵-۶۶ سالہ زندگی کا یہ مختصر اور بالکل سادہ خاکہ ہے۔ اس خاکے یا نقشے میں بہت بڑے بڑے خلئے ہیں اور ہر خانے میں

بھرنے کے لئے گوناگوں واقعات اور نوع بہ نوع حالات کا ایک وافر مجموعہ ہے اور آج بہت سے چھوٹے اور بڑے موجود ہیں جو اُن واقعات اور حالات کے عینی شاہد ہیں۔ جہاں تک قیامِ رام پور کے آخری دَور کا تعلق ہے اکثر اور اہم واقعات میرے سامنے گے ہیں۔ میں نے قصداً تفصیلات کو چھوڑ دیا ہے اس لئے بھی کہ وہ ہم سب کے سامنے کی باتیں ہیں اس لئے بھی کہ اس مختصر مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اچھن صاحب کی یہ مختصر زندگی کتنی گوناگوں، کتنی دلچسپ، کتنی پرعبرت اور کتنے متضاد عناصر کو سمیٹے ہوئے تھی اس کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو اُن کی رفاقت میسّر ہوئی ہے۔ ان میں تلوّن بھی تھا اور استقلال بھی۔ ان کا ذوق بھی بدلتا رہتا تھا اور رفقاء بھی، لیکن جس سے جس انداز کا تعلق تھا اس میں وہ کسی تبدیلی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے فیصلے اکثر وقتی جذبات کے مرہون ہوتے تھے لیکن کوئی طاقت ان کے کسی فیصلے پر اُن سے نظرثانی نہیں کرا سکتی تھی۔ ان میں اس قدر لوچ اور نرمی تھی کہ ان کے دشمن بھی اُن سے فائدہ اُٹھا لیتے تھے۔ وہ ہمہ وقت انجمن تھے۔ مجلس پسندی ان کی طبیعت تھی لیکن جب کبھی گوشہ گیری اختیار کرتے تو ان کا عزیز ترین دوست بھی اس میں خلل انداز نہ ہو سکتا تھا۔ ان کی ضرورتوں کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن وہ جب کبھی انھیں مختصر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ انھیں کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے انھوں نے لاکھوں روپے صرف کئے اور پوری مسرّت اور بھرپور طمانیت کے ساتھ فقیرانہ زندگی کو بھی خوش آمدید کہا۔ وہ غیر معمولی جری تھے اور کبھی توہمات سے خائف نظر آتے تھے۔ وہ غیر معمولی محتاط معلوم ہوتے تھے لیکن اُسی لمحے محسوس ہوتا تھا کہ انھوں نے احتیاط کرنا سیکھا ہی نہیں ہے۔ وہ بہت بامروّت نرم خو تھے۔ لیکن کتنا ہی سینے میں اتر جانے والا طنز ہو اگر لطیف فقرے کے غلاف میں ان کے دماغ میں آ جائے تو پھر وہ اس کو روک نہیں سکتے تھے۔ ان میں بے نیازی تھی، بے پروائی تھی جن کی حدیں مقرر کرنا آسان نہ تھا۔ وہ مستقبل کے بارے میں کبھی نہیں سوچتے تھے۔ ان میں ماضی کو بھلا دینے کی غیر معمولی طاقت تھی۔ ان کا ماضی ان سے سننا قریب قریب ناممکن تھا۔ وہ جو کچھ تھے فقط حال تھے۔ وہ فراخ دست تھے تو فراخ دست اور تنگ دست تھے تو تنگ دست۔ فراخ دستی پر فخر یا تنگ دستی کی شکایت ان کی طبیعت کے خلاف تھی۔ خوانِ شاہی اور سفرۂ درویشی دونوں سے وہ یکساں مسرّت و اطمینان حاصل کرتے تھے۔ نوکروں چاکروں کے جمگھٹے میں جس طرح خوش رہتے تھے، بغیر پیش خدمت دوستوں کو اپنے ہاتھ سے چلمیں بھر کر حقّے پیش کرنے میں بھی انھیں وہی انبساط ہوتا تھا۔ وہ حنفی المذہب ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی منش بھی تھے اور روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ توہم پسند بھی۔ کٹرپن کے ساتھ وہ آزاد منش بھی تھے۔ شاعر تو بہت اچھے تھے ہی لیکن ماہر نقاد بھی تھے۔ فلسفہ ان کا مضمون تھا اور ادب ان کا دلچسپ موضوع۔ غرض یہ کہ وہ اتنے کچھ تھے کہ ہر شخص کے لئے وہ سب کچھ ہونا شاید آسان نہیں۔ ان کی زندگی مشرقی اشرافیت اور مغربی بھلمنساہت کا نہایت دلکش نمونہ تھی۔

اچھن صاحب کی زندگی کا ہر چکر ان کا اپنا کھایا ہوا تھا اور جب چاہتے تھے اس کو نئے رُخ پر پھیر دیتے تھے اور سخت سے سخت انداز کو اپنا لیتے تھے۔ زمانے نے ان کو اتنے زیادہ اور اتنے بڑے موقع دئے اور بار بار دئے لیکن انھوں نے ہر موقع کو کمال استغناء سے ٹھکرا دیا بلکہ بنی ہوئی زندگی کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑا۔ ان کا حلقۂ تعارف نہیں بلکہ دائرۂ احباب نہایت وسیع اور گوناگوں تھا۔ اس میں علماء بھی تھے اور مولوی بھی، پنڈت بھی اور سادھو بھی، پروفیسر، ڈاکٹر، سیاسی، اقتصادی، حکومت کے اعلیٰ حکّام اور عوام کے لیڈر، بازاری اور خواص سب میں ان کے عزیز دوست تھے پہلی جنگِ عظیم کے بعد عظیم ہندستان میں جو شخصیتیں اُبھر آئیں، ان میں سے اکثر سے ان کے تعلقات تھے اور بہت مخلصانہ۔ ہندستان کا شاید ہی کوئی ایسا شہر یا قصبہ ہو جہاں ان کے بااثر و رسوخ احباب ان کو سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن انھوں نے کسی سے فائدہ اٹھانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی اور اپنی قلندری پر حرف نہ آنے دیا۔

اچھن صاحب کے کم دوست ہوں گے جنھیں ان سے پوری طرح واقف نہ ہونے کے باعث شکایتیں نہ پیدا ہوئی ہوں لیکن سب ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی طرف سے خود ہی اعتذار تلاش کر کے ان کو بے قصور سمجھ لیتے تھے۔ وہ ہر دل عزیز تھے اور مخاطب پر چھا جاتے تھے۔ لوگ ہمیشہ ان کی صحبت کے متمنی رہتے تھے۔ ان کے ساتھ مختصر سی ہم نشینی کی یاد مدتوں تازہ رہتی تھی۔

مرحوم نہایت ذہین اور طبّاع تھے۔ حافظہ قوی اور تیز تھا۔ جفاکشی اور محنت میں کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن ان کی بے چین طبیعت نے

ان کو کسی پہلو چین نہ دیا ۔ کہنے والے کہتے تھے کہ وہ انگریزی کے بہترین انشا پرداز تھے ۔ ان کا کیمرج لہجہ بھی اچھی خاصی شہرت رکھتا تھا ۔ جرمن زبان میں تقریر و تحریر کی قدرت کے ساتھ اس کے ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی ۔ ان کی اردو بول چال نرم، شستہ، مستند، بے تکلف اور دل کش تھی ۔ اردو نثر نگاری میں وہ کم مایہ نہ تھے ۔ ترجمے کی لیاقت غیر معمولی تھی ۔ وہ اردو غزل کے بہترین نبض شناس اور شیدائی تھے ۔ اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے تھے اور اس صنف شاعری میں ان کا مقابلہ کسی معاصر کے لئے آسان نہ تھا ۔ وہ اپنے لطیف محسوسات کو شعروں میں ڈھالتے تھے اور زبان و بیان کی تمام لطافتیں اور نزاکتیں اس میں بھر دیتے تھے ۔ سننے والا ایک طرف اُن کے داخلی تجربے کو اپنے آپ میں محسوس کرنے لگتا تھا ۔ دوسری طرف ان کی مرصع سازی پر عش عش کرتا تھا ۔ وہ دلی مکتب کے شاعر تھے تاہم اگر لکھنوی انداز اختیار کرتے تو اس میں بھی دلی کی داخلیت کو اس طرح کھپا دیتے تھے کہ صنعت گری کا وہم بھی نہیں گزرتا تھا ۔ تناسب ان کی محبوب صنعت تھی لیکن تکلف کا گمان بھی نہ ہوتا تھا ۔ ان کے الفاظ نازک، ترکیبیں شگفتہ، طرز ادا میں لوچ اور بانکپن تھا ۔ حسرت، یاس، درد اور ایک طرح کا حسین پندار یہ اُن کے اپنے مضمون تھے ۔

قدرت نے اجین صاحب کو غیر معمولی عطیوں سے نوازا تھا، لیکن افسوس کہ انھوں نے ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا ۔ آج اُن کی واحد یادگار ان کی غزلیں ہیں اور وہ بھی منتشر، گم گشتہ اور آوارہ ۔ اس جنسِ گراں مایہ کو دوسروں نے بھی اپنایا ہے اور شاید آئندہ بھی اپنائیں ۔ اگر ان کے احباب ان کو فراہم کر کے کبھی شائع کر سکے تو غالباً اردو کی غزلیہ شاعری کے لئے یہ رام پور کا نہایت بیش قیمت ارمغان ہوگا اور شاید ان کے نام کو بھی اگلی نسلوں کے لئے محفوظ کر دے گا ۔

تبرکات اشک مرحوم

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہگزر کہیں — پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے — میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں

اہلِ وطن کے دل میں نہیں گھر تو کیا ہوا — عمرِ رواں گزر رہی ہے دنیا میں ہر کہیں

بزدلی کا ساتھ خوب دیا ہمدموں نے آہ — دل سے بنا بنا کے اِدھر اُدھر کہیں

جب ہم خیالِ ساغر و مے لا کے رہ گئے — بادل اُٹھے، بلند ہوئے چھا کے رہ گئے

اک وہ کہ خود بلائے گئے بزمِ ناز میں — اک ہم کہ اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے

اب اس کا کیا علاج کہ اے مرگِ ناگہاں — ارمان دل میں اس ستم آرا کے رہ گئے

آئی بھی، اللہ گزر بھی گئی رنج کی گھڑی — لیکن سلوک یاد احباب کے رہ گئے

ادا تھی، ناز تھا، شوخی تھی مسکرانا تھا — غرض شریک مرے قتل میں زمانا تھا

اُن کا وہ دورِ جوانی، ان کی وہ کافر نگاہ — جس طرف آنکھ اُٹھ گئی وہ مے آ گئی جام آ گیا

بے رُکے وہ جو ادھر سے گزرے — تیر پہ تیر جگر سے گزرے

ہم خدا جانے کہاں راہ تکیں — وہ خدا جانے کدھر سے گزرے

خیر ہو اہلِ چمن کی یا رب — چند اڑتے ہوئے پر سے گزرے

غمِ دوراں ہی بہت کافی تھا — آپ کیوں میری نظر سے گزرے

بات میں بات اسی کی ہے سنو تم جس کی — یوں تو کہنے کو سبھی منہ میں زباں رکھتے ہیں

پھول بھی منہ سے جھڑیں بات بھی کانٹے کی رہے — یہ ادا اور سخن ساز کہاں رکھتے ہیں

جلاتی ہے دل اور بھی سمد مہری — پھر اس سے تمھاری جفا ہی بھلی ہے

جو خوں آلودہ پیکاں ہو نکالو میرے سینے سے — جو خوں آلودہ حسرت ہو وہ تیر دل ہی میں رہنے دو

جیتے جی محروم کیوں نغمے سے دل کا ساز ہو — ٹوٹتے تارِ نفس تو ہی کہ کچھ آواز ہو

حالتِ زخمِ دروں دیکھئے دل میں آ کر — چشمِ خونبار تو اک منظرِ بیرونی ہے

خوفِ رنجش نہ کچھ اندیشۂ بیداد آیا — لکھ دیا خط میں انھیں وقت پہ جو یاد آیا

خامیٔ وحشت نہ کر زنداں میں آ نا شرمسار — سر نہیں اُٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

کب کا سوتا ہوا دل جاگ اُٹھا — اک صدائے کفِ پا سے تیری
ہم نے ہر حال میں، اے بانیٔ شر — خیر چاہی ہے خدا سے تیری

کس کی شراب، اے شیخ ذرا ہوش کی پیئے — مے خانہ ان کے دورِ جوانی کا نام ہے

نگاہوں میں اٹھنے کی طاقت نہیں ہے — اب آجاؤ وقتِ ندامت نہیں ہے

نگاہوں سے ہی غائب ہو گیا کوئی تو ہوش آیا
کہ ان کم بخت ہاتھوں سے وہ دامن دور ہی کیا تھا

ہوا خواہیٔ گل کا ثمرہ تو دیکھو — جھکولے ہی کھاتا رہا آشیانہ

ہر سانس میں ہے موت کا کھٹکا لگا ہوا — گویا قدم قدم پہ مسافر کو شام ہے

یہ پتیاں، یہ پھول، یہ غنچے یہ خار کیا
جب تک نہ دو دلوں میں پھوٹ کے چھالے، بہار کیا

نکل بھی آیئے پردے سے باہر — زمانے میں کسے مرنا نہیں ہے

(مرسلہ۔ عبدالمجید حیرت)

سحر رام پوری

غزل

پینا نہ چاہیئے تھے جو آنسو، مگر پیے — ایسے ہی کچھ تھے عام نگاہوں کے زاویے
اے غیرتِ حیات کچھ احساس چاہیے — زندوں کی مجلسوں میں ہیں زندوں کے مرثیے
اس دل کے واسطے بھی کوئی آنکھ نم ہوئی — پھولوں نے اپنے داغ تو شبنم سے دھو لیے
اپنی طرح اُنھیں بھی جو دیکھا، تو ذہن میں — جیسے کسی نے سیکڑوں نشتر چبھو دیے
اب آپ کے جنوں کی غزل سے بھی ہے بعید — مُنہ دیکھتے رہیں غمِ دوراں کے قافیے
نوعیتِ ستم بھی نہیں ایک سی، کہ ہے — 'کچھ' بھول کے لئے 'تو بہت' یاد کے لیے
پہنچیں گے منزلوں کے سندیسے یہیں کہیں — بجھ بجھ کے جل رہے ہیں جہاں نت نئے دیے
حالانکہ چاک چاک گریباں ہے زندگی — یہ کون سا جنوں ہے، کہ بیٹھے ہیں لب سیے

ہے گردشِ جہاں بھی اسی سوچ میں سحرؔ
اب تک، اور ایسے دور میں، ہم کس طرح جیے

عبدالمجید حیرت

کبھی اور ابھی

کبھی

ہم بھی ہوں گے خراب حال کبھی　　کس کو آیا تھا یہ خیال کبھی

کیا خبر تھی کہ کھائیں گے وہ زخم　　جس کا ہوگا نہ اندمال کبھی

دوستو، کب کسی نے دیکھے تھے　　ایسے تاریک ماہ و سال کبھی

دور ایسا نہ تھا کبھی دشوار　　زیست ایسی نہ تھی محال کبھی

نہ ملی قید و بندِ غم سے نجات　　نہ ہوا حل یہی سوال کبھی

وائے قسمت کہ دور ہیں وہ بھی　　تھے جو اپنے شریکِ حال کبھی

اُن سے، اور اُن کے ہم نشینوں سے　　تھی ہماری بھی بول چال کبھی

اب وہ رندانِ پاکباز کہاں　　آپ تھے اپنی جو مثال کبھی

کون سا وہ کمال ہے حیرتؔ
جس پہ آیا نہ ہو زوال کبھی

ابھی

دور ہے جن سے دورِ جام ابھی　　لے رہے ہیں خدا کا نام ابھی

سامنے اور بھی ہیں کام ابھی　　جن کا کرنا ہے اہتمام ابھی

یوں پریشاں کرے نہ خلق اُنھیں　　کر رہے ہیں وہ انتظام ابھی

کچھ تو تڑپے گا، کچھ تو پھڑکے گا　　صید آیا ہے زیرِ دام ابھی

رہرووں کو جہاں پہنچنا ہے　　ہے بہت دور وہ مقام ابھی

وہ بھی ہو جائیں گے کبھی پورے　　ہیں فسانے جو ناتمام ابھی

اُن کی اصلاح بھی ضروری ہے　　ہیں خیالات جن کے خام ابھی

خیر، کچھ اُن سے رسم و راہ تو ہے　　نہ سہی نامہ و پیام ابھی

یہ ہمیں ہیں کہ مہملات کا بھی　　کیے جاتے ہیں احترام ابھی

کتنے دلدادگانِ بادہ و جام　　ہیں بدستور تشنہ کام ابھی

ہم سحر ہی سے خوش نہیں حیرتؔ
اور آئی نہیں ہے شام ابھی

رشید احمد صدیقی

کُندن

کُندن مرگیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کُندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا معلوم نہیں کب سے، کم و بیش ۳۰ - ۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائے گا یا گھنٹہ بجانے سے باز آجائے گا!

طالب علمی کا زمانہ ختم کرکے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدّت ملازمت ختم کی۔ یونیورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا۔ گھنٹے کی آواز روزمرہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آرہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا!

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کُندن مرگیا۔ ایک دھچکا سا لگا۔ آہ کُندن مرگیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسبِ معمول یہی سمجھتا رہا کہ کُندن بجا رہا ہے۔ بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کُندن مرگیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدّت سے متاثر ہوں، نظامِ فطرت میں اس سے زیادہ ناقابلِ التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظامِ فطرت کے متاثر نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں باقی "تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی!"

کُندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آجاتیں۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف امیر غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اس طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء "ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن!" ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلتا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقررہ وقفے کے بعد کُندن گھنٹہ بجاتا۔ وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آجاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کُندن کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لئے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لئے۔ ہمیشہ جواب دیتا، حضور فلاں گھنٹہ، چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلّم ہو یا کلرک۔ اس کے حضور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنّع کی گراوٹ نہیں!

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شئے نہیں۔ اس ۳۰ - ۳۵ سال میں ہم سے قریب، ہم سے دور، ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاذوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں

سیٹیوں ۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کُنذن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا ۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا ۔ لیکن ہوا وہی جو بالآخر ہو کر رہتا ہے ۔ کُنذن مرگیا ۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا ' ذ زہد سمجھو تو ئی یا ز فسق سمجھو منی' ! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزوری کی مانی جائے گی !

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا ۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا ۔ کُنذن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹیننٹ اور کوارٹرنگ (یکی پی پارک) کے سارے بہتروں کا کمپنی کمانڈر مقرر کیا اور کچھیرا (ایک بڈھا بہتر) کو لانس کارپورل Lance corporal ۔ خواص میں یہ کمپنی Mirza Akhtar Hussain's Own Fussiliers (مرزا اختر حسین اون فوسیلیرس) کے لقب سے اور عوام میں کُنذن کی سفر مینا Sappers & Miners کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونیورسٹی میں مرزا صاحب، کُنذن اور یہ سفر مینا پلٹن ایک دوسرے سے جُدا یا دور نہیں دیکھی گئی !

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے ۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے جن کے لئے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا ۔ لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے شریک ہوجانے کا امکان تھا اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرئے تو اس کے اونچے برامدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے ۔ کوٹ کی اوپری جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے ۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے بغل میں طرح طرح کی فائلیں اور کاغذ کے پلندے ۔ ڈیسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دئے یا پنسل سے نوٹ لکھ دئے ۔ زینے پر کُنذن، اس سے نیچے سڑک پر بہتروں کی سفر مینا " جاروب بدست و کھرپا در بغل " اٹینشن کھڑی ہوتی ۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لئے کوئی بنیا کھڑا ہوا اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں ۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کُنذن، سفر مینا کے ایک حصّہ کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہوجاتا دوسرا ڈیٹچ منٹ اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا !

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا ۔ یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلّموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا ۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے ۔ اس کا حساب کُنذن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے ۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کُنذن پر گرج رہے ہیں ۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف پی ڈالی تھی ۔ مرزا صاحب کُنذن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع کی ۔ اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائے گا ۔ مرزا صاحب کے حضور میں کُنذن کسی قدر شوخ تھا کہنے لگا ، حضور اطلاع کرتا تو پہلے ...... صاحب کے گھر والوں کو کرتا آپ کو کرنے سے کیا فائدہ تھا ! مرزا صاحب نے فوراً اس دوچہ پر بھی سُرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لئے یہ رعایت ہمیشہ کے لئے اُٹھالی ، چو از قومے یکے بے دانشی کرد !

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لئے ایک رعایت اور رکھی تھی ۔ ہر سال امتحان کی پُرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیاں بنائی جاتی تھیں ۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے حیطۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے ، ان کا موصوف نے منصب یا وظیفہ مقرر کر دیا تھا ۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابانِ اودھ کے ہاں وثیقہ دار ہوتے تھے اُسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دئے جاتے تھے ۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوسِ شاہی کا یوم تقریب ، دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور برسائی کا زمانہ قرار دیتے تھے ۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی علامت الٰہی زبیری کے عہدِ رجسٹراری تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ قصہ ختم ہوگیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہونچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کہ کیوں کندن مرزا صاحب کے حضور میں ہماری کارگذاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا، بجور بالکل ٹھیک ہے کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کندن کی عملداری میں سے گذرا۔ نئی کاپیوں کے لئے پرانی کاپیاں پھاڑی جا رہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا، بولا، بجور اب نوابی (نوابی) نہیں رہی، دوسری عملداری ہے! میں نے کہا کوئی بات نہیں، تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لئے نوابی زمانے والوں کے پاس آہی جایا کرو۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہوکر پٹنہ چلے گئے اور امتحانات کے لئے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آگیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے ان ہی میں سے ایک کندن تھا! تقریب کہیں ہو، کیسی ہی ہو، وقت کم ہو مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گذشتہ ۳۰-۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے!

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں 'صلائے عام' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور اتنے سے منتقر تھے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا برا اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی یا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کر لیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے!
یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اور ان کی ثبات همت و حواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں خورد و نوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے!

کسی شعبے یا شعبے کے کس کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کس حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آگئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اس کی خبر جتنی کندن کو تھی خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی، ان سب سے نپٹنے کے لئے کندن کی 'ایک شخصی وزارت' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہو سکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لئے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کئے جا سکیں، شکرگزاری کے موجب ہوں گے یہ خط لے کر کندن آجاتا۔ پوچھتا کندن کیسے ادھر آنکلے؟ بجور امتحان نے کرسی ڈسک چاہئیں، بھئی یہ تو ہمیشہ کا دھندا ہے اس میں ایسا پوچھنا کیا، میاں خاں (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اٹھوا لے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح سے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہئے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبے جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی بازار یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہوگیا یا کسی کو اغوا کر لیا گیا!

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہوکر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً

اتنے ہی اشخاص کے لئے عصرئیے یا چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسی گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے، چائے کے لئے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لئے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائے گا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازیگر کھلا! رات گئے تک یہ ہنگامۂ شعر و سخن برپا رہے گا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسبِ معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے!

جلالۃ الملک شاہ سعود اور اعلیٰحضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں ورود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا جس میں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالیشان عمارت کھڑی ہے یہیں اُن کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسبِ معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کرکے پلان کے مطابق ترتیب دینا کُندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیا کو حسبِ منشا میزوں پر چُن دینا دوسرے کُندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسبِ معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے اُن کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔

نشستوں کے لئے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کُندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلد اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح و سالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ نہ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہو تا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا نہتا پکا تعاون کُندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا کبھی بعض ممبرانِ اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا لوٹانے میں دقتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کُندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا۔ اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیئے۔ اس کہنے کو تو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ جتنا یا مال ہوتا تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی، لیکن مانگنے والا تو کُندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا اس کی کون نہ مانتا!

میرا خیال ہے کُندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسمِ خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوتِ حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جا سکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسا نہ ہو۔ کُندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلّم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری غیر سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کر دئے جاتے تھے۔ کُندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کُندن نے آکر بتایا کہ سائکل کوئی اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کُندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری گئی اور بس!

امتحان کی کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا۔ یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا جہاں کے گودام میں پارسلوں کی ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں

کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کُندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جاکر اسٹیشن پر ادھر اُدھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا، کبھی ٹالنا چاہا! بالآخر کُندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجۂ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آفریا چیلنج اُن کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جاکر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا۔ امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ ان میں سے کُندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے!

۱۹۴۷ء کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل غارتگری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوسی اور درندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کُندن کا مکان دودھ پور میں تھا جو یونیورسٹی سے بالکل ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی ہے۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کُندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا، پوچھتا کہو کُندن کب تک یہ خون خرابہ رہے گا، گاؤں میں کیا خبر ہے، کُندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو کہتا، حضور کالج پہ سید صاحب کی دُعا ہے۔ سب خیریت رہے گی، کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کُندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا۔ جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو 'سید صاحب' کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہو!

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کُندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کُندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دتی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لاکر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کُندن پر کب کیا گزری!

کُندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں، چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہئے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا!

عرصے کے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں یہ صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کُندن کو دودھ پور کا راج پر مکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کُندن چپکے چپکے راج پر مکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا حضور، یہ لڑکے ہیں نا جب چاہیں خود راج پر مکھ بن جائیں جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں' ان کا کیا!

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سیّد محمود اور سرسیّد کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھڑی ہے۔ ان میں سے ایک کُندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہوا، ادھر سے گزر ہوئے تو کُندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفسوں کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا، مزاج پوچھتا۔ کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجا لانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے میں سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں!

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کُنڈن کی عمر ایک خاص حد پر آ کر ٹھہر سی گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوی، شکل و صورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو!

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جُثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹدار آواز۔ چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کُنڈن بوڑھا ہوا اتنی محنت نہ کیا کر۔ تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی "ہم وہ کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے!"

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ، کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں، وکٹوریا گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰-۳۵ سال تک مسلسل کُنڈن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے!

ایک دن میں نے کہا کُنڈن تم اپنے اس بارہ ماسی یونیفارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور پر جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کیہ جانتے، ہم کون تھا۔ بولا میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمہارے سائے میں بسا ہوا ہے کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمہاری ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگ اور وہاں کی راجدھانیاں اُلٹ پلٹ ہوتی رہتیں!

آخر زمانے میں کُنڈن نے اپنے لئے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ "کالج کا نمک کھانے کا" ایک تصرّف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرتے کرانے یاد رکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس حرکت سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا!

کُنڈن کی منظر اور نگرانی میں سر سید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا۔ یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں۔ زندگی بھر وہ انھیں عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیا پڑا ہوگا۔ "کالج کا نمک کھانے" کا ایک اور اثر بھی ہے سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کُنڈن کب وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں! کُنڈن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا!

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بدن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کُنڈن ادھ مرا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ناقابلِ تسخیر کُنڈن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کُنڈن کو بچایا جا سکتا تھا!

کُنڈن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات اُمڈے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل پر بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے یا اُن سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج یا کل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو، کُنڈن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے۔ وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس

صورت حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے لیکن ان کو کیا کیجئے کہ جب تک ہم "گذشتہ سے پیوستہ" ہیں گذشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلے گی!

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابل فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ! اس پہ یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابلِ فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کنڈن کی تھی!

تاریخی دستاویزات کا تحفظ

ہمارے ملک میں بہت سی قدیم تاریخی دستاویزات افراد کے نجی قبضے میں ہیں۔ یہ دستاویزات ہماری نہایت قیمتی ثقافتی میراث ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کو سائنٹفک طریق پر محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہے نہ ہی وہاں قدیم دستاویزات کو مناسب طریق پر محفوظ رکھنے کی کوئی خاص پروا کی جاتی ہے۔ اس لئے بھارت کے قومی محافظ خانہ (نیشنل آرکائیوز) نے ایسے افراد سے اپیل کی ہے کہ وہ ان قیمتی دستاویزات کو محفوظ رکھنے میں امداد دیں جو بھارت کے ماضی پر روشنی ڈالتی ہیں تاکہ یہ ہمیشہ کے لئے برباد نہ ہو جائیں۔

بھارت کا نیشنل آرکائیوز (قومی محافظ خانہ) یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ جن لوگوں کے ذاتی قبضے میں قدیم دستاویزات، فرمان، نشان، پروانہ جات، سندیں اور تاریخی اہمیت کے نادر قلمی نسخے ہیں، ان سے تحفے کے طور پر یا قیمتاً خرید کر ان کو محفوظ کیا جائے۔ ان کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب تک یہ محکمہ دو ہزار سے زاید قلمی نسخے اور دستاویزات حاصل کر چکا ہے۔ پھر بھی قدیم دستاویزات کا بڑا بھاری ذخیرہ اب بھی لوگوں کے نجی قبضے میں ہے۔ نیشنل آرکائیوز ایسی قدیم دستاویزات "تحفتاً" قبول کرے گا اور اگر ان کے موجودہ مالکان اس امر کے خواہش مند ہوں تو ان مجموعوں کو ان کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ جو مالکان اپنی دستاویزات مفت دینے پر رضامند نہ ہوں نیشنل آرکائیوز ان کی قیمت ادا کرے گا بشرطیکہ مطلوبہ قیمت مناسب ہو۔ اگر مالکان اپنی دستاویزات مفت نہ دینا چاہتے ہوں اور نہ ہی ان کو فروخت کرنے پر آمادہ ہوں تو اگر محکمہ ہذا کو چند یوم کے لئے دستاویزات دے دی جائیں تو وہ ان کے مائیکروفلم عکس حاصل کرلے گا۔ اگر کوئی شخص اس خدشے کے زیر اثر اصل دستاویزات اُدھار دینے پہ تیار نہ ہو کہ ان کی دستاویزات محکمہ کو بھیجنے یا وہاں سے واپس آنے کے دوران میں گم نہ ہو جائیں تو بھی مالکان کے مکانات پر ان کے مائیکروفلم عکس تیار کرنے کے انتظامات کئے جا سکتے ہیں۔

شمیم کرہانی

غزل

جب تک نہ خوگرِ غمِ مہر و وفا تھے ہم
کچھ لذّتِ حیات سے ناآشنا تھے ہم

بیگانہ کر دیا تھا غمِ روزگار نے
ہم سے نہ وہ خفا تھے نہ اُن سے خفا تھے ہم

آوارہ گردِ عالمِ آشفتگی ہیں آج
کل رہگزارِ گُل میں رفیقِ صبا تھے ہم

تا دُور چل سکا نہ زمانہ ہمارے ساتھ
زود آشنا تھے لوگ تو دیر آشنا تھے ہم

کس سے کریں گلہ کہ جو غرقاب ہو گئی
اُس خوش نصیب ناؤ کے خود ناخدا تھے ہم

جھونکے خزاں کی گرم ہواؤں کے آئے ہیں
اُمیدوارِ آمدِ بادِ صبا تھے ہم

یارانِ سُست گام سے مجبور ہو گئے
ورنہ ہوائے شوق سے پوچھو کہ کیا تھے ہم

آزادیٔ مزاج کی پابستگی شمیم
گُلشن کی وُسعتوں میں اسیرِ صبا تھے ہم

حسرت سہروردی

ترووُلوّر

(تامل زبان کا ایک عظیم شاعر)

شاعری وہبی ہے اکتسابی نہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ شاعری جز ولیست از پیغمبری ہے۔ شاعر اپنی آنکھوں سے مستقبل کا مشاہدہ کرتا ہے کائنات کے تمام سربستہ راز شاعر کے سامنے از خود عریاں ہو جاتے ہیں۔ بڑا شاعر کسی قوم خطے یا جماعت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ ساری کائنات کا احاطہ کرتا ہے یہ تمام دلائل ترو وُلوّر پر صادق آتی ہیں۔

ترو، وُلوّر اس نام کے دو جزو ہیں۔ ترو تامل زبان کا لفظ ہے جس کے معنے مقدس کے ہیں اور وُلوّر جنوبی ہند کے ایک مخصوص طبقے کا نام ہے۔ اس شاعر کا نام اب تک نہیں معلوم ہو سکا ہے۔ یہ صرف اپنے طبقے کے نام کی مناسبت سے مشہور ہے۔ معتقدین نے ترو (یعنی مقدس) کا جزو بڑھا کر گویا اس کی عظمت کا اعتراف کیا اور یہ ترو وُلوّر کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

ترو ولوّر کے متعلق اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں۔ اب تک اس کے زمانے کا بھی تعین نہیں ہو سکا۔ نجی حالات اور ماحول کے متعلق بہت سی باتیں پردۂ خفا میں ہیں۔ تحقیقات جاری ہے شاید تامل زبان کے محقق مستقبل قریب میں ان امور پر روشنی ڈال سکیں گے۔

ترو ولوّر کی تصنیف ترو کورل (مقدس آواز) صرف تامل زبان ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی قدیم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے

جہاں تک روایتوں کا تعلق ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ یہ علاقہ مدراس ضلع مدورا میں پیدا ہوا۔ جو اس زمانے میں پانڈوؤں کا دارالخلافہ تھا۔ یہ آگے چل کر شہر مدراس کے قریب میلا پور میں ایک جُلاہے کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ جُلاہوں کے پیشے سے وُلوّر کو دلی رغبت تھی اور وہ اس پیشے کو دُنیا کے تمام پیشوں سے افضل سمجھتا تھا۔ اس کی علمی لیاقت کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس کا علم خداداد تھا۔ بظاہر وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا۔

نجی زندگی کے متعلق صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار تھی۔ بیوی کا نام "واسُوکی" تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی اور سنیاس اختیار کر لیا۔

اس کے زمانے کے متعلق مختلف آراء ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا زمانہ پیدائشِ حضرت مسیح کے بعد کا ہے، اور بعض لوگ اس کے زمانے کو پیدائشِ مسیح سے پہلے کا زمانہ بتلاتے ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اس کی پیدائش مسیح کے فوراً بعد کی تو ہے لیکن مسیح کے بعد جلد ہی یہ عالمِ وجود میں آیا۔ تامل زبان کی دو اور مشہور نظموں 'سلاپدیکارم' اور 'مَنی میکالئی' میں ترو کورل کے اقتباسات ملتے ہیں جو پیدائشِ مسیح کے فوراً بعد کی تصانیف ہیں۔

ترو وُلوّر سے متعلق تامل عوام میں بہت سے قصے مشہور ہیں جن میں زیادہ تر مبالغے کا پہلو نظر آتا ہے لیکن یہ سبق آموز ضرور ہیں۔ بیوی کے انتخاب کے متعلق جو قصہ مشہور ہے۔ اس کا یہاں پیش کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس قصے سے ترو ولوّر کے نجی زندگی کے تصور پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ترو ولور کے نزدیک ایک مشرقی عورت میں دو صفات کا ہونا لازمی ہے۔ سادگی اور شوہر کی اطاعت۔ ترو ولور کی خوشگوار ازدواجی زندگی کے قصے اطراف و اکناف میں اتنے مشہور ہو گئے تھے کہ لوگ اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے دُور دُور سے چلے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شخص نے ترو ولور سے کہا کہ میں شادی رچانا چاہتا ہوں۔ بیوی کے انتخاب کے متعلق نصیحت کیجیے۔ ترو ولور نے جواب دینے کے بجائے اسے چند دن اپنے گھر پر مہمان رکھ لیا۔ دوسرے دن صبح جب میزبان اور مہمان دونوں ناشتہ کر رہے تھے اور ترو ولور کی بیوی واسو کی کنوئیں سے پانی لے رہی تھی۔ ترو ولور نے اپنی بیوی سے کہا کہ چاول بہت گرم ہیں۔ بیوی نے فوراً ڈول چھوڑ دیا اور پنکھا جھلنے لگی۔ مہمان کو بڑا تعجب ہوا کہ ٹھنڈے چاول کو بیوی بغیر چوں و چرا ہوا دے رہی ہے۔ اس سے ترو ولور یہ بتانا چاہتا تھا کہ بیوی کو چاہیئے کہ شوہر کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

ترو کورل (یعنی مقدس آواز) ترو ولور کی تصنیف ہے جو آج سے دو ہزار سال قبل لکھی گئی۔ یہ تامل زبان کی اخلاقی شاعری کا ایک لافانی کارنامہ ہے جس کا مقام تامل کے کلاسکی ادب میں بہت ہی بلند ہے۔

تامل زبان کے اسکالرز کا کہنا ہے کہ اگر تامل ادب العالیہ سے ترو کورل کو الگ کر دیں تو کچھ نہیں رہ جاتا۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ سب سے پہلے دو سو سال قبل کنسٹانٹیس بشی نے جو ایک یہودی مشنری تھا اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ بعد میں ڈاکٹر گرویل نے جرمن اور لاطینی میں اس کا ترجمہ کیا۔ آگے چل کر مختلف لوگوں نے انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۶ء تک مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب کے چند مخصوص ابواب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں بھی ہوا۔ اس کے ترجمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا ترجمہ فرانسیسی میں بہت پہلے سن ۱۷۶۷ء ہی میں ہو چکا ہے۔ ترو کورل کا مکمل ترجمہ فرانسیسی زبان میں حال ہی میں ایم لامارسی نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام جدید زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ حال ہی میں روس نے اس کے ترجمے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ہندوستان کی اکثر زبانوں مثلاً بنگالی، تلگو، ملیالم اور کنڑ میں اس کے ترجمے موجود ہیں۔ شری شنکر راج نائیڈو ریڈر ہندی مدراس یونیورسٹی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس کا بہترین ترجمہ ہندی زبان میں کیا ہے جسے مدراس یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔ اردو میں اب تک کسی نے اس کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔ جلد ہی یہ ترجمہ ارباب ذوق کی خدمت میں پیش ہو گا۔

ترو کورل مختلف عنوانات کے تحت تین حصوں میں اور کل ۱۳۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں ۱۰ کورل ہیں۔ جس طرح دو مصرعوں سے ایک شعر بنتا ہے اسی طرح ایک کورل دو مصرعوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کے ۱۹ ابواب نجی زندگی سے متعلق ہیں۔ ۱۳ ابواب میں لوگ اور اس کے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ اوّل کے چار ابواب میں پوری کتاب کا مختصر سا تعارف درج ہے۔ دوسرا حصہ سیاسیات پر مشتمل ہے۔ یہ پہلے حصے سے دگنا اور تیسرے حصے سے تگنا بڑا ہے۔ اس حصے کا بڑا ہونا ہی ثابت کرتا ہے کہ ترو ولور کی نظر میں "سیاست" سماجی زندگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتی ہے۔ شاعر اس حصے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تیسرا حصہ "عشق و محبت" پر مشتمل ہے۔ تامل زبان کے اسکالرز اس حصے کو محبت کرنے والے دو دلوں کی پہلی ملاقات سے لے کر عارضی جدائی کے بعد دائمی ملاقات تک کے مختلف اوقات کے تاثرات کا حال بتاتے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ایک کورل (دو مصرعوں) میں ایک مکمل خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ نشست الفاظ اور انداز بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ایک اور خصوصیت جس کا اظہار ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کورل کا پہلا مصرعہ چار ارکان پر مشتمل ہے اور دوسرا تین رکنوں پر۔ اس کے باوجود صوتی لحاظ سے کانوں پر بار نہیں معلوم ہوتا۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ یہ تین حصوں پر اور مختلف عنوانات کے تحت ۱۳۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب دس کورل پر مشتمل ہے اور کل کورل کی تعداد ۱۳۳۰ ہے۔ ذیل میں حصہ اول کے پہلے تین باب سے چند کورل کے تراجم پیش کئے جاتے ہیں جس سے ترو کورل کی عظمت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

۱۔ خدا کی تعریف۔ (۱) 'ا' سے جس طرح ہر زبان کے حروف تہجی کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح موجودات عالم کی ابتدا ذات خداوندی سے ہوئی ہے۔

(ب) وہ علم ہی کیا جو "عقلِ کل" خدا کے قدموں کو چھو کر حاصل نہ ہوا ہو۔

(ج) انسان کے پھول جیسے دل میں بسیرا کرنے والے خدا کے چرنوں سے چمٹ جانے والا ہی زندۂ جاوید ہے۔

(د) وہ لوگ جو نفرت اور خواہشات سے بلند تر خدا کے چرنوں تلے بسیرا کرتے ہیں ہمیشہ دنیا کی مصیبتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

(ھ) وہ لوگ جو ذاتِ خداوندی کو برحق جان کر اس میں خود کو جذب کر دیتے ہیں غیر شعوری طور پر سود و زیاں کے غم سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ برسات کی تعریف

(ا) برسات ہی زندگی کا دار و مدار ہے۔ برسات جانداروں کے لئے 'امرت' کا درجہ رکھتی ہے۔

(ب) برسات ضروری غذاؤں کو پیدا کرنے کے علاوہ بذاتِ خود ایک غذا ہے۔

(ج) برسات نہ ہو تو بھوک کو مٹانے والی غذاؤں کو پیدا کرنے والے کسان ہل نہیں جوت سکتے۔

(د) آسمان سے بارش کے قطروں کا برسنا رک جائے تو یہ ہری دوب بھی اُگنا بھول جائے۔

(ھ) سمندر ہی سے اُٹھتا ہوا ابر برسات کی شکل میں پھر سے سمندر پر نہیں برسے گا تو یہ وسیع سمندر بھی خشک ہو جائے گا۔

۳۔ دنیا کو تج دینے والوں کی بڑائی :۔

(ا) جو لوگ دنیا کی خواہشات کو چھوڑ کر سچائی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں ان کے کارناموں کو محفوظ کر لینا ہی صحیفوں کا کام ہے۔

(ب) جس طرح مرے ہوؤں کی تعداد کا اندازہ مشکل ہے، اُسی طرح ان لوگوں کی بڑائی کا اندازہ لگانا بھی ناممکن ہے جو خواہشات کی زندگی سے بہت بلند ہیں۔

(ج) یہ دنیا اُسی کی ہے جو حواس خمسہ کی مختلف قوتوں کا صحیح علم رکھتا ہے۔

(د) بڑے لوگوں کے زندۂ جاوید اقوال خود اُن کی بڑائی اور بزرگی کے شاہد ہیں۔

(ھ) جو لوگ بلندئ اخلاق کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں ان کا غصہ بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ ایک لمحے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔

نامیاتی کھاد کی پیداوار بڑھانے کے اقدام

خوراک اور زراعت کی مرکزی وزارت نے ریاستی سرکاروں اور مرکزی علاقوں سے کہا ہے کہ وہ کیمیاوی کھاد کے ساتھ ساتھ نامیاتی کھاد کے استعمال کی بھی ہمت افزائی کیا کریں۔

اسی خیال کے پیشِ نظر کہ کسان سبز کھاد اور طویلی کھاد کی پیداوار بڑھائیں اور ان کا اور زیادہ استعمال کریں، یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ کسانوں کو غیر نامیاتی کیمیاوی کھاد دیتے وقت ان سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ وہ اپنے کھیتوں میں کتنی مقدار میں کھاد تیار کر سکتے ہیں یا دوسرے ذرائع سے حاصل کر سکتے ہیں۔

موجودہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اگر ۴۰ ٹن نامیاتی کھاد کو ایک ٹن سلفیٹ آف امونیا کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کے بہترین نتیجے نکلتے ہیں۔ خوراک کی فصلوں کے لئے اوسطاً ۲۰ سے ۴۰ پونڈ نائٹروجن فی ایکڑ استعمال ہوتی ہے اس طرح فی ایکڑ ۸ء ۱ ٹن سے ۶ء ۲ ٹن تک نامیاتی کھاد کی ضرورت ہوگی۔ نامیاتی کھاد کی پیداوار بڑھانے کے لئے پنچ سالہ پلانوں کے تحت متعدد اسکیمیں جاری کی گئی ہیں تاکہ مقامی طور پر بھی کسانوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔

وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو جامعۂ دول انسٹی ٹیوٹ (دہلی)
کے پہلے جشن تقسیم اسناد سے خطاب فرما رہے ہیں

پچھلے دنوں ایک سو بھوٹانیوں کی ایک پارٹی
بھارت درشن کے دورے پر آئی تھی۔ پارٹی
کے کچھ ممبر پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر سائنسی تحقیقات
و ثقافتی امور کے ساتھ بیٹھے ہیں

ایتھوپیا کے ولی عہد اور
ان کی بیگم سری نگر کے گورنمنٹ
آرٹ ایمپوریم میں کشمیری شال
ملاحظہ فرما رہے ہیں

یادگار

مناج

ماتمِ انبوہ

خاموشی

فن کار خود اپنی نظر میں

ستیش گجرال کے فنی شاہکار

آپ کے فن پر مسٹر موہن تنّا [illegible]
مضمون صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

صاحبزادہ واجد علی خاں اشکؔ رام پوری

آپ کے باب میں عبد السلام خاں کا

مضمون اسی شمارے میں شامل ہے۔

'تاریخ سلطنتِ خداداد' کے مصنف

محمود خاں محمودؔ بنگلوری مرحوم

آپ کے سوانح حیات صفحہ ۲ پر درج ہیں

نعمانی بنگلوری

محمود خاں محمود بنگلوری

علامہ ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی حسرت ناک وفات کو ابھی چند مہینے بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ دنیائے تاریخ و ادب خصوصاً جنوبی ہند کے علمی حلقوں کو ایک اور اہم شخصیت کی افادیت سے محروم ہونا پڑا۔ یہ حادثہ جناب محمود خاں صاحب محمود کا دنیائے دنی کو خیرباد کہنا ہے۔ مرحوم کافی عرصے سے ضیق النفس کی شکایت میں مبتلا تھے۔ لیکن ستمبر ۱۹۵۷ء سے مرض نے شدت اختیار کر لی تھی۔ علاج معالجہ سے کبھی افاقہ ہو جاتا تھا مگر دو تین مہینوں سے بالکل فراش ہو گئے تھے۔ بالآخر جنوبی ہند کے اس ادیبِ شہیر اور مایۂ ناز مؤرخ نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح ملک و قوم اور علم و ادب کا ایک مخلص خدمت گزار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔

مرحوم بڑے خوش خلق، ملنسار، علم دوست، علم پرور، خوش فکر اہلِ قلم، جنوبی ہند کے ممتاز و مسلّم مؤرخ تھے۔ آپ کے رشحاتِ قلم قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اپنی تاریخی تصانیف کے ذریعہ نہ صرف ہند بلکہ بیرونِ ہند میں بھی شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ آپ کا حلقۂ احباب ہند و پاکستان تک وسیع تھا۔

مرحوم نے بنگلور کے سینٹ جوزف ہائی اسکول میں تعلیم پائی، اور اپنی خداداد ذہانت سے انگریزی ادب میں کافی استعداد حاصل کر لی۔ آپ اردو میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ محمود تخلص کرتے تھے، لیکن فنِ تاریخ سے خاص بلکہ فطری لگاؤ رکھتے تھے اور سیاسیات سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ تحریکِ خلافت، و سوراج کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔ برطانوی سامراجیت اور اس کی خارجی پالیسی پر بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ تنقید کیا کرتے تھے۔ آپ کے حرّیت پرور مقالات و مضامین زمیندار لاہور، خلافت بمبئی، ہلال بنگلور وغیرہ مؤقر اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ تاریخ سے فطری مناسبت کے پیشِ نظر آپ نے اپنی زندگی کا مشن حضرت سلطان ٹیپو شہید اور ان کی سلطنتِ خداداد کے صحیح تاریخی حالات کی ان کی تحقیق و تدقیق قرار دے رکھا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے حرّیت پسند بادشاہوں میں سلطان شہیدؒ کی ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی بصیرت نے انگریزوں کے خطرناک منصوبوں کو بھانپا اور ہندوستان کو انگریزی سامراجیت سے نجات دلانے کے لئے جہادِ حرّیت کا علم بلند کیا اور اس راستہ میں اپنی جان کی بازی تک لگا دی۔ لیکن اس مردِ مجاہد کی سیرت و کردار اور اس کی حکومت کے قابلِ تقلید کارناموں پر انگریزی سیاست نے ایسے دبیز پردے ڈال رکھے تھے کہ اصلی خد و خال کا منظرِ عام پر آنا تقریباً ناممکن ہو گیا تھا۔ حضرت عالمگیرؒ کی طرح یہ مردِ مجاہد بھی انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی رسوائے زمانہ پالیسی کی بدولت "ستمگر اور ہندو کش" ہو کر رہ گیا تھا۔

مرحوم نے شیرِ میسور کی اصل شخصیت اور اس کی مظلومی کو منظرِ عام پر لانے کے کام کو اپنی زندگی کا مشن بنا کر ایک عزمِ راسخ کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھا اور پوری ہمت و پامردی کے ساتھ اپنے نیک مقاصد میں کامیابی حاصل کر کے رہے۔ اس سلسلے میں مرحوم کو بڑی جد و جہد اور عرق ریزی کرنی پڑی۔ اس موضوع سے متعلق تمام فارسی، اردو اور انگریزی کتابوں

کو فراہم کیا۔ میسور کے قدیم خاندانوں اور معمر بزرگوں کا پتہ لگایا۔ ان تک پہنچ کر ان سے مستند زبانی روایتیں اور قلمی مخطوطات حاصل کئے۔ بڑی ہی صبر آزما کاوشوں کے بعد ایک کتاب مرتب اور شائع کی جس کا نام "تاریخ سلطنتِ خداداد" رکھا۔ یہ فخر اور خوشی کی بات ہے کہ مؤلف کی محنت ٹھکانے لگی، اصحاب فن و نظر نے اسے حسنِ قبول بخشا اور اس کو سلطنتِ خداداد اور شیرِ میسور کی مستند تاریخ تسلیم کر لیا۔ فی الحقیقت مرحوم کا یہ کارنامہ ان کا حاصلِ زندگی اور شاہکار تھا۔ ملک کے تمام مؤقر اور موقع جرائد نے اس تالیف کا خیر مقدم کیا اور بہترین ریویو لکھے۔ اور اس تالیف کو ملک و قوم پر مرحوم کا احسانِ عظیم قرار دیا۔ قبولیتِ عام کے نتیجہ میں اس کتاب کے اب تک چار اڈیشن نکل چکے ہیں اور ہر نیا اڈیشن سابق اڈیشن سے بہتر صورت میں اور جدید تحقیقاتی اضافوں کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ پہلے اڈیشن کی بہ نسبت چوتھا اڈیشن ضخامت میں تین گنا ہو گیا ہے۔ مرحوم کو سلطان شہید سے کچھ ایسی عقیدت تھی کہ مرتے دم تک انھوں نے تحقیقات کے کام کو جاری رکھا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں مرحوم نے متعدد بار سرینگاپٹم کا سفر کیا اور سلطان ٹیپو کے مسمار شدہ قلعہ کے کھنڈر کا بار بار معائنہ کیا اور تاریخی شواہد کی روشنی میں دورانِ جنگ کی بعض تاریخی واردات کا محلِ وقوع تلاش اور متعین کیا۔ مثلاً آخری جنگ کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ غداروں نے دشمنوں کو قلعہ کے اندر گھس آنے کا موقعہ کیسے پیدا کیا۔ سلطان شہید سے فیصلہ کن معرکہ کس جگہ ہوا۔ اور کس جگہ شہادت ہوئی۔ غدار میر صادق کو کس مقام پر قتل کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اب قلعہ سرینگاپٹم میں جہاں جہاں کتبے لگائے گئے ہیں یہ مرحوم ہی کی تحقیق و کوشش کا نتیجہ ہیں۔ مرحوم کی تمام تصنیفات و تالیفات اپنے اندر بہت افادیت رکھتی ہیں اور قوم کے جذبۂ آزادی اور حبّ الوطنی کو اُبھارتی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصنّف کی کتابوں کی نوعیت و افادیت پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے:۔

۱۔ سلطان شہید۔ اس سلسلہ کی ابتدائی مختصر سی کتاب ہے جو حضرت سلطان شہید کی سیرت سے متعلق ہے۔

۲۔ دوسری جامع تصنیف "تاریخ سلطنتِ خداداد" ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ اس سے مستند اور صحیح تاریخ دوسری کوئی اب تک شائع نہیں ہوئی۔

۳۔ حیدر علی۔ ایک ناول ہے جس میں حیدر علی کی سیرت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔

۴۔ صحیفۂ ٹیپو سلطان۔ دو جلدوں میں ہے۔ یہ سلطان شہید کے خطوط فرامین و احکام کا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ لیکن ان خطوط و فرامین پر جا بجا جو وضاحتی نوٹ اور حواشی مرحوم نے لکھے ہیں اس سے مترجم کی وسعتِ نظر اور فکری کاوش کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ تاریخ جنوبی ہند۔ مرحوم کی ایک اہم تالیف ہے جس کو قبولِ عام نصیب ہوا۔ یہ کتاب بعض امتحانات میں بطور کورس پڑھائی جاتی ہے۔

۶۔ ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں۔ یہ بھی ایک تالیف ہے جس میں ان جنگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے نتیجہ میں ہندوستانیوں کو انگریزی سامراج کے چنگل میں بے بس ہونا پڑا۔

۷۔ "تاج"۔ مرحوم کی قابلِ قدر تالیف ہے جس میں تاریخ کے ناقابلِ تردید ثبوت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی عجائب روزگار حسین جمیل عمارت "تاج محل آگرہ" کے بنانے والے اطالوی یا فرانسیسی نہیں ہیں بلکہ ہندوستان ہی مایۂ ناز مہندس ہیں۔ علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی نے اس تحقیق کی داد دی اور اس کے لئے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے۔ علامہ مرحوم کی اس قدر افزائی پر مصنّف کو زندگی بھر ناز رہا۔

۸۔ "انقلابات ہیں زمانے کے" اور "اتفاقات ہیں زمانے کے" دو تاریخی افسانے ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں ایک مفید جدّت سے کام لیا ہے اور ہر افسانے کے شروع میں اس افسانے کا تاریخی پس منظر پیش کر دیا ہے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ اس جدید طرز پر اسلامی اور ملکی تاریخی افسانے لکھے جائیں۔ اس کے لئے کام بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک دو افسانوں کے مسودات بھی پورے ہو چکے تھے کہ مرض کے جان لیوا حملے نے تکمیل کی مہلت نہیں دی اور اس کے ساتھ عمر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔

غرض مرحوم کی زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی خدمت اور قوم کے ہونہار افراد میں جذباتِ حریت و آزادی پیدا کرنے میں بسر ہوا۔ مرحوم اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کی بیش قدر تاریخی تصنیفات موجود ہیں جو ان کی یاد کو مدتوں تک باقی رکھیں گی

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ہم دُعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو ان کی خدماتِ حسنہ کا بہترین اجر عطا فرمائے اور اپنی خوشنودی سے سرفراز کرے اور مرحوم کی بیوہ اور دیگر پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔

من موہن تلخ

ستیش گجرال — ایک موضوعِ بحث مصوّر

ہندوستانی فنِ مصوّری کی گذشتہ پچاس برسوں کی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا مصوّر پیدا ہوا ہوگا جس کے بارے میں اتنی مختلف رائیں اتنی شدت سے سننے اور پڑھنے میں آئی ہوں۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے دہلی کے اخبارات میں ایک نوجوان مصوّر کے بارے میں کچھ لکھا گیا — کچھ کیا ؟ اتنا کچھ لکھا گیا کہ تمام ملک کی نگاہیں اس آرٹسٹ کی طرف اٹھیں اور پھر یہ فن کار ایک آندھی کی طرح اٹھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں گھوم گیا۔ جہاں کہیں اس کے فن کی نمائش ہوئی وہیں کے اہلِ نظر چونک اُٹھے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی ستیش گجرال نے اپنے فن میں اُس غم و کرب کی ترجمانی کی تھی جس نے ایک بار تو ہندوستان کی تہذیبی بنیادوں کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرا مطلب ہے ۱۹۴۷ء کے واقعات!

ستیش گجرال ۲۵ دسمبر ۱۹۲۵ء کو جہلم میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں ایک مہلک بیماری کے ہاتھوں سُننے کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ قدرت نے ایک ننھے اور معصوم دل پر اتنی کاری ضرب لگائی لیکن واہ رے انسانی فطرت! ایسا حسین انتقام لیا کہ قدرت کو صفحۂ قرطاس پر اُتار کے رکھ دیا۔

ہاں تو بات ۱۹۵۲ء کی تھی۔ یہ ستیش گجرال کی پہلی نمائش تھی اور دہلی کے صاحبِ نظر نقادانِ فن اس نوجوان فن کار کے جذبے اور پیرایۂ اظہار کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو کر ہی نہیں رہ گئے بلکہ اُنھوں نے جی کھول کر داد دی اور ستیش گجرال کے فن سے بہت بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ گجرال نے تقسیمِ وطن کے خونیں مناظر کو جس جذبے کے ساتھ فنِ مصوّری کا روپ عطا کیا تھا وہ سب کے بس کا روگ نہ تھا۔ انھوں نے کسی ایک طبقے یا فرقے کا ماتم نہیں کیا بلکہ ایک تہذیب اور پوری انسانیت کے خونِ ناحق کا ماتم کیا۔ اس مصوّری کے لئے ایک ایسی نظر درکار تھی جس کے سامنے کچھ بھی نہ چھپ سکتا ہو۔ ستیش گجرال کی نگہِ تیز حقائق کی تہ تک پہنچ گئی اُن کی تصویر " ماتم انبوہ " اُسی زمانے کی تخلیق ہے۔ تصویر میں عالم یہ ہے کہ سب چہرے اسپ چہروں کے خط و خال اپنا اپنا انفرادی رنگ روپ کھو کر سراپا المیہ بن کے رہ گئے ہیں۔

دہلی کی نمائش کی کامیابی کے بعد ستیش گجرال فنِ مصوّری کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے میکسیکو چلے گئے۔ ۱۹۵۳ء میں میکسیکو کے پیرانِ فن عوام اور صاحبِ نظر فن کاروں نے آپ کے فن کی داد دی۔ ۱۹۵۴ء میں امریکہ کے ہنرمند اصحاب نے اس ہندوستانی فن کار کے کمالات کو دیکھا اور ۱۹۵۵ء میں سرزمینِ انگلستان کے مہذّب و متمدّن، نکتہ دان و سلیقہ مند طبقے نے ستیش گجرال کے فن کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ سب کچھ بتانے کا مقصد یہ تھا کہ ستیش گجرال اُن فن کاروں میں سے ہیں جنھیں قدرت جب حسنِ فن عطا کرتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی قبولِ عام کی سند بھی بخش دیتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ستیش گجرال بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں تو اس میں کسی قسم کی مبالغہ آمیزی نہ ہو گی۔

لیکن جب دُنیا بھر سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کے بعد ستیش گجرال نے ۱۹۵۵ء میں دوبارہ دہلی میں اور پہلی بار بمبئی میں اپنے فن کی نمائش کی تو

وہ طوفان اٹھا کہ گجرال نے سُننے کی طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ اُن کی اس نمائش کو انتہائی طور پر مایوس کُن تو کہا ہی گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان پر کچھ ایسے بھی الزامات آئے جن سے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ بیرونی ممالک کے دورے نے ستیش گجرال کے فن کو تقویت دی ہے یا نقصان پہنچایا ہے۔ پھر فن کی دُنیا ہے بھی تو ایسی ہی بے لاگ، بے باک بے رحم کہ یہاں ناکامی اور کامیابی کی حدیں بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ ذرا سی لغزش یا غفلت سب فیصلے بدل کے رکھ دیتی ہے۔ بے شمار اعتراضات میں سے ذیل کے دو بہت بڑے اعتراض تھے۔

۱۔ ستیش گجرال کے فن میں کوئی ارتقا نہیں ہوا۔ وہ اسپین اور میکسیکو کے قدیم عظیم مصوّر حضرات ایل گریکو اور آرزوکو کے اسلوبِ فن سے اس قدر مغلوب ہو کے رہ گئے ہیں کہ اُن دونوں عظیم مصوّروں کی چھاپ سے بچ نہیں سکتے۔ اُن کا اپنا اسلوب اس پرچھائیں میں دب کے رہ گیا ہے۔

۲۔ ستیش گجرال محض غم و یاس، حزن و کرب حتیٰ کہ قنوطیت کے مصوّر ہیں اور مزید برآں وہ بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگے ہیں۔

آیئے! ہم اس تمہید کے پیشِ نظر ستیش گجرال کے فن کا تفصیلی جائزہ لیں۔ ان اعتراضات کی صحت میں شبہ کیا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی لیکن ۱۹۵۵ء میں جو اعتراضات کئے گئے تھے آج ۱۹۵۹ء میں انھیں کو اور زیادہ شدّت اور تلخی سے دہرایا جانے لگا ہے۔ بقولِ "دیویک"[1] ستیش گجرال نے اپنے غم کو بہت زیادہ Dramatize کیا ہے۔ اور اگر ڈرامائی احساسات کو، جو کہ فن اور فن کار میں موجود ہوتے ہی ہیں، اپنی فکر کی جمالیاتی نگہِ انتخاب میسر نہ آئے تو یہی حشر ہوتا ہے۔"

لیکن اس سلسلے میں جو افسوس ناک بات ہوئی وہ یہ تھی کہ ستیش گجرال کے مزاج پر اس تنقید کا کوئی اچھا اثر نہ پڑا۔ جب میں نے اسی موضوع پر اُن سے بات کی تو ذرا تلخی سے بولے "قوّت اور یاسیت کا امتزاج ایک ہی چیز میں کیسے پایا جا سکتا ہے یہ میری سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ فن کی قوّت اُس کے موضوع میں نہیں اُس کے بیان میں ہوتی ہے۔ میں نے انسانی المیہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر ناظر کے نزدیک اُس بیان میں قوّت ہے تو ظاہر ہے کہ فن کار نہ تو خود المیہ کے آگے بے دست و پا ہے اور نہ ہی کیفیت ناظر میں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

اب یہاں جو بات معرضِ بحث میں آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ اوّل تو غم ہی ایک ایسا موضوع ہے جہاں ذرا سا بھی ذہین فن کار بلا کی قوتِ اظہار پر قادر ہوتا ہے ستیش گجرال تو ٹھہرے صفِ اوّل کے مصوّروں میں اور پھر یہ بات بعید از فہم ہے کہ اس سوال کو ہیئت اور موضوع کا رنگ کیوں دیا جائے؟ یہ بات ٹھیک ہے کہ یوں تو فنونِ لطیفہ کے سبھی شعبوں میں ہیئت اور موضوع کا مسئلہ بہت گمبھیر ہوتا ہے اور فنِ مصوّری میں تو یہ مسئلہ جان لیوا صورت اختیار کر جاتا ہے لیکن آخر اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ دُنیا کے ادب یا مصوّری کے عظیم شہ پاروں میں جو دخل ٹریجڈی کو رہا ہے زندگی کے اور کسی پہلو یا عنصر کو نصیب ہوا ہے؟ میرا بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر کوئی فنی تخلیق واقعی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے تو غم اور یاسیت کا کیسا قصور! اُس سے فنی تاثر میں کمی کہاں سے واقع ہو گئی! لیکن ان باتوں کا جواب ستیش گجرال کو ڈھونڈنا ہے نہ کہ نقادانِ فن کو۔ کیوں کہ جو سوال دیویک نے اٹھایا ہے وہ بہت بنیادی اور گہرا سوال ہے۔ جمالیاتی نگاہ ایک مصوّر کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا ایک جان دار کے لئے سانس لینے کا فعل۔ ستیش گجرال کی تصویریں ڈرائنگ رُوم کی زینت نہیں بن سکتیں۔ اس بات کا خود انھیں بھی نہ صرف پورا پورا اعتراف ہے بلکہ اس کی انھیں قطعی پروا بھی نہیں ہے۔ اور پھر وہ تو خود بھی Mannerism کے کچھ اتنے زبردست حامی نہیں ہیں۔

اُن کی اس بات سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے کہ "آج حُسن کی قدریں بدل گئی ہیں۔ اُس کا مفہوم بدل چکا ہے۔ آج حُسن کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز کار آمد ہو وہی حسین ہے۔ جس چیز کا کوئی مصرف نہیں وہ خوبصورت بھی نہیں ہے۔" بہت بڑی بات ہے یہ، لیکن جب اسی سماجی روش پر فن کا سہارا لے کر چوٹ کی جائے گی تو اس بات کا اہتمام لازم ہو جائے گا کہ وہ چوٹ بھی جمالیاتی اور وجدانی احساس پہ گراں نہ گذرے۔ اشاریت فن کی جان ہوتی ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہیئت اور موضوع دونوں دنیائے فن میں ایک دوسرے کے بغیر بے تاثیر و بے جان ہیں۔ مطلب یہ کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کہنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا یہ کہ ؎

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

---

[1] حوالہ از انگریزی جریدہ "مرج"۔ شمارہ بابت ۱۳ جنوری ۱۹۵۶ء

اب آپ شعروں کی جگہ رنگوں کا انتخاب "کہہ لیجیے" بات وہی ہے۔ اس سے ذرا فن کار کی سلیقہ مندی کا پتہ چل جاتا ہے۔

ستیش گجرال کے فن میں جو بات بہت زیادہ نمایاں ہے وہ ہے اُن کے اظہار بیان کی شدّت، لاوے کی مانند اُن کے اُبلتے ہوئے جذبات کا دوٹوک اظہار۔ اُن کی تصویروں کے رنگ مجموعی طور پر ناظر کے ذہن کو کچھ اس طرح متاثر کرتے ہیں جیسے ایک اندھیری رات، ایسی اندھیری رات جب کہ ملگجی اندھیرے ہر چیز کی اصل حالت کو ڈھانپ کر اُسے محض احساساتی نقوش کی صورت عطا کر دیتے ہیں۔ وہ اندھیرے ماحول کو تصوّراتی نقوش کی صورت عطا نہیں کرتے۔ یہ فرق واضح رہے کیوں کہ محض احساساتی نقوش ہی انسانی آنکھ کو ذرا ذرا سی تفصیل کے لئے بے چین کر دیتے ہیں۔ تصوّراتی نقوش تو خود ہماری اپنی تخلیق ہوتے ہیں۔ انھیں تو خود ہم ذرا ذرا سی تفصیل دے کر اُبھارتے ہیں اور واضح کرتے ہیں۔ ہیئت اور موضوع کا یہی فرق ہے میں اس بات کو مزید تفصیل سے واضح کرتا ہوں،

ذرا تصوّر کیجیے کہ رات کا گہرا سنّاٹا ہر طرف چھایا ہوا ہے بے ترتیب سامان سے اٹے پڑے ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں ایک موم بتی جل رہی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کے جھونکے سے اُس موم بتی کی لَو تھر تھرا اٹھتی ہے۔ اُس کے تھر تھراتے ہی روشنی اور دھندلکے سے ملی جلی اُس بے ترتیب سامان کی پرچھائیاں کمرے کی دیواروں پر ایک پُراسرار خاموشی کے ساتھ لہرا جاتی ہیں۔ اُن پرچھائیوں کی ہیئت اُن کے رنگ اور اُن کی وضع قطع کا اندازہ اُسی آنکھ کو ہو سکتا ہے جو اُس ہُو کے عالم میں کسی لا علاج کرب کے مارے پلک نہ جھپکا سکتی ہو۔ اور اُن ناچتی ہوئی کبھی ہولناک، کبھی بے معنی سی پرچھائیوں میں اپنے دُکھ کو تلاش کر رہی ہو۔ یاد رہے کہ وہ آنکھ اُن پرچھائیوں میں اپنے دُکھ کی تلاش کر رہی ہے اُس دُکھ کا علاج نہیں ڈھونڈ رہی۔ ورنہ آرٹ اور صوفیانہ ادب میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اب آپ اس عالم کو تصوّر پرستی، رومانیت یا ہیئت اور خوف کے فلاسفر برگ گرڈ کے الفاظ میں" انہونی دہشت "کہہ لیجیے لیکن اسے ضبط اور جنون نہیں کہہ سکتے۔ اسی فنّی مبالغہ آمیزی سے تاثرات حاصل کرنے والی بالغ نگاہ اُن تھرکتی اور ناچتی ہوئی پرچھائیوں کو خوف زدہ ہو کر نہیں دیکھتی بلکہ ایک حیرت و استعجاب کے ملے جُلے عالم میں اُن سے مطلب اخذ کرنے کی سعی کرتی ہے۔ ہاں اگر وہی فن کارانہ نگاہ اُن سایوں سے لُطف اندوز بھی ہو سکے تو فن میں عمیق گہرائیاں اور بے پناہ وسعتیں آ سکتی ہیں۔ ہو بہو یہی بات ویویک نے دوسرے الفاظ میں کہی ہے۔

ستیش گجرال کے سارے فن میں کوئی ایسی ہی رُوداد اپنی پرچھائیاں سمیٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ رُوداد یا تو فن کار کے دل و دماغ میں بار بار کوندے کی طرح لپک جاتی ہے اور فن کار اُس کے سایوں کا اس طرح تعاقب کرتا رہ جاتا ہے۔ ع

جس طرح کرتی ہو دُوری کا تعاقب دُوری

یا وہ رُوداد ایک بار کوند کر فن کار کے ذہن پر کچھ ایسا نقش چھوڑ جاتی ہے کہ فن کار اُسے صفحۂ قرطاس پر اُتارنے کے باوجود اُس کے سایوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اُسے انگریزی میں Obsession بھی کہتے ہیں۔ ستیش گجرال کے فن میں دوسرا عالم زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں المیہ میں صورت میں بھی دیکھا ہے وہ اُن کے ذہن پر ایک امٹ نقش چھوڑ گیا ہے فن کار بنیادی طور پر تخیّل کا پُتلا تو ہوتا ہی ہے۔ ستیش گجرال نے جو کچھ دیکھا اُسی کی بناء پر اُن تمام حادثات کا تصوّر اور جائزہ لینا چاہا ہے جو اُن کے خیال میں کبھی پہلے یا پُرانے وقتوں میں گذر چکے ہوں گے۔ انھوں نے اُن تمام حادثات کا شکار انسان کو محسوس کیا اور اُن کا یہ احساس اب اتنی پختگی اور شدّت اختیار کر چکا ہے کہ انھیں اس بات کا بھرپور یقین ہے کہ انسان روزِ ازل سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ یہ خیال بجائے خود ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

اسی احساس میں اُن کا فن کہیں کہیں ڈرامائی ہو جاتا ہے۔ اسی احساس کے طفیل وہ کبھی کبھی حقیقت کو اس طرح اپنی گرفت میں لے آتے ہیں کہ اُن کا فن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اُٹھتا ہے۔ مثلاً اُن کی تصویر" مناجات" ایک زبردست شدّتِ احساس کی حامل ہے۔ ستیش گجرال کے فن میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے کہ وہ جہاں کہیں حقیقت کی تلاش میں کامیاب رہے ہیں وہاں انسانی رُوح کو اس طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیتے ہیں کہ بات کہنے اور سُننے کی حدوں سے نکل کر دیدنی بن جاتی ہے۔ کون ایسا بے حس ہو گا جو "مناجات" دیکھنے کے بعد یہ نہ کہہ اُٹھے گا کہ یہ تصویر Compassion اور سچّائی کی حامل ہے۔ اس تصویر کو بیان کرنے کے لئے اگر ہمیں ادب کا سہارا لینا پڑے تو ذہن میں ہیملٹ" "پینڈورا اینڈ دی فلائنگ ڈچ مین" کے ہیرو یا کسی بھی شیکسپیئرین ٹریجک کیریکٹر یا ٹریجڈی کے بھرپور معانی کے پیشِ نظر جتنے بھی عظیم کرداروں کا تصوّر اُبھرے گا، یہ تصویر اُن سب کرداروں کی

ایک سراپا شکل دکھائی دیتی۔ تصویر کیا ہے گویا انسان اپنے آپ کو بد دعا دے رہا ہے۔

بیکن کی اس کے برعکس اسی انسانی المیہ کے احساس کی بناء پر جہاں اُن کے فن میں داخلیت دب کے رہ گئی ہے وہاں ستیش گجرال کا فن حدودِ مصوّری سے نکل کر عالمِ تخیّل میں جا پہنچتا ہے۔ اور چوں کہ مصوّری الفاظ سے نہیں کی جاسکتی لہٰذا اُن کا فن ڈرامائی ہوکے رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کی تصویر "یادگار" صریحاً پروازِ تخیّل کی تخلیق ہے۔ یہ تصویر ایک ایسی ڈرامائی شکل اختیار کر گئی ہے جس کی اصلیت کو فن کار کی آنکھ نے دیکھا نہیں بلکہ محض اُس کا تصوّر کیا ہے۔ دیکھنے اور تصوّر کرنے کے علاوہ ایک منزل پہچاننے کی بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اس تصویر میں اپنے جذبے کو پہچاننے کی بجائے بلکہ پہچانے بغیر ہی اپنی قوتِ اظہار کے زور سے دوسروں کو احساس دلانا چاہا ہے۔ وہ اپنی تصویر "یادگار" کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"یادگار بجائے خود ایک بہت بڑی ستم ظریفی ہے اور ہم اُس پر مزید ستم ظریفی یہ کرتے ہیں کہ پہلے کسی سچائی کا خون کر دیتے ہیں اور پھر اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے ایک یادگار قائم کر دیتے ہیں۔"

اس وضاحت کے پیشِ نظر مصوّر نے تصویر میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس شخص کی یہ یادگار قائم کی گئی ہے وہ اس ستم ظریفی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تمام پردوں اور دیواروں کو چیر کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تیز کھینچی ہوئی لکیروں، مختلف انداز کے خطوط اور سرمئی اور گہرے رنگوں اور نقوش کے ذریعے مصوّر نے اپنے ایک ذہنی تاثر کو ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل خرابی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے جب فن کار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ نہیں پاتا اور پھر جو کچھ کہہ دیتا ہے اُسی میں اپنے ذہنی تاثر کو ڈھونڈھنے کی کوشش کرتا ہے۔ محض عنوان سے یہ تصویر اس مفہوم کی حامل نہیں ہو پائی اور ہر جگہ اس عنوان کی وضاحت بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ یہ اکثر ہوتا آیا ہے کہ فن کار ایک خاص دلی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ اب یہ سب باتیں اس بحث کو بہت دُور تک نہیں لے جاتیں کہ موضوع کو کیا ہیئت عطا کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ایک تو تصویر کا اپنا مجموعی تاثر اس ساری بحث سے الگ ہو کے کھڑا ہو جاتا ہے اور فن کار، ناظر اور نقّاد ایک دوسرے سے بحث کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے رنگوں کا جو مزاج ہوتا ہے، اُن میں جو جذبہ پنہاں ہوتا ہے، انھیں جس طرح مخصوص انداز سے انفرادی اور امتزاجی صورت میں پیش کیا جاتا ہے وہ اس ساری بحث کو بے معنی بنا دیتے ہیں اور تصویر کو اپنے ہی معانی عطا کر دیتے ہیں۔ سوائے ڈراموں کے (اور وہ بھی کہیں کہیں) اور کہیں بھی فن میں ڈرامائی انداز کو سراہا نہیں جاتا۔ کاش ستیش گجرال جیسا ذی ہوش مصوّر اس قسم کے فن میں کوئی جاہ و جلال ڈھونڈنے کی سعی نہ کرے۔ کیوں کہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ستیش گجرال کے فن میں زیادہ تر کون سے رنگ نمایاں ہیں۔ انتھاہ اُداسیوں کا ماحول پیدا کرنے والے سُلگتے ہوئے سُرمئی رنگ کی تہوں سے کہیں کہیں گلابی رنگ کی جھلک، تصویر کے ظاہری حصّوں میں سبز رنگ کی پرچھائیاں، یا تصویر کے مرکز یا پس منظر سے گہرے پیلے رنگ پر سُرخ اور سرمئی رنگ کا گِھر گِھر آنا مصوّر کے مزاج کی ترجمانی اور عکّاسی کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام رنگوں میں غم و درد کے عنصر کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامائی عنصر بھی موجود ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی نہیں کہ ساری تصویر اصلیت سے پرے ہٹ کر زور آور ڈرامائی انداز میں ڈھل گئی۔

آج ہمارے دَور میں ایک یہ روش بھی عام ہو گئی ہے کہ ایک معیار کو پرکھنے کے لئے کسی دوسرے معیار کو کسوٹی مانا جا رہا ہے۔ ستیش گجرال کے آرٹ پر بیرونی اثرات اور خاص کر میکسیکو کے مصوّروں کے اثرات کا جو الزام آتا ہے اس کا بیان خارج از بحث نہ ہوگا۔ بیرونی اثرات کے بارے میں جب میں نے اُن سے سوال کیا تو پوچھنے لگے "کیا آپ کے خیال میں جدید ہندوستانی زندگی بیرونی اثرات سے خالی ہے؟ فن ہمیشہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تاثرات بذاتِ خود کوئی چیز تخلیق نہیں کرتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فن کار کو تحریک دے سکتے ہیں۔"

میں اپنے ملک کے اس قابلِ قدر فن کار کے اس خیال سے متفق ہوتے ہوئے بھی اس حقیقت کی طرف اُن کا دھیان دلانا چاہوں گا کہ یہ بیان ایک طرح کا اعتراف بھی ہے اور اگر بیرونی تاثرات سے تحریک ملنے پر ہمارے دیش کا مصوّر سنبھلنے کی کوشش نہ کرے گا تو اُس کا فن واقعی نقّالی ہو سکتا ہے۔ یا کم از کم Original تو نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اپنی اسی

بات کے ساتھ میں ستیش گجرال کے اُن چند الفاظ کا حوالہ نہ دوں تو یہ ایک ذہنی بد دیانتی کے علاوہ اُس مصوّر اور آپ کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ اپنی بات کی وضاحت میں انھوں نے کہا تھا:

"ہندوستانی مصوّری کی روایات میں کوئی ایک اسٹائل نمایاں نہیں ہے۔ راجپوت، مغل، کانگڑہ، بنگال —— سب اپنا اپنا رنگ لئے ہوئے اسی مٹی میں ختم ہو کے رہ گئے۔ جو باہر سے آئے وہ بھی یہیں گھل مل کر رہ گئے۔ فن ایک ایسی تحریک ہے جس سے ماضی کا پورا آرٹ مستقبل میں جاری رہ کر اس ملک کے تمدّن کی روح رواں بن جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزی حکومت کی وجہ سے یہ ارتقا رُک گیا۔ یوروپین تمدّن ہم پر ٹھونس دیا گیا۔ اس تمدّن کی قلم اس مٹی میں ٹھیک طرح سے لگ نہیں سکی۔ لیکن سو برسوں میں یہ قلم بہت پُرانی، بڑی اور مضبوط ہو چکی ہے۔ اب اسے توڑا نہیں جا سکتا کیونکہ انھیں سو برسوں کے طویل عرصے میں ہماری قدیم مصوّری کی جڑیں بھی سڑ گئیں۔"

غالباً اسی غلط قلم نے ہمیں بیرونی معیار کا محتاج بنا دیا ہے۔ اسی سے بیرونی تاثرات پہنچتے ہیں اور غالباً اسی نے ہمارے ہاں اس روایت کو جنم دیا ہے کہ اگر کوئی تخلیق ہر پہلو سے عظیم نہیں ہے تو سرے سے بیکار ہے۔ اور یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہونہار مصوّر اپنے اسلوب اور Originality کو نظر انداز کئے بیٹھے ہیں اور ہیئت اور موضوع کی غیر تخلیقی بحث میں نقادوں سے لوہا لے رہے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں کوئی نہ کوئی مصوّر ایک نہ ایک دن ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات کر دکھائے گا جو خالص ہندوستانی ہوگی جو ہمیں خالص ہندوستانی مزاج اور معیار سے آشنا کرائے گی، اور ہمارے ملک میں کسی قومی معیار نظر کو جنم دے گی جس سے ہمیں اپنی کہی ہوئی بات کو اپنی نظر سے جانچنے اور پرکھنے کی توفیق ملے گی اس قسم کے مصوّروں کی فہرست میں ستیش گجرال کے شامل ہونے کے امکانات قوی ہیں۔

عمیق حنفی
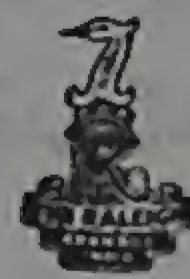
گھٹا ہی جاتا ہے دم کاغذی حصاروں میں

مرے دماغ کے اطراف تا بہ حدِّ نظر
اُڑے ہوئے ہیں دواوین فصیل تن کتنے
کوئی بتائے کتابوں کے ان پہاڑوں کے
پہنچ سکے ہیں اُدھر صاحبانِ فن کتنے
سحر کی پہلی کرن بھی اِدھر نہیں آتی
ہوائے تازہ کے جھونکے اُدھر ہی رہتے ہیں
تھکی تھکائی اِدھر آتی ہے بسنت کی رُت
لطافتوں کے ہیولے اُدھر ہی رہتے ہیں
ریاضِ دہر کے پھولوں کو دیکھنا ہے محال
مرے بیان میں رنگت ہے کاغذی گُل کی
مری نگاہ سے فطرت کے ساز او جھل ہیں
صدائیں سنتا ہوں عنقا نژاد بلبل کی
اسی جہانِ سیاہ و سفید میں رہ کر
مری زبان کتابوں سے لفظ چنتی ہے
مِرے خیال بیاضوں سے کھینچتا ہے دماغ
اسی کمال پہ سر میری فکر دُھنتی ہے

نقوش کرمِ کتابی مجھے حدیثِ شعور
مری روش ہیں حواشی کے درمیاں کے سطور

سُنا ہے میں نے کہ محنت کدوں میں ہوتا ہے
ہر ایک لمحہ اشاراتِ نو بہ نو کا جنم
بدل دیا ہے محبت نے استعاروں کو
نئے نئے ہیں پجاری نئے نئے ہیں صنم
علامتوں کا صنم زار ہے جہانِ بسیط
مگر وہ دیکھے جو پھاندے یہ کاغذی دیوار
مری غزل میں تشابیہ، مہر و ماہ و نجوم
ہوئی ہیں شمس و قمر سے عمل کی آنکھیں بیمار
بڑھا دے ہاتھ مری زندگی کہ پہلی بار
یہ علم ہو کہ ترا ہاتھ کھُردرا ہو کہ نرم
ٹھٹھر رہا ہوں کتابوں کے برف خانوں میں
سمیٹ لے مجھے باہوں میں اور کر دے گرم
کھلی فضاؤں میں لے چل اڑا کے ساتھ مجھے
اُتار دے مجھے اپنے گرے خزانوں میں
علامتوں کے، اشاروں کے وہ صنم بتلا
جو ڈھلتے رہتے ہیں کھیتوں میں کارخانوں میں

سمجھ سکے مرا بچہ بھی میری طرزِ بیاں
کسی زبان میں پہنچے رہے خیال عیاں

نہ کوئی لفظ نہ کوئی خیال اچھوت رہے
مرا کلام، مری زندگی، ہو تیرا کلام

وہ کوئی رنگ کوئی بو کوئی صدا ہو تری
ہر ایک طرز ادا کو مرے قلم کا سلام

وہ لفظ ہو کہ معانی اگر کتاب سے آئے
بغیر تیری وساطت کے پا سکے نہ مجھے

بغیر تیری سفارش کے، کاغذی بُت کی
ادائے خاص بھی اپنا بنا سکے نہ مجھے

جو کرتے رہتے ہیں مرعوب مجھ کو ناموں سے
جو میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ کے پجاری ہیں

نکال لیتے ہیں مجھ سے بھی رسم و راہِ قدیم
یہ اجنبی مرے ذہنِ رسا پہ طاری ہیں

خدا کے واسطے اس نرغۂ اجانب سے
بڑھ کے ہاتھ، مری زندگی، نکال مجھے

نکال کر مجھے پاتال سے زمین پہ چھوڑ
کھلے گگن کی فضاؤں میں پھر اچھال مجھے

زبان، زندہ جہانوں میں سانس لینے لگے
خیال، تیری وفا کا ثبوت دینے لگے

سراج حیدرآبادی

غزل

جنونِ شوق ابھی حدِّ اعتبار میں ہے
وہ سامنے ہیں، نظر اُن کے انتظار میں ہے

نہ جوئبار میں ہے اور نہ آبشار میں ہے
وہ رازِ غم جو مری چشمِ اشکبار میں ہے

نگاہ و دل کے حجابات اُٹھ گئے شاید
اک اضطرابِ مسلسل نگاہِ یار میں ہے

نفس نفس ترا پیغام سُن رہا ہوں مگر
قدم قدم تری منزل ابھی غبار میں ہے

بدل نہ دے کہیں تقدیرِ کائنات وہی
وہ ایک خم جو تری زلفِ تابدار میں ہے

کسی کے درد کو راحت بنا لیا میں نے
کسی کا جبر بھی اب میرے اختیار میں ہے

سراجؔ اُٹھ نہ سکے گا حجابِ حُسن ابھی
کوئی تو اہلِ نظر جلوہ گاہِ یار میں ہے

محبوب اللہ مجیب

ہندوستانی علوم کی مقبولیت مشرقی ممالک میں

محمدؐ بن عبدالرحیم قلیشی غرناطی نے "تحفۃ الالباب" میں لکھا ہے:۔

"ہندوستانی علوم و فنون دنیا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فلسفہ میں بھی ماہر ہیں، طب میں بھی اور ریاضی میں بھی طرح طرح کی صنعتوں میں بھی۔"

ہنٹر کی رائے کے مطابق ہندوستان کا مشرقِ وسطیٰ سے تجارتی رشتہ بہت قدیم ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندوستان سے چاندی، مور اور بندر کثرت کے ساتھ عرب، فلسطین اور مصر جاتے تھے۔ ان ملکوں کے تجار سلیمان آخر سے یعنی موجودہ جے پور سے چاندی اور جانوروں کو حاصل کرتے تھے۔

شام اور ایران پر قبضہ کرنے کے بعد عرب مشرق کی طرف بڑھے اور آہستہ آہستہ ہندوستان آ گئے۔ اس وقت جہازرانی کوئی آسان بات نہ تھی ہواؤں کے رُخ پر کشتی اور زندگی کی کشتی دونوں کا دارومدار ہوتا تھا لیکن خوش نصیبی کی بات کہ بحر قلزم کی ہوائیں ہندوستان آنے کے لئے اتنی موافق پڑتی تھیں کہ جہاز کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر یہاں تک آ جاتے تھے تجارت سے سکونت تک کی بھی بات آئی اور وہ مالابار کے ساحلی نواح میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ اسٹرک کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے ایرانی اور عرب تجار ہندوستان کے مختلف حصوں میں آ کر آباد ہونے لگے تھے۔

دوسری صدی اور اس کے بعد

لیکن جہاں تک ہندوستانی علوم و فنون کی مقبولیت کا سوال ہے وہ مشرقی ممالک میں بہت پہلے ہو چکی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے شہنشاہ خسرو نے اپنے دربار کے ہر دل عزیز حکیم باردوئی کو ہندوستان بھیجا اور اُسے تلقین کی کہ ہندوستان میں آب حیات ملتا ہے اور وہ اُسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ باردوئی یہاں مدتوں گھومتا رہا لیکن آب حیات نام کی کوئی شے دریافت نہ ہو سکی۔ لاچار ہو کر وہ اپنے ملک واپس جانا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے اس کو "پنچ تنتر" کا نسخہ دیا اور ہدایت کی کہ وہ اسے آب حیات کہہ کر اپنے شہنشاہ کے حضور میں پیش کرے۔ جب یہ نسخہ لے کر وہ ایران پہونچا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور فوراً پہلوی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد نوشیرواں کے زمانے میں اس کا ترجمہ فارسی زبان میں "انوار سہیلی" کے نام سے ہوا۔ اس کے بعد بھی ایک عربی ترجمہ ہوا اور اس کا نام "کلیلہ و دمنہ" رکھا گیا۔ یہ کام ابن مقفّع کے ہاتھوں انجام پایا۔

سنسکرت قواعد پر حسین لبری نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب البیان" رکھا۔ ہندوستانی علوم پر عربی میں جتنا کام ہوا اس کا مفصل بیان احمدؐ بن یعقوب بن جعفر نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ دوسرے عالم محمدؐ بن اسحاق ابن الندیم نے اپنی کتاب "الفہرست" میں ایسی ہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس وقت تک ہندوستانی اطباء کا نام سرِفہرست تھا۔ قاضی سعید اُندلسی اور ابن ابی عیبعہ نے اپنی اپنی کتابوں میں جن کا نام "طبقات الامم" اور "عیون الانبا فی طبقات الاطباء" ہے، ہندوستانی اطباء کا الگ الگ بیان کیا ہے۔ ابوزید سرافی نے اپنی کتاب

"سفرنامہ" میں ہندوستان کی سماجی زندگی، رسوم اور بدھ مذہب کے بھکشوؤں[1] اور دیوداسیوں کا بیان تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بیشتر مؤرخ اور سیاح ہوئے ہیں جن کو ہندوستان سے خاص دل چسپی رہی۔ مثلاً "عجائب الہند" کا مصنف بزرگ بن شہریار "مالک الممالک" کا مصنف استخری، ابوالفراج، دمشقی، ابن بطوطہ، ابن ہیکل اور ادریسی وغیرہ۔ ہندوستان کے مذہبی اصول پر شہرستانی کی ایک کتاب ہے جس کا نام "الملل والنہال" ہے

ہندوستان پر عربوں کے حملے آٹھویں صدی عیسوی سے پہلے ہی شروع ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام عبیداللہ کا ہے جو ایک عرب جنرل تھا لیکن اس کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ یہی صورت بدامل کے ساتھ ہی اور وہ بھی مارا گیا۔ تیسری بار محمد بن قاسم نے جو ایک بیس برس کا خوبصورت نوجوان تھا، اپنا ایک فوجی دستہ لے کر جس میں ۶ ہزار آدمی تھے، سندھ پر حملہ کیا[2] اور تین سال (۷۱۲ - ۷۱۵ء) کے اندر ہی اندر پورا قبضہ جما لیا، ساتھ ہی پنجاب کا حصہ بھی فتح کر لیا۔ لیکن خلیفہ سلیمان کے حکم سے واپس بلا لیا گیا اور مار ڈالا گیا۔ ۸۷۱ء تک سندھ خلیفہ ہی کے زیرِ اثر رہا اور مقامی اُمراء کے ہاتھوں اس کا انتظام ہوتا رہا۔ ہندوستان کا مشرقی ممالک سے یہ پہلا رشتہ تھا جو مضبوطی سے قائم ہوا اور ہندوستان میں مشترکہ تہذیب کا آغاز ہوا۔

ہندوستانی اطباء بغداد میں

بغداد شروع ہی سے علم و ادب کا مرکز رہا۔ علوم و فنون کے شعبے کا کوئی آدمی ایسا نہیں تھا جو وہاں نہ رہا ہو۔ چنانچہ ہندوستان سے بھی بہت سے علماء بغداد گئے۔ بغداد میں جہاں ایک طرف فارسی اور عربی کے علماء جمع تھے تو دوسری طرف سنسکرت زبان کے ماہر، اطباء، ماہر نجوم اور اہلِ قلم بھی اکٹھے ہو گئے۔

عباسی خاندان نے ۷۴۹ء سے ۱۰۹۲ء تک حکومت کی۔ ان کے وسیع عہدِ حکومت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی ہوئی۔ عرب علماء و اہلِ دانش پہلے ہی سے علم و ادب میں دل چسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے تمام علماء کو اپنے یہاں اکٹھا کر لیا۔ چناں چہ جب عباسی خاندان کی حکومت کا دارالسلطنت دمشق سے بغداد منتقل ہوا تو دنیا کے مختلف حصوں سے علماء وہاں پہونچے اور شہر بغداد کی زینت اور رونق پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔ ہندوستانی علماء بھی کافی تعداد میں وہاں پہنچے۔ جن طبیبوں نے بغداد کو رونق دی ان میں سے مانک، صالح، دھان، شانوکے اور کینکرا کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ صالح ۔ یہ آیورویدک طرزِ علاج کے ماہروں میں سے تھا۔ صالح نے خلیفہ کے چچا زاد بھائی ابراہیم کا علاج کیا اور بہت شہرت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم قریب المرگ تھا مگر صالح نے اس کی جان بچائی۔ صالح بیلا کا لڑکا تھا جو بذاتِ خود آیورویدک طرزِ علاج کا ماہر تھا۔

۲۔ دھان ۔ یہ بھی مشہور حکیموں میں سے تھا اور بغداد کے اسپتال میں بحیثیت طبیب مقرر ہوا۔ جہاں بعد میں اس کا لڑکا اس کا جانشین ہوا۔ جس نے بہت سی سنسکرت کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

۳۔ کینکرا ۔ یہ طب اور نجوم دونوں کا ماہر تھا۔ اس کی مختلف کتابوں کا عربی میں مندرجہ ذیل نام سے ترجمہ ہوا۔

ا۔ کنش (ادویات پر)

ب۔ المودار (عمر کے بارے میں)

ج۔ احسن العلم و دور فی القرآن (کائناتِ عالم کی حرکت کے بارے میں)

د۔ قربینۃ الکبیر و قربینۃ الصغیر (ماہ و سال کے بارے میں)

۴۔ مانک ۔ ان سب حکماء میں مانک کا مرتبہ بلند تھا۔ یہ شخص فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ ان دونوں زبانوں کو وہ جس طرح پڑھ سکتا تھا اسی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ترجموں میں اصل جیسی روانی ہے۔ اس نے فارسی میں بھی ایک طب کی کتاب کا ترجمہ کیا جو زہر کے اثرات کے بارے میں ہے۔ مانک عرب دنیا سے پہلے پہل اس وقت روشناس ہوا جب خلیفہ ہارون رشید کی حکومت تھی۔ اس کی رسائی اپنی ذاتی قابلیت کی بناء پر خلیفہ کے دربار میں بہت جلد ہو گئی اور پھر اپنی ذہانت اور خلوص کی وجہ سے خلیفہ کے قریب ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب خلیفہ ایک مہلک مرض میں گرفتار ہوا تو اس نے اس کا دل لگا کر علاج کیا اور خلیفہ اچھا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی اور بھی شہرت ہوئی۔

---

[1] ان المرقۃ والسجنۃ و السن ۔ محمد بن القاسم بن محمد۔ حمزہ ابو بیزل حنفی (مغلوں سے پہلے ہندوستان میں فارسی ادب) عبدالغنی
[2] "این آؤٹ لائن آف اسلامک کلچر" اے ایم اے شستری جلد اول

د۔ شاناق[1]۔ یہ بھی اس زمانے کے مشہور و معروف حکیموں میں سے تھا۔ اس کی بیشتر کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

ا۔ ایک کتاب اس نے زہر کے اثرات کے بارے میں لکھی اور جس پر ابنِ حاتم اور خود مانک کا تنقید و تبصرہ شامل ہے۔

ب۔ اخلاقیات پر اس کی کتاب کا عربی میں "منتہا الجواہر" کے نام سے ترجمہ ہوا۔

ج۔ اس نے مویشیوں کے علاج کے بارے میں اور علم نجوم پر کتابیں لکھیں۔

اس کے علاوہ دوسرے بہت سے حکیموں اور عالموں کی ایک طویل فہرست ہے جو علمِ ادویات کے علاوہ فلسفہ، حکمت اور نجوم پر عبور رکھتے تھے۔ مثلاً انکال، جبار، راجا، مجش، کراچا را اور نانک وغیرہ۔

خالد ابیارماکی کے حکم سے بھی سنسکرت سے عربی میں کچھ تراجم ہوئے۔ زہر اور خوراک کے بارے میں بھی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا۔ مہابھارت کے کچھ ابواب کا ترجمہ صالح ابنِ شیب نے کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں پہلے ہی سے علم موسیقی پر بہت سی کتابیں تھیں۔ انھیں میں سے ایک کا ترجمہ عربی میں ہوا جس کا نام "نفیر" ہے۔ عباسی خلفاء نے سنسکرت زبان کے جواہر پاروں کو اکٹھا کرنے کے لئے اپنے یہاں سے عالموں کی ایک بڑی تعداد بھی ہندوستان بھیجی۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی میں محمد بن اسماعیل تنوکی جو علم نجوم کا ماہر تھا، ہندوستان آیا اور اس علم میں تحقیق کا کام شروع کیا۔

علوم و فنون کا مرکز بغداد نہیں ہندوستان

رفتہ رفتہ زمانے کے ہاتھوں ساری سلطنتیں برباد ہوگئیں۔ علم و ادب کا مرکز اب ہندوستان بن چکا تھا۔ عرب دنیا کا مشہور مورخ ابو ریحان البیرونی محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا۔ اس کی پیدائش خیوا میں ۹۷۳ء میں ہوئی۔ اس نے یہاں آکر سب سے پہلے سنسکرت کے عالموں سے دوستی پیدا کی اور اس زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیا۔ اس کو تاریخ، مذہب، فلسفہ، ہئیت اور ریاضی سے بڑی دلچسپی رہی۔ تاریخ نویسی کی طرف اس کا رجحان پہلے ہی سے تھا۔ "کتاب الہند" میں اس امر کا انکشاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جن چیزوں کا سمجھنا مشکل ہو، اس کو جان لینے سے منزل آسان ہو جاتی ہے اور اس کو نہ سمجھنے کا سبب بھی معلوم ہو جاتا ہے، اس لئے کہ بے تعلقی کی حالت میں جو چیزیں نہیں معلوم ہو سکتیں وہ میل جول کی حالت میں معلوم ہو جاتی ہیں۔" چنانچہ ہندوستان میں رہ کے وہ لوگوں میں اُٹھ بیٹھ کر، بحث و مباحثہ کر کے چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ "کتاب الہند" کے علاوہ "آثار الباقیہ"، "پاتنجلی" (یوگ پر) "برہما سدھانت" (علم نجوم پر) تصنیف کیں۔

اس کے بعد دہلی سلطنت کا دور شروع ہوا۔ سلاطینِ دہلی نے بھی علوم و فنون میں گہری دلچسپی لی۔ دارالانشاء کا شعبہ قائم کیا گیا اور بہت سے لوگوں کو ترجمے کے کام پر مامور کیا گیا۔ بہرام شاہ کے دورِ حکومت میں اور اس کے بعد تک یعنی سلطان ابراہیم کے دورِ حکومت تک میر انشاء کا عہدہ ابوالمعانی نصر بن عبدالحمید مستوفی کے ہاتھ میں رہا جس نے ابنِ مقفع کے کلیلہ و دمنہ کے عربی ترجمے کو فارسی میں منتقل کیا۔ جوالامکھی کے مندر سے سلطان فیروز شاہ تغلق کو قریب تیرہ سو سنسکرت کے نسخے ملے۔ اس نے فوراً سنسکرت کے عالموں کو اپنے دربار میں اکٹھا کیا اور ان کے ترجمے کا حکم دیا۔ ان میں دلائل فیروز شاہی[1] بھی شامل ہے جو کہ علم نجوم کے بارے میں ہے۔ شمس سراج عفیف اپنے زمانے کا زبردست مورخ گذرا ہے، اس نے بھی فیروز شاہ کے حکم پر موسیقی کی ایک کتاب کا "غنیتہ المنیات" کے نام سے ترجمہ کیا۔

سکندر لودی کے دورِ حکومت میں بھی کارہائے نمایاں ہوئے۔ خواص خاں کا بیٹا طب کے موضوع پر سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا۔ اور اس کا نام "طب سکندری" یا "معدنِ شفائے سکندری" رکھا گیا۔

کشمیر میں زین العابدین کے دورِ حکومت میں بھی مہابھارت اور راج ترنگنی کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس نے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کو سنوارنے اور بنانے میں بڑی مدد کی۔

مسعود سعد سلمان اور عبدالشکی دو فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کا استعمال اپنے فارسی اشعار میں کیا۔ عوفی نے سعد سلمان (۱۰۴۶ء - ۱۱۳۱ء) کے بارے میں لکھا ہے کہ "داور اسہ دیوان است یکے بتازی یکے بہ پارسی دیکے بہ ہندوی"۔ سعد کے ہندی دیوان کے بارے

[1] "این آؤٹ لائن آف اسلامک کلچر" صفحہ ۳۲۳ جلد اول اے ایم اے شستری

[1] منتخب التواریخ - عبدالقادر بدایونی - جلد اول صفحہ ۲۴۹

ہیں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فارسی اشعار میں ضرور ہندی الفاظ کی آمیزش ہے:-

برشگال اے بہارِ ہندوستاں   اے نجات از بلائے تابستاں

اے پرستارِ سنگ و کہہ و دین   دے گرفتارِ عشقِ سنگ و لگن

امیر خسرو ہندوستان کی قابلِ قدر ہستیوں میں سے تھے۔ خسرو امیر سیف الدین کے لڑکے تھے۔ ان کے والد التمش کے زمانے میں خاص حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے عماد الملک کی لڑکی سے شادی کی۔ اُن کی پیدائش پٹیالی میں ہوئی۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ بلخ میں پیدا ہوئے۔ لیکن "نہ سپہر" سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ "ہست مرا مولد و ماوائے وطن" (نہ سپہر) اس سے یہ بات یقین کرنے کی حد تک پہونچ جاتی ہے کہ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ خسرو ہندوستان میں فارسی شاعری کے چراغ تو تھے ہی لیکن دوسرے علوم کی روشنی پھیلانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ علاؤالدین خلجی کے دربار کا استادِ موسیقی گوپال نائک کا بھی چراغ ان کے سامنے نہ جل سکا۔ موسیقی میں مختلف قسم کے راگ اور راگنیاں انھیں کی ایجاد ہیں۔ خسرو نے ۷۱ھ میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ہاتھوں پر بیعت کی۔ اتفاق کی بات کہ جس وقت شیخ کا انتقال ہوا تو خسرو ناصر الدین محمد تغلق کے ساتھ بنگال میں تھے۔ جب دہلی واپس ہوئے اور اپنے پیر کے وصال کی خبر سُنی تو ہوش کھو بیٹھے۔ بھاگتے ہوئے خانقاہ میں آئے جہاں حضرت شیخ ابدی نیند کا مزہ لے رہے تھے۔ دیوانگی میں آکر ان کے چہرے سے چادر ہٹادی اور روتے ہوئے بولے "گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس" اکثر خسرو کی ایک منظوم لغت کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس میں کل ۲۱۵ اشعار ہیں۔ شروعات اس طرح ہوتی ہے:

خالقِ باری سرجن ہار   واحد ایک بدا کرتار

شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہندوستانی علوم و فنون، ہندی شعر و شاعری اور سنسکرت کی بیش قیمت کتابوں کے فارسی ترجمے کی طرف بڑی توجہ دی گئی۔ اکبر کو بھی کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ ابوالفضل[1] کا کہنا ہے کہ دربار میں روزانہ مختلف زبانوں کی کتابیں جن میں ہندی، سنسکرت اور عربی و فارسی کی کتابیں ہوتی تھیں، لائی جاتی تھیں اور بادشاہ کے سامنے پڑھی جاتی تھیں۔" وہ لوگ جو سنسکرت سے ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، ان میں سے ابوالفضل نے عبدالقادر بدایونی، شیخ سلطان تھانیسری، ملا شیری اور نقیب خاں کے نام لئے ہیں۔ اکبر نے ایک دارالترجمہ[1] بھی کھولا۔ اس کے انچارج میر جمال الدین حسین انجو بنائے گئے اور ان کی نگرانی میں ان کتابوں کے ترجمے ہوئے:

۱۔ سنگھاسن بتیسی	بدایونی
۲۔ اتھربن بید	شیخ فیضی، شیخ بھاون اور حاجی ابراہیم
۳۔ راماین	بدایونی
۴۔ تاریخِ کشمیر	ملا شاہ محمد شاہ آبادی
۵۔ لیلاوتی	فیضی
۶۔ مہابھارت	ابوالفضل (رزم نامہ)
۷۔ ہربنس	ملا شیری
۸۔ جوتش	خانخاناں
۹۔ عیار دانش	ابوالفضل
۱۰۔ تاجک (نجوم)	مکرون گجراتی

دربار کے مشہور ہندی کے شاعروں میں سے راجہ منوہر داس تھا۔ گنگا پرشاد یا گنگ کوی دربار کا سب سے باعزت شاعر تھا۔ یہ سنسکرت زبان پر بھی عبور رکھتا تھا۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اس کی ایک نظم سے خوش ہو کر اس کو ایک بار چھتیس لاکھ روپے انعام دئے۔ اس کے علاوہ نرہر سہائے کرن، کرپارام، ہرول رائے پاتری (ایک شاعرہ جس کے نام ہندی کے مشہور شاعر کیشو داس نے اپنا دیوان 'کوی پریا' معنون کیا) بلبھدر مشادھیا اور بال کرشن ترپاٹھی ناتھ وغیرہ جیسے بڑے بڑے ہندی کے شاعر تھے۔

شہزادہ داراشکوہ کو بھی جسے شاہجہان شاہزادہ بلند اقبال کہا کرتا تھا، ہندوستانی فلسفہ و مذہب سے بڑی دلچسپی رہی[2]۔ اس نے

۱۔ آئینِ اکبری (بلاخ مین۔ انگریزی) جلد اوّل، صفحہ ۱۱۰

[1] تاریخِ آگرہ اور اکبر اعظم، انتظام اللہ شہابی، صفحہ ۳۱
[2]۔ داراشکوہ اور اس کی تصانیف، آج کل (اردو) اپریل ۱۹۵۹ء

اپنشد کا ترجمہ فارسی میں 'سرِ اکبر' کے نام سے کیا۔ ۱۶۵۴ء میں اس نے دیدانت اور تصوّف پر ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام "مجمع البحرین" رکھا۔ اس نام میں بھی بڑا اشاریہ لہجہ ہے۔ یعنی دو سمندروں کا اجتماع۔ دوسرے معنی میں دو مذہبوں کے ملے جُلے اور یکساں تصوّر۔ اس کی دوسری کتابوں میں سفینۃ الاولیاء، سکینۃ الاولیاء اور حسنات العارفین شامل ہیں۔

۱۷۰۷ء کے بعد سے ہندوستان متواتر انقلابات کا شکار ہوتا رہا۔ مغلیہ سلطنت کی چولیں ڈھیلی ہونا شروع ہوگئیں۔ اور لسانی انقلابات نے بھی جنم لینا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری زندگی انتشار سے دوچار ہوگئی۔ 'بزم' کو فروغ دینے والے اب صرف 'رزم' کی باتیں کرنے لگے اور زندگی تلوار کی پناہ میں آگئی۔ پھر بھی ایسے وقت میں ادبی اور علمی ذوق کم نہیں ہوا۔ شاہ عالم ثانی نے باقاعدہ ہندی میں شعر کہے ہیں۔ شاہ عالم کا ایک ہندی دیوان منتخباتِ ثانی کے نام سے رامپور سے شائع ہوا ہے۔

فی زمانہ بھی عرب ممالک میں ہندوستانی علوم و فنون میں اُسی طرح دلچسپی لی جا رہی ہے۔ حال ہی میں ہندوستانی کونسل برائے ثقافتی امور نے شکنتلا (کالیداس) کا ترجمہ فارسی میں ڈاکٹر ہادی حسین صاحب سے کروا کر شائع کیا ہے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو کی کتاب 'ڈسکوری آف انڈیا' کا ترجمہ ابھی فارسی میں دیکھنے میں آیا ہے۔

اُمید ہے کہ صدہا سال پہلے کی روایت اسی طرح پروان چڑھتی رہے گی۔ اور ہندوستان و عرب ممالک ایک دوسرے کے ادب، تہذیب، کلچر اور طرزِ زندگی سے دلچسپی لیتے رہیں گے اور اس طرح ہمارے تہذیبی رشتے مضبوط ہوتے جائیں گے۔

حمید انصاری

جادۂ نو

حریفِ جوششِ تمنّا نہیں ہے جادۂ نو
ابھی بلند ہے اے دوست ہر ارادۂ نو

محیطِ بادۂ دیرینہ کا شناور ہوں
بقدرِ ظرف نہیں ہے خمارِ بادۂ نو

رموزِ منزلِ ہستی کا روشناس نہیں
اگرچہ برق در آغوش ہے پیادۂ نو

ہجومِ رنگ سے گھبرا گیا ہے ذوقِ نظر
کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں جہانِ سادۂ نو

طریقِ بیعت و آداب بھی نیا ہوگا
"ہوا ہے فائزِ سجادہ پیر زادۂ نو"

ملے تو خیر بڑی چیز ہے شرابِ کہن
نہیں ملے تو غنیمت ہے دُردِ بادۂ نو

حمیدؔ تا سرِ منزل پہونچ ہی جائے گا
نظر میں جادۂ دیرینہ ہے نہ جادۂ نو

مقالہ نما برائے شبلی

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ / کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
۱۔	احمد، اسحاق نعمانی	۱۔ شبلی کی محرومیاں	علی گڑھ میگزین	۷۶	شمارہ اول ۱۹۵۷ء
		۲۔ شبلی کی شاعری اور ہم	صبا، حیدرآباد	۲۶	جلد۵ شمارہ ۶۵
		۳۔ شبلی اور الطلاب			
		۴۔ شبلی اور ہندوستانی نشاۃ الثانیہ			
۲۔	احمد، سید طفیل	۱۔ مولانا شبلی ایک علیگ شاگرد کی نظر سے	ادبی دنیا، لاہور	۱۷	جلد ۱۰ ۱۹۴۷ء
۳۔	احمد، عبداللہ	۱۔ شبلی اور جدید شاعری	مجلہ مکتبہ	۶	جلد ۲ شمارہ ۶
۴۔	احمد، مفتون	۱۔ شبلی کا اسلوب تحریر	خاور، ڈھاکہ	۱۹	جولائی ۱۹۵۲ء
		۲۔ مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء	نگار، لکھنؤ	۳	مارچ ۱۹۵۳ء
		۳۔ مولانا شبلی علی گڑھ سے پہلے اور بعد	”	۴۳	جولائی ۱۹۵۶ء
		۴۔ شبلی اور ان کے عہد کے سیاسی تحریکات	مشرب، کراچی		تاریخ اردو ادب نمبر ۵۶ء
		۵۔ مولانا شبلی کے بعض نقاد	نگار، لکھنؤ	۲۲	اپریل ۱۹۵۷ء
۵۔	احمد، محی الدین	۱۔ مولانا شبلی نعمانی کی فارسی شاعری	صبا، حیدرآباد	۷۷	شبلی نمبر ۱۹۵۸ء
۶۔	احمد، مقبول مولانا	۱۔ علامہ شبلی اور تنقید سیاست	ادبی دنیا، لاہور		ستمبر ۱۹۴۱ء
۷۔	احمد، مقبول خواجہ	۱۔ شبلی بہ حیثیت سوانح نگار	نئی قدریں، حیدرآباد دکن	۱۲	نومبر ۱۹۵۶ء
۸۔	اصلاحی، امین مولانا	۱۔ مدرسۃ الاصلاح اور علامہ شبلی	الاصلاح، سرائے میر		اگست ۱۹۳۶ء
۹۔	اصلاحی، بدرالدین	۱۔ علامہ شبلی پر فتوائے تکفیر	”		”
۱۰۔	آغا، ڈاکٹر وزیر	۱۔ شبلی نعمانی کی سیاسی نظر	البصیر، چنیوٹ	۶۱	شبلی نمبر
۱۱۔	افادی، مہدی	۱۔ تمدن عرب اور پروفیسر شبلی	"افادات مہدی"		

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ/کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
	افادی، مہدی	۲- علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ	"افاداتِ مہدی"		
		۳- آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ	"		
		۴- شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر	"		
		۵- ملک میں تاریخ کا معلمِ اول یعنی شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی	"		
		۶- اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ (سرسید، آزاد، نذیر، حالی اور شبلی)	"		
		۷- شبلی سوسائٹی	"		
		۸- حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک	"		
۱۲-	اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	۱- شعر العجم اور عمر خیام	ہمایوں	۳۳۶	جون ۱۹۴۴ء
		۲- شعر العجم پر ایک نظر	ادبی دنیا، لاہور	۱۷	مئی ۱۹۴۵ء
۱۳-	النعمانی، مولانا سعید	۱- اردو کے عناصر اربعہ میں علامہ شبلی کا درجہ	الناظر، لکھنؤ	۱	اپریل و مئی ۳۵ء
		۲- یادِ رفتگاں - شبلی	ادبِ لطیف، لاہور		اپریل ۱۹۵۴ء
		۳- (شبلی کی) عربی انشاء	البصیر، چنیوٹ	۱۱۲	شبلی نمبر
۱۴-	انوار الحسن	۱- شبلی نعمانی	فروغِ اردو، لکھنؤ	۳۲	۱۹۵۷ء
۱۵	ایڈیٹر 'برہان'	۱- تنقید شعر العجم پر تبصرہ	بُرہان	۱۶۰	فروری ۱۹۴۴ء
۱۶	ایک طالب علم (عبدالماجد)	۱- الکلام مؤلفہ مولانا شبلی پر ایک تنقیدی نظر	الناظر، لکھنؤ	۱	جنوری ۱۹۱۱ء
۱۷-	باسط، محمد عبدل	۱- عربی شاعری اور مثنوی (بہ نظر شبلی)	دکن ریویو، حیدرآباد	۲۶	فروری ۱۹۰۹ء
۱۸-	بیگ، مرزا احسان احمد	۱- علامہ شبلی کی فارسی شاعری	علی گڑھ میگزین	۲۴	نومبر۔ دسمبر ۱۹۲۲ء
۱۹-	بشیر، میاں	۱- شبلی بہ حیثیت مصنف	ہمایوں	۳۳۴	مئی ۱۹۳۰ء
۲۰-	بیگم رضیہ	۱- شبلی کی شعر فہمی	صبا، حیدرآباد	۱۸	شبلی نمبر
۲۱-	تبسم، پروفیسر	۱- مولانا شبلی فارسی شاعر کی حیثیت میں	مخزن، لاہور	۲۵	مارچ و اپریل ۱۹۲۸ء
۲۲	جوناگڑھی، قاضی احمد میاں	۱- مولانا شبلی بہ حیثیت شاعر	ہندوستانی، الہ آباد	۲۸	۱۳ جنوری ۲۶ء
۲۳-	جیراجپوری، مولانا اسلم	۱- الفاروق	شبلی کالج میگزین اعظم گڑھ	۲۲	
۲۴	حالی، خواجہ الطاف حسین	۱- سیرۃ النعمان (تبصرہ)	مقالاتِ حالی، جلد دوم	-	
۲۵	حبیبی، احفاد	۱- شبلی نعمانی	علی گڑھ میگزین	۱۴	جنوری ۱۹۲۲ء
۲۶	حبیبی، سید اکبر	۱- شبلی اور ڈارون (ایک اہم خط)	دکن ریویو، حیدرآباد	۲۰	ستمبر ۱۹۰۸ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ/کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۲۷-	خان، رشید حسن	۱- شبلی کا فارسی تغزل	نگار، لکھنؤ	۱۵	مئی ۱۹۵۰ء
۲۸-	خان، ظفر علی	۱- موازنۂ انیس و دبیر	دکن ریویو، حیدرآباد		اگست ۱۹۰۸ء
۲۹-	خان، عبیداللہ	۱- مقالاتِ شبلی	البصیر، چنیوٹ	۱۶۸	شبلی نمبر
۳۰-	خان، محمد حبیب اللہ	۱- مولانا محمد شبلی نعمانی	البصیر، چنیوٹ	۵۳	،،
۳۱	خان، محمد ظفر	۱- مولانا شبلی آئینۂ تحقیق و تنقید میں	،،	۳۱	،،
۳۲	خواجہ غلام الثقلین	۱- مولانا شبلی پر ایک نظر	عصرِ جدید، میرٹھ	۴۱	دسمبر ۱۹۱۴ء
۳۳	دردائی محمد محیی الدین	۱- شبلی ایک مجاہد کے روپ میں	علی گڑھ میگزین	۱۱	جولائی ۱۹۳۷ء
۳۴	ذکاء اللہ	۱- تبصرہ مجموعۂ نظم شبلی	علی گڑھ گزٹ		ستمبر ۱۸۹۳ء
۳۵	ڈار، محمد ابراہیم	۱- حیاتِ شبلی پر ایک نظر	نوائے ادب، بمبئی	۲۲	جنوری ۱۹۵۰ء
۳۶	زبیری امین	۱- شبلی کا جرمِ محبت اور سلیمان ندوی	نگار، لکھنؤ	۴۹	اکتوبر ۱۹۴۵ء
۳۷	زور، محی الدین قادری	۱- شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات	صبا، حیدرآباد	۲۳	شبلی نمبر
۳۸	زیدی، علی جواد	۱- شبلی کے سیاسی رجحانات	ادیب، دہلی		۱۹۴۳ء
۳۹	سرور، پروفیسر آل احمد	۱- شبلی میری نظر میں	'تنقید کیا ہے'۔		
۴۰	سہیل، مولانا اقبال	۱- شبلی کی جامعیت	تابشِ سہیل	۷۱	
		۲- علامہ شبلی کے مکاتیب	،،	۱۰۳	
		۳- سیرتِ شبلی	الاصلاح، سرائے میر		اکتوبر ۳۶-۳۹ء
۴۱-	ساجدہ زینت	۱- حیاتِ شبلی	صبا، حیدرآباد		شبلی نمبر
۴۲	شرر، عبدالحلیم	۱- تبصرہ "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"	دل گداز، لکھنؤ	نمبر ۱۲	
		۲- شبلی کی یاد میں	الناظر، لکھنؤ		دسمبر ۱۹۱۴ء
		۳- مجموعۂ نظم شبلی			
۴۳	شروانی، محمد حبیب الرحمن خاں	۱- المامون (تبصرہ)			۱۸۸۷ء
		۲- سفرنامہ مصر و روم و شام (تبصرہ)	مقالاتِ شروانی	۳۰	اخبار آزاد، ۱۰-۱۷ اگست ۱۸۸۴ء
		۳- الفاروق ،،	،،	۳۳	معارف، جولائی ۱۸۹۹ء
		۴- سوانح مولانا روم ،،	مخزن، لاہور		اکتوبر ۱۹۰۶ء
		۵- مرحوم علامہ شبلی نعمانی	مقالاتِ شروانی	۱۶۷	علی گڑھ گزٹ جنوری ۱۹۱۵ء
۴۴-	شروانی، محمد مقتدا خان	۱- علامہ شبلی کا قیام علی گڑھ	العلم، کراچی	۵۵	اپریل، جون ۱۹۵۸ء
۴۵-	صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث	۱- شبلی اور اردو	علی گڑھ میگزین	۱۴۲	جنوری ۱۹۳۹ء

نمبر ۱	مقالہ نگار ۲	مقالہ ۳	رسالہ / کتاب ۴	صفحہ ۵	تاریخ اشاعت ۶
۴۶-	صدیقی، ڈاکٹر آفتاب احمد	۱- شبلی کا اسلوبِ نگارش	خاور، ڈھاکہ	۱۰	نومبر ۱۹۵۲ء
		۲- موازنۂ انیس و دبیر پر ایک نظر	؍؍	۲۶	مئی ۱۹۵۲ء
		۳- شعر العجم	؍؍	۱۸	فروری ۱۹۵۲
		۴- شبلی - متکلم	البصیر، چنیوٹ	۷۶	شبلی نمبر
		۵- شبلی و حالی کا ایک تقابلی مطالعہ	ہمسر نیوز، کراچی	۱۲	نومبر ۱۹۵۶ء
۴۷-	صدیقی، حفیظ	۱- علی گڑھ تحریک اور شبلی	علی گڑھ میگزین	۲۵۸	علی گڑھ تحریک نمبر ۱۹۵۵ء
۴۸	صدیقی محمد عبد اللطیف لکھنوی	۱- اردو کے انشا پرداز- مولانا شبلی نعمانی	الناظر، لکھنؤ	ضمیمہ	جولائی ۱۹۲۷ء
۴۹-	صدیقی ڈاکٹر خورشید الاسلام	۱- شبلی	تنقیدیں	۳۴	(علی گڑھ میگزین)
۵۰-	ظفر الملک	۱- دیباچہ مجموعۂ کلام شبلی	الناظر، لکھنؤ		۱۹۲۴ء
۵۱-	عبد اللہ شیخ	۱- مولانا شبلی مرحوم مغفور	البصیر، چنیوٹ	۶۸	شبلی نمبر
۵۲	عبد اللہ ڈاکٹر سید	۱- شبلی کا نظریۂ تاریخ (قسط اول دوم)	معارف، اعظم گڑھ	۳۸/۳۴	مارچ اپریل ۱۹۳۸ء
		۲- اردو سوانح نگاری سرسید کے زمانے میں (شبلی)	ماہِ نو، کراچی	۱۲	اگست ۱۹۵۳ء
		۳- شبلی فکرِ جدید سے کیونکر روشناس ہوئے	اورینٹل کالج میگزین لاہور		
		۴- شبلی کا اسلوبِ بیان	"بحث و نظر"		
		۵- شبلی کے تصنیفی کام کی مجموعی قدر و قیمت	البصیر، چنیوٹ	۴۸	شبلی نمبر
۵۳	عبد الرحمٰن صباح الدین	۱- مولانا شبلی نعمانی	نقوش، لاہور	۱۸	جنوری ۱۹۵۶ء شخصیات نمبر
۵۴	عبد الواحد، ابو ظفر	۱- مقالاتِ شبلی	صبا، حیدرآباد	۵۷	شبلی نمبر
۵۵	عبد الحق، مولوی	۱- مقدمہ خطوطِ شبلی	خطوطِ شبلی مرتبہ امین زبیری		
۵۶	عبد الغنی	۱- شبلی بحیثیت ادیب	البصیر، چنیوٹ	۵۵	شبلی نمبر
۵۷	عطاء اللہ، شیخ	۱- شبلی - ایک پین اسلامسٹ	؍؍	۱۴	؍؍
		۲- الفاروق	؍؍	۷۶	؍؍
		۳- سفرنامۂ روم و مصر و شام	؍؍	۹۹	؍؍
۵۸	عقیدت مند	۱- حیاتِ شبلی اور مولانا سہیل	فاران	۱۵	اگست ۱۹۵۷ء
۵۹	علی، ڈاکٹر سید شاہ	۱- حالی اور شبلی سوانح نگاری کی حیثیت سے	نگار، لکھنؤ	۱۴	جولائی، اگست ۵۶ ۱۹ء
۶۰-	فاروقی، اظہر علی	۱- مولانا شبلی کی مقالہ نگاری	آج کل، دہلی	۴۷	اگست ۱۹۵۱ء
۶۱-	فاروقی، ڈاکٹر محمد احسن	۱- شبلی کی موازنۂ انیس و دبیر میں ایک فرد پر تنقید	"اردو تنقید"	۸۱	
۶۲	فیضی، بیگم عطیہ	۱- شبلی اور خاندانِ فیضی	ادبی دنیا، لاہور	۲۶	جون ۱۹۴۶ء
		۲- مولانا شبلی	صبح امید، بمبئی	۴۴	اپریل ۱۹۵۹ء

نمبر	مقالہ نگار	مقالہ	رسالہ/کتاب	صفحہ	تاریخ اشاعت
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۶۳-	قادری، اظہر	۱- حالی و شبلی	ساقی، کراچی	۶۹	اکتوبر ۱۹۵۴ء
۶۴-	قادری، خالد حسن	۱- شبلی اپنے خطوط کے آئینہ میں	نگار، لکھنؤ		۴۵ء
۶۵-	قریشی، ڈاکٹر وحید	۱- حالی اور شبلی کے ہاں تنقیدی اصطلاحات	ادبی دنیا، لاہور	۲۹	جون ۱۹۴۷ء
		۲- خالد صاحب اور علامہ شبلی	کتاب، لاہور	۲۱	فروری ۱۹۴۷ء
۶۶-	کاظمی، تمکین	۱- علامہ شبلی نعمانی	صبا، حیدرآباد	۲۱	شبلی نمبر
۶۷-	ماہر القادری	۱- شبلی نعمانی کی شاعری	ماہِ نو، کراچی	۴	اگست ۱۹۵۰ء
۶۸-	مسرور، احمد عبداللہ	۱- شبلی اور جدید شاعری	مجلہ مکتبہ جلد ۴ شمارہ ۶	۵۰	
۶۹	مسیح الزماں	۱- شبلی کا "موازنہ"	"تعبیر، تشریح، تنقید"	۵۰	
		۲- شبلی موازنے کی روشنی میں	"	۱۴۳	
		۳- شبلی اور دبیر	"	۱۵۳	
۷۰-	مکی، مولوی احمد	۱-	ہماری کتابیں		اگست، ستمبر ۱۹۴۶ء
۷۱-	مہدی، عالم خوند	۱- اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں شبلی کا حصہ	صبا، حیدرآباد	۴۷	شبلی نمبر
۷۲-	ندوی، احتشام احمد	۱- مفتون احمد اور شبلی	نگار، لکھنؤ	۳۳	جون ۱۹۵۷ء
۷۳-	ندوی، مولانا سید سلیمان	۱- مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین پر جونما تکفیر	الاصلاح، سرائے میر		اگست ۱۹۳۶ء
		۲- شعرالعجم اور عمر خیام	معارف، اعظم گڑھ		فروری ۱۹۲۴ء
		۳- مولانا شبلی شاعر کے لباس میں	"کلیاتِ شبلی"		
۷۴	ندوی، نجیب اشرف	۱- شبلی اور بمبئی	اسماعیل کالج میگزین، بمبئی		
۷۵	ندوی، محمد اسمٰعیل	۱- علامہ شبلی	البصیر، چنیوٹ	۸۸	شبلی نمبر
۷۶	نعمانی، محمد عبدالقیوم حسرت	۱- اردو میں تنقید کا ارتقاء (شبلی)	نگار، لکھنؤ	۸۲	فروری مارچ ۱۹۴۶ء
۷۷-	ہاشمی، نصیر الدین	۱- علامہ شبلی اور حیدرآباد	صبا، حیدرآباد	۴۰	شبلی نمبر

اجتماعی ترقّی کا مقصد

اجتماعی ترقّی کا پروگرام آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ ہمارے ۵½ لاکھ گاؤں میں تقریباً ۳۰ کروڑ انسان آباد ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد ان لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنا ہے۔ کھانا، کپڑا اور مکان ہر شخص کی نہایت اہم ضرورت ہے۔ بچّوں اور بالغوں دونوں کے لئے تعلیم، علاج و معالجہ، روزگار کے مواقع اور اسی طرح کی دوسری چیزیں بھی اہم ہیں۔ ایک فلاحی ریاست میں ان باتوں کا انتظام ہونا ہی چاہیئے۔

اجتماعی ترقّی کے ذریعے اس سمت میں صحیح قدم اٹھایا گیا ہے اور یہ پروگرام حسبِ توقع کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ فی الحال ۳ لاکھ دیہات (جن کی آبادی سولہ کروڑ سے بھی زائد ہے) اس پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ہمارے سارے دیہات اس پروگرام کے ماتحت آ جائیں گے۔

چند سال قبل ہمارے وزیرِ اعظم نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ کہ "اس بیج (اجتماعی ترقّی) سے ایک پودا نکلے گا جو بعد میں ایک گھنا درخت بن جائے گا اور پورا ملک اس کے زیرِ سایہ آ جائے گا۔" ان کی یہ خواہش بہت جلد پوری ہو جانے کی توقع ہے۔

ہمارا ملک بہت بڑا ہے۔ اُتر سے دکھن تک اس کی لمبائی دو ہزار میل ہے۔ پورب سے پچھم کی دُوری بھی اتنی ہی ہو گی۔ اس کا فائدہ اور نقصان دونوں ہیں۔ فائدہ یہ ہے کہ بڑے ملک میں ہی بڑا کام کیا جا سکتا ہے لیکن نقصان یہ ہے کہ اتنی بڑی آبادی کا معیارِ زندگی بلند کرنا یقیناً مشکل ہے۔ جہاں ہم مادّی فائدوں کے لئے مادّی ذرائع کام میں لا رہے ہیں وہاں ہم نے انسانوں کو بھی بہتر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس چیز نے ہمارے کام کو اور مشکل بنا دیا ہے۔

آپ نے رومی مورّخ پلینی کا نام سُنا ہو گا۔ وہ حضرت عیسٰی کی پیدائش سے قبل گذرا ہے۔ وہ اس بات کا شاکی تھا کہ روم کی ساری دولت ہندوستان چلی جا رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی مصنوعات کی روم میں بہت مانگ تھی۔

یہ بات کس طرح ممکن تھی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اتنی چیزیں پیدا کر لیتے تھے کہ ہماری روزمرّہ کی ضرورتیں پوری ہو جانے کے بعد اتنی چیزیں بچ جاتی تھیں کہ ہم دوسرے ملکوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے۔ اس لئے ہمارا ملک بہت خوش حال تھا۔

ایک روایت ہے کہ ایک مغل شہنشاہ نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ اس کی سلطنت میں جتنا سونا ہے اس کا وزن کیا جائے۔ ۶ مہینے بعد اُسے معلوم ہوا کہ اس کے افسر ابھی تک دلی اور آگرہ کا سونا تولنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ ہمارے ملک میں کتنی دولت تھی۔ یہ دولت کیا ہوئی؟

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی دولت کس طرح غائب ہوئی ملک کی یہ جمع شُدہ دولت آزادی چھن جانے کے بعد ہم سے چھن گئی۔ ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی پالیسی ایسی تھی جس سے صرف ان کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح ہم مفلس ہو گئے۔ اور آزادی کے ملنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہمارا ملک جو پہلے اناج کا بھنڈار اور دولت کا گہوارہ تھا۔ اب ہر چھوٹے بڑے معاملے میں دوسرے ملکوں کا دستِ نگر ہو گیا ہے۔

اس لئے آزادی کے بعد ہمارا سب سے پہلا فرض اپنے ملک کو خوشحال بنانا ہے جس کا مطلب بنیادی طور پر دیہاتوں کی تعمیرِ نو ہے

BURMAH-S

SHELL

BURMAH-SHELL

تپاک
تیزی
عمدگی

خندہ پیشانی، فوری توجہ، ذاتی خدمات کے چھوٹے مگر اہم اشاروں سے آپ کو برماشیل کے ہر پمپ پر جاتے ہی محسوس ہوگا کہ آپ ایک معزز گاہک ہیں.

"محترمہ" "کیا آپ کی کار میں تیل پورا ہے؟ اور بیٹری کا پانی!"

"ریڈی ایٹر میں پانی ٹھیک بھرا ہے اور ٹائر کی ہوا درست ہے" غرضیکہ جانچ پڑتال میں کمی نہیں رہی اور آپ کی تمام ضروریات بخوبی پوری کر دی گئیں.

یہ جانتے ہوئے کہ آپ عموماً مصروف ہوتے ہیں ہمارے ڈیلروں کے ملازمین کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ آپ کی ضروریات باقاعدگی پھرتی سے پوری کر سکیں،

یہ ہے
برماشیل
سروس!

اردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

غالب نمبر

ماگھ شک سمت ۱۸۸۱
فروری سنہ ۱۹۶۰ء
مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز: ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

سرورق :- شبیہہ مرزا غالب
رسالے کی پشت پر :- تاج محل

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں - چھ روپے
پاکستان میں - چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ :- ہندوستان میں - ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں - آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۸ - نمبر ۷

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

پچھلے دنوں پیرس میں مغربی ممالک کے سربراہوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ۲۷- اپریل ۱۹۶۰ء کو پیرس میں چار بڑوں کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس فیصلے کے مطابق روس کے وزیر اعظم مسٹر خروشچیف کو دعوت نامہ بھیج دیا گیا، انھوں نے دعوت نامہ منظور کر لیا لیکن کانفرنس کی تاریخ سے اتفاق نہیں کیا۔

اب روس نے مغربی طاقتوں کی یہ تجویز مان لی ہے کہ یہ کانفرنس اس سال ۱۶- مئی کو پیرس میں ہو۔ اس کانفرنس میں عالمی سیاست کے بہت سے مسائل زیر بحث آئیں گے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ تخفیفِ اسلحہ اور خاص کر اسلحہ پر کنٹرول اور ہائیڈروجن بموں پر پابندی عائد کرنے کا ہے ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ عالمی امن اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر یہ سارے مسائل بخیر و خوبی طے پا جائیں گے۔

دلی میں ۱۱- دسمبر ۱۹۵۹ء کو صدرِ جمہوریہ نے دنیا کی سب سے بڑی زراعتی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ اس عالمی زراعتی میلے کا انتظام بھارت سیوک سماج نے کیا ہے۔ یہ اپنے قسم کا انوکھا میلہ ہے، اس میں چھوٹے بڑے سولہ ملک حصہ لے رہے ہیں، ہندوستان کی ۱۷ ریاستوں نے اپنے اپنے خوبصورت پویلین لگائے ہیں۔ اس نمائش سے ہمارے کسانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا، وہ لوگ زرعی ترقی کے جدید ترین طریقوں کا مطالعہ کر سکیں گے جیسا کہ صدرِ جمہوریہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا، ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے، ہمارے کسانوں کو پرانے تجربوں پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سائنسی طریقوں کو اپنا کر نئے ڈھنگ سے اپنی کھیتی کو ترقی دینا چاہیئے۔

صدرِ جمہوریہ کے ہاتھوں درگاپور میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کارخانہ ہندوستان اور برطانیہ کے سرکاری اور غیر سرکاری تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے۔ ایسے دو کارخانے بھلائی اور رورکیلا میں پہلے ہی کام شروع کر چکے ہیں۔ فولاد چھوٹی اور بڑی صنعتوں کی بنیادی ضرورت ہے۔ فولاد کی پیداوار سے ملک کی صنعتی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔

حیدرآباد کا 'دائرۃ المعارف' ایک قدیم علمی ادارہ ہے۔ یہ ادارہ گذشتہ ۷۰ سال سے علومِ مشرقیہ کی ترویج و ترقی کے لئے نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی خدمات کو مشرق و مغرب کے ممتاز علماء اور فضلاء نے سراہا ہے۔ دائرۃ المعارف نے روس، ٹرکی، مصر، شام، عراق، سعودی عرب، ایران اور دیگر ممالک کے مشہور کتب خانوں سے نایاب علمی نسخے حاصل کر کے انھیں شائع کیا۔ ان مطبوعات نے نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں بلکہ اس طرح مشرق و مغرب کی دیگر قوموں کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی تعلقات کو بھی مضبوط کیا۔ ادارہ اپنی ان خدمات کے لئے ہر طرح کی داد و تحسین اور امداد و تعاون کا مستحق ہے۔

مالک رام

نواب مختار الملک میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ

حضرت اویس قرنیؒ کا نام تاریخِ اسلام میں نادیدہ عاشقِ رسولؐ کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف ہے۔ قرن با خلافِ روایت یمن کے ایک قریہ (تذکرۃ الاولیا) یا ایک قبیلے (روضۃ الصفا) کا نام ہے۔ حضرت اویسؒ اسی سے منسوب تھے۔ ان کی نویں پشت میں ان کے ایک ہم نام اویس ثالث ہوئے۔ یہ مدینہ کے متولیِ اوقاف تھے۔ معلوم نہیں کیوں، وہ اپنے بیٹے محمدؐ علی کو ساتھ لے کر ہندستان چلے آئے۔ یہاں ان دنوں بیجاپور کے تخت پر علی عادل شاہ جلوہ افروز تھا۔ دونوں باپ بیٹے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور علم و فضل کا لحاظ کرتے ہوئے، ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ محمدؐ علی کو دبیری کا عہدہ عطا ہوا۔

رفتہ رفتہ اس خاندان نے بہت عروج حاصل کیا۔ شیخ محمدؐ علی کے پڑوتے شمس الدین محمدؐ حیدر (بن محمدؐ تقی بن محمدؐ باقر بن محمدؐ علی) نظام علی خان، نظام الملک آصف جاہ اوّل کے عہد میں سلطنتِ دکن کے دیوان مقرر ہوئے۔ حیدر یار خاں بہادر، بشیر جنگ، منیر الدولہ، منیر الملک ان کے خطاب تھے۔ ۸۰ برس ان کی عمر تھی، جب ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ تاریخ ہوئی: حیدر یار خانِ عادل۔ ۱۱۸۹ھ۔ اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ اس عہد کی تمام تاریخیں ان کی قابلیت اور اوصافِ حمیدہ کے بیان سے مملو ہیں۔

شمس الدین محمد حیدر کے دو بیٹے تھے — محمد صفدر خاں اور تقی یار خاں۔ تقی یار خاں ۱۷۸۲ء میں لاولد فوت ہوئے۔ بڑے محمد صفدر خاں نے بھی بہت اعزاز و اکرام پایا، مختلف اوقات میں نظام کی طرف سے غیور جنگ بہادر، اشجع الدولہ، اشجع الملک، خان خاناں کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ انھوں نے ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ) میں بعارضۂ خفقان انتقال کیا، "حشرِ اومی شود بآلِ رسول" (۱۲۰۴) تاریخِ وفات ہے۔ اورنگ آباد میں اپنے والد کے مقبرے ہی میں مدفون ہیں۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔

محمد صفدر خاں کی شادی درگاہ قلی خاں سالار جنگ کی دختر نیک اختر بہجت بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سے ان کے چار بیٹے ہوئے۔ محمد تقی خاں، حسن رضا خاں، علی زمان خاں، رضا یار خاں۔ ان میں سے تیسرے بیٹے (علی زمان خاں) کا نکاح ابوالقاسم میر عالم وزیرِ اعظم دکن کی بڑی صاحبزادی نفیسہ بیگم سے ہوا تھا۔ لیکن جب زچگی میں ان کا انتقال ہو گیا، تو میر عالم نے حضور نظام کے ایما سے اپنی دوسری بیٹی صاحبہ بیگم ان کے نکاح میں دے دی۔ میر عالم ہی وہ شخص ہیں، جو ٹیپو سلطان شہید کی بربادی کا باعث ہوئے۔ بڑے زیرک اور معاملہ فہم اور کارکن شخص تھے۔ انگریزوں کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ حیدرآباد دکن کی متعدد مشہور عمارتیں انھی کی توجہ بلکہ خرچ پر تعمیر ہوئیں۔ بڑے فاضل شخص تھے۔ نظم و نثر پر پوری قدرت حاصل تھی اور صاحبِ تصنیف و تالیف تھے۔

میر عالم کی وفات ۱۸۰۸ء (۱۲۲۳ھ) کے بعد ان کے داماد علی زمان خاں بہادر، منیر الدولہ، منیر الملک ثانی، امیر الامراء ان کی جگہ دیوانِ حیدرآباد مقرر ہوئے۔ لیکن "جو چاہتے ہیں، سو آپ کریں ہیں"

کے مصداق جملہ احکام خود نظام سکندر جاہ بہادر جاری فرماتے اور ریاست کے مالی معاملات میں سیاہ و سپید کے کرتا دھرتا پیش کار مہاراجہ چندولال بہادر تھے۔ اس لیے ان کی دیوانی محض برائے نام اور گویا انھیں "بدنام" کرنے کا ایک حیلہ بن کے رہ گئی تھی۔ بہرحال یہ ۲۵ برس تک وزیرِ ریاست رہ کر ۱۸۳۳ء (۱۲۴۸ھ) میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ چندولال ہی کو ریاست کی مستقل مدارالمہامی کا عہدہ بھی تفویض ہوگیا، جس پر وہ گیارہ برس، ۱۸۴۳ء تک فائز رہے۔ معزولی کے بعد ۱۸۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نواب علی زمان خاں منیرالملک ثانی کے اس دوسرے نکاح سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے ـــــ میر محمد علی خاں اور میر عالم علی خاں۔ یہی میر محمد علی خاں ہمارے نواب مختارالملک سالار جنگ کے والد ماجد ہیں۔

میر محمد علی خاں ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت سید مرزا خاں نے کہی تھی: "ستارۂ روشن"۔ ان کی مہر کا سجع تھا: "بود جانشینِ محمد علی"۔ خطاب شجاع الدولہ، سالار جنگ تھا۔ ان کا نکاح امیرِ سلطنت سید کاظم علی خاں مختارالدولہ کی صبیہ زینت النساء بیگم سے ہوا تھا، جو ساداتِ نیشاپور میں سے تھے۔ اسی محل سے ان کے ۲ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ) کو وہ بیٹا پیدا ہوا، جو آگے چل کر اس سلسلۂ زرناب کے لیے بھی باعثِ صد فخر و مباہات ثابت ہوا۔ والدین نے اس کا نام تراب علی خاں رکھا۔ خاندان کا دستور یہ تھا کہ نومولود کو سب سے پہلے تبرکاً کسی عابدہ، زاہدہ سیدانی کا دودھ پلواتے تھے۔ یہ پیدا ہوئے، تو انھیں ریاست کے ایک معزز منصب دار، میر چراغ علی خاں کی بیگم کا، جو ہمہ صفت موصوف خاتون تھیں، دودھ پلایا گیا۔ اسی لیے میر چراغ علی خاں کے صاحبزادے، میر تہور علی خاں مختار جنگ، جلال الدولہ اور نواب سر سالار جنگ دونوں کی ایک ساتھ پرورش ہوئی اور وہ ان کے رضاعی بھائی ہونے کے باعث ان کے کوکہ کہلاتے تھے۔

میر محمد علی خاں کا عین شباب میں بعمر ۲۵ برس ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تراب علی خاں کی پرورش ان کے جدِّ بزرگوار نواب منیرالملک ثانی نے اپنے ذمے لی، جو ان سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہ چار برس کے تھے کہ انھیں ایسا شدید تپ کا عارضہ لاحق ہوگیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ روایت ہے کہ جب سب کو یاس ہوگئی تو نواب منیرالملک نے دُعا مانگی کہ بارِ الٰہا! اگر اس بچے کی موت مقدر ہی ہے، تو اس کی جگہ مجھے اُٹھا لے اور اسے صحت عطا فرما دے۔ جانے وہ کون سی گھڑی تھی، جب یہ لفظ ان کے منہ سے نکلے۔ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوگئی۔ چند دن میں بچہ بھلا چنگا ہوگیا اور نواب منیرالملک ثانی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

ہونے کو یہ ٹھیک تو ہو گئے، لیکن بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے تندرستی بالکل تباہ ہوگئی اور یہ دائمی طور پر نحیف الجثہ اور منحنی ہو کے رہ گئے۔

منیرالملک کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت، ان کے چچا میر عالم علی خاں بہادر سراج الملک کی نگرانی میں ہونے لگی۔ چونکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اندیشہ تھا کہ مزید بوجھ پڑنے سے یہ اور خراب ہو جائے گی، اس لیے ایک زمانے تک ان کی باقاعدہ تعلیم شروع نہ ہو سکی اور یہ گیارہ بارہ برس کی عمر تک معمولی شُد بُد سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے بعد جب کچھ اچھے ہوئے تو اس پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور انھوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی، حساب کتاب، انشا پردازی اور خوش نویسی کی معقول تعلیم کے علاوہ مردانہ کھیلوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی۔ چنانچہ نشانہ لگانے اور نیزہ بازی اور شہ سواری میں پورے طاق تھے۔ خاص طور پر گھوڑے کی سواری کے بہت شایق تھے۔ بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے پر نڈر سوار ہو جاتے۔ زمانۂ شباب میں انگریزی حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رفتہ رفتہ اس سے بھی بقدرِ ضرورت اچھی خاصی واقفیت پیدا کر لی تھی۔

نواب منیرالملک نے وفات کے وقت پچیس لاکھ قرض چھوڑا تھا۔ غفران منزل نواب ناصرالدولہ بہادر آصف جاہ چہارم نے قرضہ تو بے باق کر دیا لیکن ان کی بیشتر متروکہ جایداد نزول قرار دے دی۔ اس سے خاندان پر گویا عسیرالحالی کا دَور آگیا۔ نواب سراج الملک اگرچہ اپنے والد کی جگہ مدارالمہام ریاست تو ہو گئے، لیکن ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ ان کے مرتبے کے مطابق داد و دہش کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی۔ لامحالہ

انھیں قرض لینا پڑتا تھا۔ لیکن ساہوکار جانتے تھے کہ اس کی واپسی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں، اس لئے وہ کافی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ لطیفہ یہ کہ وہ بالعموم مطالبہ کرتے کہ اگر آپ کے بھتیجے میر تراب علی خاں ضامن ہو جائیں تو ہم قرض دے دیتے ہیں۔ میر تراب علی خاں اس کم سنی کے باوجود، حساب کتاب کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے۔ جب نواب سراج الملک ان سے کہتے کہ تم ضمانت دے دو، تو یہ عرض کرتے: خاکسار کو بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے، لیکن میری التماس یہ ہے کہ جاگیر میں سے کسی علاقے کا انتظام میری تحویل کر دیا جائے، تاکہ میں اس کی آمدنی سے قرضے کی ادائی کا انتظام کر سکوں۔ اس سے دو فایدے ہوئے۔ اول یہ کہ بہت سا قرض بتدریج ادا ہوتا گیا۔ ورنہ وہی صورت ہوتی، جو نواب منیر الملک کی وفات پر پیش آئی تھی۔ دوسرے انھیں چھوٹی سی عمر ہی میں مالی اور انتظامی معاملات کا غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں جب نظام نے نواب سراج الملک کو دوبارہ وزارتِ اعلیٰ پر مقرر فرمایا، تو ان کی خاندانی جایداد بھی واگزاشت کر دی۔ میر تراب علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام سے پہلی جاگیر کی دیکھ بھال ایسی عمدگی سے کی تھی کہ چچا، دل و جان سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے قایل ہو گئے تھے۔ اب جو انھیں ساری جایداد واپس ملی، تو انھوں نے اسے بھی اپنے ہونہار بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔

نواب سراج الملک نے چند دن کی علالت کے بعد ۲۶ مئی ۱۸۵۳ء (۱۷ شعبان ۱۲۶۹ھ) کو لاولد انتقال کیا۔ اس کے پانچ دن بعد نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے میر تراب علی خاں کو طلب کیا اور انگریز ریذیڈنٹ کی موجودگی میں، انھیں خلعتِ دیوانی اور سالار جنگ کے خطاب سے مفتخر فرما کر اپنا مدار المہام یعنی وزیرِ اعظم مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس (۲۴) برس کی تھی۔ میرزا ہمدم شیرازی کے طویل قطعۂ تاریخ کے آخری چند شعر ہیں ؎

فلک رتبہ نوابِ سالار جنگ — تراب علی، نورِ چشمِ جہاں
سرِ باستاں میر احمد لوا — سرِ راستاں آصفِ جم نشاں
وزیرِ خرد مند دانش پذیر — جوان و جواں بخت روشن رواں
بجائے نیاگاں بہ مسند نشست — بہ تدبیر پیر و بہ بخت جواں
پئے سالِ تاریخ ہمدم بگفت — "وزارت مبارک بہ صدرِ جہاں"

۱۲۶۹

جب یہ مدار المہام ہوئے ہیں، تو اس وقت یہاں کی حالت کس درجہ ابتر تھی، اس کا اندازہ صرف اس سے لگایئے کہ ریاست پر دو کروڑ ستر لاکھ کا سودی قرض تھا۔ اس کے علاوہ عرب جمعداروں کے پاس ریاست کی نصف سالانہ آمدنی (یعنی ۶۵ لاکھ) کا علاقہ رہن تھا، اور کوئی پندرہ بیس لاکھ سالانہ کی جاگیریں بھی انہی جمعداروں کے مستقل قبضے میں تھیں اور مزید کم و بیش تیس لاکھ کے علاقے ٹھیکے پر تھے۔ غرض خزانہ خالی تھا اور روز بروز قرض کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوج اور سپاہ کو مہینوں تنخواہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ سخت تنگ آ جاتے تو "بجنگ آمد" پر عمل کرتے ہوئے شاہی محل پر ہلّہ بول دیتے، فساد پر آمادہ ہو جاتے اور بغاوت کی دھمکی دیتے۔ لامحالہ اس پر مزید قرض لے کر دو ایک مہینے کی باقی ادا کر دی جاتی تاآنکہ یہ لوگ پھر مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جاتے۔

مالی بدحالی کا یہ حال تھا۔ رہا انتظامِ حکومت تو وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ریاست میں عرب جمعداروں اور روہیلے پٹھانوں کا دور دورہ تھا۔ ان کی شورہ پشتی اور رعایا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے واقعات لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ ایک عرب نے راہ چلتے ایک شریف آدمی سے کہا کہ صاحب، ذرا یہ دستاویز تو پڑھ دیجیے۔ اس نے دیکھ کر کہا کہ یہ چار سو روپئے کا تمسک ہے۔ عرب نے بگڑ کے کہا: واہ، خوب آدمی ہے، پانسو کے تمسک کو چار سو کا بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس میں تو چار سو ہی لکھا ہے۔ اگر اعتبار نہیں، تو کسی اور سے پڑھوا لو۔ اس پر عرب نے غیظ و غضب سے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین پھاڑ کے پھینک دیا اور اس غریب کے گلے میں رومال ڈال کے کہنے لگا: اچھا چلو اس وقت چار سو ہی ادا کر دو، بقیہ کی پھر دیکھی جائے گی۔ اب تو وہ شخص چیخنے لگا کہ میں نے کب تم سے کچھ لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے، وہ عرب اسے کھینچ کے ساتھ لے چلا۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔ ان کے ظلم کا ایک اور افسوس ناک واقعہ سنیے۔

احمدؐ علی خاں شہیدؔ تخلص منصب دارِ ریاست تھے۔ ان کی ایک نابالغ بیٹی تھی۔ عربوں کے جمعدار نامر رستم جنگ نے اپنے بھتیجے کے لیے شہیدؔ سے اس لڑکی کی خواستگاری کی۔ شہیدؔ نے کسی وجہ سے انکار کر دیا زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شام ان کے دروازے پہ ایک فقیر نے آکے سوال کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کی بیوی اور اس معصوم لڑکی کے سوائے گھر پہ کوئی نہیں تھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ، فقیر کو روٹی دے آؤ۔ جب دیر تک لڑکی واپس نہ آئی، تو ماں پکارتی ہوئی دوڑی۔ دیکھا تو لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ بہت چیخی چلاّئی، لیکن بے سود—! اگلی صبح شہیدؔ غریب نے مکان کا دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ سامنے گلی میں ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اسے کھولا، تو اس میں سے دخترِ گم شدہ کی لاش کے ٹکڑے ملے۔ کوتوالی گئے، فریاد کی، لیکن اب کیا ہوتا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

روہیلے پٹھان بھی ان عربوں سے کم نہیں تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے پیر سلطان میاں کو مہدیِ زمان مانتے تھے، اس لیے مہدوی کہلاتے تھے۔ ان کے تمرّد اور سرکشی کا اس سے اندازہ لگایئے کہ ایک دن ان کے پیرزادے کی سواری، جن کا نام محمدؐ تھا، حسبِ معمول بڑی دھوم دھام سے بازار میں جا رہی تھی۔ بلّم بردار وں اور بھال داروں کا ایک گروہ ان کے جلو میں، ہٹو بچو کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف سے حضور نظام کے پیش امام مولوی مرتضیٰ کے بھتیجے گھوڑے پر سوار آ رہے تھے۔ اس شور و شغب سے ان کا گھوڑا چمکا اور کارِ قضا اس کے پاؤں سے کیچڑ کا ذرا سا چھینٹا اڑ کر پیرزادے صاحب کے دامن پر آ پڑا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ان کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ ایک بلّم بردار نے بلّم کی نوک سے مولوی زادے کی پگڑی اچھال کے زمین پر پھینک دی۔ یہ غیرت اور غصّے کے مارے بے حال ہو گئے اور ساتھ کے خدمت گار سے تلوار لے کر ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دوسرے نے تلوار کا ہاتھ مارا۔ جس سے ان کی چار انگلیاں کٹ کے الگ ہو گئیں۔ پھر کیا تھا پیرزادے کے ہمراہی ان پر ٹوٹ پڑے اور تلوار، کٹار، بھالے سے ان کے پرزے اڑا دیے۔ دارالخلافے میں، دن دہاڑے، عین سرِ بازار یہ حادثہ پیش آیا اور کوئی ان ظالموں کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

ہر ایک رئیس نے جمعیت اکٹھا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ رعایا پر ظلم و تعدّی کرتے اور ان سے جو چاہتے، وصول کر لیتے۔ اگر کوئی انکار کرتا تو اسے کھلے بندوں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ پھر ان کی آپس میں خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

غرض ریاست کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرونی طور پہ کامل خلفشار کا عالم تھا اور باہر نہ اس کی کوئی عزّت تھی نہ وقار۔

سالار جنگ نے زمامِ وزارت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے ریاست کی مالی حالت کی اصلاح پہ توجہ دی کہ دراصل یہی جملہ خرابیوں کی جڑ تھی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس پشت ہا پشت سے اتنی بڑی بڑی جاگیریں چلی آ رہی تھیں، جن کی لاکھوں کی آمدنی سے اُن کی حیثیت گویا خود مختار رئیس کی ہو گئی تھی، وہ بھلا کیوں ان سے دست بردار ہونے لگے تھے۔ لیکن سالار جنگ نے بہت دبیر اور دُور اندیشی اور حکمت عملی سے کام لیا۔ کہیں نرمی سے جاگیر دار کو رام کیا اور کہیں ضرورت پڑے پہ سختی سے کام نکالا۔ یوں تیرہ برس کے عرصے میں ریاست کا تمام قرض بھی ادا کر دیا، مرہونہ علاقے بھی واگزار ہو گئے، فسادی عناصر کا بھی قلع قمع ہو گیا، اور وہی ریاست جس کی نہ گھر میں کوئی ساکھ تھی، نہ باہر پوچھ، اب ہندستان کی سب سے طاقتور ریاست شمار ہونے لگی۔

ان سے پہلے ریاستی کاروبار میں کسی نظم و ترتیب کا پتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ نظام اور ان کے مدار المہام کی ذاتی رائے پہ موقوف تھا۔ اب ریاست کے تمام محکمے سالار جنگ بہادر کی توجہ اور بیدار مغزی سے عالمِ وجود میں آئے۔ سب سے پہلے خزانۂ عامرہ قائم ہوا پھر لوگوں کو تنخواہ باقاعدگی سے مہینے کے مہینے ملنے لگی۔ اس کے بعد انھوں نے کاروبارِ ریاست کو چار انتظامی شعبوں میں تقسیم کر کے انھیں چار امیروں کے سپرد کیا، جن کی حیثیت گویا وزیروں کی تھی۔ یہ صدر المہام کہلاتے تھے۔ اس طرح گویا ایک کابینہ مرتب ہو گئی۔ غرض ان کے عہد میں یہ سب کام کاج ایک مہذّب اور متمدّن نظام کے مطابق ہونے لگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب کچھ بے غل و غش آسانی سے ہو گیا۔ صرف حاسدوں اور فتنہ پردازوں ہی نے قدم قدم پہ روڑے اٹکائے ہوتے، تو اس سے تعجب نہ ہوتا، کیونکہ ان کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ انھیں بدنام کریں اور

ناکام بنا دیں ۔ سب سے بڑی مشکل خود غفران منزل نواب ناصر الدولہ کی
تھی ۔ سالار جنگ مرحوم جی جان سے چاہتے تھے کہ نہ صرف ریاست میں
انگریزی طرزِ حکومت ہی رائج کیا جائے بلکہ خود انگریزوں سے بھی پورا
ربط ضبط اور دوستی کا رشتہ قایم ہو جائے ۔ انھیں اس کا پوری دیانتداری
سے یقین تھا کہ اسی میں ریاست کی بھلائی ہے ۔ دوسری طرف نواب ناصر الدولہ
سخت و بیدار قسم کے انسان تھے ۔ وہ انگریز اور انگریزی قانون اور انتظام
کے نام تک سے بھڑکتے اور برہم ہوتے تھے ۔ جب حکمران کے یہ خیالات ہوں
تو وزیر کی حالت قابلِ رحم کیوں نہ ہو ۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سالار جنگ
کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا ۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی مایوس نہیں
ہوئے ، پورے استقلال اور وقار سے اپنی حکمتِ عملی پر قایم رہے اور بتدریج
ریاست میں اصلاحات کا نفاذ کرتے رہے ۔

غفران منزل نواب ناصر الدولہ کا ۱۸۵۷ء میں انتقال ہو گیا ۔
بسترِ مرگ پر انھوں نے اپنے وارث نواب افضل الدولہ (آصف جاہ پنجم)
اور وزیر نواب سالار جنگ کو وصیت کی کہ حکومت انگریزی کا برتاؤ ہماری
ریاست سے ہمیشہ دوستانہ رہا ہے ، اس لیے تمھارا فرض ہے کہ تم بھی اس
سے وفاداری کا تعلق رکھو ۔ جس دن نواب افضل الدولہ گدی پر بیٹھے ہیں ،
اسی دن دلی سے اس ہنگامے کے شروع ہونے کی خبر حیدرآباد پہنچی جس
نے آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ پھر ان دونوں
نے جس طرح مرحوم کی آخری نصیحت پر عمل کیا ، وہ ان کے کردار کی
بلندی پر دال ہے ۔ انھیں ہر طرح کی دھمکیاں دی گئیں بلکہ دھمکیوں سے
گزر کر ان پر دو قاتلانہ حملے ہوئے ، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے ۔ جو
راستہ انھوں نے اختیار کیا تھا ، اس پر بے خوفی اور مضبوطی سے
قایم رہے ۔

نواب افضل الدولہ نے تخت نشین ہوتے ہی انھیں خطاب مختار الملک
سے سرفراز فرمایا ۔ میر احمد علی خاں شہید نے تاریخ کہی ہے

بہ نواب سالار جنگ اہلِ حشمت — خطاب و جواہر سزاوار بادا
بہ دل داشتم فکرِ سالِ ہمایوں — خرد گفت : "جاوید مختار بادا"
(۱۲۷۳)

نواب افضل الدولہ کے عہد میں بھی پورا زمانہ یہی مدار المہام رہے ۔ خوش اعتقادی
اور دینداری میں یہ بھی اپنے والد مرحوم نواب غفران منزل سے کم نہیں تھے ۔
اسی لیے ان کی نئی نئی جدتوں سے اکثر جزبز ہوتے ، بلکہ معاندوں کی
ریشہ دوانیوں کے باعث برافروختہ اور ناراض تک ہوتے رہتے تھے
لیکن انھیں بھی ان کی وفاداری اور خیر خواہی پر کامل اعتماد تھا ۔ اور سالار جنگ
نے بھی اپنی جاں فشانی اور اخلاص سے دن رات محنت کر کے ریاست کو
چار چاند لگا دیے ۔ ۱۸۵۷ء میں ریاست نے جو رویہ اختیار کیا تھا
اس سے انگریزی حکومت ان کی دوستی کی قایل ہو گئی تھی ۔ چناں چہ
جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور ملک کے سب حصوں پر انگریزی
تسلط از سرِ نو قایم ہو گیا ، تو ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے اظہارِ خوشنودی
کے طور پر نواب افضل الدولہ کے لیے ایک لاکھ روپے کے اور مختار الملک
کے لیے بیس ہزار کے تحایف ارسال کیے ۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں
مختار الملک کو "سر" کا خطاب بھی دیا ، پھر ۱۸۷۱ء میں نائٹ گرانڈ کمانڈر
آف دی آرڈر آف سٹار آف انڈیا G. C. S. I. کا خطاب
اور ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر اکیس توپ کی سلامی کا ذاتی اعزاز
ملا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سلطان عبدالحمید خلیفۃ المسلمین نے بھی
تمغۂ مجیدی درجہ اوّل عطا کیا ۔

مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا
اور ان کے ڈھائی سالہ صاحبزادے میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم
ان کے جانشین ہوئے ۔ اب مختار الملک کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں ۔
سرکار انگریزی نے ان کے ساتھ نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر کو شریک
ریجنٹ مقرر کیا تھا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامرا نے کبھی ان کے
کام پر اعتراض نہیں کیا ۔ اور یہ ہر معاملے میں اپنی صوابدید ہی سے
فیصلہ کر دیتے تھے ۔ جب نواب شمس الامرا کا اپریل ۱۸۷۷ء میں انتقال
ہو گیا ، تو ان کی جگہ نواب رشید الدین خاں وقار الامرا شریک ریجنٹ
مقرر ہوئے ۔ چار برس بعد دسمبر ۱۸۸۱ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے
ہو گئے ، تو اب ان کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں
کی گئی ۔ اب گویا "مختار الملک" اسم بامسمیٰ ہو گئے ۔

شروع میں برار کا علاقہ دراصل ریاست حیدرآباد ہی کا حصہ
تھا ۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے اسے انگریزی فوج متعینہ ریاست
کی بقایا تنخواہ کے عوض میں اپنی تحویل میں لے لیا ۔ مختار الملک نے

مدارالمہام مقرر ہوتے ہی اس انتظام کی خرابی محسوس کر لی تھی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جب تک ریاست کی مالی حالت خستہ رہی، اس کی واپسی کی کوشش بھی بے سود تھی۔ جب انھوں نے اپنی مسلسل مساعی اور اصلاحات سے ریاست کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا اور انگریزوں پر بھی ثابت ہو گیا کہ حیدرآباد کا نظم و نسق کسی دوسری جگہ سے کم نہیں، تو انھوں نے استردادِ برار کی کوشش شروع کی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو ہندستان میں جن خطرناک حالات کا سامنا تھا، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان ایام میں بھی نواب مختارالملک نے سخت مخالفانہ صورتِ حال کے باوجود پوری وفاداری اور ثابت قدمی سے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ انگریز ان کی خدمات کے اعتراف میں برار واپس کر دیں گے۔ لیکن چونکہ اس قضیے کا فیصلہ بہر حال ولایت میں ہونا تھا اور ہندستان کے حکام محض وہاں کے احکام نافذ کرنے والے تھے، اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ انگلستان کا سفر کیا جائے اور ذاتی گفت و شنود سے یہ معاملہ طے کرایا جائے۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم کے نام سے ملکہ وکٹوریہ کے جانشین ہوئے) ہندستان کی سیر کو آئے۔ ان کے حاشیہ میں ڈیوک آف سدرلینڈ بھی تھے۔ وہ سیر کے لیے جنوری ۱۸۷۶ء میں حیدرآباد پہنچے اور یہاں نواب مختارالملک کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے روانگی سے پہلے، انھیں انگلستان آنے اور اپنے ہاں مہمان بننے کی دعوت دی۔ یہ تو پہلے ہی سے اس سفر کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس دعوت نے گویا سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام دیا۔ چنانچہ وہ ۸۔ اپریل ۱۸۷۶ء کو (۵۲) آدمیوں کے قافلے کے ساتھ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ راستے میں وہ روما میں شاہ وکٹر عمانویل بادشاہِ اطالیہ اور پوپ سے ملے اور اس کے بعد اطالیہ کے بعض دوسرے شہروں کی سیر کرتے ہوئے ۱۲۔ مئی کو پیرس پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں صرف ایک دن رک کر آگے روانہ ہو جائیں گے، جہاں کا مفصل پروگرام پہلے سے بن چکا تھا۔ لیکن پیرس میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا جس سے سارا انتظام تلپٹ ہو گیا۔ جس دن یہ یہاں پہنچے ہیں، اسی شام کو اپنی قیام گاہ گرانڈ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان کی بے بسی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ چلنے پھرنے تک سے معذور تھے۔ اس حالت میں سفر کیونکر ہو سکتا تھا۔ غرض انھیں علاج کے لیے مجبوراً دو مہینے یہاں رکنا پڑا۔ جب قدرے افاقہ ہوا اور وہ سفر کے قابل ہوئے تو یکم جون کو ایک خاص بحری جہاز پر سوار ہو کر ولایت پہنچے۔ یہاں ان کی جتنی خاطر مدارات اور اعزاز و اکرام ہوا، اس کا تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے۔ ہر جگہ جلسے اور دعوتیں ہوئیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف سول لا D. C. L. کی اعزازی ڈگری ملی۔ لنڈن کی کاؤنٹی کونسل نے ایک خاص اجلاس میں انھیں آزادشہری Freedom of the city of London کا اعزاز دیا۔ خود ملکہ وکٹوریہ نے ایک دن ونڈسر محل میں مہمان رکھا۔ بے شک یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن جس مقصد کے لیے انھوں نے اتنا دور دراز کا سفر اور بے شمار خرچ گوارا کیا تھا اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ، بلکہ اس سے متعلق کوئی گفتگو تک نہ ہو سکی۔ جب انھوں نے وزیرِ اعظم انگلستان سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کرنے کی درخواست کی، تو جواب ملا کہ ہم بہت مسرت سے ملیں گے، لیکن برار کے مسئلے پر کوئی بات چیت نہ کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ حکومت انگریزی کی اس سرد مہری اور بے رخی سے نواب مختارالملک کے دل کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ اپنے مقصد میں اس ناکامی کو کبھی نہیں بھولے۔ یہ قافلہ بحسن و خوبی ۲۴۔ اگست کو واپس بمبئی اور اگلے دن ۲۵۔ اگست کو حیدرآباد پہنچا۔

فروری ۱۸۸۳ء میں ڈیوک آف مکلنبرگ حیدرآباد تشریف لائے۔ یہ ولایت کے شاہی خاندان کے فرد تھے اور وہاں کے سفر کے زمانے سے نواب صاحب موصوف کے ان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب مختارالملک کا ارادہ تھا کہ ۸۔ فروری کو بڑے وسیع پیمانے پر ان کے اعزاز میں پُر تکلف دعوت دیں۔ سوءِ اتفاق سے اس سے دو ایک دن پہلے نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نواب شمس الامرا مرحوم کی بیگم تھیں۔ اس پر وہ دھوم دھامی دعوت منسوخ کرنا پڑی اور فیصلہ ہوا کہ اس کی جگہ صرف ساٹھ آدمیوں کی ایک مختصر سی دعوت دی جائے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔ سات کی شام کو وہ حسبِ معمول بہت رات گئے تک اپنے فرائضِ منصبی کی

دیکھ بھال میں مشغول رہے۔ دو بجے شب کو یکایک طبیعت خراب ہو گئی۔ اطبا نے تشخیص کی کہ ہیضہ کا حملہ ہوا ہے، لیکن کسی نے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا اور سب اپنے اپنے کام کاج میں مشغول رہے یہاں تک کہ دونوں صاحبزادے بھی صبح کے وقت باریاب ہو کر پروگرام کے مطابق مہمانِ معظم کے ساتھ شکار پر روانہ ہو گئے۔ پہلے اپنے ذاتی معالج کا علاج رہا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور طبیب میرزا علی سے رجوع کیا گیا، لیکن مرض میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی اور ان کی حالت رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سہ پہر کو دو بجے کے لگ بھگ مسٹر جونس W. B. Jones انگریز ریذیڈنٹ عیادت کے لئے آیا۔ اس نے واپس جاکر ریذیڈنسی کے ڈاکٹر بوماں Beaumont کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ لیکن وقت آ لگا تھا۔ قے اور اسہال کی کثرت سے سخت نڈھال ہو گئے تھے۔ دوا اور دعا سب بے کار ثابت ہوئیں۔ القصہ پورے تیس برس تک اپنے ملک اور مالک کی نیک طینتی اور دیانت، دانائی اور بیدار مغزی کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد ۸۔ مئی جمعرات کی شام کے ساڑھے سات بجے جان بحق ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ

تاریخِ وفات کا مصرع ہے ع

گم بشد معدنِ فطرت ز دکن

ایک دوسری تاریخ ’جنازہ وزیرِ اعظم‘ میں بہت حضرات کو توارد ہوا۔

جنازہ جمعے کے دن ۹۔ مئی کو اٹھا۔ حیدرآباد کے مشرقی حصے میں تالاب میر جملہ کے قریب دایرہ میر مومن میں محوِ خوابِ ابدی ہیں، جہاں اس زمانے میں یہاں کے شیعہ اصحاب دفن ہوا کرتے تھے۔ خاندانِ مختار الملک کے مدافن اس دایرے میں ایک الگ چاردیواری میں ہیں۔ مختار الملک کی قبر اندر چبوترے کی سیدھی جانب واقع ہے۔

نواب مختار الملک کا نکاح ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں نواب میر غلام حسین خاں فخر الملک بہادر کی صاحبزادی حیات النسا بیگم سے ہوا تھا۔ شادی کے بعد شوہر نامدار کے گھر میں ان کا عزیز النسا بیگم نام اور دولہن پادشاہ خطاب قرار پایا۔ نواب صاحب کی وفات کے وقت ان کی مندرجہ ذیل اولاد موجود تھی:۔

دو بیٹیاں نور النسا بیگم عرف بڑی صاحبزادی اور سلطان بخت افروز بیگم عرف چھوٹی صاحبزادی۔

دو بیٹے تھے، میر لائق علی خاں۔ ولادت ۱۲۔ نومبر ۱۸۶۲ء۔ خطابات: سر، سالار جنگ، مختار الملک، عماد السلطنت، کے سی ایس آئی۔ صرف ۲۲ برس کی عمر میں جنوری ۱۸۸۴ء میں مدار المہام دکن ہوئے۔ عین شباب کے عالم میں ۶ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ میر یوسف علی خاں سالار جنگ انھیں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت صرف ۲۵ دن کے تھے۔ بڑے صاحب ذوق اور ماہرِ فنونِ لطیفہ تھے۔ حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کا جملہ سامان اور کتاب خانہ بیشتر انھی کا جمع کیا ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۹ء میں لاولد فوت ہوئے۔

دوسرے بیٹے نواب مختار الملک کے میر سعادت علی خاں تھے۔ ان کی ولادت اپریل ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ غیور جنگ، شجاع الدولہ، منیر الملک ثالث بہادر ان کے خطاب تھے۔ انھوں نے بھی ۲۷ برس کی عمر میں ۲۷۔ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاولد انتقال کیا۔

از خاندانِ کسریٰ دیگر کسے نماند

(۲)

غالب نے اگست ۱۸۶۰ء (صفر ۱۲۷۷ھ) میں اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ، معلوم نہیں کس کی تحریک پر، نواب مختار الملک کی خدمت میں نذر بھیجا۔ ان کی طرف سے تو کوئی جواب نہ ملا، لیکن منشی محمد حبیب اللہ ذکا نے، جو ان کے میر منشی تھے، انھیں ایک خط لکھا، جس میں میرزا سے ان کے دیوان فارسی اور ماہِ نیم ماہ کی فرمائش کی تھی۔ غالب نے خیال کیا کہ یہ فرمائش نواب مختار الملک بہادر کے ایما سے ہوئی ہے اور جواب میں لکھا[۵] کہ ماہِ نیم ماہ وجود میں آیا ہی نہیں اور کلیاتِ فارسی کا پہلا ایڈیشن کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جو نسخے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں ضائع ہو گئے۔ اس کی دوبارہ اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا، تو مطبوعہ نسخہ حاضرِ خدمت ہوگا اور

---

۵ کلیاتِ نثرِ فارسی (غالب) ص ۲۴۶ - ۲۴۷

اگر اس کا انتظام نہ ہو سکا تو کاتب سے لکھوا کے قلمی نسخہ بھجوا دوں گا۔
معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے بعد انھوں نے وہ قصیدہ نواب مختار الملک بہادر کی مدح میں لکھا اور ان کے منشیِ انشا مولوی موید الدین خاں کی وساطت سے ان کی خدمت میں گزرانا، جس کا مطلع ہے ؎

در مدح سخن چساں نگویم ۔۔۔ شرطست کہ داستاں نگویم

اور جو کلیات مطبوعہ میں نمبر ۳۶ پر چھپا ہے۔ غالب بالعموم قصاید خاص اہتمام سے خوشنویس سے افشانی کاغذ پر لکھوا کے ممدوح کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قصیدہ انھوں نے اپنے قلم سے لکھ کے حیدرآباد بھیجا تھا۔ ان کی اصلی تحریر آج بھی سالار جنگ میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے، صلۂ ستایش تو درکنار، ممدوح کی طرف سے اس کی رسید تک موصول نہ ہوئی۔ اس پر انھوں نے ایک عرضداشت لکھی جو ان کے کلیاتِ نثر فارسی میں شامل ہے (ص ۷۴۲-۸۴۲)۔ اس پر بھی صدائے برنخاست۔ اس کے بعد انھوں نے تو خط یکے بعد دیگرے نواب صاحب ممدوح کے نام لکھے۔ لیکن جب کسی کا جواب نہ ملا تو انھوں نے مولوی موید الدین سے استمداد کی (جن کے ان سے پہلے کے مراسم تھے) اور پہلی عرضداشت کی نقل بھی ملفوف کر دی۔ مولوی صاحب نے نواب مختار الملک کو اپنے نام کا یہ خط دکھایا اور عرضداشت بھی پیش کی۔ اس پر حکم ہوا کہ دارالانشا میں تفتیش اور تلاش کی جائے، تاکہ میرزا صاحب کو جواب لکھا جا سکے۔ اس دوران میں کلیاتِ نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا تھا۔ میرزا نے حسب سابق اس کا ایک نسخہ بھی مولوی موید الدین خاں کی معرفت نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا اور لکھا کہ اگر پہلا قلمی قصیدہ دارالانشا میں دستیاب نہ ہو سکے، جب بھی یہ کلیاتِ مطبوعہ میں ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے (نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۹-۱۰)

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھیں قصیدے پر کچھ انعام ملا یا نہیں۔

کتابیات

۱۔ مرقعۂ عبرت از نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی (ترجمہ مولوی مہدی حسن)
اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد (۱۳۰۰ھ)

۲۔ ریاضِ مختاریہ سلطنت آصفیہ ۔۔۔ از میر دلاور علی دانش
مطبع ہزار داستاں، حیدرآباد (۱۹۴۲ء)

۳۔ سر سالار جنگ اعظم ۔۔۔ از ابو المکارم فیض محمد
افتخار پریس، حیدرآباد (۱۹۵۰ء)

۴۔ تاریخ حیدرآباد دکن ۔۔۔ از مولوی محمد نجم الغنی
نولکشور پریس، لکھنؤ (۱۹۳۵ء)

۵۔ کلیات نثر غالب (فارسی) ۔۔۔ از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۸۸۴ء)

۶۔ کلیات نظم غالب (فارسی) ۔۔۔ از غالب
مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۹۲۴ء)

۷۔ اردوئے معلی ۔۔۔ از غالب
کریمی پریس، لاہور (۱۹۲۲ء)

۸۔ نگار (ماہنامہ) لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۵۹ء

۹۔ دستاویز ۔۔۔ Pol. A-Sept., 1880- NOS. 150/158
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

۱۰۔ دستاویز ۔۔۔ Pol. A-April 1583- NOS. 95/100
(موجودہ دفتر خانۂ قومی ہند، نئی دہلی)

سکندر علی وجد

غزل

اہلِ جنوں کی لغزشِ پیہم
دنیا کے سنگیت کا سرگم

ایک حقیقت ایک فسانہ
آنکھ میں آنسو پھول پہ شبنم

حُسن کی اک معصوم نظر سے
دل کی دنیا درہم برہم

وہ تصویرِ حسن و جوانی
گنگا اور جمنا کا سنگم

اُن کی ہستی کیف سراپا
اپنی ہستی درد مجسّم

جب سے مری محفل سے گئے وُہ
نبض کی جنبش مدّھم مدّھم

اے شبِ ہجراں ہم کو اُن کے
غم کا بھی غم اپنا بھی غم

تیرے سوا اے جلوۂ جاناں
جو کچھ دیکھا بھول گئے ہم

جانِ سخن ہے شانِ سخن ہے
شوقِ زُلیخا عصمتِ مریم

ایک تبسّم غنچہ غنچہ
ایک تجلّی عالم عالم

وجد جہاں میں اہلِ نظر کا
کوئی نہیں ہے مونس و محرم

میکش اکبرآبادی

مرزا غالب ایک صوفی کی حیثیت سے

(اپنے چند غیر مطبوعہ خطوط کی روشنی میں)

"علم تصوف سے جس کی نسبت لکھا گیا ہے کہ 'برائے شعر گفتن خوب است' ان کو (مرزا غالب کو) خاص مناسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے ان کے مطالعے سے گزرے تھے اور سچ پوچھئے تو انھیں متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا تھا۔"

یادگارِ غالب صفحہ ۵۴

مطبوعہ مطبع فیض عام علی گڑھ

"انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہلبیتِ نبی کی محبت"

یادگارِ غالب صفحہ ۱۱۲

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ"

یادگارِ غالب صفحہ ۲۹

ان اقتباسات سے ثابت ہے کہ مرزا غالب کا صوفی ہونا کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے صوفی تھے۔ انکا تصوف کی کتابوں کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور یہ کہ وہ خالی اوقات میں مسئلہ وحدۃ الوجود پر غور بھی کیا کرتے تھے۔

اس غور و فکر کو تصوف میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور مجاہدہ و اعمال پر اسے بہ مراتب فوقیت دی گئی ہے۔ الطبقات الکبریٰ میں علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک خاص صحابی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

وکان رضی اللہ عنہ یقول تفکر ساعۃ خیر من قیام اربعین لیلۃ

"وہ (ابودرداء رضی اللہ عنہ) کہا کرتے تھے ایک ساعت کا تفکر چالیس راتوں کے قیام (عبادت و نماز) سے بہتر ہے"

طبقات صفحہ ۲۷ جلد اول

تصوف ایک مسلک اور عقیدہ بھی ہے، ایک مستقل علم اور فلسفہ بھی ہے اور ایک مخصوص حال اور وجدان بھی۔ کسی ایک ذات میں ان تینوں باتوں کا جمع ہو جانا ایک بڑی اہم بات ہے۔ مرزا غالب کا مسلک اور عقیدہ ان کے اشعار اور مختلف تحریروں سے معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن اس فلسفے کے عالم کی حیثیت سے اور صاحبِ حال و وجدان کی حیثیت سے ہم اُن سے واقف نہیں ہیں۔ یہ واقفیت اُن چند غیر مطبوعہ خطوط سے حاصل ہوئی ہے جو مرزا غالب اور حضرت جی خدا نما غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے مابین لکھے گئے اور جو حضرت غمگین کے ایک مرید خاص حضرت ہدایت النبی صاحب قادری گوالیاری نے ایک رسالے کی شکل میں

مرتب کرئے ہیں۔ یہ خطوط حضرت غمگینؔ رح کے سجادہ نشین عالی جناب کپتان سردار سید غنی محمد شاہ حضرت جی کی ملکیت ہیں اور ان کے صاحبزادہ حضرت سید رضا محمد حضرت جی کی نوازشِ خاص کے سبب سے ہیں ان سے استفادہ کرسکا ہوں۔

یہ سب خط تعداد میں ۱۲ ہیں جن میں سے ۹ مرزا غالب کے اور باقی حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔ مرزا غالب نے حضرت صاحب کو قبلۂ حاجات اور پیر و مرشد کے القاب سے مخاطب کیا ہے اور حضرت صاحب نے مرزا صاحب کو مشفق کے لقب سے یاد فرمایا ہے۔ ان خطوط میں سے اکثر حقائق اور مسائلِ تصوّف کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور اس علم سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے ایک نعمت الہٰی اور لطیفۂ غیبی۔ لیکن اندازِ بیان اور فلسفیانہ اصطلاحات اور خود مسائل کے دقیق ہونے کی وجہ سے عام دل چسپی کی چیز نہیں البتہ مرزا غالب سے دل چسپی رکھنے والوں کے لئے چند انکشافات بہت اہم ہیں۔

(۱) یہ کہ مرزا غالب اپنے صوفیانہ عقائد کے علاوہ عملاً بھی صوفی تھے اور شغلِ برزخ ان کا معمول تھا۔ یہ شغل صوفیوں میں منتہی حضرات کا شغل سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فنا و بے خودی کی کیفیت سے بھی سرفراز تھے اور یہ حال ان پر اکثر طاری ہوجاتا تھا۔ اس حال کی صوفیوں کے تمام مکاتیبِ فکر میں بڑی قدر و قیمت ہے اور اسلامی اور غیر اسلامی صوفیوں کی ایک اہم منزل ہے۔

(۲) مرزا غالب کی واقفیت فلسفۂ مابعد الطبعیات اور مسائلِ تصوّف سے غیر معمولی تھی۔ یہ قابلیت اُن کے خطوں سے بھی معلوم ہوتی ہے اور خود حضرت غمگین نے بھی اس کا اعتراف فرمایا ہے۔ ایک خط میں حضرت نے لکھا ہے کہ جو واقفیت آپ کو ہے وہ اس دور کے علماء ظاہر کو نہیں ہے۔

(۳) مرزا صاحب اپنے شغل سے نوشتی کو اپنے بزرگوں او قابلِ احترام شخصیتوں سے بھی پوشیدہ نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے کمالاتِ باطن کو اپنے احباب پر بھی ظاہر نہ کرتے تھے۔ درحقیقت یہ ایک بڑی نادر اخلاقی اعتبار سے بہت اہم خوبی ہے جس سے عموماً بڑے بڑے صاحبانِ باطن اور علماء و متقی بھی محروم ہیں۔

اصل مسائل کی تفصیل کے لئے پورے خطوط کا مطالعہ ضروری ہے پھر بھی اس مضمون سے خطوط کے مضامین اور مسائل کا بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

حضرت غمگین اور مرزا غالب کے ان خطوں میں خاص زیرِ بحث مسئلہ وحدۃ الوجود اور فنا کا ہے۔ بے خودی یا فنا دراصل وحدۃ الوجود ہی کا ایک ذیلی یا ضمنی مسئلہ ہے۔ یہ دونوں نظریے اسلامی اور غیر اسلامی تصوّف میں مشترک ہیں۔ وحدۃ الوجود کو ان سادہ الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ برہما یا خدا کے سوا کوئی موجود نہیں ہے لیکن اربابِ وحدۃ الوجود کے مختلف مکاتیبِ خیال ہیں۔ ان کے فرق کو سمجھے بغیر اس مسئلے کو اچھی طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس مسئلے کا اندازِ بیان اور طرزِ استدلال ابتدائی عہد کے اسلامی صوفیوں کا وہی تھا جو قرآن و حدیث اور اس دور کی دوسری اہم تصانیف کا تھا۔ یہ سادہ اندازِ بیان سنائی عطّار اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے زمانے تک ملتا ہے۔ اس اندازِ بیان کے علاوہ دوسرا انداز جو یونانی فلسفے کے اثر سے پیدا ہوا وہ شیخ محی الدین ابن عربی کا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین عربی شیخ شہاب الدین سہروردی کے ہم عصر ہیں۔ وہ اپنے نظریات کا ماخذ اور اصل قرآن و حدیث کو ہی قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال کا انداز صاف اور سادہ نہیں ہے بلکہ اس میں تو فلاطونی نظریات اور فلسفے کی اصطلاحات شامل ہوگئی ہیں۔ ابنِ عربی کے بعد کی تصانیف میں منطق اور فلسفے کی اصطلاحات اور زیادہ شامل ہوتی گئیں اور جن دلیلوں سے متاخرین فلاسفہ اپنے نظریات ثابت کرتے تھے۔ ان دلیلوں سے ہی صوفیہ نے ان کے مسلک کی تردید اور اپنے مسلک کی تائید کی۔ مرزا غالب اور حضرت غمگین کے زمانے میں یہی طرز مقبول تھی اور یہ خطوط اسی طرز کا کامیاب نمونہ ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو اپنے زمانے میں علومِ معقول کے امام

ـــــــــــــــ

ل حضرت غمگین رح کا حال مختلف کتابوں میں ہے اور اتنا معروف ہے کہ اس موقع پر اس کی تفصیل غیر ضروری معلوم ہوئی۔ حضرت کا سنہ پیدائش ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۳ء اور وفات ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) ہے جب کہ مرزا غالب کا سالِ پیدائش ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) اور سالِ وفات ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء ہے۔

سمجھے جاتے تھے وحدۃ الوجود کے بڑے زبردست حامی تھے اس پر ان کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف بھی ہے جس کا نام "فیض الموجود فی اثبات وحدۃ الوجود" ہے ۔ مجھ سے مولانا کے بھتیجے مولانا اولاد حسین صاحب خیرآبادی فرماتے تھے کہ مولانا کے اثر سے ہمارے خاندان کی لونڈیاں تک وحدۃ الوجود کو حق سمجھتی تھیں ۔ اس کے علاوہ حسنِ اتفاق سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بھی جو علوم منقول (تفسیر حدیث وغیرہ) کے امام تھے اس مسئلے کی حقانیت کے قائل تھے اور اس وجہ سے علماء ظاہر بھی اس سے متاثر تھے ۔ غالب اور مولانا فضل حق میں بہت زیادہ ارتباط تھا اس لئے قیاس یہ ہے کہ علاوہ اور وجوہ کے مولانا کی صحبت بھی ان پر اثر انداز ہوئی ہوگی ۔ لیکن یہ سب باتیں صرف علمی اعتبار سے مرزا غالب کو متاثر کر سکتی تھیں اور ان کے عقیدے کے قیام میں مدد دے سکتی تھیں مگر دیکھنا یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیوں کے اشغال کے طریقے اور ان کی مشق و مزاولت کے سلیقے کیسے معلوم ہوئے ۔

اس بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی یہ اطلاع رہنمائی کر سکتی ہے کہ مرزا غالب کو مولانا فخر الدین دہلوی[2] کے خاندان میں بیعت تھی ۔ آب حیات میں آزاد نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ کس سے بیعت تھے لیکن مولانا حالی نے یادگار غالب میں کئی جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ مرزا صاحب حضرت میاں کالے صاحب[2] کے مکان میں کئی سال رہے اور حضرت کے ذریعے سے مرزا غالب کی رسائی قلعۂ معلیٰ تک ہوئی ۔ حضرت میاں کالے صاحب حضرت مولانا فخر الدین دہلوی کے پوتے اور جانشین تھے اور خود بہادر شاہ بھی حضرت سے بیعت تھے اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ مرزا غالب کو صوفیانہ تعلیمات حضرت میاں کالے صاحب ہی سے پہونچی ہوں گی ۔

اس تمہید کے بعد اصل خطوط میں سے کچھ مخصوص موضوعات و مضامین کی طرف اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے ان خطوط سے اجمالی تعارف بھی ہو جائے گا اور کوئی خاص قابلِ ذکر بات رہ بھی نہ جائے گی ۔ اصل خط فارسی میں ہیں ان کی عبارات نقل کرنے سے قصداً گریز کیا گیا ہے ۔ کیونکہ وہ خط حضرت جی کے خاندان کی ملکیت ہیں ۔

پہلا خط مرزا غالب کا ہے ۔ یہ خط حضرت جی کے دو خطوں اور ایک غزل کی رسید میں ہے ۔ مرزا صاحب کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جی نے مرزا صاحب سے استمزاج کیا ہے کہ میں رباعیات کے دیوان کے دیباچے میں آپ کا ذکر کر دوں اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ جب دیوان رباعیات آپ تک پہونچے تو اسے غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھئے گا ۔

مرزا غالب نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے کہ آپ نے یہ رباعیاں میرے لئے لکھیں اور لکھا ہے کہ دیباچے میں میرا ذکر نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے باپ دادا کے لئے باعثِ ناز و فخر ہے ۔ دیوان رباعیات کے اخفا میں تعمیلِ ارشاد کی جائے گی ۔ مگر حضور نے لکھا ہے کہ غیر کی نظر سے پوشیدہ رکھنا تو یہاں غیر کون ہے ۔ یہ ایک لطیفہ کے طور عرض کیا گیا ہے ورنہ بات یہ ہے کہ ان حقائق و معارف کے سمجھنے والے کتنے ہیں اور جو سمجھنے والے ہیں وہ غیر نہیں ہیں ۔

یہ خط دس تاریخ ذالحجہ کو لکھا گیا سنہ درج نہیں ہے ۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے تحریر فرمایا ہے کہ لفظ غیر پر جو اعتراض آپ نے کیا ہے میں اس سے خوش ہوا ۔ اس جودت طبع اور سخن رتبہ کے ساتھ خدا ملاقات جسمانی بھی کرامت فرمائے ۔ غیر تو ایک بے معنی لفظ ہے اس کے معنی بھی عین ہی کے ہیں کیونکہ عین اور غیر دونوں حق کے نام جیسے ہادی اور مضل ۔ الفاظ سے حقیقت نہیں بدلتی لیکن اگر میں اور تو، یہ اور وہ کے الفاظ عبارت سے نکال دئے جائیں تو عبارت کے معنی ہی سمجھ میں نہ آئیں گے ۔

اس کے بعد حضرت جی نے ابن عربی[2]، جنید[2] و شبلی[2] کے اقوال اور احادیث کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسرار و رموز کو ان حضرات نے بھی پوشیدہ رکھنے کی تاکید کی ہے ۔ حالانکہ یہ لوگ تمام عالم کو عینِ حق سمجھتے تھے ۔ اس عالم میں ہم خود ہی اپنے غیر ہیں ۔ یہ باتیں باریک ہیں اور بغیر اس مقام پر پہونچے ہوئے سمجھ میں نہیں آتی ہیں ۔ رسولِ خدا کے زمانے سے آج تک تمام صوفی ان باتوں کو پوشیدہ رکھتے آئے ہیں آپ بھی میرے کہنے پر عمل کریں جب تک مجھ سے آپ نہ ملیں گے ان

باتوں کا سمجھنا مشکل ہے۔

روئی سے ہی تمام کپڑے بنے ہوتے ہیں اور کپڑا روئی ہی کی ایک شکل ہے لیکن کوئی چادر اور عمامے کو روئی نہیں کہتا اسی پر عین اور غیر کو قیاس کر لیجے۔ رباعی

اس ایک وجود میں یہ کیا کیا ہے سیر — زاہد ہے حرم ہے اور غمگیں ہے دیر
اسما و صفات ہیں یہ نمائش کے — کہنے سے عین ہو نہ کہنے سے غیر

گو چرخِ چہارمیں کی تجھ کو سیر — اس کا تو غیر اور تیرا ہے وہ غیر
یہ نشرِ خودی نہ جانے جب تک تجھ سے — حاصل عینیت غمگیں ہے خیر

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ اگر آپ اسے تجربہ نہ سمجھیں اور اس میں اپنا فائدہ سمجھیں تو بات یہ ہے کہ میرا غیر آپ کے عین سے اچھا ہے

رباعی

وہ شخص لطیف اور وہ فہم ہے پاک — شائستہ ہوا سبب عقل جس کا چالاک
غمگین جو رخش بے محابا ہو تیز — انسان کو شرط اس سے ہے خوف و ہاک

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں جو خط لکھا ہے وہ افسوس اور معذرت پر مبنی ہے اور خط کا ایک حصہ اسی معذرت پر صرف کیا ہے کہ میں نے عین اور غیر کے متعلق جو کچھ لکھا وہ گستاخی یعنی حق بات یہی ہے جو حضرت نے لکھی ہے میرا مقصد صرف بذلہ سنجی تھا کوئی ادعا یا سرکشی نہ تھی خیال یہ کیا تھا کہ یہ بات ذوق آفریں ہوگی مگر خوبیٔ نقدیر کہ اس نے مجھے پریشانی میں ڈال دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ خط کے علاوہ حضرت جیؒ نے کوئی اور خط بھی مرزا صاحب کو لکھا تھا جس میں اظہار ناراضی تھا اور دیوانِ رباعیات کے نہ بھیجنے کے قصہ کا اظہار تھا۔ اس سے مرزا غالب کو بہت تکلیف پہونچی اور انھوں نے اپنی تکلیف کے اظہار کے ساتھ ہی اپنی نازک مزاجی کی طرف بھی اسی طرح اشارہ کیا اور لکھا کہ

میرے رنج و غم کا سبب یہ ہے کہ آپ کا پہلا خط ارشاد و ہدایت لیکن دوسرا خط عتاب آمیز ہے جس کا تحمل میں اپنی ناتوانی کی وجہ سے نہیں کر سکتا ہوں۔ پھر یہ شعر لکھا ہے

ما تنگ ظرفاں حریف ایں قدر سختی نہ ایم — دانہ اشکیم ما را گردشِ چشم آسیاست

پھر لکھا ہے کہ رباعیات کے نہ بھیجنے کی شہرت میرے لئے دور باش کے ہم معنی ہے جو میرے دل کو خون کئے دیتی ہے حالانکہ مجھے آپ کے وعدے سے بے اندازہ مسرت تھی اور میں منتظر تھا کہ رباعیات مجھے کب موصول ہوں۔

اسی سلسلے میں مرزا غالب لکھتے ہیں کہ آپ نے اسی خط میں لکھا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ عقل کی رسائی اور ذہن کی تیزی میں آپ تفضّل حسین خاں کے ہم پایہ ہیں۔ اس بارے میں میری گزارش یہ ہے کہ تفضّل حسین خاں ایک شخص تھے جو انواع علوم کے عالم تھے۔ طب، نجوم ہیئت اور ہندسہ خوب جانتے تھے اور ہر قسم کے علم میں بات کر سکتے تھے۔ میں نے تو صرف و نحو بھی نہیں پڑھی اور منطق و معانی بھی نہیں جانتا ایک ناتمام فارسی کی واقفیت سے میں ان کے مرتبے تک کیسے پہونچ سکتا ہوں۔ اس موقع پر مجھے اپنی ایک غزل کا مطلع اور حسن مطلع یاد آگیا۔

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو — کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو
زیں ہرزہ روان گشتن قلزم نتوان گشتن — جوئے بہ خیاباں رو سیلے بہ بیاباں شو

اس کے بعد مرزا صاحب نے پھر تصوّف کے اسی خاص مسئلے کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کا محبوب ترین نظریہ ہے۔ انکسار کے بعد فرماتے ہیں کہ میں اتنا جانتا ہوں کہ مجھے یزدگی کی طرف مائل کر دیا اور تھوڑی سی بے خودی عنایت کر دی ہے۔ وجود کی تقسیم پر جیسا کہ اہلِ ظاہر کا اعتقاد ہے میں یقین نہیں رکھتا کیونکہ وجود ایک ہے اور ہرگز تقسیم قبول نہیں کر سکتا نہ اس میں تغیر تبدّل واقع ہو سکتا ہے اور وجود کے مقابلے میں عدم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وجود اور ہستی کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کچھ بھی نہیں ہے اور حق کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔

ما ہماں عین خودیم اما خود از وہم دوئی
درمیانِ ما و غالب ما و غالب حائل است

ہر قسم کے ذکر و فکر اور ذوق میں سے میرے دل کو محی الدین ابن عربی کے ایک فقرے نے اپنی طرف کھینچ لیا ہے کہ "الحق محسوس والخلق معقول" (یعنی خلق کا وجود ہماری عقل و فہم کے سوا کہیں نہیں ہے اور جو کچھ بھی محسوس ہوتا ہے وہ حق کے سوا کچھ نہیں) میرا ایمان یہی ہے باقی سب وہم ہے اور اس عالم میں جو کچھ ہے از قسم نبوت و ولایت، حشر و نشر، عذاب و ثواب

سب درست ہے اور ان سب پر میرا ایمان ہے ــــ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ آپ کی توجہ باطنی سے مجھے بے ارادہ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول مبارک یاد آگیا ما شمت الاعیان الثابتۃ رائحۃ الوجود یعنی اعیانِ ثابتہ نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی ۔ اس موقع پر مرزا غالب نے اپنے یہ شعر لکھے ہیں

چوں پردۂ شب یار مصوّر بہ خیال است ایں کارگہِ وہم ز پیدائیِ اشیا
اندیشہ دو صد گل کدہ گل بردہ بہ دامن اما ہمہ از نقش و نگارِ پرِ عنقا
آئینہ بہ پیش نظر و جلوہ فراواں دل پر ہوس و صاحبِ خلوت کدہ تنہا

پھر لکھتے ہیں کہ مرشد کے حضور میں ان حالات کا عرض کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک گھڑا پانی کا دریا کے نذر لائے یا ایک پھول کی پنکھڑی باغ کی نذر کرے ۔ لیکن مقصد صرف اپنے عقیدے کا اظہار ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ رکھنے والا کسی چیز کا منکر نہیں ہے اور سب کو ایک کیفیت کے ساتھ قبول کرتا ہے ۔ کفر کو بھی اور اسلام کو بھی، عین کو بھی اور غیر کو بھی، یہ سب تصوّر کی حیثیت سے موجود ہیں لیکن وہ تصوّر نہیں جو ہم کرتے ہیں بلکہ وہ تصوّر جو اس کیفیت خاص کو حاصل ہے اس موقع پر بہت ہی مناسب ہے کہ اسے سمندر اور موج اور آفتاب اور روشنی سے تشبیہ دی جائے ۔

اس کے بعد مرزا غالب نے جس بات کا ذکر کیا ہے وہ بوجوہ اہم ہے اور اس سے ہمیں مرزا صاحب کے متعلق ایک عجیب اور جدید انکشاف ہوتا ہے ۔ وہ حضرت غمگین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھتے ہیں کہ :

سیّد امانت علی صاحب جو حضور کے تربیت یافتہ ہیں اکثر مجھے نوازتے رہتے ہیں اور جب خلوت میسّر آتی ہے تو ان سے راز کی باتیں ہوتی ہیں ابھی دو تین روز ہوئے کہ برنگی کا ذکر آگیا ۔ چونکہ میں آج کل برنگی[1] کے نظارے میں مبتلا ہوں اس لئے میں نے اس بارے میں مبالغہ کیا

اور کہا کہ اس سے بلند کوئی اور مقام نہیں ہے ۔ میر امانت علی صاحب نے کہا کہ اس مقام کا چھوڑنا بھی ایک مقام ہے ۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے لیکن کہنے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جو استغراق کی زیادتی کے بعد خود ہی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حاصل کرنا مشاہدۂ بے رنگی پر توجہ کرنا ہے نہ یہ کہ اس سے قطع نظر کر لی جائے . . . .

پھر حضرت سے مرزا صاحب عرض کرتے ہیں کہ خدا کے لئے مجھ پر ایسی توجہ فرمائیں کہ میرا یہ شغل ترقی کر جائے تاکہ رفتہ رفتہ میں بالکل مستہلک اور مستغرق ہو جاؤں اور رنگ اور بے رنگی دونوں سے چھوٹ کر عدم محض ہو جاؤں ۔

اس خط پر صرف تاریخ، دن اور وقت ہے سنہ نہیں ہے ۔ یہ خط ۲۸ محرم ہفتے کے دن چاشت کے وقت لکھا گیا ہے ۔

مرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں حضرت شاہ غمگین نے مرزا صاحب کے عقیدے کی تصدیق و تحسین فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ :

مجھے آپ کا عقیدہ معلوم کرکے ناقابلِ اظہار اور بے اندازہ خوشی ہوئی ۔ مجھے آپ سے دلی محبت ہے اور میرا دل خود بخود آپ کی طرف کھنچتا ہے ۔ میں آپ سے کیسے ناخوش ہو سکتا ہوں میں نے جو کچھ لکھا تھا محبت سے لکھا تھا ۔ آپ مجھ سے خدا کے واسطے محبت رکھتے ہیں نہ آپ کو مجھ سے کوئی دنیاوی غرض ہے نہ دینی . . . . .

اس کے بعد حضرت نے مرزا صاحب کے شغل پر تبصرہ فرمایا ہے اور حیرتِ مذموم اور حیرتِ محمود کا فرق بتایا ہے اور اپنے سلوک و اشتغال و واردات بیان کئے ہیں ۔ اپنے پیر اور اپنے سفر کا حال بیان فرمایا ہے ۔ اس خط سے حضرت غمگین کے مجاہدہ و ریاضت اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خط دوسرے سالکین راہ کی رہنمائی بھی کرتا ہے ۔ غالباً اسی خیال سے حضرت نے مرزا صاحب کو تفصیل سے اپنے حالات لکھے ہیں ۔ اس خط میں جو رباعیاں حضرت نے لکھی ہیں وہ اربابِ ذوق کی خدمت میں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا ۔

غمگیں ہوتا اگر تجھے علمِ یقیں بے عینِ یقیں نہ ہوتی دل کو تسکیں
پھر حقِ یقیں کے ذوق اور شوق میں بار ہوتا بس حق حق ترا ملت و دیں

---

[1] شغل برنگی صوفیوں کا ایک خاص شغل ہے جو آنکھیں کھول کر آسمان یا خلا میں نظر جما کر کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ بے خودی اور ربودگی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے فنا بھی کہتے ہیں اور جس کا حصول تمام سلاسل تصوف میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے ۔

ایک عمر رہی ہے میری اللہ کی جنگ — دنیا رہا ہیں شکست سو سو ذرنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا — نہ فوج رہی نہ ہیں نہ وہ نام و ننگ

عقل کہے جو اسے نہیں وہ عاقل — وجدانی جو سمجھے وہ نہیں ہے واصل
کہتے نہ رسول ما عرفنا غمگیں — جز عجز نہ ہوتی معرفت گر حاصل

تو قولِ علی میں اور مت لا شبہات — غمگیں ہے یہی عرفت ربی کی بات
ہے فسخ عزائم اس لیے فرمایا — آتی ہی نہیں ہے علم میں کنہ ذات

ہو جس میں کہ یافت ہے وہ حیرت محمود — مذموم ہے ہو شہود جس میں نہ کشود
ہر چند کہ اس کی دید غمگیں ہے محال — ممکن نہیں پر سوائے اس کے مشہود

اس کے بعد حضرت جی نے لکھا ہے کہ ایک تازہ مضمون کی رباعی کہی ہے جو داد کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں

کر ظن نہ اس مئے شراب رمانی پہ — مت کبر کر اپنی زہد پیشانی پہ
گر کفر دوئی نہیں تجھے اے زاہد — قشقۂ کبود ہے کیوں پیشانی پہ

مرزا غالب نے اس خط کے جواب میں حضرت کی اس آخری رباعی کی بہت داد دی ہے اور لکھا ہے کہ اس رباعی کے مضمون کی تازگی نے مجھے بے خود کر دیا واللہ کہ کسی سخن ور کا ذہن اس نکتے تک نہ پہونچا اور کسی نے زاہد کے پیشانی کے داغ کو قشقۂ کبود سے تشبیہہ نہیں دی۔ اس کے بعد ایک رباعی کے متعلق لکھا ہے کہ شاید میر حیدر علی سے رباعی کی نقل میں سہو ہو گیا ہے کیونکہ پہلے بیت میں قافیے کے بعد 'کو' آیا ہے اور دوسرے بیت میں 'کو' نہیں ہے یہ بات قاعدۂ شعر کی رُو سے جائز نہیں ہے۔ رباعی یہ ہے

چل راہ بریدہ پائے لنگی چھوڑ — رکھ جاں کو فراخ دل کی تنگی کو چھوڑ
رنگوں میں نہ قیدرہ مشائخ کی طرح — غمگیں آزاد ہے تو بے رنگی چھوڑ

مرزا غالب نے حضرت کے اس فقرے کو بہت محسوس کیا ہے کہ نہ آپ کو مجھ سے غرض دینی وابستہ ہے نہ دنیاوی۔ لکھتے ہیں کہ:
آپ کے اس فقرے نے میرے دل کو بہت افسردہ اور ملول کر دیا اور میں اس بات پر مجبور ہو گیا کہ بات کو تفصیل سے عرض کروں۔ قبلہ و کعبہ! راستی میرا آئین اور محبت میرا دین ہے میں سچ کو ایمان اور جھوٹ کو کفر سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے جو ارادت اور محبت آپ سے ہے وہ شرح و بیان میں نہیں آسکتی ...... عنایت اور عتاب دونوں التفات کا نتیجہ ہیں۔ رہا اغراض دنیاوی و دینی کے بارے میں تو الحمدللہ کہ میرا دل ان دونوں چیزوں سے پاک ہے میں محبت کے سوا نہ دنیا سے واقف ہوں نہ دین سے۔ میں ہیچ اور نادان ہونے کے باوجود اتنا جانتا ہوں کہ وجود ایک ہے اور ہرگز منقسم نہیں ہو سکتا اگر میں دنیا اور دین کو مان لوں تو شرک فی الوجود میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ جو شرک کی بدترین قسم ہے۔ میرے نزدیک دین بھی دنیا کی طرح ایک نقش موہوم ہے اور وہم سے دل لگانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کے طلبگاروں کو دنیا اور دین کے طلبگاروں کو دین مبارک۔ ہم ہیں اور سواد الوجہ فی الدارین[1] جس کا مطلب ہے نیستیٔ محض۔ اس بارے میں یہ قول حق ہے کہ اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی (الاعیان ماشمت رائحۃ الوجود) یہاں وجود کا مطلب اس ہستیٔ موہوم سے ہے یعنی اس ہستی موہوم کا ظہور اور نمائش۔ اور یہ نمائش محض وہم اور باطل ہے اور یہ سب کچھ محض اعتبار ہے اس کی حقیقت نہیں ہے۔ اعیان ثابتہ سے لے کر حشر تک جو کچھ نمائش اور ظہور ہے سب باطل ہے وجود میں کوئی تغیر نہیں ہوا وہ اسی ایک حالت پر ہے...

اس کے بعد مرزا صاحب نے تفصیل سے اعیانِ ثابتہ پر اظہارِ خیال کیا ہے اور جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کی تشریح کی ہے اس کے بعد بے رنگی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں اور حضرت جی نے جو ایراد کیا تھا اس کا جواب دیتے ہیں

---

[1] صوفیہ ایک حدیث بیان کرتے ہیں الفقر سواد الوجہ فی الدارین فقر دنیا و دین کی روسیاہی ہے اور اس کا مطلب وہی بیان کرتے ہیں جو مرزا غالب نے بیان کیا ہے یعنی نیستی محض ۔ از سواد الوجہ فی الدارین اگر داری خبر چشم بکشا و جمال کفر و فقر بانگر

حضرت! اس غلام نے اپنی نظر خلا میں نہیں ٹھہرائی ہے
بلکہ دل کو بے رنگی سے باندھ لیا ہے اور اعیانِ ثابتہ کی بحث
میں جو ذکر کیا گیا ہے یہی میرا منظورِ نظر ہے۔ میری کوشش
یہ ہے کہ میں اپنی اصل نیستی کی طرف لوٹ جاؤں۔ نہ میں ذکر
جانتا ہوں نہ شغل ع دانی ہمہ اوست ورنہ دانی ہمہ اوست
تحریر میں تقریر کی سی بات نہیں آسکتی میں اس دن کا آرزومند
ہوں کہ شرف قدمبوسی حاصل کروں اور آپ کی زبان سے آپ
کے ارشادات سنوں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تمہارے تصوف کی
طرف سے مجھے پورا اطمینان ہوگیا تو جناب واقعہ یہ ہے کہ میں
تو ایک بے علم اور جاہل سپاہی زادہ ہوں میرے باپ دادا
صحرانشین ترک تھے۔ میں دو ایک مصرعے موزوں کر لیتا ہوں
اور ایک دو لطیفے ہر فن کے کہہ لیتا ہوں۔ تصوف سے میرا
کیا تعلق اور درویشی سے مجھے کیا نسبت۔ میرا حال اس سے
زیادہ نہیں ہے کہ وحدتِ وجود اور اشیا (موجودات)
کا معدوم ہونا میرے خمیر میں ڈال دیا گیا ہے اور "حق محسوس
ہے اور خلق معقول" میرا عقیدہ بنا دیا گیا ہے میں اتنا
جانتا ہوں کہ صرف ایک موجود ہے اور اس کے سوا کچھ
موجود نہیں ہے اس کے سوا میری ہمت کوشش و ریاضت
اور دولت و مال صرف ایک دو شراب کے پیمانے پر منحصر
ہے جو رات کو پی لیتا ہوں اور مست ہوکر سو جاتا ہوں نہ دین
سے واقف ہوں اور نہ دنیا سے اللہ بس ماسوی ہوس۔
حاضر ہونے اور سفر کرنے میں گرمی اور بے سامانی مانع نہیں
ہے ایک خرقہ تن پر ڈال لوں اور روانہ ہو جاؤں۔ مگر میرا
مقدمہ جو ولایت گیا ہوا ہے اسے دو سال ہو گئے مجھے امید
ہے کہ امروز فردا یا ہفتہ دو ہفتے اور مہینہ دو مہینے بعد
ولایت سے حکم آجائے گا اور اس وقت میں گوالیار
روانہ ہو جاؤں گا۔

اس خط پر ۱۸- ربیع الاوّل روز شنبہ ہنگام نیمروز سنہ ۱۲۵۵ء
درج ہے۔

اس خط کے جواب میں حضرت جی نے جو خط مرزا غالب کو لکھا ہے
اس میں وضاحت اور فراخ دلی سے اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ

رباعی میں قافیے کی غلطی سہو کاتب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ
میری بے حواسی اور پریشان خیالی اس کا سبب ہے یہ ایسی
غلطی ہے جو کوئی نادان بھی نہ کرے گا حالانکہ تقریباً بیس
دفعہ میں نے اس رباعی کو پڑھا لیکن اس عیب کی طرف
خیال ہی نہ گیا اگر آپ اس کی اصلاح نہ کرتے تو یہ رباعی
دیوان میں اسی غلطی کے ساتھ درج ہو جاتی ....

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

اسی سبب سے میں نے بارہا آپ کو لکھا ہے کہ چوں کہ
اللہ تعالیٰ نے آپ کو فنِ سخنوری میں یکتائے زمانہ کیا ہے
لہٰذا آپ میرے دیوان کو اوّل سے آخر تک اصلاح کی نظر
سے دیکھ لیں لیکن آپ تساہل سے کام لیتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے
محبت رکھتے ہیں تو میری اس عرض کو ضرور قبول کرلیں۔ یہاں
میرے ہم نشینوں کو اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے اغلاط
پر مجھے مطلع کریں۔

اس کے بعد مرزا غالب کی حقائق فہمی کا ان الفاظ میں اعتراف فرماتے ہیں:

آپ کو علم تصوف میں جو دستگاہ ہے جس کا اظہار آپ
کے خطوں سے ہوا وہ علمائے ظاہر کو بھی نہیں ہے...

اس کے بعد اعیانِ ثابتہ کی بحث کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

اس قول میں (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی)
وجود سے مراد وہی وجود نہیں ہے بلکہ اعیان تو عینِ ذات
ہیں۔ آپ نے جو تشبیہ اس سلسلے میں آفتاب کی شعاعوں
کی دی ہے وہ مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ آفتاب میں شعاعوں
کا احساس تو نقصانِ بصارت کا سبب ہے ورنہ جو لوگ
کہ آفتاب کا مشاہدہ کرتے ہیں ان کو شعاعیں نظر نہیں آتیں
چنانچہ میں نے بھی ابتدا میں دو سال تک یہ کام کیا ہے[1]....

---

[1] اسے شغلِ آفتابی کہتے ہیں۔ صبح کو طلوعِ آفتاب کے وقت آفتاب پر نظر جماتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ تصور بھی کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد تنزلات کا بالاجمال بیان فرما کر فرماتے ہیں کہ :

یہ قول (اعیان نے وجود کی بو بھی نہیں سونگھی)[لہ] حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرف کسی نے بھی منسوب نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے کسی معتبر کتاب میں یہ قول حضرت امامؑ کی طرف منسوب دیکھا ہو تو مجھے بھی مطلع فرمائیں۔ آئندہ سے مسائلِ تصوّف کو ملاقات پر موقوف رکھئے۔ مجھے آپ کا آزادانہ رویہ بہت پسند ہے اور اسی لئے میں آپ کی ملاقات کا خواہش مند ہوں اگر ایسا شاہباز ہاتھ آجائے تو پھر سوائے عنقا کے شکار کے کسی طرف توجہ نہ کرے گا۔ شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہزاروں آدمی ہیں لیکن مجھے ان سے کیا تعلق وہ لوگ تو لانبی ڈاڑھی، کتری ہوئی مونچھیں، تسبیح اور ڈھیلے ڈھالے جبّے چاہتے ہیں اور یہ چیزیں یہاں کہاں ہیں آپ کے طریقے سے بہت خوش ہوں۔ خدا تعالیٰ آپ کی برنگی میں ترقی دے۔ جب مجھ سے ملاقات ہوگی تو میں بھی اسی کی تائید کروں گا۔ یہ طریق میرا پسندیدہ ہے

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

دیوانِ رباعیات بھی تیار ہو جائے تو وقتِ ملاقات آپ کو دوں گا۔

اس خط پر بھی ۱۲۵۵ھ ہجری درج ہے۔ مرزا غالب نے اس خط کا جو جواب لکھا ہے وہ کلیات نثر غالب میں درج ہے اور سوائے اظہارِ عقیدت کے کوئی خاص بات اس میں نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر مرزا غالب کا خط ہے جو اس مجموعے میں مرزا غالب کا پانچواں خط ہے۔ کوئی بات قابلِ ذکر اس میں بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ مرزا صاحب نے اس بات کو قبول کر لیا ہے کہ مسائلِ وحدت و کثرت آئندہ خطوط میں بیان نہ کئے جائیں گے اور ملاقات پر موقوف رکھے جائیں گے۔

اس کے بعد مرزا غالب کا چھٹا خط ہے یہ خط مرزا غالب نے اس انداز سے شروع کیا ہے کہ عبارت کا رُخ مسائلِ تصوّف کی طرف پھر گیا ہے۔ فرماتے ہیں" میں کافر ہوں اگر کبھی میں نے غیر سے شکر و شکوہ کیا ہو۔ کسی[لہ] نے کیا خوب کہا ہے :

دریا بوجودِ خویشتن موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

اس خط میں بھی وحدتِ وجود کا ذکر اور فنا و عدم محض ہو جانے کی تمنا ہے۔ اس خط پر ۳۰ ربیع الثانی۔ پیر ۱۲۵۳ھ لکھا ہے غالباً سنہ کی نقل میں غلطی ہوئی ہے۔

مرزا غالب کا ساتواں خط ۲۷ شعبان ۱۲۵۵ھ منگل کا لکھا ہوا ہے اور حضرت صاحب کی رباعیات کی ستائش و ثنا پر مشتمل ہے۔

آٹھواں خط بھی حضرت صاحب کے نام ہے اس میں حضرت کے دیوان کی تعریف اور اس کے پہونچنے کی رسید اور شکریہ ہے۔ اس خط میں وحدۃ الوجود کا ذکر اور اپنا نظریہ اور حال مختصراً بیان کرکے دعا و توجہ کی خواہش کی ہے

نویں خط میں مرزا غالب نے لکھا ہے کہ احباب نے دِلّی میں طرح دی تھی اس میں میں نے دس شعر کہے ہیں جو بہ نظرِ اصلاح حاضر کر رہا ہوں غزل کا مطلع یہ ہے

در وصل دل آزاریٔ اغیار ندانم — دانند کہ من دیدہ ز دیدار ندانم

اس خط پر تحریر تاریخ ۱۸۔ رجب ۱۲۵۵ھ درج ہے

لہ معلوم نہیں مرزا غالب کے ذہن میں یہ کس طرح جاگزیں ہو گیا کہ الاعیان ما شمت رائحۃ الوجود حضرت امام حسین علیہ السلام کا قول ہے۔ دراصل یہ قول شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا ہے۔ حضرتؑ امام کے زمانے میں اعیان وغیرہ کی اصطلاحیں عرب میں نہیں پہونچی تھیں۔

لہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ رباعی سحابی کی ہے اس کا پہلا بیت یہ ہے

عالم بخروشِ لا الٰہ الا ہو ست
غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست

محمد عتیق صدیقی

حبیب اللہ ذکا اور مرزا غالب

انیسویں صدی کے اوائل میں جب اس برصغیر کے بیشتر حصوں پر "خلق خدا کی ، ملک بادشاہ کا ، اور حکم کمپنی بہادر کا ، ڈنکا بجنے لگا تھا ، تو اس وقت ہندوستان کی دفتری ، کاروباری اور علمی زبان فارسی تھی - امراء ، شرفاء اور متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ فارسی ہی کو خط و کتابت اور اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے تھے - اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ اس دور میں اردو شاعری کا مذاق اگرچہ عام ہو چکا تھا ، لیکن اردو شعراء کے تذکرے بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے -

۱۸۳۰ء میں کمپنی انگریز بہادر نے اپنے سیاسی و انتظامی مصالح کی بنا پر فارسی کی سرکاری و دفتری حیثیت ختم کر دی ، اور اس کے ساتھ ہی فارسی کے رواں دواں سوتے خشک ہونے لگے اور بالآخر انیسویں صدی کے وسط میں اس نے دم توڑ دیا - لیکن یہ سانحہ پیش آنے کے بعد بھی ایک مدت تک ، ایسے لوگوں کی خاصی تعداد باقی رہی جو اس مردہ لاش کو سینے سے لگائے رہے - اس گروہ سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بزرگ حبیب اللہ ذکا بھی تھے ، جو فارسی کا صرف اچھا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ اس زبان پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی - اور اس کا ثبوت ان کا "مجموعۂ نظم و نثر فارسی" ہے "خاش و خماش" جو ان کے انتقال کے تقریباً نو سال کے بعد ۱۳۰۲ ہجری مطابق ۱۸۸۴ عیسوی میں مطبع آصفی (حیدر آباد) سے طبع ہوا تھا - اس مجموعہ کا " والا جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی ایک مختصر اردو عبارت سے آغاز ہوتا ہے ، جس کو ہمارے زمانے کی اصطلاح میں "پیش لفظ" کہتے ہیں - اس پیش لفظ کے عنوان کی عبارت ، جو غالب کی نہیں بلکہ صاحب کتاب مولوی ذکا کی ہے ، حسب ذیل ہے :

"سواد عبارتے کہ والا جناب مستطاب نواب اسد اللہ خاں غالب دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر پشت مجموعۂ نظم و نثر کہ بغرض اصلاح خدمت والا شان فرستادہ شدہ بود ، بقلم خویش رقم فرمودہ اند و بپایان آں مہر خود زدہ اند -"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنا مجموعۂ نظم و نثر فارسی مرزا غالب کے پاس اصلاح کے لئے ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۴ء) میں بھیجا تھا - اسی مجموعے کی پشت پر مرزا غالب نے اپنی رائے لکھ دی تھی اور اس کے نیچے اپنی مہر بھی لگا دی تھی - وہ عبارت یہ ہے :

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں ، کسی امیر کا نہیں ، کسی شیخ شیادکا نہیں - یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے ، اور فقیر اپنے دوست کے کلام کو معرضِ اصلاح میں بہ نظرِ دشمن دیکھتا ہے - پس جب تملق نہیں ، مدارا نہیں ، تو جو مجھ کو نظر آیا ہے بے حیف و حیل لکھوں گا -

" نثر میں نعمت خانِ عالی کے طرز کا احیا کیا ہے ، مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے - قصائد میں انوری کا چربہ اتارا ہے ، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے - غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز ، منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ، ہمہ دانِ یکتا ، لفظ طراز ، معنی آفرین ، آفریں صد آفریں

بزار آفریں۔"

منشی حبیب اللہ ذکا کے 'خاش و خماش' پر مرزا غالب کا یہ مختصر اردو پیش لفظ ہے۔ اس تحریر کا قابلِ ذکر اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ مرزا غالب جن کو فارسی پر صرف مہارت و قدرت ہی نہیں حاصل تھی بلکہ جو فارسی کے مقابلے میں اردو کو ہیچ و بے حقیقت سمجھتے تھے، انھوں نے ذکا کے 'مجموعۂ نظم و نثر فارسی' پر پیش لفظ اردو میں لکھا تھا۔ یہ بات اگر ایک طرف غالب کی حقیقت پرستی کا ٹھوس ثبوت فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف ان حضرات پر ایک گہرا طنز بھی ہے جو اس وقت بھی فارسی ہی پر جان چھڑک رہے تھے اور کسی طرح بھی ماضی سے اپنے دامن کو جھٹک کر حال سے وابستہ کرنے پر رضامند نہ تھے۔

خاش و خماش کی فارسی نظم و نثر کو یا اس سے متعلق مرزا غالب کے اظہارِ خیال کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس مجموعے کے صرف ان حصوں سے ہم کو اس وقت دل چسپی ہے، جن کا مرزا غالب کی ذات سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ہے۔ ان پہلوؤں کا اجمالی ذکر کرنے سے پہلے منشی حبیب اللہ ذکا سے بھی سرسری ملاقات کر لینا ضروری ہے۔

ذکا کا وطن " من مضافات مدراس" تھا جہاں ۱۲۴۴ ہجری (مطابق ۱۸۲۸ء) میں پیدا ہوئے۔ خود ان کی اپنی فکر کے مطابق "بے خود و بد خوے" ان کی تاریخ میلاد ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے 'برادرِ مہربان محمد رحمت اللہ رسا' سے حاصل کی اور میر مہدی علی ثاقب اور سید مرتضیٰ حسینی بینش کے سامنے " زانوئے سبق تہہ " کئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تلاشِ معاش کی فکر ہوئی۔ چناں چہ 'صدر وزارت دکن' کا "طنطنۂ نظم امور و آوازۂ قدردانی" سن کر حیدر آباد کا رُخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد کم و بیش ایک سال" وسیلت و واسطہ" کی جستجو میں کھپایا۔ ایک بزرگ عبدالوہاب حسینی نے ان کی دست گیری کی اور اس کش مکش سے ان کو نجات دلائی۔ ان کے 'قصیدہ و عرض داشت' نے ممدوح تک رسائی پائی۔ بالآخر یکم ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۵ء) کو ذکا نواب مختار الملک کی سرکار سے باضابطہ وابستہ ہو گئے۔

غالب اور ذکا کے تعلقات کب اور کیوں کر پیدا ہوئے؟ جہاں تک 'کب'، کا تعلق ہے، اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ رہا 'کیوں کر' کا معاملہ، اس باب میں غالباً ذکا ہی نے پہل کی تھی۔ خاش و خماش میں غالب کے نام جو رقعات ہیں، ان میں جو پہلا خط ہے، وہی ذکا اور غالب کے تعلقات کی غالباً پہلی کڑی ہے۔ جو یوں شروع ہوتا ہے :

" آن کہ در حضرت او خامہ بسر ضِ ادب است

شاہ مردانِ سخن غالبِ عالی نسب است

بندگی ہا مقبول و کورنشہا موصول باد۔ از بندۂ روے خواجہ

ندیدہ و بخوے خواجہ گرویدہ . . . . . "

اور جواب کے لیے اپنا پتہ یہ لکھا تھا،

"در حیدر آباد دکن، بدارالانشاء مہین دستور مختار الملک

بحبیب اللہ ذکا برسد"

اس خط پر اور دوسرے خطوں پر بھی تاریخ ارسال درج نہیں ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ذکا اور غالب کی خط و کتابت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ ذکا چوں کہ " مہین دستور مختار الملک" کے منشی تھے، اس لئے غالب نے ان کے خط کو نعمت غیر مترقبہ اور ان کی ذات کو خدا داد وسیلہ سمجھا ہوگا۔ چناں چہ غالب نے فوراً ان کے خط کا جواب دیا اور ان کے نام کے آگے 'مولوی' اور نام کے پیچھے 'خان' کا اضافہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ " بندہ نہ پایگاہ مولویت دارد نہ خطاب خانی " ذکا کے خط کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ بھی مختار الملک کے نام غالباً براہِ راست روانہ کیا ، اور ذکا کے خط میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں ذکا نے لکھا کہ :

" رسیدن دیوان اردو را نہ بالقوۃ اثرے است و

نہ بالفعل خبرے۔ یا رسیدہ باشد و کسش نہ دیدہ باشد . . .

بندہ را مصرعے از مصنفات جناب بر زبان است ع

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر"

(دیوانِ اردو کے پہنچنے کا نہ تو اب تک کوئی اثر ہی ظاہر ہوا ہے اور نہ اس کی خبر ہی ہے۔ ممکن ہے کہ پہنچا ہو اور کسی نے اس کو نہ دیکھا ہو . . . . بندے کی زبان پر آپ ہی کا مصرع ہے

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر)

اس حسنِ طلب کے جواب میں غالب نے ذکاؔ کو بھی دیوانِ ریختہ کا ایک نسخہ بھیجا اور ساتھ ہی "قصیدہ مدحیہ (نواب مختارالملک)" بھی روانہ کیا جو ممدوح تک پہنچ تو گیا مگر اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ایک دوسرے خط میں ذکاؔ نے، غالباً غالب کی یاد دہانی پر، لکھا کہ "میر دخترِ منشی عبدالقادر کو اس پر میں نے آمادہ کیا کہ وہ دوبارہ آپ کا ذکر چھیڑیں اور آپ کے محامد پھر بیان کریں۔ انھوں نے یہی کیا ہے۔ یہ گذارش دل نشین (ممدوح) ہوئی۔" اور اس خوش خبری کے ساتھ یہ بھی مشورہ دیا کہ "اگر منشی نامہ و چیگامہ بوساطت ایجنٹ دہلی دیا دیگر از اہلِ فرہنگِ فرنگ" بھیج دیا جائے تو " اس فقرے کا (کہ دبرخوان نوالِ مختارالملک بہادر بخشی و بہرۂ من نیز نہادہ اند) جو آپ نے لکھا ہے، ممکن نہیں ہے کہ بطلان ہو سکے۔"

غالب ہی کے سلسلے میں ذکاؔ نے غالب کے دوستوں سے بھی خط و کتابت شروع کی۔ ایک خط میں غالب ہی کو لکھتے ہیں کہ "منشی غلام غوث بے خبر نے اردو رقعات کے چھپنے کا مژدہ با وعدۂ ارسال سنایا ہے۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "آپ کے ضعفِ بصارت کا حال سننے کے بعد میں آپ کو اپنے خطوط پڑھنے کی زحمت نہیں دینا چاہتا۔ اسی لئے نواب مصطفیٰ خاں بہادر (شیفتہ) سے میں نے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا۔"

ذکاؔ کے اس مجموعۂ نظم و فارسی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور غلام غوث بے خبر کے علاوہ منشی نول کشور کے نام بھی دو ایک رقعات ہیں اور ان کا بھی مرزا غالب ہی کی ذات سے تعلق ہے۔

'خاش و خماش' کے حصۂ نظم میں "تاریخ چاپ کلیاتِ فارسی غالب" بھی ملتی ہے جو حسبِ ذیل ہے:

غالب کہ نفیِ مطلق اگر معنی کم است　　　گویم کہ ہمسرش بسخن کم تر آمدہ
دیوان او از مطبع نول کشور　　　طومار سی کارگزاراں بر آمدہ
تاریخ انطباع نویسد ذکاؔ ہمی　　　جانِ سخن بقالب طبع اندر آمدہ
صدہاے از رشک بر آرند منکراں　　　یک حرف ما چہ شد، ہمہ زاید گر آمدہ [۱۲۸۵]

ذکاؔ کے اس مجموعے میں ہم کو "تاریخ رحلت حضرت غالب" بھی ملتی ہے جو حسبِ ذیل ہے:

گذشت از جہاں آں جہانِ سخن　　　کہ می گفتمش عرفی و طالب است
خرد گفت سالش ریاضِ جناں　　　کراں تا کراں مسکنِ غالب است

اسی کے نیچے حاشیہ کی حسبِ ذیل عبارت بھی ہے

"درسنہ ۱۲۸۳ خبر رحلت حضرت غالب کہ دراصل غلط بود،
شہرت یافتہ بود۔ واں گاہ ایں قطعہ تاریخ نوشتہ شدہ بود۔"

(یعنی سنہ ۱۲۸۳ ہجری میں حضرت غالب کی رحلت کی خبر مشہور ہو گئی، جو غلط تھی، اس وقت یہ قطعہ تاریخ لکھا گیا تھا)

عمر انصاری

غزل

شکوے کہ ہنسی میں ڈھل گئے ہیں　　　دریا تھے جو رُخ بدل گئے ہیں
جس سمت بھی ہم نکل گئے ہیں　　　راہوں میں چراغ جل گئے ہیں
کیا ہم سے خطا ہوئی ہے دُنیا　　　تیور ترے کیوں بدل گئے ہیں
نکلا نہیں چاند مدّتوں سے　　　تارے کوئی چال چل گئے ہیں
اللہ ری گردشِ زمانہ　　　لوگوں کے خدا بدل گئے ہیں
سننے ہی نہیں صدا کسی کی　　　دیوانے کہاں نکل گئے ہیں
معلوم ہے ہم کو اپنا عالم　　　کہنے کو تو ہاں سنبھل گئے ہیں
دراصل وہی ہیں دشمنِ جاں　　　جو حادثے کل پہ ٹل گئے ہیں

بدلا نہیں دل عمرؔ ہمارا
ہر چند کہ ہم بدل گئے ہیں

حبیب اللہ ذکا کے مجموعۂ نظم ونثر فارسی
"خاش وخماش" پر مرزا غالب کا پیش لفظ

ہو اللہ

سواد عبارتی کہ دار الاجناب مستطاب نواب اسد اللہ خان غالب
دہلوی در سال ہزار و دو صد و ہشتاد و یک بر پشت مجموعہ
نظم و نثر کہ بغرض اصلاح خدمت والا شان فرستادہ شدہ بود بقلم
خویش رقم فرمودہ اند و پایان آن مہر خود زدہ اند

یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ شیاد کا نہیں
یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر نے دوستی کے کلام
معرض اصلاح میں بنظر دشمن دیکھتا ہے سبب تعلق نہیں ہے ارا نہیں تو
مجھکو نظر آیا ہے بے حیف و میل کہوں گا نثر میں نعمت خان عالی کی
طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اوس سے بہتر دیا ہے قصاید میں انوری کی
جبر بہ اوٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز
عاشقانہ سوز و گداز منشی حبیب اللہ ذکا سخنور ہمہ دان یکتا لفظ طراز معنی
آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین ......
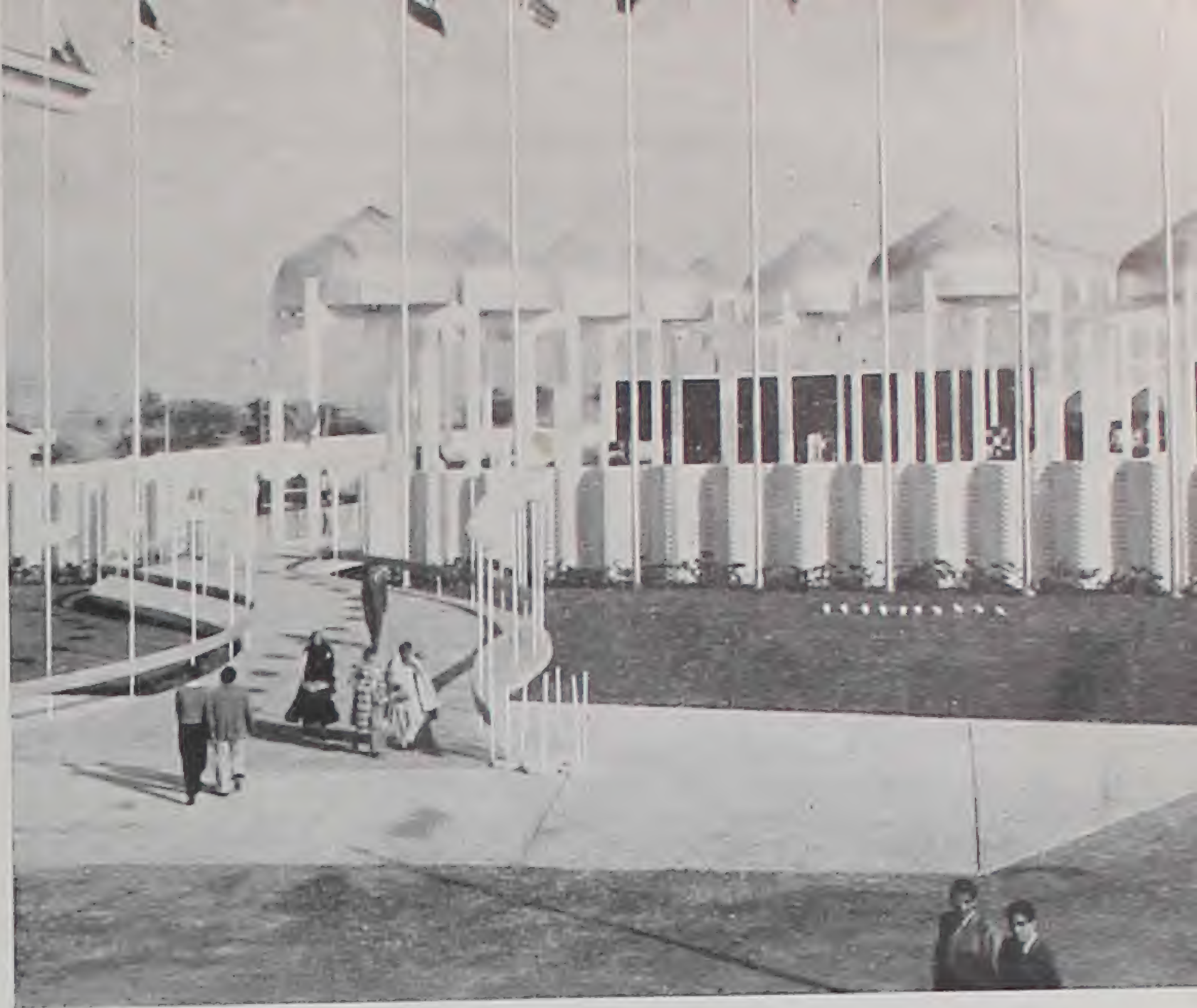
غالب ۱۲۸۱ھ

نواب مختار الملک میر تراب علی خان بہادر سالار جنگ

آپ کے باپ ہیں مالک رام کا
مضمون صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیں

میلے کا

دِلّی میں عالمی

امریکی میلہ

میسور کا پویلین

ر دروازہ

زراعتی میلہ

روسی پویلین

پنجاب کا پویلین
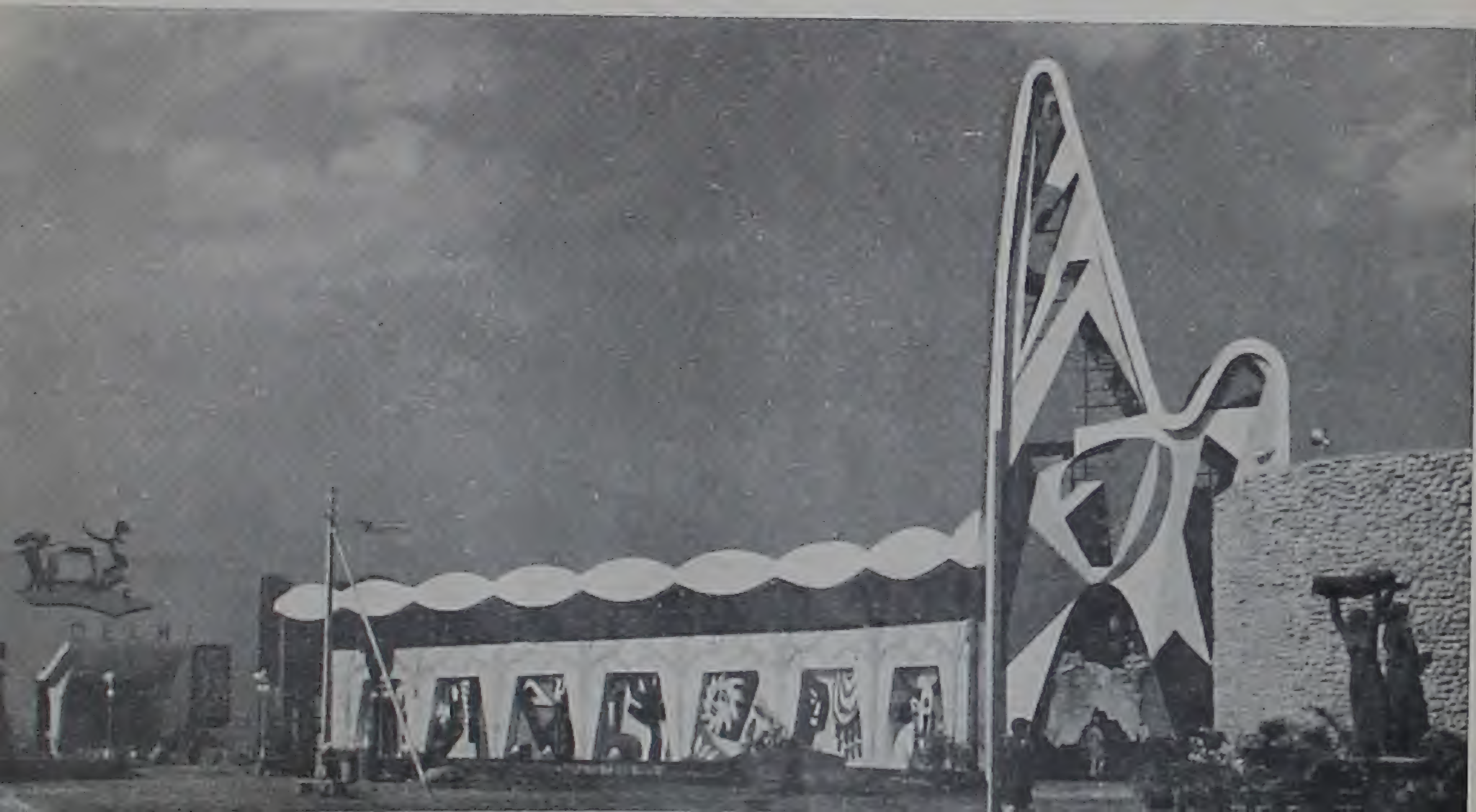
بُجھ گیا ایک چراغ

آج سے پچاس برس پہلے سندیلے کے ایک مشاعرے میں حضرت دل شاہ جہان پوری کے ایک شعر نے سامعین کو زیر و زبر کر دیا تھا ؎

نہ وہ آرامِ جاں آیا، نہ موت آئی شبِ وعدہ
اسی دُھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

انشاؔ کی زمین میں یہ معرکۃ الآرا شعر نصف صدی سے لوگوں کی زبان پر ہے۔ لیکن شبِ وعدہ موت کے نہ آنے کا شکوہ کرنے والا موت کی آغوش میں جا چکا۔ ۲۵۔ دسمبر کی شب میں دل پر فالج کا شدید حملہ ہوا صبح ہوتے ہوتے زبان بند ہو گئی اور ۲۶۔ دسمبر کو امیر مینائی کی یہ یادگار بھی رخصت ہو گئی ؎

آنکھ اپنی نہ جھپکنا تھی نہ جھپکی اے دلؔ
رازداں رنگ بدلتے رہے افسانوں کے

مگر اب کے ایسی آنکھ جھپکی کہ رازداں اور ان کے افسانے دھرے رہ گئے۔ مرحوم قادر الکلام غزل گو تھے۔ انسانی شرافت اور خلق و مروّت کا مجسمہ تھے۔ پُرانے بادہ کش اُٹھتے جا رہے ہیں۔ میخانہ خالی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ مرحوم کے انتقالِ پُر ملال سے ریاضؔ اور جلیلؔ کی موت تازہ ہو گئی۔ مرحوم ہی کے اس شعر پر اس تعزیت نامے کو ختم کرتا ہوں ؎

ہر موجِ بحرِ عشق کی طوفانِ بے پناہ
کھیلا ہوں جان پر تو کنارہ ملا مجھے

عرشؔ ملسیانی

دلؔ شاہجہاںپوری

اِک چراغ اور بجھا

اسد خاں اسدؔ ملتانی بڑے نغز گفتار شاعر تھے۔ حال ہی میں پاکستان میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لطیف مزاح اور لطفِ قوافی ان کے خاص محاسن تھے۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ سوچ سمجھ کر پختہ شعر کہنا ان کا شعار تھا۔ ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک بزمِ اردو شملہ کے مشاعروں کے روحِ رواں رہے۔ ان مشاعروں میں جوشؔ، جگرؔ، احسن مارہروی، بیخود دسائی، مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت امرناتھ ساحرؔ دہلوی، فراقؔ گورکھپوری اور ملک کے ممتاز شعراء دادِ سخن دیتے رہے۔ مسٹر غلام محمد مرحوم سابق گورنر جنرل پاکستان کی معیت میں انھوں نے اردو کی بیش بہا خدمات ادا کی تھیں۔ ان کے اُٹھ جانے سے ایک سنجیدہ شاعر، ایک متین ادیب، ایک باوقار مزاح گو اور ایک صاحبِ فن سے اردو کی صفِ اوّل میں خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے لیکن ہندوستان کے دوستوں، ادیبوں اور شاعروں سے ان کے تعلقات میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ اس نثری نوحے کو غالبؔ کے ایک شعر میں تصرّف سے مرحوم کے حق میں دعائے خیر پر ختم کرتا ہوں ؎

یہ لاش درکفن اسدؔ خوش بیاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

عرشؔ ملسیانی

اسدؔ ملتانی
(۱۹۳۸ء)

نادم سیتاپوری

غالب کی حریف۔ زہرہ و مشتری

مرزا نوشہ کو 'غالب' بنانے میں جو نمایاں حصہ مولینا فضل حق خیرآبادی نے لیا تھا اس کی مثال شاید ہی غالب کی زندگی میں کہیں اور نظر آئے — ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور کے یہ الفاظ

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) سے (غالب کی) ملاقات نہ ہو تو شاید میر تقی میر کی پیش گوئی کی دوسری شق پوری ہوتی جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ لڑکا (غالب) بھٹک جائے گا۔"

(صفحہ ۱۹۔ سرگزشت غالب مطبوعہ ابراہیمیہ پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۹ء)

اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں جنھیں 'غالبیات' پر ریسرچ کرنے والوں نے نہ جانے کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ حالانکہ بنیادی طور پر تمام 'غالب پرست' متفق ہیں کہ مولینا خیرآبادی وہ منفرد شخصیت ہیں جنھوں نے غالب کی زندگی کو اس ڈگر پر لگایا تھا جہاں آج غالب اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ زندہ ہے۔

..شیخ محمد اکرم صاحب نے 'غالب نامہ' میں لکھا ہے:۔

"مولوی فضل حق (خیرآبادی) غالب کے سب سے بڑے محب اور محسن تھے انھوں نے نہ صرف مرزا کی شعر و سخن کے میدان میں رہنمائی کی جو ان کا اصل "دائرۂ عمل" تھا بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی۔"

(صفحہ ۴۵۔ 'غالب نامہ' مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ)

اور مالک رام صاحب جیسے 'غالب شناس' کی یہ رائے غالب کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو اس سے زیادہ اُجاگر کرتی ہے:۔

"اگر مولوی فضل حق (خیرآبادی) اور ان کے رفقاء کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آ جاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابل قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہوا۔ ان کی اس زمانے کی اخلاقی حالت کا ذکر ہو چکا ہے اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔"

(صفحہ ۴۷۔ "ذکرِ غالب" (تیسرا ایڈیشن) مطبوعات مکتبۂ جامعہ دہلی)

لیکن 'آب و گل' کی یہ 'تضاد پسندی' بھی تاریخ ادب کا ایک دلچسپ موڑ ہے کہ 'خیرآباد' کی اس سرزمین کو جہاں 'فضل حق' جیسی 'غالب ساز' شخصیت کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہیں 'زہرہ اور مشتری' نے بھی جنم لیا جو اپنے زمانے میں غالب کی خاص حریف سمجھی جاتی تھیں۔

غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی ادبی ہنگامہ آرائیوں کے اعتبار سے ایک اہم زمانہ خیال کیا جاتا ہے۔ 'قاطع برہان' کی اشاعت کے بعد 'قاطع القاطع'، 'محرق قاطع'، 'ساطع برہان' اور 'مؤید برہان' کا سلسلہ جو شروع ہوا تو لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں بھی تموّج پیدا ہو گیا۔ اودھ میں آتش و ناسخ کا رنگ پہلے سے اتنا چھایا ہوا تھا کہ غالب کے ماننے والے اُنگلیوں پر

گئے جاتے تھے۔ مخالفت کا زور اتنا تھا کہ ریاض خیرآبادی جیسے 'مرنجِ و مرنجاں' قسم کے بزرگ نے 'مشقِ سخن' کی ابتداء ہی 'دیوانِ غالب' کے 'جوابی دیوان' سے کی جس کی ایک غزل کے مقطع کا آخری مصرعہ یہ تھا

بیں ہوں ریاضؔ کچھ اسدِ دہلوی نہیں

ریاضؔ کے اس دیوان کا لطیفہ بھی بہت دل چسپ ہے۔ میرے نانا سید ناظر حسین ناظرؔ[1] (وکیل سیتاپور) ریاضؔ کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ ریاضؔ جب غالب کے جواب میں یہ دیوان مکمل کر چکے تو ناظر سے ذکر کیا کہ میں نے غالب کے جواب میں پورا دیوان کہہ دیا ہے۔ کسی دن تمھیں بھی دکھاؤں گا۔ ناظر بڑے ہی پُر مذاق اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ بولے! خوب —— آپ اور غالب؟ سبحان اللہ۔ کیا کہنا؟

ان کے کلرک منشی چنیؔ لال مرحوم وہیں قریب بیٹھے ہوئے مقدمات کی مثلیں ترتیب دے رہے تھے۔ ناظر نے فی البدیہہ کہا

فلک کو دیکھتا ہوں غالب اور ریاض احمدؔ
خدا کی شان ہے ناظر حسین و چنیؔ لال

زہرہ اور مشتری اسی خیرآباد (ضلع سیتاپور) کی دو طوائفیں تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی میں ان کے خلاف ایک اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کر رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں کے تنقیدی مضامین 'اودھ اخبار' وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کا ضمنی تذکرہ 'ذکرِ غالب' میں کیا ہے —— تحریر فرماتے ہیں :۔

"یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمرن جان مشتری (عرف منجھو) اور امراؤ جان زہرہ (عرف بی چھٹن) نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور مذکور الصدر آغا علی شمسؔ کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کر دئے تھے۔ پنڈت کشن لال طالبؔ دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں سے ایک شعر تھا

شعاعِ شمسؔ زہرہؔ مشتری ہے
بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے

(فٹ نوٹ صفحات ۱۸۱/۱۸۲ ذکرِ غالب تیسرا ایڈیشن)

"تذکرۂ خم خانۂ جاوید" نے ان مضامین کا اصل مصنف زہرہ و مشتری کے استاد آغا علی شمس کو قرار دیا ہے اور شمس کے ذکر میں لکھا ہے ——

"انھیں دنوں میں آپ (شمس) نے بھی مرزا (غالب) کے خلاف اخباروں میں زہرہ و مشتری کے نام سے مضامین شائع کئے تھے اور مرزا صاحب کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پہ خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے۔"

(صفحہ ۶۰۳۔ جلد پنجم)

لیکن 'خمخانۂ جاوید' کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ ۲۵ جون ۱۸۶۷ء کے 'اودھ اخبار' (لکھنؤ) میں غالب کے خلاف جو مضمون شائع ہوا تھا وہ آغا علی شمس ہی کے نام سے تھا زہرہ و مشتری کے نام سے شائع کرانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا جب خود شمس پس پردہ رہ کر معرکہ آرائی کرتے —— مالک رام صاحب نے لکھا ہے :۔

" اسی دوران میں میر آغا علی شمس لکھنؤی نے 'اودھ اخبار' (۲۵ جون ۱۸۶۷ء) میں ایک مضمون لکھا جس میں مرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے۔ اس کا جواب سخنؔ نے اردو نثر میں اور باقرؔ نے فارسی نثر میں لکھا۔"

(ذکرِ غالب صفحہ ۱۸۱/۱۸۲)

ظاہر ہے کہ آغا علی شمس نے غالب کی مخالفت پس پردہ کی تھی پھر یہ کہنا کہ زہرہ و مشتری کے مضامین شمس کے لکھے ہوئے تھے کسی طرح قرینِ قیاس نہیں ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زہرہ اور مشتری نے یہ مضامین شمس کے ایما اور مشورے سے لکھے ہوں گے۔ اس کے علاوہ جہاں تک ان دونوں بہنوں کی علمی و ادبی قابلیت اور شعری صلاحیتوں کا تعلق ہے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں بہنوں نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی ذاتی قابلیت اور ذہنی صلاحیت کا نمونہ ہیں اور ان میں ان کے استاد شمس کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس دور کے کسی

---

[1] اس زمانے میں ایک دوسرے سید ناظر حسین ناظرؔ سیتاپوری بھی گذرے ہیں جنھیں ریاض خیرآبادی کی حقیقی بھتیجی منسوب تھیں۔ مشہور مصنف سید رئیس احمد جعفری ندوی انھیں کے صاحبزادے ہیں۔

استاد سے اس کے لائق شاگرد کو مل سکتا تھا۔

امام باندی (عرف چھوٹی بی) طوائف کی یہ دونوں لڑکیاں اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ بچپن ہی میں خیرآباد سے لکھنؤ چلی گئی تھیں۔ وہیں کی شائستہ محفلوں میں پلی بڑھیں اور وہیں پیوندِ خاک ہوگئیں۔ فارسی اور اُردو کے علاوہ فنِ شعر کی تکمیل میر آغا علی شمس (شاگرد ملک الشعراء قاضی محمد صادق خان اختر) سے کی جو اپنے دور کے ایک باکمال بزرگ گذرے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے شمس کی مثنوی طلعۃ الشمس کی ابتداء میں ان کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں۔

"(۱۲۳۲ھ تا ۱۳۱۲ھ)

سید آغا علی نام، شمس تخلص۔ اصل ان کی خراسان سے ہے۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ والدین نے انتقال کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں راجہ کندن لال اشکی نے ان کو اپنا پسرِ خواندہ قرار دیا۔ خوشنویسی کی مشق شمس نے انہیں سے کی تھی۔ انھیں کی وساطت سے نواب محمد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے ان کو رنگین رقم مشکیں قلم (اور) خان بہادر کا خطاب عطا ہوا اور وقائع نگاری کی خدمت سپرد کی گئی۔ کچھ روز تک زمرۂ مصاحبینِ شاہی میں بھی شامل رہے نواب فخر الدولہ زخمی بھی ان کی امیرانہ پرورش کرتے تھے۔ راجہ کندن لال کے بعد عرصہ تک نواب محمد تقی خان شاگرد مرزا سلیم کی سرکار سے توسل رہا لیکن آخر حصۂ عمر ان کا انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں تنگدستی میں بسر ہوا۔ زہرہ و مشتری مشہور طوائفانِ لکھنؤ کو فارسی پڑھاتے تھے اور انہیں کے مکان میں رہا کرتے تھے۔ بی مشتری کے نکاح کر لینے اور خانہ نشین ہونے کے بعد کانپور چلے گئے اور وہیں انتقال کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک الشعراء اختر کے شاگرد تھے۔ تحقیقِ الفاظ و صحتِ زبان میں کمال حاصل تھا۔ کتبِ درسیہ عربی و فارسی کی تکمیل مولوی فضل حق خیرآبادی، مولوی اوحد الدین بلگرامی، مولوی سبحان علی لکھنوی، مولوی سلامت اللہ کشفی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، میرزا قتیل اور مفتی میر عباس سے کی تھی۔ دیوان اردو و فارسی کے علاوہ ان کی ہندی چیزوں کا بھی مجموعہ قابلِ دید ہے۔ گلستانِ سعدی کے جواب میں ایک کتاب 'سنبلستان' لکھی تھی۔"

(طلعۃ الشمس مطبوعہ اردوئے معلیٰ پریس علی گڑھ)

امراؤ جان (عرف چھٹن صاحبہ) زہرہ اور بی قمرن جان (عرف مجھو صاحبہ) مشتری لکھنؤ کی ڈیرے دار طوائفیں تھیں۔ ان کی ماں امام باندی کے بزرگوں کی زمینداری میں بمقام 'سیتاپور' آباد تھی لیکن جب اس کی بہن (غالباً خالہ زاد) الٰہی بخش نے خیرآباد کے چکلہ دار سے نکاح کر لیا تو طوائفوں کا یہ خاندان سیتاپور سے خیرآباد منتقل ہوگیا جو اس زمانے میں نوابینِ اودھ کی نظامت (کمشنری) کا درجہ رکھتا تھا۔ زہرہ و مشتری خیرآباد ہی میں پیدا ہوئیں لیکن بچپن ہی میں انھیں خیرآباد کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ جس چکلہ دار سے ان کی خالہ نے نکاح کر لیا تھا وہ معتوب و معزول کر دیا گیا۔ ان دونوں بہنوں کی مکمل تعلیم و تربیت لکھنؤ کی اس علمی و ادبی فضا میں ہوئی جہاں بڑے بڑے شرفاء اپنے بچوں کو علمِ مجلسی سکھانے کے لئے طوائفوں کے گھر بھیجا کرتے تھے۔ درسی تعلیم اور فنِ شعر تو ان دونوں بہنوں نے میر آغا علی شمس جیسے محقق دوراں اور فاضلِ اجل سے سیکھا۔ موسیقی اور رقص کی دیکھ دیکھ حیدر علی قوال اور استاد گھسیٹا خاں نے کی۔ جان عالم نواب واجد علی شاہ کا دورِ حکومت تھا۔ لکھنؤ ہی نہیں دونوں بہنوں کی دھوم ہندوستان میں مچ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ زہرہ و مشتری دو جداگانہ ہستیاں ہونے کے باوجود کچھ اس طرح لازم و ملزوم کر دی گئیں کہ آج 'زہرہ و مشتری' کے ذکر میں کوئی تفریق نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کسی ایک ہی منفرد ہستی کا نام ہے حالانکہ شعرائے اُردو و فارسی کے تمام تذکروں میں ان دونوں کا ذکر علیحدہ علیحدہ کیا گیا ہے۔ "تذکرہ بہارستان ناز" جو ان دونوں بہنوں کی زندگی میں چھپا تھا اس میں دونوں کا ذکر موجود ہے۔

"زہرہ — تخلص۔ امراؤ جان نام۔ بی چھٹن صاحبہ مشہور شعر گوئی میں مشاق۔ شوخ طبعی میں شہرہ دور دور۔ میر آغا علی شمس کی شاگرد ہیں اور انھوں نے ہی بنایا ہے 'میرچی' کا شہرہ اظہر من الشمس ہے۔ زہرہ کی زبان کو انھوں نے چمکایا ہے۔ شاگرد اگر اچھا ہو تو فخرِ استاد ہے۔ زہرہ

کی بدولت میاں شمس کی ہردم سب کو یاد ہے - اب بی مشتری کی تحریر سے معلوم ہُوا کہ پانچ برس سے اس شاعرہ نے کسی رئیس عالیخاندان سے عقد کر لیا - اپنا دامن تر گوہرِ توبہ و استغفار سے بھر لیا - شعر گوئی کو بھی ترک کر دیا - دیکھئے اچھوں کی صحبت نے اچھا ہی اثر دیا - خدا کرے چھپک کی عادت نہ اختیار کرلے - ہمیشہ کے لئے پردہ نشینی ہی اپنا شعار کرے -"

(صفحہ ۹۴ - تذکرہ بہارستان ناز مطبوعہ مطبع عثمانی میرٹھ ۱۲۸۱ھ)

اس کے بعد زہرہ کے اردو کلام کا نمونہ بھی دیا گیا ہے -

دوسری جگہ مشتری کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے :

" مشتری تخلص - موسوم بہ قمرن جان معروف بہ منجھو لکھنؤ کی رہنے والی - شاعری میں خیال بیشالی - طبیعت نہایت تیز - فکر رسا ہے - میاں شمس کی تعلیم یافتہ ہے - ماشاءاللہ جیسے استاد کی مشہور طبیعت ہے ویسی ہی زہرہ و مشتری کو شہرت ہے - اور کیوں نہ ہو جب تعلیم میں استاد صاحب اس قدر خیال سے بتائیں تو شاگرد کیونکر نہ گھر گھر شہرت پائیں واقعی یہ کہ حضرت شمس نے ان دونوں کا لہ آتش کو ایسا چمکایا ہے کہ فلک پر زہرہ و مشتری کا رنگ اڑایا ہے اگر چندے اسی طرح تعلیم پائیں گی تو بی مشتری اپنے تئیں فلک پہ پہونچائینگی - سات برس کی عمر سے اس شاعرہ کو شوقِ نوشت وخواند ہے - یہ ستارہ جلوہ ریزی حضرت شمس سے بڑھتے بڑھتے اب چودھویں رات کا پورا چاند ہے - خیر سے سامانِ ظاہری سے درست اور اللہ کی دی ہوئی کچھ جائداد ہے - مسجد - امام باڑہ - باغ - مکان قدیم الایام بمقام خیرآباد ہے - اردو فارسی نظم ونثر اور تاریخ گوئی ان کی سوا مشق خط خفی وجلی سب میں طاق ہے - مگر پندار میں بھی شہرہ آفاق ہے - غرض ایسے استاد شفیق کے سبب سے فن شعر کا کوئی دقیقہ نہیں باقی ہے - وہ کون بزمِ مشاعرہ ہے جہاں شمس و زہرہ و مشتری کی نہیں مشتاقی ہے - یہ شاعرہ ہر فن میں کامل کیوں نہ ہو اس کا استاد بھی تو صاحبِ کمال ہے دیکھئے مشتری عطارد رقم کا ۲۳ برس کی عمر میں ایسا ہو جانا استاد کی صاحب کمالی پر دال ہے - سبحان اللہ کیا ذہن آسمان پیوند ہے کوئی جھوٹ سمجھے یا سچ - ایک کے دل کی دوسرے کو کیا خبر - مگر ہمیں تو جی سے اس کا کلام پسند ہے - ہاں اس قدر افسوس ہے کہ اس لیاقتِ علمی پر اپنے نزدیک بہت دُور ہے - جس آدمی میں جوہر لیاقت بھی ہے اور انکسار بھی ہے وہ تو نوراً اعلیٰ نور ہے شعر

بتوں نے حسن پہ نخوت اگر سیکھی تو کب سیکھی
نکورو ہو کے بدخصلت اگر سیکھی تو کب سیکھی

مگر یہ جو اس کو نخوت ہے کب خالی از حکمت ہے - ہماری رائے میں یہ وہ ٹیکا ہے جس نے نظرِ بد سے اس کو بچا رکھا ہے المختصر جو انداز ہے اچھا ہے اب صفحہ "بہارستان ناز" اس غنچہ دہن کے اشعار سے گل بدامن ہے -"

(صفحہ ۸۳ و ۸۴ تذکرہ "بہارستانِ ناز")

اس کے بعد مشتری کے بھی اردو و فارسی اشعار کا ایک اچھا خاصا انتخاب پیش کیا گیا ہے -

یہ اقتباس کچھ کم ایک صدی ادھر کے ایک اردو تذکرے سے کیا گیا ہے جو غالب کی حیات میں چھپ چکا تھا - اگر دو تین سال ترتیب و تدوین کے بھی شامل کرلئے جائیں تو یہ اندازِ بیان پورے سو برس ادھر کا ظاہر ہے جس میں جگہ جگہ زہرہ و مشتری ہی پر نہیں ان کے استاد شمس پر بھی چوٹیں کی گئی ہیں -

اُردو اور فارسی کے اکثر و بیشتر تذکروں میں "زہرہ و مشتری" کے مختصر حالات ضرور ملتے ہیں لیکن جتنی بڑی کمی خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے پوری کی ہے مجھے ابھی تک کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آئی وحشت مرحوم نے ان کے مختصر مگر محققانہ حالات ہی نہیں لکھے بلکہ ان کے بہت سے خطوط بھی فراہم کر کے ماہنامہ 'جادو' ڈھاکہ میں شائع کرادئے - خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ماہنامہ 'آج کل' (دہلی) کے

خطوط نمبر ۱۹۵۴ء میں مشتری کا ایک اردو خط شائع کیا ہے جو انھیں محترمی قاضی عبدالودود صاحب (بیرسٹر پٹنہ) کی وساطت سے پہونچا ہے۔ اسی خط کے سلسلہ میں فاروقی صاحب نے وحشت کے حوالے سے مشتری کے مختصر حالات بھی لکھے ہیں :-

"مشتری کے متعلق خان بہادر رضا علی وحشت نے لکھا ہے ۔مشتری سیتاپور ضلع خیرآباد (خیرآباد ضلع سیتاپور صحیح ہے) کی ایک مشہور رقاصہ تھی مگر ہمیشہ لکھنؤ میں رہی۔ نام قمرن جان تھا عرف بی منجھو۔ علم موسیقی میں گھسیٹ خان اور حیدر علی خان قوال کی شاگرد تھی۔ شاعری کا سنِ شعور سے شوق تھا۔ آغا شمس کی شاگرد تھی۔ مشتری کا ایک دیوان فارسی موسوم بہ "خانۂ خیال"[2] طبع ہوگیا ہے۔ یہ شعر بہت جلد کہتی تھی جب مہاراجہ مہندر سنگھ۔۔۔ والی پٹیالہ لکھنؤ میں آئے مشتری نے سرِ محفل چند اشعار — مدح میں نظم کئے اور اجازت لے کر ان کو پڑھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے اور ایک ہزار روپے انعام میں مرحمت کئے۔ آخر میں تائب ہوکر ناچنا گانا چھوڑ دیا تھا اور سید اعجاز حسین اعجاز سے عقدِ شرعی کیا تھا۔ مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد کے مالک ہوئے جہاں حسن وجمال نے اس کے کمالات کو چار چاند لگائے تھے۔ صفاتِ حمیدہ نے — عزیزہ خلق کردیا تھا۔ فنِ شعر سے جیسا اس کو اُنس تھا ویسی ہی وہ اہلِ فن کی قدرداں تھی۔ اطرافِ ہند کے مشاہیر سے روشناس تھی ۔۔۔۔ لکھنؤ ہی میں نسّاخ ۔۔۔۔۔۔ سے اس کا تعارف ہوا اور ۔۔۔۔۔ دونوں کا تعلق بہ درجہ تعشق پہنچ گیا۔

عبدالغفور نسّاخ نے سخن شعرا میں لکھا ہے (ص ۴۷۹)

مشتری تخلص۔ قمرن جان عرف منجھو طوائف۔ ساکنہ لکھنؤ۔ شاگرد آغا علی شمس۔ خوش طبع وخوش نویس وخوشگوار ہے۔ راقم الحروف سے اس شوخیٔ مجسم سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی۔"

(ماہ نامہ 'آج کل' (خطوط نمبر) اپریل ۱۹۵۴ء صفحہ ۹ و ۱۰)

زہرہ عمر میں مشتری سے بڑی تھی مگر کسی تذکرے سے زہرہ کا سنِ پیدائش معلوم نہیں ہوتا۔ تذکرہ 'بہارستانِ ناز' کی اشاعت (۱۲۸۱ھ) کے وقت مشتری کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے مشتری کا سنِ ولادت ۱۲۵۸ھ نکلتا ہے۔ 'مشاہیر نسواں' میں مشتری کا سن وفات ۱۳۱۵ھ لکھا ہوا ہے۔

"مشتری۔ لکھنؤ کی قمرجان عرف منجھو طوائف کا تخلص ہے یہ شاعرہ آغا علی شمس کی شاگرد تھی۔ بڑی اچھی طبیعت پائی تھی ۱۳۱۵ھ میں نذرِ اجل ہوئی۔"

(صفحہ ۵۱۹۔ مشاہیر نسواں مطبوعہ خادم التعلیم پریس لاہور ۱۹۰۲ء)

گویا بوقتِ وفات مشتری کی عمر ۵۷ سال تھی۔

مشتری کی ماں امام باندی (وفات ۱۲۸۵ھ و ۱۸۶۸ء) اگرچہ شاعرہ نہیں تھی لیکن اتنی حاضر جواب، پُر مذاق اور بذلہ سنج عورت تھی کہ بڑی بڑی محفلوں میں اچھے اچھے منھ کی کھا جاتے تھے۔ محترمی قاضی عبدالودود صاحب نے آغا علی شمس کی 'نقلِ محفل' کے حوالے سے امام باندی کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔

"بحث تھی کہ آج ایک امام کی شہادت کا دن ہے اور دوسرے امام کی ولادت کا۔ خوش رہنا چاہیئے یا مغموم؟ امام باندی نے بے ساختہ جواب دیا کہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا حتی المقدور 'شادیٔ مرگ' ہونا چاہیئے۔"

---

[1] دتاسی کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۴۰۰ میں مشتری کا ترجمہ درج ہے جو 'بہارستانِ ناز' مصنفہ رنج سے ماخوذ ہے۔ دتاسی کا بیان ہے کہ ۶۔ جولائی ۱۸۶۹ء کے 'اودھ اخبار' میں اس کی ایک غزل بھی چھپی تھی اس نے مشتری کو ساکنہ لکھنؤ شاگرد شمس اور رقیب 'زہرہ' لکھا ہے۔

[2] مشتری کے دیوان کا نام 'خانۂ خیال' نہیں بلکہ 'ترانۂ خیال' ہے۔ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ "مطبعِ گلزار محمدی" دیکھا ہے اس پر 'ترانۂ خیال' معروف بہ 'دیوانِ مشتری' ہی لکھا ہوا ہے۔ 'خانۂ خیال' مشتری کے فارسی مجموعۂ نثر کا نام ہے۔ (نادم سیتاپوری)

(صفحہ ۲۳ - ۲۴ : نقلِ محفل ' مطبوعہ گلزارِ محمدی ۱۳۹۱ھ)

امام باندی، زہرہ اور مشتری کی حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے اتنے لطیفے مشہور ہیں کہ اگر انھیں قلمبند کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن ان کی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کی صداقت بھی مشکوک ہو گئی ہے۔

مشہور تو یہی ہے کہ زہرہ و مشتری اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں لیکن مجھے اب تک زہرہ کی کوئی فارسی غزل، نظم، رباعی یا قطعات دستیاب نہیں ہو سکے البتہ زہرہ کی اردو غزلیں جا بجا تذکروں اور گلدستوں میں اب بھی بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ مشتری کا فارسی اور اردو کلام تذکروں میں بھی موجود ہے اور کثرت سے شعر و سخن کے گلدستوں میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ مشتری کی فارسی غزلیات کا مجموعہ 'ترانۂ خیال' (معروف بہ دیوانِ مشتری) اور فارسی نثر کا مجموعہ 'خانۂ خیال' بھی ہیں۔ 'ترانۂ خیال' اور 'خانۂ خیال' دونوں مطبع گلزارِ محمدی (اکبری دروازہ چوک لکھنؤ) میں چھپے تھے۔ ان کے پہلے ایڈیشن میری نظر سے نہیں گذرے لیکن دوسرے ایڈیشن (۱۳۰۴ھ) میرے پیشِ نظر ہیں۔ مجموعہ نثر فارسی 'خانہ خیال نثر مشتری' کی ضخامت صرف بیس صفحات ہے۔ آخر میں منشی شنکر دیال فرحت شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر کی ایک فارسی تقریظ بھی شامل ہے۔

ترانۂ خیال (دیوان مشتری) ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایکسو سے زیادہ غزلیات، قطعات، تضمینیں اور تاریخیں وغیرہ شامل ہیں اور بعض تمام غزلیات وغیرہ مشکل صنعات میں کہی گئی ہیں جو مشتری کے کمالِ فن کی دلیل ہیں۔ مثلاً

۱۔ محیط الکل (ہر لفظ کہ نوشتہ خواہد شد ازیں حساب عدد "محمدؐ" بر خواہد آمد)

۲۔ " " (اس کے ہر لفظ سے 'علی' کے اعداد نکلتے ہیں)

۳۔ ترکِ الف (۴) ترک ہائے موحد (۵) ترک خو قانی (۶) ترک مثلثہ (۷) ترک جیم (۸) ترک ہائے بے نقط (۹) ترک ہائے معجمہ (۱۰) ترک تحتانی (۱۱) صنعت فوقانیہ (۱۲) صنعت تحتانیہ (۱۳) صنعت تضمیمہ (۱۴) صنعت موصل (۱۵) صنعت منشاء (۱۶) صنعت خیفا وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ فارسی کا یہ مجموعہ مشتری کے ارتقائے کمال کی ایک ایسی منھ بولتی تصویر ہے جس کی مثال شاید اس دور کی خواتین میں مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ اس مجموعہ کا قریب قریب نصف حصہ تقریظوں اور تاریخوں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر تاریخی مصرعوں سے ۱۲۹۷ھ اور ۱۲۹۸ھ نکلتے ہیں۔ دو ایک مادہ تاریخ ۱۲۸۰ ہجری کے بھی ہیں۔ سب سے آخری قطعۂ تاریخ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کا ہے جس سے ۱۳۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ تاریخ گو شعراء میں امیر مینائی، داغ دہلوی، مرزا آغا حسن ازل، شیخ الطاف حسین تسلیم مرادآبادی، منشی گوبند لال صبا، افضل علی ضو (مالک سید الاخبار) عباس حسین فصاحت (خلف میر آغا حسن امانت) میر غلام حسین قدر بلگرامی (تلمیذ غالب) میرزا عنایت علی بیگ ماہ (برادر مرزا حاتم علی مہر) کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قدر بلگرامی کے نام کے ساتھ جو عبارت آرائی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ میرزا غالب کے خلاف جو ادبی ہنگامہ آرائی کی گئی تھی اس پر ذاتیات کی چھاؤں بھی نہیں پڑی تھی۔ قدر کے قطعۂ تاریخ کا سرنامہ ہے ——

"شاہ بیت قصیدہ عظمت و فضیلت۔ مصراع چہارم
رباعی شرافت و نجابت۔ بدر و صدر آسمان و ایوان بلند مقامی
و نیکنامی قدر جناب مولوی غلام حسین صاحب بلگرامی مرید و
شاگرد نواب اسد اللہ خان غالب اکبرآبادی۔ دبیرانۂ مضامین
آفرینی را باعث آبادی"

(صفحہ ۶۲ ترانۂ خیال)

سب سے آخری صفحہ پر مطبع گلزارِ محمدی کے مالک 'محمدؐ وزیر' کا ایک اعلان ہے جس میں دوسرے لوگوں کو اس کتاب کی طباعت سے منع کیا گیا ہے۔ اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشتری کا مکان 'قدیم نخاس' (لکھنؤ) میں تھا۔

مشتری کی فارسی 'انشا پردازی' کا نمونہ 'خانۂ خیال' کے علاوہ بہت سے 'خطوط' بھی ہیں جنھیں خان بہادر رضا علی وحشت مرحوم نے جمع کر کے چھپوائے ہیں۔ لیکن ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ بھی مشتری اور زہرہ کے بہت سے خطوط گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں۔ حال ہی میں مجھے ان کے دو غیر مطبوعہ فارسی خطوط کی نقلیں برادرم مولوی نجم الحسن خیرآبادی کے توسط سے دستیاب ہوئی ہیں جو

کسی خیرآبادی بزرگ' کو لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط پر نہ کوئی تاریخ ہے نہ مکتوب الیہ کا نام۔ صرف سیاق عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'زہرہ و مشتری' کے یہ خطوط ان کے کسی ہم وطن ہی کے نام ہیں۔ پہلے خط میں کسی مقدمہ کا ذکر ہے جو ان کے موروثی باغ کے سلسلے میں چل رہا تھا۔

باسمہ سبحانہ'

دام اقبالہ و اجلالہ۔ خوب شد کہ بہ ترمیم شکست و ریخت غریب خانہ بطور دیگر سر دست مناسب بود ہمت عالی گماشتند۔ و مرمت کلی بر فصل زمستان کہ بشرط خیریت زود تر می رسد۔ گزاشتند شکایت بدگمانی من نسبت خود عبث خود از خامہ رافت بار چکید؟ خدا نخواستہ ایں فعل ہیچ و پوچ بیا بیابان دور نہ دل نزدیک کسے صادر و وارد گردیدہ۔ خلاصہ تحریر سابق ایں بود است کہ درستی کارہائے ما بر گذارش ما منحصر و موقوف نباشد بلکہ ہر چہ مقتضائے وقت و محل ناز از آں مربی مطلق و مالک برحق۔ رنگ ظہور باشد۔ حال مقدمہ مرجوعہ عدالت مفصل بنگارند و ایں ہم کہ بر باغ مرہونہ قبض و دخل ضابطہ یانہ بہ تحریر آرند و ارسال مسک مطلوب از ایں جہت در التوا افتادہ کہ وارث قرض خواہ از ینجا پا براہ سفر کانپور ستادہ۔ واجب دانستہ عرض نمود۔ زیادہ فرحت بنمود۔

سعدین۔ زہرہ مشتری

اختر... آسمان ریاست — و فیض رسانی گوہر دریائے امارت و قدر دانی دام اقبالہ'

والا نامہ مکرمت مشحون۔ مرحمت مقرون۔ تاج سر ورود۔ شفقت آمود گردیدہ و مضمون آن از اول تا آخر آبرو بخش ذہن ناقص ما بر لیاقت گشت۔ کنیز پروری و پرستار نوازی کہ از غلامان جناب نسبت ایں کمترینان بظہور رسید۔ شایان ولی نعمتان و سزاوار خداوندان بود۔ شکر احسانات بے پایان از حوصلہ تحریر و اندازہ تقریر بیرون و افزونست ایزد

بسیار بخش بجلدوی چنیں مراحم و تفضلات جناب والا احتشمت و اقبالے کہ ما فوق آن متصور نباشد عطا فرماید۔ بجائے پاک ہر چند خواستیم کہ آستان فیض نشان بہ لبہائے ارادت و عقیدت ببوسیم۔ لیکن امور یکہ سنگراہ مقصود شد۔ بیانش دریں پارچہ قرطاس نمی تواند گنجید۔ انشاء اللہ بعد محرم حاضر گشتہ آں قصہ طویل را بہ سمع اقدس خواہیم رسانید آمدیم مبلغ اکہا سباب و صرف ضروری بدست میر نجف علی صاحب فرستادیم الیشان حسب معمول قدیم بجا آوری مراسم عزاداری حق المقدور خواہد پرداخت لیکن آنجناب براہ عنایات مربیانہ یک آدم ہوشیار بطور مددگار بہ امام باڑہ لنیات نما شند۔ تا وقتیکہ میر صاحب بمجالس دیگر روند۔ آدم مذکور نگہبانی فرش وغیرہ بر عمل آرد۔ و فروخت فصل انبہ وغیرہ باغ و خالی ماندن ہر سہ دکان از کرایہ دار مرکوز خاطر دریا مقاطر باشد بلکہ تا فروخت شدن فصل یک دو "پاسی" معتبر از طرف جناب عالی محافظ باغ شود۔ و باغ جدید کہ تصدق فرق مبارک است۔ در بنیو دیا نشاندہ نشود۔ و سبزہ کنیز کہ بے اجازت و اطلاع ما آنجا رفتہ ہرگز در مسجد و امام باڑہ و غریب خانہ راہ نیابد زیادہ سوائے این رباعی چہ گذارش دہم۔

اے آنکہ ترا لطف و عطائے زیبد

ما راگنہ و جرم و خطائے زیبد

زنہار نگویم کہ چنان کن و چنیں

با حسن تو ہمان کن کہ ترا می زیبد

بخدمت سراسر عظمت حاشیہ نشینان بساط عزت مستاط قبلہ و کعبۂ جہان مخدوم و مسجود زمان حضرت فرشتہ خصلت جناب متولی صاحب مدظلہ آداب و تسلیم قبول باد

"زہرہ و مشتری"

ان دونوں خطوط سے ان کی وطنی وابستگی کا اچھا خاصہ ثبوت ملتا ہے۔ لیکن آج اسی "خیرآباد" میں ان کے مکان کا تو ذکر ہی کیا 'مکین' کا نام لیوا بھی کوئی نہیں۔

مرزا جعفر حسین

مرزا غالب کا فارسی کلام

تقریباً سو سال کے اندر جتنا مطالعہ غالب کا کیا گیا ہے، کتابیں، مضامین، رسائل، تحقیقاتی مقالے اور عقیدت مندانہ خراج تحسین یا مخالفانہ نقد و تبصرہ سے بھرے ہوئے دفتر تیار کئے گئے ہیں اتنا کسی اور کے بارے میں نہیں لکھا گیا اور نہ کوئی دوسرا شاعر یا ادیب اتنا بڑا مرکزِ توجہ بن سکا۔ اس کی وجہ بقول پروفیسر احتشام حسین یہ ہے کہ " لوگ دوسروں کی کاوشوں کو اپنے لئے بہ قدرِ ذوق نہیں پاتے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ لوگ غالب کو اپنے آئینہ میں اور غالب کے کلام کو آئینہ بنا کر اس میں اپنی شخصیت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ مرزا کے بے حد مختصر اردو دیوان سے متعلق ہے جس کو وہ خود "بیرنگ من ست" کہہ کر سبک کر چکے تھے۔ ان کو اگر اپنے کلام پر ناز تھا تو فارسی کلام پر جس کا اچھا خاصا ضخیم کلیات ہمارے پاس موجود ہے مگر ہم نے اس پر آج تک اتنی توجہ نہیں کی جس کا وہ مستحق ہے۔ مرزا کی اس کلام کے متعلق جو اپنی رائے ہے وہ ان دو شعروں سے واضح ہو جاتی ہے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ — بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیمِ خیال — مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگ من ست

مرزا کے اسی قول سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے فارسی دیوان کو ارتنگ کا مرتبہ دے کر اقلیمِ خیال میں اپنے کو مانی و ارژنگ کا ہم پلّہ قرار دیتے تھے۔ ان کا فارسی کلام ان کے اس قول کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مرزا کی مادری زبان فارسی نہیں تھی، ان کا ماحول ایرانی نہیں تھا۔ طبیعتاً بھی وہ "کنارِ آب رکنا باد و گلگشت مصلےٰ" کے شیدائی نہیں تھے۔ شیراز و اصفہان اور سمرقند و بخارا کی یادیں اگر ان کے دل میں موجزن ہوتی بھی تھیں تو صرف اس لئے کہ ہندوستان کے بہشت میں ان کے لئے آدم کا وجود عنقا تھا وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ

سخن نیست در لطفِ ایں قطعہ غالب
بہشتے بود ہند کآدم ندارد

اپنے معاصرین میں ان کو انسانیت اور انسانی ہمدردی کا اتنا فقدان محسوس ہوتا تھا کہ وہ یک لخت آدمیوں کی صورت سے ڈرنے لگے تھے اور آدمیوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے متعدد بار اور طرح طرح سے کیا ہے۔ اس مقام پر صرف ایک اردو اور ایک فارسی شعر پیش کر دینا کافی ہوگا۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مرا ز روزِ قیامت غمے کہ ہست این ست
کہ روئے مردم دنیا دوبارہ باید دید

مردم گزیدگی سے تکلیف کا اظہار غالباً ان دو طریقوں سے بہتر کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اپنے بھائی بندوں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کے احساس کے باوجود مرزا کے دل میں ہندوستان کے شہروں، ہندوستان کے میووں اور ہندوستان کے پانی سے وہ محبت تھی کہ وہ "کنارِ آب رکنا باد" کو سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ آم

سے اُن کو عشق تھا اور اس ہندوستانی پھل کو وہ جنت کے میووں پر ترجیح دیتے تھے۔ کہتے ہیں:

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ہندوستان کے پانی میں دریائے سون سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ متعدد مقامات پر دریائے سون کا ذکر آیا ہے اور اس کے پانی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے ہر مقام پر لفظ سوہن استعمال کیا ہے مگر سمجھنے والا بھی سمجھنے پر مجبور ہے کہ ان کی مراد دریائے سون ہی ہوگی۔ کہتے ہیں:

مرحبا سوہن و جاں بخشی آبش غالب
خندہ بر گمرہیٔ خضر و سکندر دارم

ہندوستان کے شہروں کا جب وہ ذکر کرتے ہیں تو ان کے اندازِ کلام ہی سے ان کے دل کی گہرائیوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایک فارسی قطعہ میں 'محرم سرائے سرور' سے مکالمہ ہوتا ہے۔ یہ "محرم سرائے سرور" حضرت مرزا کی روح ہے۔ اس مکالمہ میں مختلف شہروں کے بارے میں سوالات ہیں اور ان کے جوابات۔ ان جوابات ہی کو دیکھ کر مرزا کے جذبات کا صحیح پتہ چل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست　　گفت جان ست و ایں جہانش تن
گفتمش چیست ایں بنارس گفت　　شاہدے ہست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد　　گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوشش باشد　　گفت خوشش تر نہ باشد از سوہن
حال کلکتہ باز جستم گفت　　ہابد اقلیم ہشتمش گفتن

الخ

ان اشعار کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مرزا ہندوستان کے ماحول اور یہاں کی روایات میں آتنا ڈوب چکے تھے کہ ان کو بیرونی ماحول اور کیفیات سے متاثر ہونے کی ضرورت ہی باقی نہ تھی اس لئے ان کے فارسی کلام کے محاسن اور زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ فارسی شعراء میں مرزا جن اساتذہ سے متاثر ہوئے وہ وہی شعراء تھے جو ہندوستان میں آکے بس گئے تھے اور جنھوں نے ہندوستان ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا جیسے نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل۔

ان اساتذہ سے لگاؤ اور ایرانی ماحول سے فطری دوری کا یہ اثر ضرور ہوا کہ مرزا کے یہاں حافظ و خیام کی سرمستی و چاشنی، سعدی کی سادگی، فردوسی کی ایسی رفعتِ خیال، قاآنی کا شکوہ الفاظ، انوری کا لب و لہجہ اور دوسرے خالص ایرانی شاعروں کے وہ خصوصیات جو ایرانی ماحول و وراثت سے متعلق ہیں بہت کم ملتے ہیں لیکن پھر بھی مرزا ہی کا یہ دم خم تھا کہ انھوں نے ان خصوصیات کو بھی حاصل کر کے چھوڑا اور پھر ان لسانی اور وجدانی خصوصیات میں تفکر و تعقل کی گہرائیوں، حسن و عشق کی معاملہ فہمیوں، تصوف کی محو کر دینے والی منزلوں، انسانی کردار کی بلندیوں اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کے معیار کو شامل کر کے اپنے فارسی کلام میں وہ چار چاند لگا دیئے جن کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں ملنا بہت مشکل ہے۔

مرزا نے اپنے ابتدائی مشقِ سخن میں بیدل کی تقلید کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ اُن کے اردو دیوان میں بہت سے ایسے شعر ملیں گے جو بیدل کے رنگ میں کہے تھے۔ فارسی میں بھی اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا اور بیدل کی ایک ہم طرح غزل کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں:

ہر طرف منظر کردیم ہم بخود سفر کردیم
لے محیط حیرانی ایں چہ بیکرا نیہا ست
ما ز سیر ایں گلشن عشوۂ طرب خوردیم
ورنہ چشم وا کردن عبرت امتحانیہا ست
سازِ ما شکستِ دل یا رازیں نوا غافل
بر کہ بیش خود نالیم نالہ بیزبانیہا ست
بیدل

در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ می نمی میرم ہم ز ناتوانیہا ست
از خمیدن پشتم روے بر قفا باشد
تا چہا دریں پیری حسرت جوانیہا ست
کشتۂ دل خویشم کز ستمگراں یکسر
دیدہ دلفریبیہا گفت مہربانیہا ست
با عدو عتابستے و ز منش حجابستے
وہ چہ دلربائیہا ہے چہ جانستانیہا ست
غالب

ان اشعار کا موازنہ ثابت کر دے گا کہ بیدل کی تقلید کرنے کے باوجود مرزا کی انفرادیت ثابت ہے اور ان کا وہ طرز جو آگے بڑھ کر خود انھیں کا اندازِ سخن کہلایا اور بن گیا اس کلام میں بھی موجود ہے۔ ورنہ دلفریبیوں کو مہربانی کہنے، نہ مرجانے کا سبب ناتوانی کو قرار

دے دیئے اور پیری میں حسرت جوانی کا نمونہ پیش کرنے کی ترجمانی نہ ہوتی یہی وہ مقامات ہیں جہاں مرزا غالب آپ اپنی مثال ہیں اور کوئی دوسرا ان کا ہم پلّہ یا مدِمقابل نظر نہیں آتا۔

مرزا کی فطری صلاحیتوں میں ان کے مطالعے اور دقیقہ سنجی نے بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مرزا نے اگر بیدل کی تقلید کی تو اسی ایک زاویۂ نگاہ کے وہ پابند نہیں رہے۔ انھوں نے ہر اُس شاعر کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جس کو وہ اساتذہ کی صف میں جگہ دینے کے لئے تیار تھے اور ہر ایسے استاد سے کچھ نہ کچھ اکتساب کی جدوجہد بھی کی تھی۔ چنانچہ اپنے فارسی کلّیات کی تقریظ میں وہ خود لکھتے ہیں:

"شیخ علی حزیں بخندہ زیرلبی بیراہہ روی مرا در نظرم جلوہ گر ساخت۔ وزہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آں ہرزہ جنبش ہائے ناروا در پائے رہ پیمائے من بسوخت۔ ظہوری بسرگرمی گیرائی نفس حرزے بہ بازوے و توشۂ بر کرم بست و نظیری لاأبالی خرام بہنجار خاصہ خودم بچالش آورد۔ اکنوں بیمن فرّہ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من بخرامش تدروست و برامش موسیقار بجلوہ طاؤس ست و بہ پرواز عنقا۔"

متذکرہ بالا بیان کا دقیق مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ مرزا کی نگاہ میں شیخ علی حزیں اور طالب آملی کے مقابلہ میں ظہوری اور نظیری کا پلّہ بھاری تھا اور عرفی کا مقام ان دونوں کی منزلوں کے درمیان ہیں۔ اس وضاحت کا ثبوت خود مرزا کے اشعار سے بھی مل جاتا ہے۔ عرفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیفیت عرفی طلب از طینت غالبؔ ——— جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

قافیہ غالبؔ چو نسبت پرس ز عرفی ——— گر من فرہنگ بودے چہ غمستے

گشتہ ام غالب طرف با مشربِ عرفی کہ گفت

روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

ان اشعار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا اپنی 'طینت' میں 'کیفیت' عرفی کا اکتساب اور الفاظ کی بہتات میں عرفی سے فیض حاصل کرکے 'مشربِ عرفی' کے ہم نوا بننا چاہتے تھے اور اس ہم نوائی کو حاصل کرنے کے بعد بھی ان کا کلام یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنے مخصوص ذوقِ فکر اور طرزِ ادا کو برقرار رکھتے ہوئے عرفی سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ شعر عرفی اور غالب کے دونوں کی علٰحدہ علٰحدہ "طینت" اور بلند خیالی کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں:-

صبحدم چوں در دمد دل صورشیون زآمن
آسماں صحن قیامت گردد از غوغاے من
(عرفی)

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جاے من
وائے گر باشد ہمیں امروز من فرداے من
(غالب)

اقبال کرم میگزد اربابِ ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را
(عرفی)

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را
خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را
(غالب)

یہ دونوں مطلع قصائد کے ہیں۔ عرفی اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ بھی اس مقام پہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اس لئے کہ دونوں کا مخصوص طرزِ ادا اور دونوں کے سوچنے اور اظہار خیال کے رجحانات اسی ایک غزل سے واضح ہو جائیں گے۔

جنگ آتش آشتی آتش مدارا آتش ست
خوش سرو کارے ازاں بدخو مرا با آتش ست
بادہ خواہی باش تا از غم برُوں آرم کہ من
انچہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست
آبِ حیواں می کنم در جام و آتش میخورم
بادہ با شاہد مے ناب ست و تنہا آتش ست
ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست
با کہ گویم سرایں معنی کہ نورِ حسنِ دوست
با دماغِ من گل و با چشمِ موسیٰ آتش ست
(عرفی)

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتش ست
بعد ازیں گویند آتش را کہ گویا آتش ست
انتظارِ جلوۂ ساقی کبابم می کند
مے بہ ساغر آبِ حیوان و بہ مینا آتش ست
بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روے دریا آتش ست
گریۂ دارم کہ تا تحت الثریٰ آب ست و بس
نالۂ دارم کہ تا اوجِ ثریا آتش ست
پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا مترس
در شریعت بادہ امروز آب و فردا آتش ست
(غالب)

عرفی سے اکتسابِ فیض اور پھر اس فیض میں جدّت آفرینی مرزا کا طرّۂ امتیاز تھا جو اوپر کی دونوں غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی حالت اُن دوسری غزلوں کی بھی ہے جو مرزا نے عرفی کی طرحوں میں کہی ہیں۔ عرفی کے علاوہ مرزا نے نظیری اور ظہوری سے بھی برابر کی ٹکر لی ہے۔ ہو سکتا ہے

کہ ہر مقام پر مرزا کا پلّہ بھاری نظر آئے لیکن جہاں تک بلندیٔ فکر، جذبات نگاری، حقیقت کی بے نقابی اور ایک اعلیٰ کردار پیش کرنے کا تعلق ہے اس میں مرزا کا مرتبہ کسی طرح بھی ان شعراء سے کم نہیں ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ مرزا نے ان دونوں اساتذہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں شعراء کے کردار کو بھی اچھی طرح سمجھا اور پرکھ لیا تھا۔ ظہوری کی طبیعت مرزا کی طرح دقیقہ سنج تھی۔ دونوں کے یہاں ندرتِ خیال کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، انسانی کردار کا معیار دونوں کی نظر میں یکساں طور پر بلند تھا اور خواہشات و جذبات کی ترجمانی میں دونوں ہم آہنگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے ہر مقام پر ظہوری کا احترام ملحوظ رکھا ہے اور بڑے بلند الفاظ میں ان کو یاد کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں :۔

غالب از جوشِ دم ما تربتش گلپوش باد ۔۔۔ پردہ سازِ ظہوری را گل افشاں کردہ ایم

غالب از اوراق ما نقشِ ظہوری دمید ۔۔۔ سرمۂ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

غالب از من شیوۂ نطقِ ظہوری زندہ گشت ۔۔۔ از نوا جان در تنِ سازِ بیانش کردہ ایم

ذلّہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست ۔۔۔ در سخن درویشیٔ باید نہ دکان داریئے

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب ۔۔۔ رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مرزا کا طرزِ ادا اور ان کی ندرتِ خیال جس طرح آپ اپنی مثال ہے وہی حالت ان کی انفرادیت کی بھی ہے جو ظہوری کو قابلِ احترام سمجھنے کے بعد بھی ان کی تاسی میں جھلک رہی ہے۔ مثال کے طور پر لے لیجئے۔ ظہوری نے "آستانش را" اور "پاسبانش را" کی ردیف اور قوافی میں غزل کہی ہے۔ مرزا نے اپنی طبع آزمائی کے لئے قافیہ بدل کے راہ نکالی۔ دونوں کی ہم بحر غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :۔

شب از مژگان تر رفتم غبارِ آستانش را
پشیمانم کہ کارے یاد دادم پاسبانش را
فگندی بستونے کاش پیشِ سخت جانِ خود
کہ دیدی باوجود ناتوانیہا توانش را
بجاہِ عشق با سرمایۂ دارم سرِ سودا
کہ صد جاں قیمتِ یک نگاہِ رائگانش را

بپردم دوزخ و آں داغہائے سینہ تابش را
سرابے بود در رہ تشنۂ برقِ عتابش را
ندانم تا چہ برقِ فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصور کردہ ام بگسستنِ بندِ نقابش را
سوارِ توسنِ ناز ست و بر خاکم گزر دارد
ببالِ آرزو چیدا نکہ در پائے رکابش را

بنشاں چوں روم بر مسندِ تعلیم ننشینم
کہ بلبل بگزراند پیشِ من درسِ فغانش را
(ظہوری)

خیالش صید دام پیچ و تابِ شوق بود اما
من از مستی غلط کردم لبِ شوخی خطابش را
(غالب)

اسی طرح مرزا نے یہ بھی ستم ظریفی کی ہے کہ بعض مقامات پر بحر بدل کے اور کہیں ردیف میں فرق کرکے ظہوری سے ٹکر لی ہے اور اپنی انفرادیت کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے۔ مثال میں دو غزلوں کے چند شعر پیش ہیں۔ پہلی غزل میں صرف ردیف کا فرق ہے۔

از دم تیغ نگاہ تن بہ تپیدن دہم
سرمۂ حیرت کشم دیدہ بہ دیدن دہم
از روشِ جلوۂ آہ براہ افگنم
در خلشِ غمزۂ خون بچکیدن دہم
بندِ نقابی کشم تیغ و ترنج آورم
یوسف و یعقوب را کفِ ببریدن دہم
توبۂ پرہیز را کردہ شکستی درست
محضرِ ناموس را زیب دریدن دہم
آمدنِ دیک لب حرف کسے دو نیست
کز بن ہر موئے را گوش شنیدن دہم
(ظہوری)

سوخت جگر تا کجا رنج چکیدن دہیم
رنگ شو اے خونِ گرم تا بپریدن دہیم
جلوہ غلط کردہ اند ز رخ یکتا تا ز مہر
ذرہ و پروانہ را مژدۂ دیدن دہیم
سبزۂ ما در عدم تشنۂ برق بلاست
در رہِ سیلِ بہار شرح دمیدن دہیم
شیوۂ تسلیم ما بودہ تو اضع طلب
در خمِ محراب تیغ تن بخمیدن دہیم
خیز کہ راز درون در جگر نے دہیم
نالۂ خود را ز خویش دادِ شنیدن دہیم
(غالب)

دوسری غزل میں بحر کا فرق ہے۔ مگر اس فرق کے باوجود مرزا کو ظہوری کی تاسی کا احساس تھا اسی لئے مقطع میں اس کو یاد کر لیا

"ذلّہ بردارِ ظہوری باش غالب بحث چیست
در سخن درویشیٔ باید نہ دکاں داریئے"

اب دونوں کی غزلیں ملاحظہ ہوں :

عزّتم شد عزّتے از خواریئے
گشت آساں بود گر دشواریئے
مژدہ از من بخت خواب آلودہ را
بستہ ام افسانۂ بیداریئے
در زمینِ سینہ کشتم تخمِ داغ
دار دا بر دیدہ اخگر کاریئے

کافرم گر از تو باور باشدم غمخواریئے
از مئے استغنا تم کردہ ذوقِ خواریئے
از کنارِ دجلہ آتش خانہ چنداں دور نیست
کشتیٔ ما بر شکستی دود رستاں یاریئے
شاد باشی اے غمِ زیبم مرگ ایں ساختی
گشت صرفِ زندگانی بود گر دشواریئے

از برائے صبر نافرمان خویش
می نویسم نامۂ بیز ادیئے
آرزوے یاریٔ دارم زیار
کاش می آمد زمن اغیار بیٔ
بیلاجم در خوش مدہائے غیر
عشق وارد نیز دنیا داریٔ
(ظہوری)

برق از نہرت کباب ہیجا با سوزیئے
مرگ از لطفت ہلاک دید منہا زارییٔ
باخرد گفتم چہ باشد مرگ بعد از زندگی
گفت بے خواب گرانے از پس بیداریئے
اے دل از مطلب گر بشنم دستگاہت را چہ شد
شیوئے شورے فغانے اضطرابے زاریئے
(غالب)

ظہوری کے مقابلے میں نظیری کی ہم طرح غزلیں مرزا کے کلام میں زیادہ تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ مرزا اگر ایک طرف ظہوری کے تعمقِ فکر اور ندرتِ خیال سے متاثر تھے تو دوسری طرف نظیری کے لطافتِ بیان اور حسن ادا کے بہت زیادہ دلدادہ تھے۔ نظیری نے حسن و عشق کے معاملات جس لطیف پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ مرزا نے اس باب میں نظیری کی تاسی کرنے کی بے حد کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر وہ نظیری کے ہم پلّہ بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی یہ جدوجہد بسا اوقات اس لئے ناکام رہی کہ ان کی دقیقہ سنج اور مشکل پسند طبیعت نظیری کے لطافت اور اسلوبِ سخن کو قبول نہ کر سکی۔ اس کا احساس خود مرزا کو بھی تھا اور وہ کہہ اٹھتے تھے کہ "جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم" اس شعر کا دوسرا مصرع بھی نظیری کا ہے۔ اس مقام پر مرزا غالب اور خواجہ نظیری کی بعض ہم طرح غزلوں کا موازنہ ان دونوں اساتذہ کے علٰحدہ علٰحدہ رجحانات الگ الگ اسلوبِ سخن اور بالخصوص مرزا کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لئے کارآمد ہوگا۔ ایسی تین غزلوں کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

کی بودی کہ امشب سوختی آزردہ جانے را
بقدرِ روزِ محشر طول دادی ہر زمانے را
سوالے کن زمن امروز تا غوغا بشہر افتد
کہ اعجازِ فلانے کرد گویا بے زبانے را
کتابِ ہفت ملت گر بخواند آدمی عاصیست
نخواند تا ز جزو آشنائی داستانے را

بہ پایانِ محبت یاد می آرم زمانے را
کہ دل عہد و وفا نابستہ دام دستانے را
فسونے کو کہ بر حالِ غریبے دل بدرد آرد
بدانداینشے بانزدہ عزیزان شادمانے را
ندارم تابِ ضبطِ راز و می ترسم ز رسوائی
مگر جوئیم نہ بہر ہمزبانی بیزبانے را

بہر جنسے کہ می گیرند اخلاص وفا خوب ست
پس از عمرے گزر افتاد بر ما کاروانے را
دلا سیلابِ خوں را از شگافِ سینہ بیروں کن
کہ امشب سودہ ام بر دیدہ خاکِ آستانے را
نمی دانم نظیری کیست چوں می آمدم زاں کو
بحالِ مرگ دیدم بر سرِ رہ ناتوانے را
(نظیری)

بیا در گلشن بختم کہ در ہر گوشہ بنمائیم
ز جوشِ لالہ و گل در حنا پائے خزانے را
کمالِ دزدِ دل اینست در ترکیبِ انسانی
بخوں آغشتہ اندام دین ہر موئے جانے را
بشہر از دوست بعد از روزگارے یافتم غالب
ز عنوانِ خطے کز راہ دور آمد نشانے را
(غالب)

ظاہر ہے کہ نظیری کی غزل بہت بلند ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ نظیری کی یہ غزل اس کی بہترین غزلوں میں ہے اور حسن و عشق کی معاملہ بندی جو نظیری کا طرۂ امتیاز ہے اس غزل میں معراجِ کمال پر ملتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مرزا کی غزل صرف ندرتِ خیال اور دقیقہ سنجی کی بہترین مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ اب دوسری غزل ملاحظہ ہو:

کس نہ نمود جرعۂ کز جگرم گزک نخواست
بے نمکی ز گفت کس کز سخنم نمک نخواست
رنگ رخِ سخن نشان میدہد از عیارِ مرد
صاحبِ فہم خوردہ بیں نا سرہ را محک نخواست
گفت شنید دوستاں ہائے عیبن می شنود[ن]
آنکہ شمردہ زد نفس ہمدمِ ملک نخواست
من ہمہ عجز و ہمکناں میل نزاع می کنند
ہر کہ حریف باف شد عاقل از و خسک نخواست
عالم و یک مسیح دم دیر مغاں و یک صنم
ہر چہ نخواست را آمی اختر نہ فلک نخواست
مصرع نظم بخلیط صفرو نثر بے فقط
نسخۂ نظم و نثر من نقطۂ سہو و شک نخواست
(نظیری)

ہر چہ فلک نخواست ست ہیچکس از فلک نخواست
ظرف فقیہ می نجست بادۂ ما گزک نخواست
جاہ ز علم بیخبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست
زاہد و ورزش سجود آہ ز دعوئ وجود
تا نہ زد اہرمن رہش بدرقۂ ملک نخواست
بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نخواست
گشتہ دل انتظار پرور دیدۂ پیر رہ سفید
در رہِ شوق ہمرہی دیدہ زمردمک نخواست
ریز ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود
یک صنم بسجدہ در زمانہ صیبہ شرک نخواست
(غالب)

ان غزلوں کا موازنہ مرزا ہی کو خیال، اسلوبِ سخن اور طرزِ ادا میں نظیری سے بہت بلند بتاتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں بھی

ن عیش می بود

مضمون آفرینی، دقیقہ سنجی اور ندرتِ خیال کی منزل آجائے مرزا بڑے سے بڑے استادانِ فن کے دوش بدوش کھڑے ہو جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ آئیے اب ایک اور ہم طرح غزل کا موازنہ کر لیا جائے:

ما حالِ خویش بے مژہ پا نوشتہ ایم
روزِ فراق را شبِ یلدا نوشتہ ایم
قاصد بہوش باش کہ بر یک جواب تلخ
عرضِ ہزار گونہ تمنا نوشتہ ایم
درِ نگو معالجۂ عمر کوتہ است
این نسخہ از علاجِ مسیحا نوشتہ ایم
ہرگہ کہ کردہ ایم رواں کشتیٔ امید
طوفانِ باد و شور بہ دریا نوشتہ ایم
تحقیقِ حالِ ما ز نگہ می تواں نمود
حرفے ز حالِ خویش بسیما نوشتہ ایم
(نظیری)

تا فصلے از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم
عنوانِ راز نامۂ اندوہ سادہ بود
سطرِ شکستِ رنگ بسیما نوشتہ ایم
در ہیچ نسخہ معنیٔ لفظِ امید نیست
فرہنگ نامہائے تمنا نوشتہ ایم
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم
کوتہ ز لفتشِ جبہۂ ما یک قلم پُرست
لختے سپاس ہمدمیٔ پا نوشتہ ایم
(غالب)

ان اشعار سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مرزا کا پلہ اگر اونچا نہیں تو نیظری سے ہلکا بھی نہیں ہے۔ ایک مختصر مضمون میں اتنی گنجائش کہاں کہ اساتذہ کے کلام کا دل کھول کے موازنہ کیا جا سکے۔ تاہم اربابِ ذوق کی تسلیِ جستجو کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ مرزا اور نیظری کے موازنہ کے لیے "مکتبہا، مشربہا"۔ "بلا خفتنت، کی خفتنت"۔ "عربیت، بےادبیت۔" "کام ندارد، انجام ندارد"۔ "مبشر گیرد، زودتر گیرد" "چاکش نگر، پاکش نگر۔" "امتحاں برخیز، امتحاں برخیز" "دریا زکردن، دراز کردن"۔ "سخن خواہد شدن، برہمن خواہد شدن" کے ردیف و قوافی والی اور اسی قبیل کی دوسری ہم طرح غزلوں کا مطالعہ ادبی شعور کی تشنگی دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور اگر عرفی، ظہوری، نیظری، بیدل اور غالب کے ایسے باکمال اساتذہ کو ایک ہی صف میں دیکھنا مقصود ہو تو "با آتش ست، مدارا آتش ست"۔ "خرد مند ست، بند ست" "بسمل افتاد ست، قاتل افتاد ست"۔ "وضو کنند، سبو کنند"۔ "تاب شستہ ایم، آب شستہ ایم" کے ردیف و قوافی والی معرکۃ الآرا غزلیات میں تلاش کر لیجئے۔ ایسے موازنہ کے بعد مرزا کے اصلی خدو خال واضح ہو جائیں گے اور ہم یہ کہنے میں بجا طور سے فخر حاصل کر سکیں گے کہ ہم اپنے صرف ایک ہندوستانی شاعر کو بڑے بڑے ایرانی اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں جو ان سب کا فرداً فرداً اور اجتماعی طور سے بھی شاعری کے جملہ محاسن میں پوری طرح مدِ مقابل بن سکتا ہے۔

آئیے اب ذرا مرزا غالب کی انفرادیت کا بھی جائزہ لیا جائے۔ مرزا کے سوچنے کا طریقہ اور اپنے مخصوص رجحانات کو اپنے مخصوص انداز بیان میں پیش کرنے کا سلیقہ بھی اُن کی آپ مثال ہے۔ ان کے اردو اشعار زبان زد خلائق ہیں لیکن فارسی میں بھی اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ فارسی میں بہتات ہے۔ انھیں میں سے کچھ اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں وہ اشعار جن کا رشک کے موضوع سے تعلق ہے خاص توجہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ "رشک" مرزا کا خاص موضوع تھا۔ اردو میں بھی اس موضوع پر ان کے اشعار اپنا جواب نہیں رکھتے۔ فارسی میں زورِ قلم اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔

جانِ غالب تاب گفتاری گماں داری ہنوز
سخت بیدردے کہ می پُرسی ز ما احوالِ ما

خارہا از اثرِ گرمیٔ رفتارم سوخت — منتے بر قدمِ راہ روانست مرا

سخن کوتہ مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما
ز ننگِ زاہد افتادم بکافر ماجرائیہا

چوں بہ قاصد بسپرم پیغام را — رشک نگذارد کہ گویم نام را

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

خورسندیٔ غالب بود ز ہیں ہمہ گفتن — یکبار دلیز مائے کہ اے ہیچکسِ ما

چناں گرم است بزم از جلوۂ ساقی کہ پنداری
گداز جوہرِ نظارہ در جام ست مینا را

بخلوت مژدۂ نزدیکیٔ یار ست پہلو را
فریبِ امتحاں پاکب زی دادہ ام او را
چو بنشیند بہ محفل بگزرانم در دل تنگش
کہ رنجد غیر از و چوں بے سبب درہم کشد رو را

بادہ اگر بود حرام بذلہ خلاف شرع نیست　　دل نہ نہی بہ خوب ما طعنہ مزن بہ زشت ما

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار　　نیست گر صبح بہاری شب ماہے دریاب

از ہر بن موئے چشمۂ خوں باز کشادم　　آرائش بستر ز شفق می کنم امشب

بر تنک مایگیم رحم کہ یک عمر گناہ　　ہم بنا راج سبکدستی بخشودن رفت

آمد از رہ غرور بوسہ بخلوتم نداد　　رفت و در انجمن ز غیر فرد نواگری گرفت

جادہ شناس کوئے خصم بودم و دوست راہ جوئے　　منکر ذوق ہمرہی خردہ بر رہبری گرفت

نظر فروز ادا ہا بہ دشمن ارزانی　　بہ من سپار اگر داغ سینہ تابے ہست

رشک آیدم بروشنئ دیدہ ہائے خلق　　دانستہ ام کہ از اثر گرد راہ کیست

با من بخواب ناز و من از رشک بدگمان　　تا عرصۂ خیال عدو جلوہ گاہ کیست

تلخ ست تلخ رشک تمنائے خویشتن　　شادم کہ دل ز وصل تو نومید بودہ است

بے پردہ شو ز غصہ والزام دہ مرا
گفتم کہ گل خوش ست بگلشن در یں چہ بحث

ہائے این پنجہ کہ با جیب کشاکش دارد　　بود با دامن پاکت چہ قدر ہا گستاخ

شباب و زہد چہ نا قدردانی ہا ستیست　　بلا بجان جوانان پارسا ریزد

می رمی از من و خلقے بگمانست ز تو　　بیجا باشو و بنشیں کہ گماں برخیزد

چہ عیش از وعدہ چوں باور ز عنوانم نمی آید　　بنوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

خیز و در ماتم ما ہر مہ فروشوئی ز چشم　　وقت مشاطگی حسن خدا داد آمد

بیمانہ بران رند حرام ست کہ غالب　　در بیخودی اندازۂ گفتار نداند

ہست تفاوت پسے ہم ز طلب تا بہ نبید　　لذت دیگر دہد بوسہ چو دشنام شد

مے بہ زہاد مکن عرض کہ این جوہر ناب　　پیش این قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

بوسم لب دلدار و گزیدن نتوانم　　نرم ست دلم حوصلۂ کام ندارد

اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت　　کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

بخشم ناسزا می گوید و از لطف گفتارش
گماں دارم کہ حرف دلنشینے بعد ازیں گوید

بدیں قدر کہ بے تر کنی و من بکشم　　ترا ز بادۂ نوشیں چہ مایہ کم گردد

نخوت نگر کہ می خلد اندر دلش ز رشک　　حرفے کہ در پرستش معبود می رود

ز رشکست اینکہ در عشق آرزوئے مردنم باشد　　تو جان عالمے حیفست گر جان در تنم باشد

کمے دارد ز رشکست اینکہ غمخواری نمیخواہم　　کہ ترسم پا بداو را ہر کہ از حالم خبر گیرد

بروں میا ز خانہ بہ ہنگام نیمروز　　رشک آیدم کہ سایہ بپا بوسی می رود

چو رہ بقصد نشان بر کمان بجنباند　　تپید ز رشک دلم تا نشان بجنباند

خارہا در رہ سودا زدگان خواہد ریخت　　ورنہ در کوہ و بیاباں چہ گل است بہار

جاں می دہم از رشک بہ شمشیر چہ حاجت　　سر بخبر پا من زن و دامن بہ کمر بر

از ذوق میان تو شدن سر بسر آغوش　　بیمہر فن ماست بہ زنار میا موز

لحمے از معشوق ہر جا در کتابے بنگری　　بر کنار آں ورق جانہا فدایش می نویس

نیست معبودش حریف تاب ناز آوردنش
پیش آتش دیدہ ام روزے نیاز آوردنش

تا خود از بہر تماشا کیست می میرم ز رشک
خضر و چندیں کوشش و عمر دراز آوردنش

سعی در مرگ رقیبان گران جان کردی　　می شناسم کہ چہ از ناز و ادا گشت تلف

رنگ و بو بود ترا برگ نوا بود مرا　　رنگ و بو گشت ہمہ برگ نوا گشت تلف

ریزم از وصف رخت گل را شرر در پیرہن　　آتش رشکم بجان تو بہار افتادہ ام

چہ پرسی کز نشاط وقت قدح نوشی چہ میخواہم
ہمیں بوسیدنی چوں مست تر گردی ملیدن ہم

خوئے سرکشتم داری عجز رشک نپسندم　　سینۂ من از گرمی تابہ سمندر کن

جنون رشک را نازم کہ چوں قاصد رواں گردد　　دوم بخویش و گیرم نامہ اندر راہ از وے

رشک نبود گر حذر گلت جانب دشمن گرفت　　دردم سا طور پنہاں ست زخم کاریئے

دلم میجوئی و از رشک می میرم کہ در مستی　　چرا زاں گوشۂ ابرو اشارت کامیابستے

جیسا کہ کہا گیا یہ صحیح ہے کہ مرزا ایرانی نہ تھے، فارسی ان کی مادری زبان نہ تھی، انھیں شیراز و اصفہان جانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اُن کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں تھا کہ مبداء فیاض نے انھیں فارسی کا ذوق ازل میں بخشا تھا کیونکہ اس کے بغیر زبان و بیان کی لطافتوں کی ان منزلوں سے گزرنا آسان نہ تھا جن سے غالب گزر رہے ہیں کامیاب ہوئے۔ ذوق کے اختلاف اور اندازِ نظر کے فرق کی وجہ سے ان کا مقابلہ شاید خالص ایرانی غزل گویوں مثلاً سعدی، حافظ، خواجو کرمانی، عراقی، جامی وغیرہ سے نہ کیا جا سکے لیکن ہندوستان کے اہم ترین فارسی شعراء مثلاً خسرو، ظہوری، نظیری، عرفی اور بیدل کے ساتھ ان کا نام نہ لینا نا ممکن ہے۔ یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

شمس غازی آبادی

تاج محل

اے تاج محل یادگہِ عشق و امارت
ہرگہ کہ تو شہپارۂ اربابِ دوَل ہے
لیکن ترے آغوشِ مناظر میں بہر نوع
تذلیلِ محبت کا ہر اک باب اٹل ہے

ہر دل ہے یہاں ولولۂ شوق سے معمور
ہر آنکھ مکافاتِ محبت کی طلبگار
صورت گرِ آئینِ وفا نخوتِ خود بیں
اظہارِ تمنا پہ نہیں عشق گنہگار

تقدیس محبت کا لئے پرچم نوری
پاکیزگیٔ حسن کے انداز سموئے
تو ایسے کھڑا ہے کہ برہوگن کوئی جیسے
دریا کے کنارے ہو سفینے کو ڈبوئے

یا پھر کوئی جوگن کہ لئے بربطِ صد تار
ہر تار کی جھنکار پہ پی بول رہی ہو
یا کوئی پری سوئے فلک مائلِ پرواز
یا پھول پہ تتلی ہے کہ پر تول رہی ہو

یا برسرِ نیلام کوئی جانِ تماشہ
اپنے ہی تماشے کی جھلک دیکھ نہ پائے
دنیائے ہوسناک سے سہمی کسی جانب
تکتی ہو کچھ ایسے کہ خریدار نہ آئے

یا شمع فروزاں ہے کہ فانوس سے باہر
یا پھر شبِ مہتاب ہے پتھرائی ہوئی سی
یا پھر کسی دولہا کا درخشندہ مکٹ ہے
یا پھر کوئی میت ہے کہ کفنائی ہوئی سی

یا پھر کوئی فانوس فضاؤں میں معلق
یا قوسِ قزح میں کوئی لٹکا ہوا جھولا
یا پھر کہیں انوار کی سمٹی سی ضیائیں
یا اوجِ سماوات سے تاروں کا بگولا

یا پھر کوئی زاہد ہے کہ باندھے ہوئے احرام
یا پھر بُتِ سیمیں کا ابھرتا ہوا جوبن
یا نقرئی کرنوں میں دمکتا ہوا ہیرا
یا چاند ستاروں کا نکھرتا ہوا جوبن

یا چشمِ حیادار سے ڈھلکا ہوا آنسو
یا کاہکشاں سے کوئی ٹوٹا ہوا تارا
یا برگِ گُلِ تر پہ کوئی قطرۂ شبنم
یا ساغرِ بلّور میں ٹھہرا ہوا پارا

تبلیغِ محبّت کا عمامہ ہے ترے سر
تو پیکرِ تسلیم و رضا روحِ وفا ہے
بھر دیتا ہے ہر دل میں محبت کے شرارے
خاموشی سے تو نے بھی عجب کام لیا ہے

حیرت ہے کہ کچھ لوگ تجھے دیتے ہیں الزام
یہ ان کے نئے طرزِ تخیّل کی عطا ہے
حالانکہ حقیقت میں امارت کا یہ مصرف
تہذیب کے چہرے کے لئے نورِ خدا ہے

ہے مستیٔ صد شوق تری دید سے حاصل
انوار کی لہروں پہ سبو دوڑ رہا ہے
کیا جانیے وہ کون سے دل دفن ہیں تجھ میں
پتھر کی رگوں میں بھی لہو دوڑ رہا ہے

عرفانِ محبت میں ہے تفریقِ دوئی کفر
آوازۂ لیلیٰ پہ بھی مجنوں کا گماں ہے
تانیث ہے تذکیر کے پہلو سے نمایاں
ممتاز محل ہو کے بھی تو شاہ جہاں ہے

کس چیز سے تشبیہہ دوں کیا کیا تجھے کہہ دوں
جتنا بھی ترے حُسن کی تعریف ہو کم ہے
اے موسیٔ عمرانِ وطن کے یدِ بیضا
تو واقعی دنیائے محبّت کا حرم ہے

ماجد سلمان

غزل

کیفیتِ الم بھی ہے ذوقِ نشاطِ کار بھی
زیست بقدرِ ظرف ہے جبر بھی اختیار بھی

ساقیٔ مہربانِ من! پھر کوئی بادۂ کہن!
عشق کو راس آ گئی تلخیٔ روزگار بھی

اب میری بے نیازیاں پہونچی ہیں دیکھیے کہاں
خاطرِ دل پہ ہے گراں نکہتِ زلفِ یار بھی

شاہدِ بزمِ دلبراں پھر اُٹھے نازکی کماں
ملنے لگا ہے کچھ سکوں عشق کو زیرِ دار بھی

کشمکشِ حیات میں نشۂ مے کا ذکر کیا
دل کو سکوں نہ دے سکا لطفِ نگاہِ یار بھی

پوچھ رہے ہو اس سے کیا لالہ و گل کی داستاں
بھولا نہیں جو آج تک لذتِ نوکِ خار بھی

شام ہے شامِ بے سحر نالہ ہے وہ بھی بے اثر
آہ! ٹھہر گئی ہے کیا گردشِ روزگار بھی

پہلے اک آسرا بھی تھا اب کوئی آسرا نہیں
تم تو بجھا کے چل دئے شعلۂ انتظار بھی

اس دلِ غم پرست کا کوئی مزاج داں ہو کیا
وجۂ ملال بن گئی پرسشِ چشمِ یار بھی

فرخ جلالی

ہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک غیر معروف خط

غالب کے خطوط اُن کی زندگی کی سچّی تصویریں ہیں ان کے تفکّر آمیز شعروں میں جو اشکال اور حسن ہے وہ مکاتیب میں شوخی اور سادگی سے بدل جاتا ہے۔ یہاں پُر پیچ راہیں نہیں ہیں سیدھے راستے ہیں. اس لئے غالب کے خطوط کی دستیابی اُن کے ذہن کے گوشوں کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے. محققینِ غالب کی کوششوں کے باوجود خطوط کی بڑی تعداد ابھی بکھری ہوئی ہے۔ غالب کے ایک شاگرد خان بہادر منشی محمد سخاوت حسین مدہوش انصاری بدایونی کے نام ایک خط ملا ہے۔ جو عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں شامل نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ رقعہ خطوطِ غالب مرتبہ مولانا مہر میں بھی شامل نہیں ہے۔ کچھ وجوہ کی بناء پر مکرمی مالک رام صاحب کی تالیف "تلامذۂ غالب" میں جناب مدہوش کے حالات درج نہ ہو سکے۔ مگر ان کا نام تلامذۂ غالب میں صفحہ ۲۵۰ پر لکھا ہے۔ یہاں ہم ان کے مختصر حالات پیش کرتے ہیں۔

جناب محمد سخاوت حسین انصاری بدایوں کے رہنے والے تھے۔ مدہوش تخلص تھا۔ آپ کے دادا حضرت میاں جی عبدالملک انصاری تیرھویں صدی ہجری کے مشہور بزرگوں میں سے تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ آپ حضرت شمس الدین ابوالفضل سید شاہ آلِ احمد صاحب اچھے میاں[1] مارہروی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ بڑے صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ اکثر طلباء کو درس بھی دیتے تھے۔ شیخ محمد رضی الدین بسمل نے اپنی تالیف "تذکرۃ الواصلین" میں صفحہ ۲۳۴ پر لکھا ہے:-

"آپ کے تین صاحبزادے تھے۔ ایک امان اللہ حسین عرف خلیفہ ننّو اور میاں امداد حسین و شیخ محمد عنایت حسین مرحوم اُن کے پوتے میرے دوست خان بہادر محمد سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔"

مولوی محمد سخاوت حسین انصاری کے ایک لڑکا تھا۔ اس کا انتقال چھوٹی عمر میں ہو گیا تھا۔ ایک بیٹی تھیں جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ جناب مدہوش کے نواسے مختلف ممالک میں ممتاز عہدوں پر ملازم ہیں بڑے نواسے الحاج حامد سعید خاں ایل ایل بی۔ اے (علیگ) یو۔ این۔ او کی طرف سے ایران میں ماہرِ خوراک و زراعت کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ دو نواسے پاکستان میں ممتاز عہدوں پر فائز ہیں ان کے ایک نواسے جناب عبد سعید خاں فنا ایل ایل بی۔ اے (علیگ) ہندوستان میں سب رجسٹرار ہیں۔ فانی بدایونی اور دوسرے شعراء سے سلسلۂ تلمذ ہے اہلِ سخن کے قدردان ہیں اور بہت خوب شعر کہتے ہیں۔ احباب کے اصرار پر ایک مختصر مجموعہ کلام "رنگا رنگ" نظامی پریس بدایوں سے طبع ہو چکا ہے۔ مکرمی فنا صاحب فرماتے ہیں کہ اپنی چہیتی بیٹی کو غالب کا ایک شعر یاد کرنے پر ایک اشرفی انعام میں دیا کرتے تھے تقریباً اسّی برس کی عمر میں ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔

تعلیم کے سلسلے میں اساتذہ کا حال کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوا۔ تذکرۃ الواصلین کی تقریظ لکھتے ہوئے جناب مدہوش فرماتے ہیں۔

"اس کتاب کے مؤلف میرے شفیق مولوی محمد رضی الدین المتخلص بہ بسمل بدایوں میں پیدا ہوئے وہیں تعلیم و تربیت[2] پائی

---

[1] حضرت اچھے میاں ۲۸ رمضان ۱۱۶۰ھ کو مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ سلسلہ عالیہ قادریہ کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ آپ کے خلفاء میں بڑے بڑے مشاہیر شامل تھے حضرت شاہ عین الحق بدایونی اور شاہ سلامت اللہ کشفی شاگرد تبیل آپ کے نامور خلیفہ گزرے ہیں۔ ۱۲۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

[2] جناب بسمل نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا مولوی اساس الدین (اُن کو غالب نے ایک خط میں سلام لکھا ہے) اور چچا عزیز الدین عزیز و صادق کے پاس دہلی میں پائی۔ جناب عزیز غالب کے مقدمہ میں وکیل تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔

چوں کہ قدرتی طور پر ذہانت و قابلیت تھی اپنے ہم چشموں میں
ہمیشہ باوقار رہے ان کا طرزِ عمل شریفانہ اور عادات مقبولِ عام
ہیں زہد و اتقا اُن کا حصّہ ہے مگر یہ سب کچھ میرے معظم و
مکرم اُستاد اُن کے والد ماجد حکیم مولوی محمد سعید الدین[۱] صاحب
مرحوم و مغفور کا فیض و برکت ہے۔"

مدہوش بدایونی کی عمر کا بڑا حصّہ شاہجہان پور میں گذرا وہیں وکیل عدالت دیوانی تھے۔ شاہجہانپور کی پبلک زندگی میں بڑا نام پایا۔ وہاں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپلٹی کے وائس چیئرمین بھی رہے۔ اپنے زمانے کی قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ سرسیّد کو جب جدید تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے قوم کے اکابر سے مشورے طلب کئے تو مشاہیر نے اس موضوع پر رسائل لکھے۔ سرسید نے ان رسالوں کے خلاصے ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء میں میڈیکل ہال پریس بنارس سے مجلس خازن البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم المسلمین کی طرف سے چھاپے اس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بیج بنارس میں پڑا اور علی گڑھ میں بار آور ہوا یوں کہیے بتوں کو وجود کی نسبت ہوئی۔ اس کتاب میں سرسیّد لکھتے ہیں کہ وہ (محمد سخاوت حسین مدہوش) تربیت و تعلیم اس طرح پر چاہتے ہیں۔

"اولاً لکھنا پڑھنا سیکھنا پھر علم حفظ صحت بدنی اور
نفع نقصان اشیاء خوردنی و نوشیدنی اور تہذیب اخلاق دینی
اور خدمت ماں باپ بھائی بند محبت عزیز و بیگانہ اور صحبت ساتھ
دوست و آشنا برتاؤ ساتھ حاکمان حقیقی و مجازی کے احکام و
اوامر بادشاہ حقیقی و مجازی کے اور تحریر و تقریر مافی الضمیر کے
دوسرے کے اور آپ کو بخوبی آجاوے۔"

تعلیم کا یہ نظریہ زندگی کے اہم شعبوں پر بڑی حد تک حاوی ہے اور اپنے زمانہ کے رجحانات کا عکس بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر ملکی تحریکات میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے بار بار "ہم" فرماتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے فرمایا لفظ "ہم" سے آپ کی مراد 'ہ' سے ہندو اور 'م' سے مسلمان ہے۔ اس نکتہ کو بہت سراہا گیا۔
تصانیف اور تالیفات میں رسالہ تعلیم مسلمانان اور رقعاتِ مدہوش کا پتہ چلا ہے۔ تذکرہ الواصلین کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ نثر لکھتے تھے اور اشعار کا استعمال برمحل کرتے تھے۔ کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مکرمی جناب مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی فرماتے ہیں کہ بہت وجیہہ اور خوبصورت تھے طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔

غالب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور خط کا جواب برابر دیتے تھے۔ اسلامیہ کالج میگزین بدایوں، جدید شعرائے بدایوں نمبر مرتبہ فرخ جلالی و قمر فرشوری، "تلامذۂ غالب" از مالک رام "رنگارنگ" از فنا لودی بدایونی میں غالب سے تلمذ کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مولوی مہیش پرشاد کے کاغذات میں بھی بحیثیت تلمیذ غالب ذکر موجود ہے۔ رسالہ ہردل عزیز مشمولہ سراج سخن شاہجہان پور کے فروری ۱۸۹۴ء کے پرچہ میں لکھا گیا ہے۔

"چوں کہ افتخارنامہ عالی حضرت غالب دہلوی مرحوم و
مغفور کا اندراج کتب عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں رہ
گیا تھا لہٰذا بطور یادگار درج ہے۔"

غالب کا خط جناب محمد سخاوت حسین مدہوش کے نام

"مشفقی مکرمی منشی سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ
سبحان اللہ آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں اپنے کو نفریں
کروں اگر شتاب نہ لکھوں اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے
تمھارا خط دیا۔ اِدھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں
ایک شخص گوشہ نشیں فلک زدہ اندوہگیں نہ اہل دُنیا نہ اہلِ دین
مجھ سے نکمّے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو اس کے خط کا لکھنا کیوں
مجھ پر شاق ہو۔ ظاہراً تم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو
میرا اس قدر اشتیاق ہو یاں ایک بُری بھلی شاعری اُس کا
حال یہ ہے کہ آگے جو کچھ کہا سو کہا اب شاعر بھی نہ رہا بہرحال
تمھاری فقیر نوازی کا شکر گذار اور طالبِ دیدار ہوں۔

نجات کا طالب

غالب

چاشتگاہ دوشنبہ ۴ فروری

[غالب کا یہ غیر معروف خط عزیز گرامی وریندر پرشاد سکسینہ کی
عنایت سے دستیاب ہوا اور اُن کے شکریہ سے شائع کیا جاتا ہے]

---

[۱] حکیم محمد سعید الدین کامل زین العابدین خاں عارف کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں حصہ لیا۔ ۱۳۱۶ھ میں انتقال کیا۔
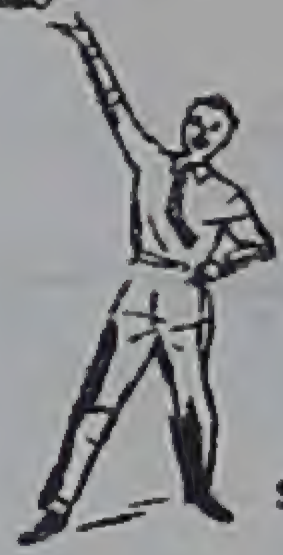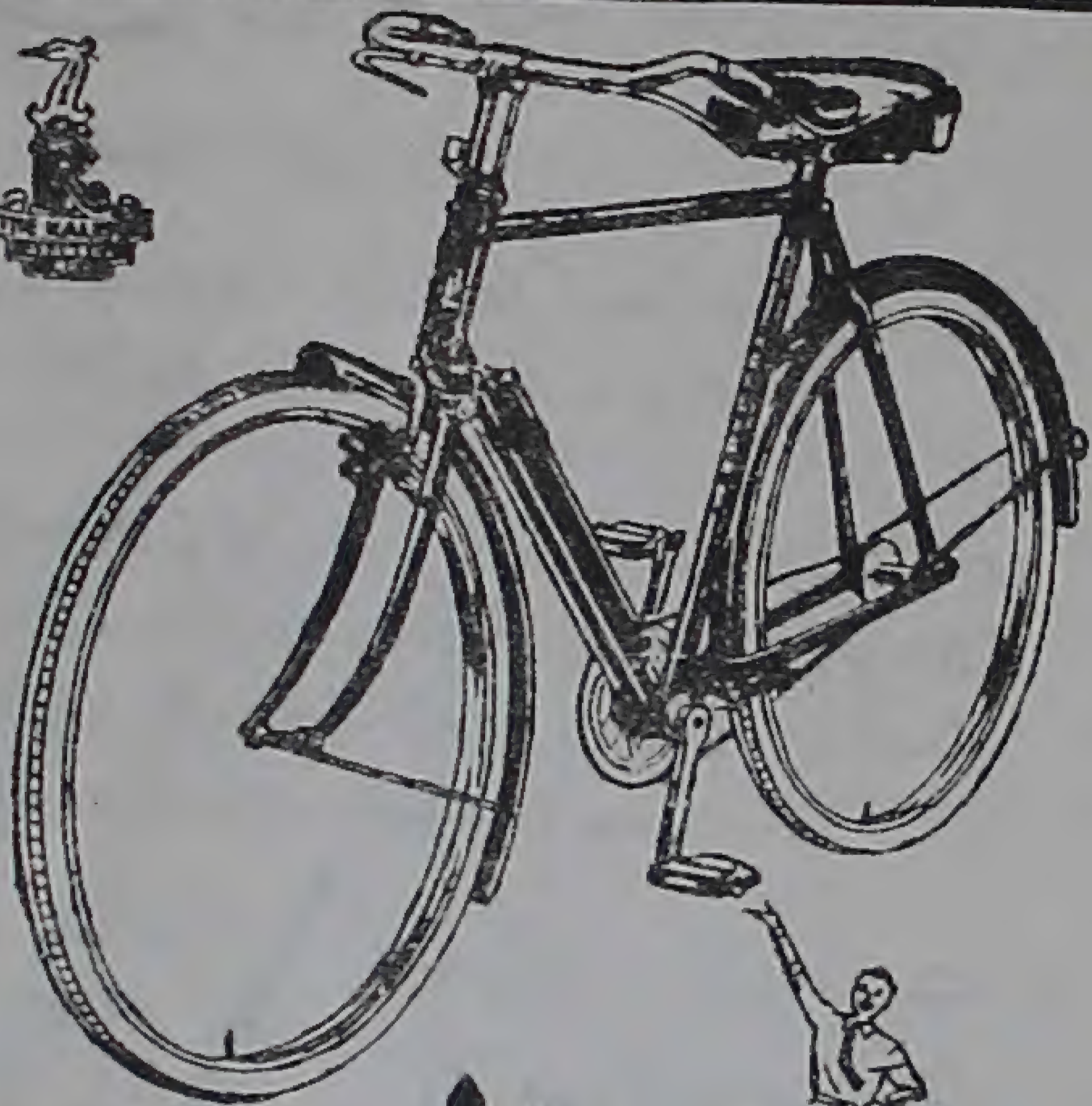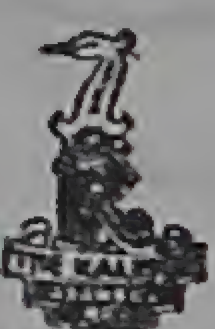
نہر میں پھر پانی بہنے لگا

رضاکارانہ کوششوں کا کرشمہ

جموں وکشمیر کے راہبال علاقے میں واقع کرناہ بلاک کی یہ ساڑھے سات میل لمبی نہر بہت دنوں سے بے کار پڑی تھی۔ لوگ اسے بھُولے ہوئے سے تھے۔

ایک دن آیا۔ اس علاقے کے کوئی چار سو عوام اسے دوبارہ جاری کرنے کے کام میں جُٹ گئے۔ اُنھوں نے مٹی نکالی، کنارے اونچے اُٹھا کر مضبوط بنائے، پاٹ چوڑا کیا۔ پانی کے بہاؤ میں حارج پتھروں کو باہر نکال پھینکا۔ کوششیں پھل لائیں۔ پانی پھر سے بہنے لگا۔ اب نواحی دیہات کا ایک بڑا رقبہ اِسی نہر سے سیراب ہوتا ہے۔

آپ کاج مہا کاج۔ رضاکارانہ کوششوں سے بڑی سہولتیں میسّر آتی ہیں۔ اور ترقی کی رفتار بڑھتی ہے

پلان کی مدد اپنی مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجئے

DA.29/21

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں۔ چھ روپے / پاکستان میں۔ چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ :- ہندوستان میں۔ ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں۔ آٹھ آنے (پاک)

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

ترتیب

سرورق :- فصلِ گل

رسالے کی پشت پر :- نوجوانوں کے میلے میں [کیرالہ یونیورسٹی کی طالبات کا رقص]

پھالگن شک سمت ۱۸۸۱

مارچ ۱۹۶۰ء

جلد ۱۸ - نمبر ۸

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مُلاحظات

۲۶ جنوری کو ہندوستانی جمہوریہ کی دسویں سال گرہ ملک بھر میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ منائی گئی۔ سب سے بڑی تقریب راجدھانی میں ہوئی جہاں صدرِ جمہوریہ نے بری، بحری اور فضائی فوج کے دستوں کی مشترکہ پریڈ کی سلامی لی۔ صدر ڈاکٹر راجندر پرساد نے اس موقع پر قوم کے نام اپنے پیغام میں ملک کے باشندوں کو چوکس اور متحد رہنے کی ہدایت کی، کیونکہ اس بات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ کسی قوم کے لئے اپنی آزادی کے تحفظ کی خاطر مستقل طور پر ہوشیار رہنا ضروری ہے۔ سرحد کے حالیہ واقعات اور ہندوستان کی پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اشتعال انگیزی اور لوگوں میں ناراضگی کے بڑھتے ہوئے جذبے کے باوجود ہم نے جھگڑے کو پُرامن اور دوستانہ طریقے سے حل کرنے کے لئے گفت وشنید پر اپنا اعتماد قائم رکھا ہے۔

پچھلے دنوں روس کے صدر مارشل وروشلوف ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے۔ ملک میں جہاں جہاں وہ گئے ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ دہلی کے شہریوں کی طرف سے دی گئی استقبالیہ دعوت میں صدر وروشلوف نے کہا کہ اگر دوسرے ملک عام اور مکمل تخفیفِ اسلحہ کی تجویز پر رضامند ہو جائیں تو روس اپنے تمام اسلحہ جن میں راکٹ اور ایٹمی ہتھیار وغیرہ سب شامل ہیں، پھینک دینے کو تیار ہے۔ ان کا یہ اعلان عالمِ انسانیت کے لئے امن کا پیغام ہے اور بقول وزیرِاعظم پنڈت نہرو ہندوستان جس نے اپنی جنگِ آزادی پُرامن ذرائع سے لڑی، وہ اس امن کے پیغام اور تخفیفِ اسلحہ کی تجویز کا خیرمقدم کرتا ہے۔

ہمارے پڑوسی دیش نیپال کے وزیرِاعظم مسٹر بی۔ پی کوئرالا بھی انہیں دنوں ہندوستان تشریف لائے۔ ہندوستانی عوام کی طرف سے جس جوش وخروش کے ساتھ ان کا خیرمقدم کیا گیا وہ ہند و نیپال کی مستحکم دوستی اور مخلصانہ تعاون کا مظہر تھا۔ وزیرِاعظم نیپال اور ہندوستانی وزیرِاعظم کے مشترکہ اعلانیہ میں بھی اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ ایک دوسرے کی آزادی، تحفظ و سلامتی اور ترقی سے دونوں ملکوں کا مفاد وابستہ ہے۔ اور اسی لئے دونوں ملکوں کو چاہیئے کہ وہ مشترکہ مفادات سے متعلق امور پر ایک دوسرے سے قریبی صلاح ومشورہ کرتے رہیں۔

امسال یومِ جمہوریہ کے موقع پر صدرِ جمہوریہ نے جن حضرات کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز عطا کیا ہے، ان میں ہندی کے ممتاز شاعر پنڈت بال کرشن شرما نوین اور بنگالی کے شہرہ آفاق شاعر قاضی نذرالاسلام شامل ہیں۔ 'ادارہ آج کل' ان دونوں حضرات کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

حال ہی میں ہندوستان اور آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیموں کے مابین جو پانچ ٹیسٹ میچ ہوئے۔ ان میں سے آسٹریلیا کی ٹیم نے دو میچ جیتے اور ہندوستانی ٹیم نے ایک میچ جیتا اور دو میچ برابر رہے۔ اس نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کرکٹ کے کھیل نے کافی ترقی کی ہے۔ بعض نئے کھلاڑی بھی منظرِ عام پر آئے ہیں جن میں جے سمہا، نڈکارنی، بیگ، کندرم اور کینی شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کرکٹ کے کھیل کا مستقبل شاندار ہے۔

جوشؔ ملسیانی

اِصلاحِ شعر

اصلاحاتِ شعری کے موضوع پر تین چار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر مبتدی اور نو مشق شعراء ان میں یہ کمی محسوس کرتے ہیں کہ وجہ اصلاح (توجیہہ) یا تو بتائی ہی نہیں کی گئی اور کہیں بتائی گئی ہے تو مختصر اشارات ہی سے کام لیا گیا ہے۔ اس اختصار کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی استاد اصلاح کے وقت زیادہ زحمتِ تحریر گوارا نہیں کر سکتا اشارات ہی سے کام لینا کافی خیال کرتا ہے یا وجہ اصلاح کو سمجھنا شاگرد ہی کے ذوقِ سلیم اور اس کی ذہانت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی کتابوں کے مؤلف کتاب کی ضخامت بڑھ جانے کے خیال سے محتاط ہو جانے اور اشارات ہی سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

دونوں وجوہ اپنی اپنی جگہ پر قابلِ رخصت تو ہیں مگر اس کے باوجود توجیہہ بالتفصیل نہ سہی مجمل طور پر اتنی تو ہو جسے کسی نہ کسی حد تک توضیح کہا جا سکے۔

اصلاح کنندہ کو شعر کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن دونوں کو گہری نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض وقت تو حسنِ ظاہر ہی کو درست کر دینے سے کام چل جاتا ہے۔ لیکن حسنِ باطن یعنی معنویت میں بھی خلل ہو تو یہ صورت اصلاح کنندہ کے لئے دہری مصیبت ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ مقولہ درست ماننا پڑتا ہے کہ شعر کہنے سے شعر کی اصلاح زیادہ مشکل کام ہے۔

معنوی خلل عموماً دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ شاعر نے مضمون تو تلاش کیا مگر اس میں کوئی لطافت یا شعریت پیدا نہیں کر سکا۔ اس قسم کا شعر نظری قرار دئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں ضعفِ بیان کی وجہ سے مضمون اُلجھ کر رہ گیا ہو اور وضاحت و سلاست دونوں اس کوتاہی کی شکوہ سنج ہوں۔ اس قسم کے سقم کا نتیجہ یا تو ابہام ہوتا ہے یا اہمال۔ یہ خرابی مصرعوں میں بہت سا ردّ و بدل کرنے کی متقاضی ہوتی ہے اور بسا اوقات اصلاح کنندہ ایسے شعر کو بھی نظری قرار دے دیتا ہے۔ اس قسم کے فیصلہ میں بھی اسے حق بجانب ہی کہا جا سکتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کا کام شعر کی اصلاح کرنا ہے معمّہ حل کرنا نہیں ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اچھے شعر میں دونوں وصف ہوتے ہیں۔ حسنِ ظاہر بھی اور معنویت بھی۔ معنویت کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ اس میں لطافت بھی ہو اور شعریت بھی۔ اگر یہ وصف شعر میں نہیں ہے تو اکیلا حسنِ ظاہر کسی مصرف کا نہیں۔ اور اگر معنویت تو ہے مگر حسنِ ظاہر کی پروا نہیں کی گئی تو یہ صورت کبھی جاذبِ دل نہیں ہو سکتی۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زبان اور تخیل کو دوش بدوش رکھنا چاہیئے تو اس قول کی تشریح بھی یہی ہے کہ حسنِ ظاہر اور لطیف قسم کی معنویت کو ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے دیا جائے ؎

تمہیں چاہو تمہیں چاہو تمہیں چاہو رقیبوں کو
کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

اس شعر میں صرف زبان ہی زبان ہے۔ معنویت کی کوئی لطافت یا شعریت اس میں نہیں ہے۔ اس قسم کے اشعار قافیہ پیمائی ہی کہے جا سکتے ہیں ؎

حضرتِ دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

حضرت داغ کے اس مطلع میں زبان کی صفائی بھی ہے بیان کی سادگی اور سلاست بھی ہے۔ حسنِ ظاہر کے تمام اوصاف موجود ہیں مگر ان خوبیوں سے بھی کچھ بڑھ کر وہ معنویت وہ شعریت اور مفہوم کی وہ وسعت ہے کہ شعر بجائے خود ایک دیوان ہے۔ کوئی بات نہیں بتائی گئی مگر پھر بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ ایسے ہی شعر کو مکمل شعر کہا جا سکتا ہے۔ زبان کی حلاوت اور بیان کی سلاست نے حسنِ معنی کو پر پرواز لگا دئے ہیں۔ کنائے اور صراحت میں فرق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔

معنویت میں تو یہ نکتہ قابلِ غور ہوتا ہے کہ کہنے والے نے کیا کہا۔ حسنِ ظاہر سے یہ مراد ہے کہ کیسا کہا۔ افسوس کا مقام ہے کہ عصرِ حاضر میں زیادہ تر کیا کہا ہی کی پروا کی جاتی ہے اور کیسا کہا کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ دیکھا دیکھی دورِ جدید کے نقاد بھی تنقید نگاری میں کیا کہا ہی کی جانچ پرکھ میں زورِ قلم دکھاتے ہیں اور کیسا کہا کی وہ بھی پروا نہیں کرتے۔ حال آں کہ کیسا کہا کا تعلق نظم ہی سے نہیں نثر سے بھی ہے۔

حسنِ ظاہر کی پروا نہ کرنے کے تین بڑے بڑے سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ نوجوان اور نومشق شعراء کی بیشتر تعداد استاد کی ضرورت سے بے نیاز رہتی ہے اور وہ پیرِ شو بیا موز کا مفہوم نہ سمجھ کر ہمہ دانی کے زعم میں ٹامک ٹوئیے مارتے پھرتے ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ فصیح اور ٹکسالی زبان کا ریاض کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ فصحا کی زبان اور بازاری زبان میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ بھاری بھرکم اور رکیک الفاظ بھی ان کی نظر میں ویسے ہی فصیح ہیں جیسے سلیس، سبک اور مہذب زبان کے الفاظ۔ ایسی ترکیبیں تراشی جاتی ہیں جن میں کوئی معنوی ربط نہیں ہوتا اور جن کی شانِ نزول سوائے ایجادِ بندہ کے اور کچھ نہیں ہوتی۔ مثلاً سیم گوں خاموشیاں، سہمے ہوئے سائے لیٹی ہوئی راہیں، سوز و وحشت، شعلہ و شبنم، ضَو زار، درد زار، حسرت زار ترنم ریز، کیف ریز، بادہ خانہ، جنوں کدہ وغیرہ۔

تیسرا بڑا سبب یہ ہے کہ نوجوانوں کی طبیعت فنی پابندیوں سے بے زار اور برگشتہ خاطر ہے۔ حال آں کہ ان فنی پابندیوں میں کوئی بھی ایسی نہیں جسے چشم انداز کیا جا سکے۔ شعر میں ایک لفظ بھی سوقیانہ قسم کا آ جائے تو شعر مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ قافیہ اور ردیف وستِ و گریباں نہ ہوں تو اچھے سے اچھا مضمون بے لطف ہو جاتا ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ مثلاً تجسّس، تفحّص، تفکّر، مکلّف وغیرہ کو بھی غزل کی نزاکت برداشت نہیں کر سکتی ع

اک منجم نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

اس کی جگہ اک نجومی کہا جائے تو مصرع ثقالت سے پاک رہتا ہے۔ اس قسم کے بیسیوں فنی نکتے ہیں جنھیں اصلاح کنندہ نظر میں رکھتا ہے اور جب تک ایسا ایک بھی سقم شعر میں باقی رہتا ہے شعر کی اصلاح مکمل اصلاح نہیں کہی جا سکتی۔ یہی فنی نکات ہیں جنھیں اس مضمون میں بیان کرنا مقصود ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اصلاح کنندہ کو اس ادبی خدمت گزاری میں کن کن مشکلات سے واسطہ پڑتا ہے اور وہ کس طرح ان مشکلات کو حل کرتا یا حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

حسنِ بیان کا پہلا وصف صحتِ زبان ہے۔ اس سے مراد فصحا اور صرف فصحا کی زبان ہے جیسا کہ حضرت امیر مینائی فرماتے ہیں ؎

ہم سند کے لئے لُغت میں امیر
فصحا کی زبان لیتے ہیں

اس زرّیں قول کی تعمیل میں یہ احتیاط بھی ضروری ہے کہ متروکاتِ زبان کا پورا خیال رکھا جائے۔ متروکات کا سلسلہ ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے رہتے اور کئی پرانے الفاظ بول چال سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متروک الفاظ کے لئے اساتذۂ ماضی کے کلام کی سند نا قابلِ تسلیم ہوتی ہے۔ آج کوئی یاں، واں لکھ جائے یا اگر کی جگہ گر نظم کر دے اور اس کی تائید میں مشاہیرِ ماضی کا کلام بطور سند پیش کرے تو یہ کوشش بے کار ہے۔ ہندی، انگریزی یا کسی اور زبان کے لفظ جو اردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان کے متعلق بھی یہ احتیاط لازم ہے کہ وہی الفاظ تسلیم کئے جائیں جن کا بدل اردو میں نہیں ہے۔ مثلاً ڈاکٹر، ٹکٹ، ڈرائیور، ماسٹر، ڈپٹی کمشنر، ہیڈ کلرک، پوسٹ کارڈ، منی آرڈر، پیکٹ وغیرہ۔

متروکات کے علاوہ جن کی فہرست راقم کے دوسرے مجموعۂ کلام (جنون و ہوش) میں موجود ہے اور جس کو ابھی مکمل نہیں کہا جا سکتا اور بھی متعدد نکات ایسے ہیں جو مبتدی شعراء کے کلام میں بیشتر قابلِ اصلاح نظر آتے ہیں۔ مثلاً کبھی کے بعد بھی، ہرگز کے ساتھ کبھی، نہ حرفِ نفی کے بعد ہی۔ ہی کے استعمال میں ایک اور خرابی بھی دیکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ

حرفِ جار کے بعد ہی لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً نوکری سے ہی جواب ملا۔ یہ ہی حرفِ جار سے پہلے آنا چاہیئے۔ یعنی نوکری ہی سے جواب ملا۔ نہ حرفِ نفی کے استعمال میں بھی بعض دفعہ یہ غلطی پائی جاتی ہے کہ اس کی تکرار کے محل پر توجہ نہیں کی جاتی۔ مثلاً

نہ میرا حال پوچھا تم نے اب تک

ظاہر ہے کہ یہ حرفِ نفی جو شروع میں آیا ہے تکرار کا متقاضی ہے۔ مثلاً نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ اس قسم کے سقم سے بچنے کے لئے نہ کے ساتھ پوچھا کا لفظ لایا جاتا، یعنی۔ نہ پوچھا تم نے اب تک حال میرا تو تکرار کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اسی طرح اُن سے کہو کی جگہ اُنھیں کہو مجھ سے کہا تھا کہ جگہ مجھے کہا تھا لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ لہجہ پرانی زبان کا ہے اب تو ان پڑھ اہلِ زبان بھی "اُن سے کہو" بولتے ہیں۔ انھیں کہو نہیں بولتے۔ بعض ہرگز کی جگہ ہرگزہ لکھ دیتے ہیں۔ بعض زمانے بھر کی جگہ جہاں بھر (وہ بھی نون غنہ سے) لکھ جاتے ہیں۔ کیا جانے یا نہ جانے کی جگہ صرف جانے لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً جانے کیا ہوا ع

جانے کیا راز ہے وہ اب بھی خفا ہیں مجھ سے

متروکات کی جس فہرست کا ابھی ابھی مذکور ہوا میرے خیال کے مطابق اس میں ابھی کچھ اور اضافے کی گنجائش ہے مثلاً برہمن درے ساکن، فارسی میں راے مفتوح اور راے ساکن سے دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اردو میں یہ لفظ راے ساکن ہی سے بولا جاتا ہے اس لئے راے متحرک سے یہ لفظ بلاشبہ قابلِ ترک ہے۔ اسی طرح شیدا کی جگہ شیدائی۔ معنی جب دونوں کے ایک ہی ہیں تو پھر آخری اضافہ زوائد ہی میں شمار ہونا چاہیئے۔

صحتِ زبان میں ضعفِ تالیف کا سقم بھی قابلِ لحاظ ہے۔ مثلاً قریب لگ، اگ، چراغ الدین یا ع

چشم بادل بھی اشک بار ہے آج

فارسیت بھی صحتِ زبان کے منافی ہوتی ہے مثلاً بس کہ، اے کہ، از بس کہ، وگرنہ، بعد از مرگ، پس از مردن ع

ذکر مرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں

فارسی مصدر کا اردو میں استعمال بھی فارسیت ہی ہے۔ پینے کا ہنگام آگیا یہ فارسی لفظ بول چال میں شامل نہیں ہے اس لئے ترکیبی صورت ہی میں اس کا استعمال درست ہو سکتا ہے مثلاً ہنگامِ شب، ہنگامِ صبح۔

توالیِ عطف اور توالیِ اضافت سے بھی فارسیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اساتذہ نے ان کی تعداد چار تک روا رکھی ہے۔ مگر راقم کے خیال میں یہ تعداد بھی زیادہ ہے مسلسل دو اضافتیں کافی ہیں۔

صحتِ الفاظ کی بحث بھی صحتِ زبان ہی سے متعلق ہے۔ تلفظ کی غلطی تو چھوڑیئے یہ صورت تو سخت مضحکہ خیز ہے۔ شاعر کو زبان کے ایک ایک لفظ پر جھونپڑا بنانا پڑتا ہے۔ یہاں صرف وہ الفاظ قابلِ ذکر ہیں جن کے تلفظ ایک سے زیادہ ہیں۔ مثلاً خضر ضاد ساکن سے بھی درست ہے اور ضاد متحرک سے بھی۔ کافر کے تلفظ بھی مختلف ہیں سخن بھی اسی قبیل سے ہے۔ ایسے الفاظ کا کوئی ایک تلفظ جو زیادہ مقبول ہو منتخب کر لینا مناسب ہے۔ مثلاً خضر کو عام بول چال میں ضاد ساکن ہی سے بولتے ہیں۔ کافر کو فاے مفتوح سے، سخن کو جاے معجمہ کے زبر سے عموماً بولتے ہیں اس لئے یہی مقبول تلفظ انتخاب کے لئے قابلِ ترجیح ہیں۔ یہ روش مضحکہ خیز اور خلافِ اصول ہے کہ جہاں ضاد ساکن آسکے وہاں خضر کو ضاد ساکن سے لکھ دیا اور جہاں ضاد متحرک کی گنجائش نظر آئی وہاں اسے سحر، اثر کے قوافی میں لے آئے۔

تذکیر و تانیث کے سلسلے میں بھی شاعر کی روش کسی اصول پر مبنی ہونی چاہیئے۔ متعدد الفاظ ایسے ہیں جو تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ مانے جاتے ہیں مثلاً طرز، غور، فکر، آغوش، بلبل وغیرہ۔ ان کے لئے بھی بول چال کی عمومی صورت ہی قابلِ لحاظ ہے۔ طرز کو کہیں مذکر لکھ جانا اور کہیں مؤنث یہ کسی اصول پر مبنی نہیں۔ شاعر کو چاہیئے کہ اگر وہ اس لفظ کو مؤنث مانتا ہے تو اسے ہمیشہ مؤنث ہی لکھے۔ طرز کو زیادہ تر مؤنث اور غور کو زیادہ تر مذکر بولتے ہیں مثلاً کافی غور کیا گیا۔ بہت سے غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اسی طرح بلبل کو بھی عموماً مؤنث بولتے ہیں۔ پس کوئی ایک قبول صورت انتخاب میں آسکتی ہے اور وہی انتخاب مستقل طور پر اپنا دستور العمل بنایا جاسکتا ہے۔ راقم نے اپنے کلام میں بھی اور شاگردوں کے کلام میں بھی طرز، فکر، آغوش کی تانیث ہی کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے۔ ایسے الفاظ میں بے اصولی کبھی گوارا نہیں کی۔

صحتِ زبان کے بعد شعر کی دوسری خوبی حسنِ بندش ہے۔ مضمون میں

لطافت بھی ہو، شعریت بھی ہو، زبان بھی فصیح اور ٹکسالی ہو۔ پھر بھی حسنِ بندش کے بغیر شعر بے لطف رہتا ہے۔ ع

چُست جب بندش نہ ہو لطفِ بیاں آتا نہیں

شعر کی زبان بول چال سے پوری مطابقت رکھتی ہو یا بول چال کے قریب قریب ہو اور شعر حشو و زوائد سے اس حد تک پاک ہو کہ کوئی لفظ نثر بناتے وقت کم نہ کیا جا سکے اور ان کی ترتیب و تناسب بھی ترنم یا موسیقیت کے معیار پر ہو۔ ایسی ٹھوس اور مضبوط بندش ہی کو حسنِ بندش کہا جا سکتا ہے۔ سہل ممتنع سے بھی یہی مراد ہے کہ شعر کی نثر نہ بن سکے۔ مثلاً ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

یہ شعر مکمل قسم کے سہل ممتنع کی مثال ہے۔ اساتذہ کے کلام میں ایسی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ جن زمینوں میں فعل بطور ردیف نہیں آتا ان میں عموماً تقدیم و تاخیر کا امکان ہوا کرتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ کوشش شرط ہے کہ زبان عام بول چال کے قریب قریب ہی رہے۔ فعل کا درمیان آنا اس خاص وصف کے منافی نہ ہو۔ بلے ضرورت تقدیم و تاخیر سے ہمیشہ اجتناب لازم ہے۔ تقدیم و تاخیر کی قبیح مثالیں سنئے ؎

صبح گزری شام ہونے آئی میرؔ
تو نہ یاں جیتا بہت دن کم رہا

دوسرے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ تو بہت کم مدت تو جیتا نہیں رہا۔ کافی عمر بسر کر چکا ہے۔ مگر بہت دن کم رہا یہ الفاظ تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے بہت ہی اُلجھن پیدا کر رہے ہیں ؎

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیئے اے مرغِ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیّاد کا

مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ صیّاد تڑپ رہا ہے۔ اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ لفظ صیّاد مضاف الیہ ہے اور دم مضاف ہے جو صیّاد سے بہت دُور واقع ہوا ہے۔ دم صیّاد کا۔ اس طرح کہا جاتا تو یہ مغالطہ پیدا نہ ہوتا اور صیّاد کے تڑپنے پر توجہ مبذول نہ ہو سکتی۔ ذیل کا مصرع بھی تقدیم و تاخیر کی قبیح مثالوں میں سے ہے ع

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

ڈالی یہاں بہ معنی شاخ ہے۔ مگر مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ڈالنا مصدر کا فعل مجہول ہے۔ اس مغالطہ کی وجہ یہ ہے کہ ٹوٹ گئی کو گئی ٹوٹ کہا اور پھر ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان چھ لفظ حائل کر دئے۔ ایسی ہی خرابیوں کی بنا پر فصحائے حال اجزائے فعل کی تقدیم و تاخیر بارِ سماعت خیال کرتے ہیں اور ٹوٹ گئی کی جگہ گئی ٹوٹ، آتا ہے کی جگہ ہے آتا، فرمانے لگے تھے کی جگہ لگے تھے فرمانے نہیں کہتے۔ مطلب یہ کہ ہر فعل کے اجزا کو ہمیشہ بول چال کے مطابق رکھنا پسند کرتے ہیں اور ع

وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اُٹھاتے

زک اُٹھاتے ہیں کی جگہ 'ہیں زک اُٹھاتے' نہیں کہتے۔ بعض وقت اجزائے فعل کی تقدیم و تاخیر یا بے ترتیبی تو نہیں ہوتی۔ مگر دو اجزا دُور دُور واقع ہونے سے بھی مصرع محلِ نظر ہو جاتا ہے۔ مثلاً

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

یہاں مت اور آ جائیو کے درمیان دو لفظ حائل ہو گئے ہیں۔ نیز مت اور فریب کے اتصال نے ایک اور بے لطفی پیدا کر دی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بیان کر دینا بہت دل چسپ ہو گا کہ تقدیم و تاخیر بعض جگہ حسنِ کلام بھی ہوتی ہے۔ بعض دفعہ روزمرّہ میں بھی یہ ضروری ہو جاتی ہے۔ مثلاً آؤ گے کب، لاؤ گے کیا، دیکھ لیا مزا ان شرارتوں کا۔ ع

ہم نے یہ مانا کہ دِلّی میں رہیں کھائیں گے کیا

گویا مقصودِ بیان یہ ہے کہ ذوقِ صحیح بعض دفعہ شعر میں بھی تقدیم و تاخیر پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی تشریح کے لئے مرزا غالب کے ایک فارسی خط کا حوالہ دے دینا کافی ہو گا۔

مرزا سے ان کے ایک شاگرد نے اپنی غزل جو اصلاح کے لئے بھیجی تھی واپس طلب کی۔ مرزا جواب میں لکھتے ہیں کہ غزل دیکھ لی تھی مگر تلاش پر بھی نہیں ملی۔ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شعر میں زحاف بے مزہ واقع ہُوا تھا اس میں ترمیم کر دی گئی تھی۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نہ خریدار کا حصہ ہوں نہ حق بائع کا
میں وہ دانہ ہوں کہ گر جائے کفِ میزاں سے

شاگرد نے 'بائع کا حق' لکھا تھا اور مرزا نے 'حق بائع کا' تحریر فرمایا اس ترمیم کی تائید تشریح سے نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک وجدانی کیفیت ہے

جسے ذوقِ صحیح ہی سمجھ سکتا اور وہی اس حسنِ سخن کی داد دے سکتا ہے۔

ناروا قسم کی تقدیم و تاخیر کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ ہمارا بیان بول چال کے مطابق نہیں رہتا، اور دوسری خرابی یہ ہے کہ تعقید لفظی کا سقم پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر کا مقصودِ نظر کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ بعض دفعہ شعر میں ذم کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔

تعقید صرف لفظی ہی نہیں ہوتی معنوی بھی ہوتی ہے۔ جب شاعر نپے تلے اور برمحل الفاظ میں مفہوم واضح کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور شعر ایک معمہ یا لفظوں کا گورکھ دھندا بن جاتا ہے یا کنایہ قریب کو چھوڑ کر کنایاتِ بعیدہ سے کام لیتا ہے یا عجیب و غریب اور غیر متعارف الفاظ استعمال کرنے سے بیان میں غرابت پیدا کر دیتا ہے یا محذوفات میں ان کی ناطق صورت پیدا نہیں کرتا یا پیچ دار ترکیبوں سے مفہوم کو اُلجھا دیتا ہے تو ان تمام فروگذاشتوں سے تعقید معنوی پیدا ہو جاتی ہے اور مقصودِ بیان تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں قسم کی تعقیدیں مل کر سامع کے فہم پر مصیبت نازل کر دیتی ہیں اس لئے شعر میں دونوں قسم کی تعقیدیں خواہ وہ لفظی ہوں یا معنوی، خواہ وہ انفرادی شکل میں ہوں خواہ مخلوط صورت میں شعر کو سقیم الحال بنا دیتی ہیں۔

غزل کی زبان میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بازاری پھبتیاں، بازاری محاورے اور بہت سے بازاری الفاظ تو نظم کی ہر ایک صنف میں مضحکہ خیز ہوتے ہیں خواہ وہ نظم طنز و تعریض کی حامل ہو یا مزاحیہ۔ بہت سے الفاظ اور بھی ہیں جو اپنی جگہ فصیح سمجھے جاتے ہیں مگر غزل کی زبان میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔ مثلاً لفظ نادانی تو آپ غزل میں استعمال کر سکتے ہیں مگر اس کی جگہ حماقت لکھیں تو شعر قابلِ تضحیک ہو جاتا ہے۔

متروکاتِ زبان کے علاوہ متروکاتِ شعری بھی ہوتے ہیں مثلاً عیوب قافیہ، عیوب ردلیف، تقابل ردیفین، شکستِ ناروا۔ تقطیع میں قواعد و ضوابط کے خلاف چلنا، کسی زحاف کا ایسی بحر میں استعمال کرنا جو اس کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ تنافر یعنی ہم مخرج یا قریب المخارج کو بالاتصال لکھنا، مثلاً

زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

اسی طرح اب بھی، جب بھی، خاک کی، اس سے، اب پھر وغیرہ۔

قافیہ معمولہ کا اعادہ جس کا وجود چھ سات شعر میں صرف ایک دفعہ روا ہے۔ مثلاً آشیانہ ملا، خزانہ ملا کی زمین میں خدا نہ ملا، گیا نہ ملا، مدعا نہ ملا کے قوافی کا اعادہ۔ اس میں یہ سقم ہے کہ جب آشیانہ، خزانہ، زمانہ کے قوافی مصرع مطروحہ میں تجویز کئے گئے ہیں تو نون حرفِ روی ہے، نون حرفِ روی کو چھوڑ کر خدا، مدعا کے قوافی لانا یعنی الف کو حرفِ روی بنا لینا کس طرح روا ہے۔ ردلیف کا حرفِ نفی (نہ) قافیہ میں جا ملانا صاف طور پر قافیہ معمولہ ہے جو عیوبِ قافیہ میں شامل ہے۔ اسی طرح انساں کا، رضواں کا، اگریباں کا، ان قوافی کے ساتھ چھا نکا، ڈھا نکا کے قوافی۔ ایسے قوافی کی تکرار معیوب ہوتی ہے۔ شکست ناروا اور ایطا بھی متروکات شعری کہلاتے ہیں۔

نئی روشنی کے شعراء ردلیف و قافیہ سے بے نیاز ہو رہے ہیں اور یہ تلقین کر رہے ہیں کہ اس پابندی سے قوتِ بیانیہ اکثر جگہ سپر انداز ہو جاتی ہے۔ وہ ایک مصرع چھوٹا اور ایک مصرع بڑا لکھ دینا بھی روا سمجھتے ہیں مگر وہ نہیں سوچتے کہ پابندیاں کہاں نہیں ہیں۔ آزاد سے آزاد ملکوں کے باشندوں پر بھی بہت سی قانونی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمارے تعلقاتِ خانہ داری بھی قیود سے مستثنٰی نہیں ہیں انسانی اخلاق بھی ہم سب کے لئے بے شمار پابندیاں تجویز کرتے ہیں۔ خدائی احکام اور مذہبی قوانین نے بھی ہم سب کے افعال و اعمال پر بہت بٹھا رکھے ہیں۔ جب یہ پابندیاں گوارا ہوتی یا گوارا کرنی پڑتی ہیں تو نظم میں فنی پابندیاں کیوں گوارا نہیں ہو سکتیں اور شعر پر محنت کرنے سے طبیعت کیوں گریز کرتی ہے۔ یہ گریز تو صاف طور پر عجزِ طبیعت کا ثبوت ہے۔ پختہ مشق شعراء کا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مشق و مزاولت سے یہ پابندیاں ان کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہیں اور فکرِ شعر میں کبھی سدِّ راہ نہیں ہوتیں۔ جب تک شعر فنی پابندیوں کے مطابق نہیں ہوتا وہ اپنی فکرِ شعر سے مطمئن بھی نہیں ہوتے۔ یہ اثر بھی ان کی عادتِ ثانیہ ہی کا کہا جا سکتا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے دیکھئے شوقؔ، نسیمؔ اور حسنؔ کی مثنویاں دیکھئے، داغؔ کا شہر آشوب دیکھئے اُردو قصائد کا حصۂ تشبیب ملاحظہ کیجئے، کون سا ایسا مضمون ہے،

جو فنی پابندیوں کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے ان نظموں میں کامیابی سے بیان نہیں کیا گیا۔ جب حقیقتِ حال یہ ہے تو پھر کس طرح مان لیا جائے کہ ردیف و قافیہ بے ضرورت ہیں۔ حق یہ ہے کہ ردیف و قافیہ کے بغیر شعر میں خوب صورتی اور کشش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ تجویز کردہ مضامین یا تخیل کے نتائج اگر غزل کے شعر میں نہیں سما سکتے تو یہ ضروری نہیں کہ آپ وہ مضامین غزل کے لئے وقف کریں۔ ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے نظم کی اور قسمیں بھی تو موجود ہیں۔ قطعہ ہے، رباعی ہے، مخمس ہے، مسدس ہے، ترجیع بند ہے، ترکیب بند ہے۔ جس صنف میں خیالات آسانی سے سما سکیں وہی صنف جولانیٔ فکر کے لئے منتخب ہو سکتی ہے۔ قطعہ اور رباعی میں تو دو تین قافیوں ہی سے کام چل جاتا ہے۔ ان اصنافِ نظم میں نفسیات کا مضمون ہو یا جمالیات کا، علم و حکمت کا موضوع ہو یا فلسفۂ اخلاق کا، جذبات ہوں یا احساسات، حمد ہو یا مناجات، واقعہ نگاری ہو یا قومی خیالات، تمام فنی پابندیوں کے باوجود معجز نگاری کے ایسے نمونے موجود ہیں کہ حسنِ سخن خود ان کی داد دینے پر مجبور ہے۔

متروکاتِ شعری میں تقابلِ ردیفین کا سقم بھی شامل ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس سقم سے یہ مراد ہے کہ دوسرا مصرع اگر "ہے" پر ختم کیا ہے تو مطلع کے سوا کسی اور شعر کا مصرع اول "ہے" پر ختم نہ کیا جائے۔ صوتی اعتبار سے مصرع اول کی یہ شکل ناگوار سی ہوتی ہے اور حسنِ ردیف کے منافی سمجھی جاتی ہے۔ راقم تو یہاں تک محتاط ہے کہ مصرع اول کے آخر میں "ہیں"، "ہے" تو درکنار، ردیف کا کوئی ہم قافیہ لفظ بھی نہ آنے پائے۔ مثلاً "نئے"، "مے" وغیرہ۔ اسی طرح "نہیں آتی" ردیف ہو تو مصرع اول نہ تو "آتی" پر ختم ہو نہ "ایسی"، "اچھی"، "دیکھی" وغیرہ پر۔ پہلی صورت کو تقابلِ ردیفین اور دوسری صورت کو شبہ تقابلِ ردیفین کہیں گے۔

انھیں متروکاتِ شعری میں شترگربہ ہے۔ حضرت داغ اپنے منظوم ہدایت نامہ میں فرماتے ہیں ؎

ایک مصرع میں ہو تُو دوسرے مصرع میں ہو تم
یہ شترگربہ ہوا میں نے اسے ترک کیا

اسی طرح ایک مصرع میں تم اور دوسرے میں آپ آ جائے یا ایک مصرع میں میرا اور دوسرے میں ہمارا آ جائے تو یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

بعض احباب شعرِ ذیل میں ؎

چھوڑا ہے ساتھیوں نے پسِ کارواں مجھے
لے جائے دیکھئے مری قسمت کہاں مجھے

نافہمی سے شترگربہ کا سقم ظاہر کرتے ہیں مگر "دیکھئے" کا استعمال بے تکلفانہ بول چال میں شامل ہے اس لئے اسے شترگربہ نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت داغ کے یہ دو شعر بھی ملاحظہ ہوں ؎

لے چلے کوچۂ دلدار سے میت میری
دیکھئے لوگ اسے جا کے کہاں رکھتے ہیں

پڑی ہے جان عجب کشمکش میں کیا کیجے
نہ دل سے عشق نہ دل مجھ سے دور ہوتا ہے

یہاں بھی "دیکھئے" اور "کیا کیجے" دونوں بے تکلف زبان کا نمونہ ہیں۔ واحد شخص کی زبان پر بھی ایسے الفاظ آ سکتے اور آ جاتے ہیں اس لئے انھیں بھی شترگربہ کہنا درست نہیں۔

رکاکت، ابتذال اور ذم کے پہلو بھی شعر میں بہت قابلِ اعتراض ہوتے ہیں۔ بازاری زبان، بازاری محاورے اور بازاری الفاظ کے استعمال سے بھی یہ تینوں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ تقدیم و تاخیر بھی ایسی ہی کسی خرابی کی موجب ہوتی ہے۔ تیری اور تمھاری کے استعمال میں احتیاط نہ کرنے سے ذم کا پہلو نکل آتا ہے۔ بعض الفاظ کے قرب سے کراہت آمیز مفہوم صوتی اعتبار سے پیدا ہو جاتا ہے مثلاً اس اور حال کا قرب اسہال کی آواز پیدا کرتا ہے۔ جا اور دامن کا قرب بھی اسی قبیل سے ہے۔ ع

میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی

یہ مصرع ایک مشہور شاعر کا ہے۔ زبان اچھی، بندش اچھی، الفاظ کی ترتیب و تنا سب درست، مگر پھر بھی معنویت کی مبہم صورت نے ذم کا پہلو پیدا کر دیا اور مصرع مضحکہ خیز ہو گیا۔ رکھنا، رکھوانا، کرنا، کرانا دھرنا، دھروانا مصادر اور ان کے فعلوں میں ذم کا پہلو بڑی آسانی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس خرابی کا علاج یہ ہے کہ ایسے فعلوں میں مفعول پہلے آنا چاہیئے اور فعل بعد میں نیز مفعول کا محلِ وقوع فعل کے ساتھ ملحق رہے دوری پر نہ ہو تو شعر ایسے قبیح سقم سے بچ جاتا ہے۔ تیری اور تمھاری کے

استعمال میں بھی یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ مؤنث مضاف ان کے بعد آئے اور وہ مضاف الیہ کی ضمیر سے ملحق رہے۔

متروکاتِ شعری میں کچھ اور باتیں بھی شامل ہیں مثلاً ایطا کا عیب۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایطائے خفی اور ایطائے جلی۔ ایطائے جلی تو قبیح عیب ہے مثلاً دردمند اور حاجت مند، تاجور اور ہنرور، چارہ گر اور دادگر، مہربانی اور پاسبانی، باریکیاں اور رعنائیاں وغیرہ کے قافیے۔ ایطائے خفی کی مثالیں۔ دانا و بینا، خنداں و گریاں، لگا اور بجھا، دوستی اور دشمنی وغیرہ۔ ان کی شناخت کا عام اصول ہے کہ مشترکہ علامت دُور کرنے کے بعد باقی لفظ اگر بامعنی ہیں اور ہم قافیہ نہیں ہیں تو یہ ایطا ہے۔ مثلاً دوستی اور دشمنی میں یائے مصدری مشترک ہے۔ اسے الگ کر دینے کے بعد دوست اور دشمن دو بامعنی لفظ باقی رہتے ہیں جو ہم قافیہ نہیں ہیں، پس یہ ایطا ہے اور عیوب قافیہ میں شامل ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے الفاظ میں اگر یائے مصدری مشترک نہیں یعنی ایک میں یے مصدری ہے اور ایک نسبتی یا فاعلی، تو اسے ایطا نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً شاعری اور دہلوی، زندگی اور آدمی، بے کسی اور مشتری وغیرہ۔ یہی صورت لگایا اور بجھایا میں ہے، یہی عیب دانا اور بینا یا خنداں اور گریاں میں ہے۔ اس عیب سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ مشترکہ علامت دُور کرنے کے بعد باقی حصوں میں یا تو دونوں بے معنی رہ جائیں یا کوئی ایک بے معنی ہو۔ مثلاً لگا کے ساتھ پلا، بتا، دکھا، مسکرا وغیرہ قافیے۔ یا دوستی کے ساتھ زندگی، بندگی کا قافیہ۔ مثال ؎

یہ بلا میرے سر چڑھی ہی نہیں
میں نے کچے گھڑے کی پی ہی نہیں

یہ شعر ایطائے خفی سے بچ کر کہا گیا ہے۔ ایک جگہ صرف چڑھ باقی رہتا ہے دوسری جگہ پے۔ یاد رہے کہ ایطا کا عیب صرف مطلع ہی میں ہوتا ہے۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے مولانا قمر بدایونی نے رسالہ علی گڑھ میگزین میں بحث "قافیہ" کے عنوان پر ایک جامع مضمون شائع کیا تھا۔ اس میں اس بنا پر کہ نوجوان شعرا زیادہ پابندیوں سے گھبراتے ہیں۔ ایطائے خفی کی پابندی اڑا دینے اور ایطائے جلی کی پابندی بحال رکھنے کا مشورہ پیش کیا تھا۔ یہ مشورہ نامناسب نہ تھا مگر مشاہیر نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ راقم سے بھی بعض عزیزوں نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ایطائے خفی کو جائز سمجھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس سلسلے میں تین چار مشاہیرِ فن سے بھی میں نے خط و کتابت کی اور اس اجازت نامے کے حق میں تائید بھی کی خاص کر اس بنا پر کہ تمام مشاہیر کے کلام میں کہیں نہ کہیں لگانا، بجھانا کی قسم کے قوافی مل جاتے ہیں۔ ان خطوط کے جواب میں ان اصحاب نے اجازت نامے کی تائید کی ہے۔ یہ قوافی غلط نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کے عزیز اگر یہ اجازت چاہتے ہیں تو اجازت دے دی جائے مگر خود یہ پابندی نہ چھوڑیں تاکہ فنی نمایندگی ہوتی رہے۔ مشاہیر کے اس اتفاق رائے پر میں اپنے عزیزوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ لگا، بجھا کے قوافی لکھ کر ایطا کی پابندی چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ دیں، اور اگر اسے حسب سابق گوارا کر سکتے ہیں تو یہ بھی ان کی پسند اور مرضی پر منحصر ہے البتہ ایطائے جلی سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

تخفیف الفاظ کی بحث میں یہ بات تو مسلّم ہے کہ فارسی عربی الفاظ میں حروف علت (الف، واو، ی) کا سقوط معیوب ہوتا ہے سوائے اس صورت کے کہ ان کے بعد الف وصل موجود ہو، مگر ہندی الفاظ کے ساتھ یہ پابندی لازم نہیں۔ اس رعایت کے باوجود فصحا کا قول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو تخفیف سے بچنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت داغ فرماتے ہیں ؏

وہ فصاحت سے گرا شعر میں جو حرف دیا

حروفِ علت کی تخفیف کے علاوہ تخفیف کی بعض اور صورتیں بھی محلِ نظر ہوتی ہیں۔ فارسی الفاظ کی اردو جمع میں تخفیف بھی مصرع کی روانی اور حسنِ بندش میں خلل انداز ہوا کرتی ہے۔ مثلاً یہ مصرع

سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم

مصرع کے شروع میں بھی الفاظ کی تخفیف بارِ سماعت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ راقم نے مصرع کے شروع میں ہو، ہوں، ہے، ہیں نیز میں (ضمیر متکلم) کی تخفیف ترک کر دی ہے۔ سوائے اس صورت کے جب ان کے بعد الف وصل آتا ہو۔ وہ اور یہ کی تخفیف شروع مصرع میں البتہ ناگزیر ہے۔

ہندی الفاظ نیا، بھلا، بڑا، بھلے، بڑے، بھلی، بڑی، بھرا، بھرے

بھری، کہاں، جہاں، دہاں، یہاں، لیے، پیے، سے، جیے کی تخفیف بھی مصرع کو سست کر دیتی ہے، مثلاً

۱- جو بات ہے دل میں بھری محفل میں کہوں گا (بھری کی تخفیف)
۲- اے عندلیب کس لیے ہے بے قرار آج (لیے کی تخفیف)

الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے متعلق شکایت میں ان کی، محبت میں ان کی، جفاؤں میں تمہاری، اداؤں سے تمہاری، ہر زخم میں دل کے، ہر بات میں اس کی۔

۱- کیوں تم کو توجہ نہیں رُوداد پہ میری
۲- آنکھوں سے میرے جاری ہے کیوں آب شار آج

اس قسم کی تمام صورتیں اگرچہ راقم نے سَحر فی صدی تو ابھی ترک نہیں کیں مگر حتی در بھران سے بچنے ہی کی کوشش کرتا ہوں۔ حرفِ جار کے آ جانے پر اس کے بعد ضمیر مضاف الیہ یا مضاف الیہ کے آنے سے پرہیز کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔ یعنی محبت ہماری، محبت تمہاری، یہ تقدیم و تاخیر تو بارِ گوشش نہیں۔ شعر میں اتنی تقدیم و تاخیر ناگزیر بھی ہے۔ مگر محبت میں ہماری، محبت میں تمہاری، محبت میں اس کی وغیرہ وغیرہ بلا شبہ قابلِ ترک یعنی متروکاتِ شعر ہی میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔

حسنِ بندش کی بحث میں شکستِ ناروا کا سقم بھی قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ بعض بحریں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ ترنّم اور موسیقی یا مصرع کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نصف مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا قریب قریب مکمل ہو۔ اس عنوان پر راقم کا ایک مفصل مضمون 'آج کل' کی کسی گزشتہ اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں صرف مجمل طور پر اتنا بیان کر دینا کافی ہے کہ اگر کسی فنّی کتاب میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک سقم کو سقم نہ سمجھا جائے۔ کئی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف ذوقِ صحیح ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی وجدانی کیفیت یا تقاضائے موسیقیت کی وجہ سے لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتیں مگر ذوقِ صحیح اسے بخوبی جانتا، بخوبی سمجھتا اور بخوبی محسوس کرتا ہے اور خود بتا دیتا ہے کہ یہاں مصرع کی روانی شکست خوردہ ہے۔ اس شکست کی کئی صورتیں ہیں۔ اجزائے فعل کا ایک جزو پہلے نصف میں اور دوسرا جزو دوسرے نصف میں ہو مثلاً ؎

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

جار مجرور میں مجرور کا ایک نصف میں رہ جانا اور حرفِ جار کا دوسرے نصف کے شروع میں آ جانا، مضاف مضاف الیہ میں سے مضاف الیہ اور حرفِ اضافت کا ایک نصف میں اور مضاف کا دوسرے نصف میں۔ اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ حرفِ اضافت بھی دوسرے نصف کے شروع میں جا رہے۔ ایک ہی لفظ کا کچھ حصہ پہلے نصف میں اور باقی لفظ دوسرے نصف کے شروع میں۔ مرکبِ عطفی میں معطوف علیہ پہلے نصف کے آخر میں اور معطوف دوسرے نصف کے شروع میں۔ ندا منادیٰ میں حرفِ ندا پہلے نصف کے آخر میں اور منادیٰ دوسرے نصف کے شروع میں آ جائے۔ فارسی اضافت میں مضاف کے بعد مضاف الیہ دوسرے نصف کے شروع میں، یعنی پہلا نصف مضاف پر ختم کر دینا۔ اسی طرح فارسی عطف میں پہلا نصف حرفِ عطف پر ختم کرنا، ایک محاورے کے کچھ لفظ پہلے مصرع میں اور کچھ دوسرے نصف کے شروع میں لانا۔ یہ سب شکستِ ناروا ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

تمام اساتذۂ اردو فارسی کا کلام ان خاص خاص بحروں میں جو اس سقم سے تعلق رکھتی ہیں، اس شکست سے پاک نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں اِکّا دکّا مثالیں ان کے کلام میں ہوں تو اسے النادر کالمعدوم کہنا چاہیئے۔ اساتذہ کی اس نمایاں احتیاط کو دیکھ کر بھی اگر یہ کہا جائے کہ

یہ کس حدیث میں آیا ہے کس کتاب میں ہے

تو اس حجّت کو کس طرح بجا کہا جا سکتا ہے

ان خاص بحروں کی مثالیں یہ ہیں:-

۱- آزادہ رَہ کے ہم نے دن عمر کے گزارے
وہ چار دن سفر میں، وہ چار دن وطن میں

۲- کوئی مستِ سرگرداں آ گیا، مئے بے خودی وہ پلا گیا
نہ صدائے نعرۂ دَیر اٹھی، نہ حرم سے شورِ اذاں اُٹھا

۳- یہ مزا تھا دل لگی کا، کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا، نہ مجھے قرار ہوتا

۴۔ نہ وہ آس رہی نہ اُمنگ رہی، نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے، درِ دَیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے

۵۔ واعظ نے کہا یہ منبر پر، اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

۶۔ اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے، آخر کام تمام کیا

۷۔ چرخ کا جور مٹ گیا، چرخ کا دَور مٹ گیا
چرخ تو اور مٹ گیا، پڑ کے مرے غبار میں

۸۔ کیا ابتدا کیا انتہا، جو آئے گا وہ جائے گا
دنیائے فانی کچھ نہیں اللہ بس باقی ہوس

۹۔ اب اپنے حسن پر فدا، خنجر بھی ہے جگر بھی ہے
کمالِ شانِ دلبری، اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

۱۰۔ آئی گھٹا جب ساون کی، اک افسردہ بول اُٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ برکھا کب ہوتی ہے

۱۱۔ وہ بھی نہ تو کوئی دم، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

۱۲۔ سو رنگ کی تصویریں، حاضر بھی ہیں غائب بھی
پردہ مری آنکھوں کا، فانوسِ خیالی ہے

۱۳۔ تشبیہہ مدِ نظر ہے کس کی، کہ کوئی پوری نہیں اُترتی
مٹا دیئے صانعِ ازل نے، ہزاروں نقشے بنا بنا کر

۱۴۔ ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

اور بھی دو تین صورتیں ایسی ہوں گی۔ ذوقِ صحیح خود بتا دیا کرتا ہے کہ کہاں اس سقم سے بچنے کی ضرورت ہے اور کہاں نہیں۔ ترجیح کا تقاضا بھی ذوقِ صحیح کے تقاضے کی پوری تابعداری کرتا ہے۔

تشبیہات اور تمثیلات میں یہ احتیاط لازم ہوتی ہے کہ تشبیہ اپنے مشبہ بہ کو اور تمثیل اپنے ممثل لہ کو اس طرح واضح کرے کہ توقیر کی جگہ تحقیر کا پہلو پیدا نہ ہو۔ اگر یہ صورت ہو تو وہ تشبیہ یا تمثیل کسی مصرف کی نہیں۔ تمثیل کی خرابی کے لئے یہ مثال کافی ہوگی۔

شاعر ایک قطعہ میں کہتا ہے کہ یاس کی ظلمتوں میں امید کی روشنی اس طرح اپنی جھلک دکھاتی ہے جیسے کوئی دوشیزہ اپنے ہی سائے سے ڈرتی ہو۔ اس قسم کی بے ربط تمثیل سے مفہوم میں جو اُلجھن پیدا ہوتی ہے یا وضاحت میں ضعفِ بیان کا جو سقم ہے وہ ظاہر ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں   ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

یہ تمثیل مثل لہٗ کو یا فلسفی کی ناکام کوشش کو جس وضاحت سے بیان کرتی ہے اس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ مشکلات میں اُلجھنے کی بالکل صحیح اور روشن تصویر اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ بیان میں یہ حسن اس تمثیل ہی کی خوبی نے پیدا کیا ہے۔

مضمون کافی طویل ہوگیا ہے۔ ابھی متعدد نکاتِ باسخن ہائے گفتنی اور ہیں۔ مگر کاغذ کی تنگ دامانی اور زحمتِ تحریر زیادہ طوالت کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر بھی جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ مبتدی اور نومشق احباب کے لئے کافی مفید ہو سکتا ہے بہ شرطیکہ وہ اس خامہ فرسائی کو کسی قدر و قیمت کے قابل سمجھیں۔

تصحیح:۔ فروری ۱۹۶۰ء کے شمارے میں صفحہ ۴۴ پر غلطی سے فرخ جلالی کے مقالے کے عنوان میں 'مدہوش' کی جگہ 'ہوش' چھپ گیا ہے۔ ناظرین تصحیح فرمائیں۔

'آج کل' ۱۹۶۰ء کا سالنامہ ہندوستانی مصوری نمبر ہوگا

جعفر حسینی جعفر

گلِ نرگس

(شاعرِ فطرت Wordsworth کی مشہور نظم The Daffodils کا آزاد منظوم ترجمہ)

میں مثلِ ابرِ نیساں محوِ سیرِ کوہساراں تھا — فضا میں وادیوں کی لطفِ گلگشتِ بہاراں تھا
سمندر اک گلِ نرگس کا موجیں مارتا دیکھا — نسیمِ صبح میں پھولوں کا رقصِ جاں‌فزا دیکھا
فضاؤں میں ہواؤں کی مسرت باریاں دیکھیں — کنارے جھیل کے قدرت کی صنعت کاریاں دیکھیں
قطار اندر قطار استادہ لاکھوں پھول نرگس کے — مسلسل دُور تک لاانتہا پھیلے ہوئے دیکھے
سنہرے پھول نرگس کے ہزاروں لہلہاتے ہیں — فلک پر کہکشاں میں جیسے تارے جگمگاتے ہیں
ادھر پانی خوشی کے سرمدی دریا بہاتا ہے — مگر گلزارِ نرگس اور ہی کچھ گُل کھلاتا ہے
کہاں پانی کہاں نرگس کی آب و تاب لاثانی — کہ جس کو دیکھ کر تھا پانی پانی جھیل کا پانی
ہر اک ذرہ جہاں کا عالمِ حیرت میں ساکن تھا — نہ ہو بے تاب شاعر تابِ گل سے کب یہ ممکن تھا
میں محوِ دیدِ گل تھا اور نہ تھی مجھ کو خبر اتنی — کہ یہ منظر مجھے بخشے گا اک دولت مسرّت کی
بعزمِ استراحت جب کبھی بستر پہ جاتا ہوں — دلِ راحت طلب کو وقفِ صد افکار پاتا ہوں
کبھی خالی کبھی احساسِ غم سے نالہ فرسا ہے — تماشا ہے دلِ ناداں دلِ ناداں تماشا ہے
تو ایسے میں اچانک وادیِ گلزار کا منظر — چمک اُٹھتا ہے مثلِ برق میری چشمِ باطن پر
مسرّت کا خزانہ تحفۂ خلوت جسے کہئے — وہ میری چشمِ باطن چشمۂ جنّت جسے کہئے
مُرادوں کی نکل آئی ہے صورت نامرادی میں — خوشی کا ایک ساگر بہ رہا ہے دل کی وادی میں

دلِ دیوانہ دارم باگلِ گلزار می رقصم
بیادِ نرگسِ شہلائے آں دلدار می رقصم

اظہر راہی

ہجو صنفِ سخن کی حیثیت سے

ہجو مشتق ہے لفظ ہجا سے جس کے لغوی معنی برائی یا ملامت کرنے کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں ہجو اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص، واقعہ یا کیفیت کی مذمت کی جائے۔ یہ مذمت چونکہ عموماً طنزیہ یا مزاحیہ انداز میں کی جاتی ہے اس لئے ہجو کا طنز و مزاح سے گہرا تعلق ہے لیکن اس کے باوجود ان تینوں میں فرق ہے۔ ہجو میں طنز و مزاح کا شائبہ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ طنز و مزاح کا ہر نمونہ ہجو کا آئینہ دار ہو۔ ہجو کا تصور زیادہ تر اشخاص یا اشیاء کی مذمت سے وابستہ ہے یا پھر اس میں کسی عہد کی بدحالی کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے جس کا تعلق بھی مذمت سے ہوتا ہے۔

شعر الہند میں عبدالسلام ندوی نے ہجو کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

> "جن فضائل و مناقب پر قصیدہ کی بنیاد قائم ہے انھیں کے سلب کرنے کا نام ہجو ہے[1]"

اوّل تو یہ تعریف منفی پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر کی گئی ہے جو تعریف کا صحیح طریقہ نہیں ہے، دوسرے اس میں صرف اشخاص کی ہجو کو سامنے رکھا گیا ہے جبکہ ہجو کا دائرہ اشیاء، واقعات اور تاریخی حالات تک پھیلا ہوا ہے۔

جہاں تک متفرق اشعار کا تعلق ہے ہجو کے نمونے اردو کی سبھی اصنافِ سخن خصوصاً غزل، مرثیہ اور واسوخت وغیرہ میں مل جاتے ہیں غزل میں شیخ، واعظ، زاہد، محتسب وغیرہ کو لتاڑنا یا ہم عصروں کی مذمّت کرنا، مرثیہ میں دشمنانِ اہلبیت پر لعن و ملامت کرنا، واسوخت میں معشوق کی بدچلنی کا پردہ چاک کرنا اور اسی قسم کے دوسرے مضامین بخوبی ہجو کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ اس طرح ہجو کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کے حدود کا تعیّن کرنا محال ہے۔ لیکن کسی صنف کا تصور متفرق اشعار پر قائم نہیں ہوتا اس کے لئے ایک سے زیادہ مسلسل اشعار اور کسی مقررہ موضوع یا ہیئت کا ہونا لازمی ہے۔ اردو میں بعض اصنافِ سخن ایسی ہیں جن کی بنیاد موضوع پر ہے اور بعض ایسی ہیں جن کی بنیاد ہیئت پر ہے۔ غزل میں بالعموم حسن و عشق کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں لیکن ہر اس نظم کو غزل کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا جس میں حسن و عشق کے مضامین نظم کئے گئے ہوں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشعار اسی خارجی شکل میں ہوں جو غزل کے لئے لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ہر اس نظم کو مرثیہ کے تحت میں رکھا جائے گا جس میں کسی کی موت پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہو۔ خواہ وہ کسی بھی ہیئت میں لکھی گئی ہو۔ صنفِ ہجو کی بناء موضوع پر قائم ہے اس کے لئے کسی خاص ہیئت کی قید نہیں ہے۔ ہم ان تمام مسلسل اشعار کو ہجو کہہ سکتے ہیں جن کا موضوع اور مقصد ہجو ہو۔

ہجو میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً غصّہ، ملامت، طنز، طعن، پھبتی، استہزاء اور دل آزار ظرافت، کیونکہ ہر پہلو سے اس کا مقصد

---

[1] شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۳۷۳

اپنے مخالف کی مذمت کرنا ہوتا ہے اس لئے کسی قسم کا بھی پیرایۂ بیان اختیار کیا جاسکتا ہے اور عیب جوئی یا تمسخر کے لئے اچھائی میں بھی برائی کا پہلو نکل آتا ہے۔

ہجو کے محرکات

جہاں شاعر کو کوئی ایسی بات شخصیت یا حادثہ نظر آتا ہے جسے وہ برا سمجھتا ہے یا جس سے اس کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے وہیں وہ ہجو کا موضوع نکال لیتا ہے۔ دراصل ہجو کا تعلق شاعری کی دوسری اصناف کی طرح جذبات ہی سے ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے ہجو میں کسی شخص کے معائب یا کسی عام انسانی نقص کا طنزیہ اظہار ہوتا ہے اور اس اظہار کے لئے مخصوص قسم کے جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جذبات کا ذکر آتے ہی ہمارا خیال ان مخصوص روایتی جذبات کی طرف جاتا ہے جن سے غزلیں بھری پڑی ہیں اور ایک عرصہ تک ہماری شاعری میں ان ہی جذبات و احساسات کا دخل رہا ہے جو دنیا کے فانی ہونے، انسان کی بے پایاں خواہشات اور حسد و ذرائع کا ذکر یا زیادہ سے زیادہ وطن کی محبت کے ترانوں تک محدود رہتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے الفاظ میں:۔

> "اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہجو پر منظم جذبات کے بغیر ممکن ہی نہیں ہجو گو شاعر ناانصافی، بے رحمی، ظلم اور اسی قسم کے انسانی نقائص کے مشاہدے سے متاثر ہو کر اس کا جذبہ نفرت، غضب، حقارت جوش میں آتا ہے۔ ان ہی جذبات کا اظہار وہ اپنی نظم میں کرتا ہے اگر جذبۂ عشق ایک پرزور طاقت ہے تو جذبۂ نفرت بھی ایک طاقت ور زور ہے[1]"

شخصی اور سماجی ہجویات میں اس جذبہ کی کارفرمائی بہت نمایاں ہے۔ مزاح اور ہجو میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ایک زندگی کی ناتمامی کے احساس کا صرف اظہار کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا اسی نقص کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے خلاف جذبۂ نفرت ابھارتا ہے۔ نقص کو دور کرنے کے لئے احساس کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن صرف احساس کے اظہار کے لئے جذبۂ نفرت کی کوئی ضرورت نہیں اور یہیں سے مزاح اور ہجو کی راہیں جدا ہوتی ہیں۔

ہجو کے شخصی محرکات میں ذاتی عناد، شاعرانہ چشمک شخصی کمزوریوں کا بیان شامل ہے۔ ہجو گو چونکہ انسان ہے اور ایک ایسے ماحول میں پرورش پاتا ہے جہاں محبت کے جذبہ کے ساتھ نفرت کا جذبہ بھی موجود ہوتا ہے اس لئے وہ شخصی محرکات سے پہلوتہی نہیں کرسکتا اس لئے ہجو کی ابتداء عموماً کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔

ذاتی عناد ہجو کا بنیادی پتھر ہے اور جب یہ جذبہ پرورش پانے لگتا ہے تو پھر شاعرانہ چشمک اور شخصی کمزوریوں کے بیان میں ذاتیات کو بھی دخل ہوجاتا ہے اور ان بیانات میں عداوت، نفرت اور تضحیک کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن اچھا ہجو نگار وہ ہے جو اس ذاتی عناصر کو صرف کسی مخصوص فرد کی عیب جوئی یا تمسخر تک محدود نہ رکھے بلکہ اس میں ایسی عمومیت پیدا کردے کہ وہ تمام اشخاص اس کے دائرہ میں آجائیں جن میں وہ خامیاں موجود ہیں۔ مثال کے لئے سودا کی ہجو "شیدی کوتوال" کو لیجئے جو صرف ایک فرد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے اپنی صناعی سے پورے سماجی ڈھانچہ پر بھرپور وار کیا ہے اور صرف 'شیدی کوتوال' کے لئے جذبۂ نفرت نہیں ابھارا ہے بلکہ پورے اس نظام کے خلاف منافرت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

اس قسم کی شخصی ہجویات اس فن کی اعلیٰ مثالیں ہیں لیکن وہ ہجویات جن سے شاعر کا مطلب صرف اپنے دل کی بھڑاس نکال کر جذبۂ نفرت کو ٹھنڈا کرنا ہے کسی صورت میں اعلیٰ ادب میں نہیں کہی جاسکتیں۔

سماجی محرکات کے ذیل میں ہم ان تمام ہجویات کو لاسکتے ہیں جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ مقصد سیاسی اور معاشی بدحالی یا اخلاقی کمزوریوں کی نشان دہی کرنا ہے۔ اس قسم کی ہجویات کا آرٹ بلند پایہ ہے کیونکہ اس سے شاعر کی وسعت نظر اور مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے اس کے سیاسی اور سماجی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ جو شاعر زندگی سے جس قدر قریبی رابطہ رکھے گا اس کی ہجویات میں اتنی ہی تاثیر اور ہمہ گیری ملے گی اور چونکہ ان میں ہم عصر تہذیب کے بیانات ہیں اس لئے ہر دور میں ان کی ادبی

---

[1] سخن ہائے گفتنی: صفحہ ۱۹۵

اہمیت مسلّم رہے گی۔ یہی نہیں بلکہ اس قسم کی ہجویات سماج کی ایک ایسی تنقید ہوتی ہیں جس سے اس کی خامیاں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ شاعر کی شعوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان خامیوں کو دور کیا جائے۔

ہجو کی قسمیں

موضوع کے لحاظ سے ہجو کی دو بڑی قسمیں کی جا سکتی ہیں۔ ایک شخصی اور دوسری سماجی۔ شخصی ہجو سے مراد وہ ہجو ہے جس میں اشخاص کو ہجو کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں شاعر محض ذاتی عناد یا چشمک کی بنا پر کسی کی مذمت کرتا ہے اس کی مثالیں ہمیں تقریباً ہر دور کے ہم عصر شعراء کی نوک جھونک میں ملتی ہیں۔ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ چونکہ درباری مذاق کو پورا کرتی ہے اس لئے اس کی سرپرستی بھی کی جاتی ہے۔ انشاء کی صلاحیتوں کا درباری سرپرستی کی وجہ سے غلط استعمال اور درباروں میں مسخروں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ راجہ اور نواب اس قسم کی نوک جھونک سے ذائقہ بدلنے کا کام لیتے تھے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں سماجی کمزوریوں کو شاعر ایک اصلاحی نقطۂ نظر سے پیش کرتا ہے جیسے ضاحک کی ہجو میں سوداؔ اُن کی بسیار نوشی پر طنز کرتے ہیں اور نئے نئے مضحک پہلو نکالتے ہیں۔

سماجی ہجو کے تحت میں وہ ہجویات آتی ہیں جن میں سماجی کمزوریوں کو نمایاں کیا جاتا ہے اسی وجہ سے "شہر آشوب" کو موضوع کے اعتبار سے ہجو نگاری میں سب سے بلند درجہ دیا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت ہمیں قدماء کے یہاں کئی مسدّس، مخمّس اور قصائد ملتے ہیں جو اس دور کے سیاسی، معاشرتی اور مجلسی حالات کی ہجو پر مبنی ہیں۔ یہ ہجویات اس دور کے حالات کا پتہ دیتی ہیں۔ سماجی ناہمواریوں، دشواریوں اور مصائب کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا جاتا ہے کیونکہ ان میں شخصی موضوعات اور ذاتی عناد کی کارفرمائی نہیں ہوتی اور صالح جذبات ہوتے ہیں جس پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ اس قسم کی ہجویات موضوع کے لحاظ سے بھی نیز شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے بھی اہم ہیں۔ صنفِ ہجو میں ایسی ہجویات کو برتری اس وجہ سے حاصل ہے کہ ان میں دلی جذبات اور تاثرات کی مکمل ہم آہنگی ہوتی ہے کوئی تصنع یا تکلف نہیں ہوتا اور نہ کسی قسم کا ڈر یا خوف پایا جاتا ہے۔

نفسِ مضمون کے اعتبار سے ہجو کی تقسیم کرتے ہوئے ہزل اور ہرزہ گوئی کا خیال آتا ہے۔ لیکن ہزل ایک علٰحدہ صنف ہے اور اپنی نوعیت میں ہجو سے مختلف ہے۔ ہزل کو مزاحیہ یا ظریفانہ کلام کے تحت رکھا جا سکتا ہے جو ہجو کے مقابلہ میں بلند پایہ آرٹ نہیں ہے۔ کلیم الدین نے اس فرق کو واضح کرنے کی غرض سے ظرافت، طنز اور ہجو کے لئے بترتیب Humour، Irony اور Satire کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ ظرافت نگاری اور ہجو گوئی کے فرق کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں :-

"خالص ظرافت نگار کسی بے ڈھنگی شے کو دیکھ کر ہنستا ہے وہ اس نقص، خامی، بدصورتی کو دور کرنے کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ ہجو گو اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ اس ناقص، ناتمام منظر سے اس کا جذبۂ تکمیلِ حسن احمد نیت انصاف جوش میں آتا ہے اور وہ اس جذبہ سے مجبور ہو کر اس مخصوص مذموم منظر کو اپنی ظرافت اور طنز کا نشانہ بناتا ہے[۱]۔"

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہزل اور ہجو میں بنیادی فرق ہے۔ ہزل کی نشان دہی ہجو میں تو کی جا سکتی ہے لیکن خالص ہزل کو ہجو کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہجو گو ظرافت اور طنز دونوں سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔

ہرزہ گوئی کی بنیاد ضرور ہجویہ عنصر پر قائم ہے لیکن اسے کوئی ادبی حیثیت نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ کوئی صناعی نہیں ہے جبکہ ہجو کا آرٹ اس سے بہت بلند ہے اس لئے ہرزہ گوئی اور ہزل گوئی دونوں کو خارج از بحث سمجھنا چاہیئے۔

ہجو کا اسلوب

ہجو میں نہ تو قصیدہ کی طرح اشعار کی تعداد مقرر ہے اور نہ اس کی کوئی مخصوص ہیئت ہے اور نہ قصیدہ کی طرح پُرشکوہ زبان کی ضرورت ہے بلکہ اس کے برخلاف ہجو کی زبان جس قدر عام فہم ہوگی اسی قدر وہ زیادہ

---

[۱] سخن ہائے گفتنی صفحہ ۱۹۲

مقبول ہوگی کیونکہ اس کا مقصد اپنی زبان دانی کا لوہا منوانا نہیں بلکہ عوام و خواص تک اپنی بات پہنچانا ہے اسی وجہ سے ہجو کے مضامین نہ تو فلسفیانہ خیالات پر مشتمل ہوتے ہیں اور نہ ان کے مفہوم گنجلک ہوتے ہیں۔

اسلوب کے اعتبار سے ہم ہجو کی تقسیم سادہ ہجو، ہجو ملیح، ہجو قبیح اور سب و شتم کے عنوانات سے کر سکتے ہیں۔ یہ ہجو کی درجہ بدرجہ سیڑھیاں ہیں۔ سادہ ہجو میں لہجہ نرم اور انداز بیان میں حلاوت اور مٹھاس ہوتی ہے۔ ہجو ملیح میں یہی نرمی کسی قدر سختی میں بدل جاتی ہے لیکن اس سختی کی نمایاں طور پر نشان دہی نہیں کی جا سکتی اور اسی سے ہجو کا لطیف پہلو پیدا ہوتا ہے۔ ہجو قبیح میں یہی سختی تندی اور کرختگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہجہ میں متانت اور مٹھاس کے بجائے درشتی اور جھلاہٹ کا احساس ہوتا ہے اور سب و شتم میں اس جھلاہٹ اور تندی کی جگہ گالی گلوچ، عریانی اور فحاشی لے لیتی ہے۔ زبان کے جس قدر حربے ہو سکتے ہیں استعمال کئے جاتے ہیں۔ فحش الفاظ محاورات اور دشنام طرازی کی بھرمار ہوتی ہے۔ جعفر زٹلی کی ہجویات اسی اسلوب کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ہجو کی بدنامی زیادہ تر اسی اسلوب کی وجہ سے ہے۔

ہجو اور نقاد

صنف ہجو ابتدائی دور میں کبھی سنجیدگی کی نظر سے نہیں دیکھی گئی اور ہمیشہ قابل نفرت سمجھی گئی۔ جعفر زٹلی ہمیشہ اپنی ہجویات کی وجہ سے مورد عتاب رہے اور آخر میں فرخ سیر نے انھیں قتل کرا دیا[1]۔ لیکن صنف ہجو کے لئے سودا کا دم غنیمت ثابت ہوا۔ انھوں نے اس کی ادبی حیثیت کو نمایاں کیا اور سماجی موضوعات سے متعلق ہجویات لکھ کر اس صنف کو ادب میں ایک نمایاں جگہ دی۔ تذکرہ نویسوں نے بھی ہجو نگار شعرا کا ذکر مناسب نہیں سمجھا۔ جعفر زٹلی کے بیان میں آزاد نے 'آب حیات' میں "زٹلی کا اعتبار کیا؟" کہہ کر اس کے ذکر سے پہلو تہی کی۔ ابتداءً ہجو دراصل اس کی مستحق بھی تھی کیونکہ قدما کی ہجویات میں کوئی ایسی بات یا خوبی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے انھیں کوئی مخصوص ادبی اہمیت دی جاسکے سوائے اس کے کہ وہ اردو کے ابتدائی نمونے ہیں۔

سودا کے ذکر میں البتہ مختلف تذکرہ نویسوں نے پہلی بار ہجو کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا ہے لیکن پھر بھی سودا ان کے طنز و تشنیع کے نشانہ بنے رہے۔ شیخ چاند نے 'سودا' میں سودا کی ہجویات سے متعلق ایک باب قائم کر کے ہجو کی اہمیت اور اس کی ادبی خوبیوں کی بخوبی نشان دہی کی۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی نے 'شعر الہند' حصہ دوم میں اردو کی انواع شاعری پر ادبی حیثیت سے ریویو کرنے کی غرض سے ہجو کا ایک مستقل باب قائم کیا لیکن انھوں نے ہجو کو ایک جداگانہ صنف کی حیثیت سے سامنے نہیں رکھا البتہ عربی شاعری اور تنقید کی روشنی میں مندرجہ ذیل اصولوں کا تعین کیا۔

"(۱) ہجو میں کسی کے جسمانی عیوب کا ذکر نہیں کرنا چاہیئے
(۲) ہجو میں اصلی اور سچے عیوب کا ذکر کرنا چاہیئے
(۳) شریف اور بلند مرتبہ اشخاص کی ہجو میں تصریح کے بجائے تعریض سے کام لینا چاہیئے۔
(۴) ہجو میں ہمیشہ اختلاف مراتب کا خیال رکھنا چاہیئے
(۵) ہجو میں اشعار کی تعداد بھی محدود ہونی چاہیئے۔"

اگر مولانا کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں ہجو گوئی کی بنیاد ڈالی جائے تو ایسی ہجویات جذبات سے عاری پھیکی اور اخلاقی وعظ سے زیادہ نہ ہوں گی۔ مولانا ہجو سے صرف ذاتی یا شخصی ہجویات مراد لیتے ہیں اور ان ہجویات کو فراموش کر دیتے ہیں جو سماجی موضوعات پر ہیں اور دراصل ہجو کے بلند پایہ نمونے ہیں چنانچہ ہجویات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان بزرگوں کی ذلیل شاعری (ناجی، میر ضاحک، سودا، بقاء اور انشاء) ہجویات صرف موزوں گالی گلوچ ہیں جو ہجو گوئی کے تمام محاسن سے خالی ہیں۔"

اپنے نظریہ کی روشنی میں ان کا خیال ہے کہ

"مرثیوں میں بعض موقعوں پر جستہ جستہ جو ظریفانہ اشعار آگئے ہیں ان کو صحیح ہجو کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔"

---

[1] کلیات جعفر زٹلی مطبوعہ لکھنؤ صہ ۴۸

ان کی نظر میں حالی کے یہاں ہجو گوئی کے جملہ عناصر ملتے ہیں۔ سودا کی معاشرتی اور سماجی ہجویات سے مولانا کی پہلو تہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہجو کے سرمایہ کو صرف گالی گلوچ سمجھتے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "طنزیات و مضحکات" میں ہجو کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے لیکن وہ بھی ہجو اور طنز میں بنیادی فرق محسوس نہ کر سکے جیسا کہ ان کی رائے سے ظاہر ہے۔

"بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔"

ہجو کی صنفی اہمیت تسلیم کرنے میں کلیم الدین جیسے کٹر مغرب پسند پیش پیش ہیں انھوں نے اپنی کتاب "سخن ہائے گفتنی" میں ہجو کے مرتبہ سے بڑی اچھی بحث کی ہے اور ظرافت، طنز اور ہجو کا فرق نمایاں کیا ہے اور ہجو کو ان سب پر فوقیت دی ہے۔

عہد حاضر کے بعض دوسرے نقادوں نے بھی ہجو کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے صنف کی حیثیت دی ہے۔ پہلے نقادوں کی بے نیازی بڑی حد تک ہجو کی سماجی حیثیت، افادیت اور ہمہ گیری سے ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ آج جب سماجی پس منظر کی روشنی میں ہجویات کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو اس کی قدر و قیمت، افادیت اور ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

کرشن موہن

آس اور پاس

تیرا غم ہے، کیسے کم ہو
پائندہ ہے یہ گنجینہ
اشکوں کی برسات لگی ہے
آ پہنچا ساون کا مہینہ
ارمانوں کے بارِ گراں سے
ڈوب نہ جائے دل کا سفینہ
اپنے دل میں میل نہیں ہے
اپنا سینہ ہے آئینہ
سازِ تمنا محفل محفل
سوزِ تمنا سینہ سینہ

دیں ہو کہ دنیا راس نہیں ہے
دل کو سکوں کی آس نہیں ہے
اپنے پاس نہیں ہیں ہم بھی
تو جو ہمارے پاس نہیں ہے
کیسی ہیں یہ آس کی کلیاں
رنگ نہیں، بو باس نہیں ہے
پاسِ وفا کا دعویٰ اُن کو
جن کو وفا کا پاس نہیں ہے
اپنی زیست ہے غم کی محفل
خوشیوں کا اجلاس نہیں ہے

تمکین کاظمی

ترکی نور محلی

ترکی کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے فردوسی طوسی تک پہنچتا تھا، ان کے دادا نادر شاہ کے عہد میں ہرات سے آکر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے، ان کے والد سکھوں کے عہدِ حکومت میں شہر نور محل مضافات لاہور میں جاکر رہ گئے اور سردار نور محمد ہراتی کی لڑکی سے شادی کرلی، ان کی والدہ چونکہ ایرانی النسل اور ہرات کی تھیں اس لئے فارسی ان کی مادری زبان تھی، یوں تھوڑی بہت پنجابی بھی بول لیتی تھیں، اسی لئے ترکی کو اپنی مادری زبان فارسی ہونے کا فخر تھا۔

ترکی کے والد نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ اگرچہ وہ شعر کہنا پسند نہ کرتے تھے مگر حل معنیٔ اشعار میں انھیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ سات زبانیں جانتے تھے اور سات قلم لکھتے تھے۔ چونکہ ترکی بچپن سے شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے اس لئے ان کے والد منع کرتے تھے کہ شاعری نہ کیا کرو۔ ایک روز ایک لاہوری شاعر جو اپنے تئیں شاہ آفریں کی اولاد بتاتے تھے آئے اور ان سے کہنے لگے کہ میں نے ایک مصرع کہا ہے مگر دوسرا مصرع نہ پہنچا سکا۔ تم مصرع کہہ دو۔ انھوں نے کہا کہ میں تو شعر نہیں کہتا البتہ میرا لڑکا شعر گوئی سے دل چسپی رکھتا ہے شاید وہ مصرع لگادے چنانچہ ترکی کو بلاکر انھوں نے کہا کہ اگر اس مصرع پر مصرع لگا سکو تو میں تمھیں شعر کہنے کی اجازت دے دوں گا۔ ترکی نے مصرع پوچھا تو شاعر نے سنایا ع

شبم منظرِ ہمہ زلفِ مشکفام تو بود

ترکی نے فوراً مصرع پہنچایا ع

اسیر طائرِ نظارہ ام بدام تو بود

اس مصرع کو سبھوں نے پسند کیا اور ترکی کے والد نے نہ صرف انھیں شعر کہنے کی اجازت ہی دی بلکہ ناطق گرانی کا شاگرد بھی کرادیا۔

ترکی کا نام غلام احمد تھا مگر جب وہ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے مرید اور فقیر ہو گئے تو غوث علی شاہ نے علائی شاہ نام دیا انھوں نے علائی تخلص اختیار کیا اور شہاب الدین واثق ہراتی اور پھر مولوی امام بخش صہبائی سے نہ صرف اصلاح لینی شروع کی بلکہ کتب درس اور عروض و قافیہ کی تکمیل بھی کی۔

ترکی جب کبھی صہبائی کا ذکر کرتے تو ان کا یہ شعر پڑھ کر جھومنے لگتے تھے ؎

دیدم سحر صہبائیٔ آشفتہ در میخانۂ
شعری بلب ساغر بکف اوراق دیواں در بغل

ترکی نے مولوی رکن الدین مکملؔ سے بھی استفادہ کیا تھا اور ان سبھوں سے فارسی ہی کی اصلاح لی تھی مگر اردو زبان پر بھی انھوں نے تاخت کی تھی اور اردو شعر کہہ کر میر علی اوسط رشک لکھنوی کو دکھایا کرتے تھے۔

تیس سال تک ترکی نے تحصیلِ علم کی پھر سیر و سیاحت کے شوق میں گھر سے نکل پڑے۔ اسی سفر میں ایک دیوان موسوم بہ 'گلشنِ معنی' مکمل کیا اور 'فرخ نامہ' نام سے چار ہزار اشعار میں راجہ نابھ والیٔ نابھ کے حکم سے نظم کی جس کے صلے میں ریاست نابھ سے

منصب جاری ہوا جو انھیں تاحیات ملتا رہا۔ اسی طرح بائیس سال تک سیاحت کی اور دنیا بھر کا سفر کیا، بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس سفر کے حالات ان کے ایک شاگرد سید نواب جان تمنا نے رسالہ "مخزن ترکی" میں شائع کئے ہیں۔ اسی سفر کے عجائبات میں مولوی اسمٰعیل جنّی سے ترکی کی ملاقات شامل ہے جو مسجد جامع منگرول میں ہوئی۔ چالیس سال کی عمر میں لارڈ میو اور راجگان کی طرف سے امیر الشعرا و خطاب ملا۔

ترکی نے حسب ذیل تصانیف یادگار چھوڑی ہیں :۔

(۱) فرخ نامہ (رامائن) منظوم (۲) دیوان فارسی موسوم بہ گلشن معنی (۳) ساقی نامہ (۴) مثنوی گلزارِ محبت (۵) رسالہ بدر حسین (منظم) (۶) مثنوی صوت سرید (۷) سرور الناظرین (نثر) (۸) گلبانگ ترکی (نثر) (۹) دیوان سرمایۂ پیری (۱۰) مثنوی طول امل (۱۱) مثنوی شکراب (۱۲) مثنوی ناز و نیاز (۱۳) تذکرۂ سخنورانِ چشم دیدہ (۱۴) مثنوی گلزارِ شہادت (۱۵) مثنوی جلال اختر (۱۶) مثنوی سعد و جمیلہ۔ (۱۷) تبسم کدہ (۱۸) دیوان سرمایۂ حیات (۱۹) دیوان شباب اردو۔

ان میں نمبر ۱ تا ۱۳ فارسی میں اور نمبر ۱۴ تا ۱۹ اُردو میں ہیں۔ جو طبع ہو چکی ہیں سوائے دو کتب گلزارِ محبت اور گلزارِ شہادت کے، جن کے مسودے چوری ہو گئے تھے۔

ترکی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مختلف ریاستوں میں گزارا۔ آخر عمر میں ۱۳۱۳ھ میں حیدرآباد پہنچے اور یہاں پہنچ کر پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے صرف دربارِ دہلی کے موقع پر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے ہمراہ دہلی گئے اور پھر واپس آکر حیدرآباد ہی میں رہے۔

یہ حالات جو اوپر بیان کئے گئے ہیں میں نے ان کے تذکرۂ سخنورانِ چشم دیدہ مطبوعہ ۱۳۲۳ھ سے لئے ہیں جو خود ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان حالات کے اختتام پر خود ترکی نے لکھا ہے :

"سال عمر من بہ نود رسیدہ بلکن ہزار ہزار بلکہ بے شمار
شکر پروردگار عالمیاں است کہ ہنوز تاب در تنم و دندان مستحکم
چوں جواناں سی سالہ است و ایں ہمہ فیض صحبت حضرت
مولوی محمد اسمٰعیل است۔"

ترکی نے گگے زئی خاندان میں شیخ سکندر بخش کی بیٹی سے شادی کی تھی یہ خاندان جالندھر کا مشہور خاندان تھا۔ چنانچہ شیخ غلام قادر گرامی اسی خاندان کے فرد اور ترکی کے حقیقی سالے تھے۔ چونکہ گرامی بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے اس لئے ترکی ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور انھیں لکھایا پڑھایا بلکہ رموز شاعری سے بھی واقف کرایا اور اپنے بال بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا۔ ترکی جہاں جہاں رہے گرامی بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے مگر کپور تھلہ کے قیام کے زمانے میں گرامی سے کوئی بے اعتدالی ہو گئی اور ترکی بگڑ گئے، چنانچہ گرامی کی ہجو تک کہہ دی۔ ترکی کا پہلا دیوان موسوم بہ "گلزارِ صدیقی" جو قیام مانگرول کے زمانے میں مکمل اور طبع ہوا ہے ان کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ گرامی کا قصور یہ تھا کہ ابتداً انھوں نے ترکی کی شاگردی سے انکار کیا اور پھر شاید ترکی سے برابری بھی کی یا مقابلہ کیا اور ممکن ہے کہ ترکی کا کچھ کلام بھی جو ترکی نے گرامی کی ابتدائی شاعری کے زمانے میں دیا تھا اپنے نام سے مشہور کیا ہو، بس یہی فردِ جرم گرامی پر عائد ہوئی اور ترکی نے کہنا شروع کیا ؎

زادۂ سگ گویم آں ناپاک مادر زاد را
آنکہ بعد از کسب فن عق عق کند استاد را
ہندی و ترکی بود یکساں بچشم ناشناس
روز و شب ہم رنگ باشد کور مادر زاد را

گر گرامی ز بیاضم دُرِ مضمون برداشت
چیست غم تشنہ لبے قطرہ ز جیحوں برداشت
وارثِ حضرت شیدا است گرامی امروز
از بیاضم ہمہ تا معنیِ موزوں برداشت

ترکی کے غصے کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ والیٔ مانگرول کی مدح میں قصیدہ کہتے کہتے

"ایں شش شعر در شکایت گرامی شاگرد خود نوشتہ کہ
اکثر بعض مضامین و بعض اشعار بغارت بردہ"

کہہ کر ہجو شروع کر دی، مگر یہ غصہ چند ہی روز کے بعد کم ہو گیا اور جب گرامی ۱۳۰۶ھ میں حیدرآباد آ گئے تو ترکی کا دل صاف تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں یہ شعر کہا تھا ؎

اوّل از داغ و گرامی پرسشِ ترکی خبر
چوں نسیم آں کس کہ از باغِ دکن آید بہ دل

اس کے بعد خود ترکی بھی ۱۳۱۳ھ میں حیدرآباد آگئے۔ ترکی نے اپنی آمدِ حیدرآباد کی تاریخ کہیں نہیں لکھی ہے اور نہ کسی اور ذریعہ سے یہ معلوم ہو سکتی ہے البتہ ترکی کی تنخواہ کی اجرائی کی مسل (فائل) میں ان کی ایک درخواست موجود ہے جو بڑی ہی دلچسپ ہے، ملاحظہ کیجیے

یا معطی السائلین

اے سرپرا میرِ ملکِ دکن	تو رہے شاد تیرا دشمن رنج
میرا ہو جائے کچھ مقرر آج	بہرِ بابا فریدِ شکر گنج

بہ مسافرِ دور و دراز غریب الدیار بامید روزگار از عرصۂ یک سال و چار ماہ در دولت پر حاضر ہے۔ تنگ اس قدر ہوں کہ زیست سے تنگ ہوں

نے در روز خورش و نے در شب خواب
آفتاب دولت و اقبال درخشاں باد

عرضی

کمترین ترک علی شاہ ترکی امیدوار
یکم ماہ رجب ۱۳۱۴ھ

یہ بے ڈھنگی عرضی مدار المہام دکن کے ملاحظہ میں پیش کی گئی تھی۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکی ماہ ربیع الاول ۱۳۱۳ھ میں حیدرآباد آئے ہیں، دوسری خصوصیت ان کا بے ڈھنگا پن تو عرضی کے لفظ سے نمایاں ہے۔

ترکی کی کرامت دیکھیے کہ اسی بے ڈھنگی عرضی پہ مدار المہام نے ۱۲۔ رجب ۱۳۱۴ھ کو تجویز فرمائی کہ ایک سو پچاس روپیہ تنخواہ جاری کی جائے۔ چنانچہ اسی تاریخ سے ڈیڑھ سو روپے ترکی کو ملنے لگے۔ ترکی کی یہ عرضی منشرحۂ مدار المہام مثل (فائل)، نشان (۱۲۷) ۱۳۰۶ف میں موجود ہے۔

ترکی کثیر العیال تھے دو لڑکیاں اور کئی لڑکے تھے۔ خاندان کے کچھ اور افراد بھی ساتھ رہتے تھے اس لئے تنخواہ کافی نہ ہوتی تھی۔ ان حالات میں انھوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شادؔ کے دربار میں رسائی پیدا کی اور مہاراجہ بہادر نے اپنا فارسی کلام انھیں دکھانا شروع کیا اور سو روپے ماہوار تنخواہ اپنی اسٹیٹ سے مقرر کر دی۔ عید بقر عید، ہولی، دیوالی پہ سرفرازیاں الگ ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ علامہ طوبیٰ شوستری، نواب صفت آنگی جنگ (نواب ناڑبن)، نواب ضیاء یار جنگ، نواب وزیر الدولہ، نواب سیف الملک رحمٰن علی پاشا طلسمی وکیل، نواب صولت جنگ، سید منتجب الدین تجلیؔ، محمد علی خاں ناظم بھی مالی امداد و اعانت کرتے رہتے تھے۔

والد مرحوم (تجلیؔ) اپنا فارسی کلام طوبیٰ شوستری کو دکھایا کرتے تھے۔ مگر جب ترکی سے دوستی ہو گئی تو انھیں سے مشورہ کرنے لگے۔ اس طرح دونوں میں پُرخلوص مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ ترکی ہمیشہ بلکہ تقریباً روزانہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے۔ میری والدہ اور نانی بھی ترکی کی بڑی معتقد تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ولادت سے پہلے ایک لڑکا تولد ہوا تھا اور ترکی نے اس کی تاریخ ولادت کہہ کر اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔ والدہ نے اس قطعہ تاریخ کو خوش نویس سے لکھوا کر فریم کر کے مکان میں رکھنا چاہا۔ جب یہ قطعہ خوش نویس کو دیا جانے لگا تو ترکی نے منع کیا کہ اس قطعہ کو نہ لکھواؤ۔ اب جو بچہ ہوگا تو میں دوسری تاریخ کہہ کر خوش نویس سے لکھوا کر دوں گا اُسے گھر میں لگانا۔ اس وقت یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی مگر چند مہینوں کے بعد ہی اس لڑکے کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد میری ولادت ہوئی تو ترکی نے یہ قطعۂ تاریخ کہا ؎

بمشکوئے تجلیؔ چوں پسر شد	فلک گفتہ کہ آمد بر زمیں ماہ
سرِ اعدا بریدہ گفت ترکی	تجلیؔ را مبارک باشد ایں ماہ
۱	۱۳۲۰ھ

اور اس قطعہ کو بڑے ہی نفیس زرافشاں کاغذ پہ خوش نویس سے لکھوا کر اطرافِ سنہرے بیل بوٹے بنوا کر ایک عمدہ فریم میں لگا کر دیا کہ اسے گھر میں لگاؤ۔ میری نانی اسے ترکی کی کرامت پہ محمول کرتی تھیں اور ان کی بڑی معتقد تھیں، اس کے علاوہ ایک واقعہ اور ہوا کہ میرے والد ایک دفعہ سخت بیمار ہو گئے۔ اطبّا نے ناامیدی ظاہر کر دی اس وقت ترکی نے ایک پورا کفن منگوا کر نہایت نفیس کھانا پکوایا اور ایک فقیر کو یہ کھانا پیٹ بھر کھلا کر کفن اور میت کا پورا سامان دے کر رخصت کر دیا اور

ایک بکرا منگوا کر اس کو ذبح کر کے اتنے ہی ٹکڑے کرائے جتنے سال کی والدہ کی عمر تھی اور ہر ایک ٹکڑے کے ساتھ ایک روپیہ یا پانچ پیسے رکھ کر فقیروں میں تقسیم کراوئے۔ اتفاق سے دوسرے روز سے والدہ کو صحت ہونے لگی اور وہ دس پندرہ روز میں صحت یاب ہو گئیں۔

یہ دونوں کرامتیں ترکی کی قلندری پر دال تھیں والدہ تو صرف ان کا احترام کرتی تھیں مگر نانی تو بس انھیں زندہ ولی سمجھتی تھیں۔ جب کبھی گھر میں فاتحہ نذر نیاز ہوتی سب سے پہلے ترکی کے گھر حصہ جاتا اور جو میٹھا گھر میں تیار ہوتا ترکی کے گھر بھجوایا جاتا کیونکہ میٹھا ترکی کو بہت پسند تھا۔ جب بھی ترکی غریب خانہ پر آتے کڑک کر صدا لگاتے "دودھ ملیدہ اللہ ہی دے گا" ترکی ابھی دیوان خانہ میں بیٹھنے بھی نہ پاتے کہ ان کے لئے کوئی نہ کوئی میٹھا اندر سے آ جاتا اور اگر کوئی میٹھا موجود نہ ہوتو بالائی اور چائے تو ضرور آ جاتی اور وہ پیالی بھر بالائی میں تھوڑی سی چائے اور بہت سی شکر ڈال کر ایک لب بند لب ریز پیالی بنا لیتے جس کا نام انھوں نے "لب دہڑ" رکھا تھا۔

ترکی کو اپنے قلندرپن پر ناز تھا اور حقیقت میں وہ تھے قلندر، سب کے دوست اور سب پر مہربان۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتے اور کسی کی رُور عایت نہ کرتے تھے۔ داد دینے میں بخیل اور اعتراض کرنے میں سخی واقع ہوئے تھے صرف ان میں خرابی یہ تھی کہ وضعداری مطلق نہ تھی کسی کی رُو رعایت مطلق نہ کرتے اور نہ لگی لپٹی رکھتے۔ طبیعت میں اکھڑ پن اور جلد بازی بہت تھی صلاحیت اور بردباری مطلق نہ تھی۔ جلدی ہر بات میں تھی۔ خفا جلد ہو جاتے پھر جلد ہی خوش بھی ہو جاتے، شعر بھی جلد کہتے، اصلاح بھی جلد دیتے، کھانے پینے چلنے پھرنے میں بھی جلدی کرتے۔

سفید پنجابی شلوار اور سفید کرتا (ایس، اوکا) گھٹنوں سے نیچے تک لمبا پہنتے تھے اس پر صدری (واسکٹ) ہوتی جو رنگین اور عموماً سُرخ رنگ کی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شیروانی اور لمبا کوٹ بھی پہن لیتے تھے۔ سر پر اکثر پٹو باندھتے یا کبھی ترکی ٹوپی پہنتے۔ شملہ (صافہ) بہت کم باندھتے تھے۔ صدری کے جیب میں ایک بڑی سی جیبی گھڑی (ریلوے راسکوپ) رہتی تھی جس کی ٹِک ٹِک دُور تک سنائی دیتی تھی اس کا چاندی کا موٹا سا توڑا (زنجیر) لٹکتا رہتا تھا۔ ماشاء اللہ پورے قد کے آدمی تھے۔ ہڈی چوڑی، ہاڑ مضبوط، غذا بھی خوب تھی، خوش خوراک اور پُر خور بھی تھے۔ آخر میں افیون بھی کھانے لگے تھے اور بمبو کا شوق بھی فرماتے تھے۔

مشاعروں میں پڑھنے کا انداز بھی نہایت اچھا تھا، نیم ترنم سے پڑھتے تھے۔ آواز بڑی گرج دار تھی۔ لہجہ نہایت مردانہ اور سپاہیانہ تھا۔ فارسی بالکل ایرانی لہجے میں بولتے تھے۔ غزل اس دھوم سے پڑھتے کہ محفلِ مشاعرہ چمک اٹھتی۔ کبھی دُہرے ہو جاتے۔ کبھی صف سے آگے نکل جاتے کبھی ہاتھ چلا کر سنخ گرا دیتے کبھی کھڑے ہو جاتے، غرض ان کی غزل خوانی ایک تماشا ہوتی تھی۔

ایک روز مشاعرے میں ایک رباعی سنائی ؎

دیکھو برتہ کو جو غالب کو نہیں دیکھا ہے

ذوق کی گر ہے تمنا تو رسا کو دیکھو

نادر علی برتہ شاگرد ظہیر دہلوی اور غلام مصطفیٰ رسا شاگرد داغ کی طرف اشارے کئے، پھر مصرع سُنایا

اور ناسخ کی جو صورت کی ہے خواہش دل میں

مصرع پڑھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے آگے بڑھ کر بیچوں بیچ پہنچے اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل ٹھہر کر سیدھا پاؤں اٹھا دیا اور ایک گول چکر لگایا اور اس طرح کہ کرتے کا دامن پیشواز کی طرح پھیل گیا پھر مصرع سنایا

ترکیٔ مست کے انداز و ادا کو دیکھو

سارا مشاعرہ دنگ رہ گیا اور آپ اپنی مستی کا اظہار فرماتے رہے۔ ایسی حرکتیں مشاعروں میں ہمیشہ کرتے تھے۔

ہزل سے بھی طبیعت کو خاصی مناسبت تھی۔ گالیاں وہ چُنی ہوئی دیتے کہ الامان۔ ہزل خوب کہتے تھے۔ ہر جمعرات کی رات ایک مخصوص مجمع ہزل کہنے والوں کا آپ کے گھر پر ہوتا۔ والد مرحوم اس جمعرات پارٹی کے بہت خلاف تھے۔ وہ کبھی نہ جاتے تھے اور نہ کوئی سنجیدہ ملنے والا ہی شریک ہوتا۔ مجھے بھی والد ہمیشہ منع کرتے رہتے کہ جمعرات کی شام کو ترکی کے گھر نہ جانا۔ مگر ایک روز اتفاق سے میں

جا پہنچا ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ دس بارہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں اور غزل خوانی ہو رہی ہے ۔ اس وقت ترکی اپنی غزل سنا رہے تھے ۔ کوئی شعر اس قابل نہ تھا جو نقل کیا جا سکے ۔

ہجو گوئی میں بھی کمال تھا ۔ ہجو خوب اور بہت کہتے تھے ۔ جہاں کسی پر خفا ہوتے ہجو کہنے لگتے ۔ اعتراض کرنا ان کی فطرت تھی ۔ اپنا پرایا دوست دشمن سب پر اعتراض کرتے ۔ بعض دفعہ خود اعتراض کرتے اور خود ہی جواب دیتے ورنہ لتاڑ ڈالتے ۔ مشاعروں میں تو لوگوں کا ناک میں دم کر دیتے ۔ خود اعتراض کرتے ، دوسروں سے اعتراض کراتے ۔ خود بحث کرنے لگتے ۔ لطف خاص یہ کہ آج جو اعتراض آپ کرتے کل وہی اعتراض کوئی اور کرتا تو آپ معترض کے خلاف بحث کرنے لگتے اور اعتراض کو غلط ثابت کر دیتے ۔ سند کے لاکھوں شعر یاد تھے ۔ ایک ایک بات کے لئے سو سو شعر سند میں سنا دیتے ۔ اور اگر کسی استاد کا شعر یاد نہ آتا یا نہ ملتا تو خود کہہ کر فی البدیہہ سناتے اور کسی نہ کسی استاد کا نام لے دیتے ۔ کس میں اتنی ہمت تھی جو اُن کی ہٹ دھرمی کا مقابلہ کرتا ۔ آخر میدان انہیں کے ہاتھ رہتا ۔

ان کے اپنے شاگردوں کے مشاعرے میں داد دی جاتی تو خود تن کر بیٹھ جاتے اور قریب بیٹھے والوں سے کہتے "کیوں کیسی غزل بنا دی ہے میں نے ، سارا مشاعرہ داد دے رہا ہے ۔ اگر بدنصیبی سے کوئی شخص ان سے غزل کہلوا کر مشاعرے میں سناتا اور داد ملتی تو لوگوں سے کہہ دیتے کہ میں نے غزل کہہ دی ہے ورنہ یہ کیا کہہ سکتا ۔

غرض عجیب و غریب بزرگ تھے ۔ اس وقت میرے سامنے ان کا کوئی دیوان بھی نہیں ہے ۔ چند شعر تذکرۂ سخنوران چشم دیدہ سے لے کر اور مجھے جو یاد ہیں ان میں سے چند تبرکاً نقل کرتا ہوں ؎

دل را بہ نیم نرگسِ مستانہ شکستم
ایں شیشۂ گلرنگ بہ پیمانہ شکستم

دل را خدنگ غمزۂ آفت پسند برد — گرگ از میانِ گلۂ من گوسپند برد
گر بلوئے تو شبے دو دو فغانم گزرد — بگزرد بر دل تو آنچہ بجانم گزرد
نورِ قمر نہ عکس چراغم گرفتہ اند — آتش برائے طور ز داغم گرفتہ اند

گر نیاید یار امشب جامِ مل خواہم شکست
گردنِ مینا برنگِ شاخ گل خواہم شکست
اعتبارِ توبہ ام ہرگز مکن اے پارسا
در خزاں گر نشکنم در فصلِ گل خواہم شکست

بہ بزمم نقدِ دل از دیدہ جاناں می رود بیروں
بہ انداز یکہ گلچیں از گلستاں می رود بیروں

نخواہم بر ہمیٔ بزمِ عیش دوستاں دیدن
بآں چشمے کہ دیدم فصلِ گل نتواں خزاں دیدن

بہ شکلیں طرہ اش تابِ رُخ پُر نور می جویم
کلیمم در شبِ تار آتشے از طور می جویم

صد پارہ دل بہ محفلِ جانانہ بردہ ایم — پیمانۂ شکستہ بہ مے خانہ بردہ ایم
رُخ تو می نگرد آنکہ بے نقاب منم — کسیکہ چشم نپوشد ز آفتاب منم

بیاموز از طریقِ سایہ آئین ادب ترکی
کہ بنشیند چو بنشینی و برخیزد چو برخیزی

مفگن نگہ مست بہ دلہائے شکستہ — ریزد نہ کسے بادہ بہ مینائے شکستہ
از دل خیزد صدا در کوفتن — می خورد بے مغز بر سر چوب ہا
در سرائے مانہ ہر راہے کہ میخواہی بیا — کلبۂ مار انشانے از در و دیوار نیست
لکنت اندر دہن یار تماشا دارد — در صدف ایں درِ شہوار تماشا دارد

ترکی فارسی کے استاد اور زبان فارسی کے بڑے ماہر تھے مگر انہیں اردو شاعری کا جنون بھی تھا اور خواہ مخواہ اردو پر بھی کرم فرماتے تھے چنانچہ "سرمایۂ حیات" کے نام سے تین سو صفحات کا ایک دیوان ۱۳۳۲ھ میں شائع کر چکے تھے ۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ فارسی کا ایک استاد اُردو کے پست اشعار پر ناز بھی کرتا تھا ۔ بہرحال یہ معجون مرکب اور متضاد قابلیتوں کا مظہر جس کے ہزاروں کارنامے سینکڑوں لطیفے ، بیسیوں قصے سامنے آجاتے ہیں ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۸ ۔ مارچ ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد میں اللہ کو پیارا ہو گیا ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

رُوس کے صدر مارشل وروشلوف
کی دہلی میں تشریف آوری

صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد
صدر وروشلوف کا خیر مقدم کر رہے ہیں

صدر وروشلوف کا جلوس نئی دہلی کے بازار سے گزر رہا ہے

نوجوانوں کے چھٹے سالانہ میلے میں علاقائی رقص کے مظاہرے

پنجاب کا بھنگڑا ناچ

آندھرا کا ماتھری رقص

گجرات کا پھول گربا ناچ

کیرالہ یونیورسٹی کے طلباء کا رقص

کیرالہ کی شری کماری
بھرت ناٹیم کے انداز میں

راجستھان کا آدی واسی شکاری ناچ

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد کے ہاتھوں درگاپور
میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح

نیپالی پارلیمنٹ کے ممبر
وزیر اعظم پنڈت نہرو کے ساتھ

یار جامی

اختر شیرانی کی چند مشہور نظمیں

دورِ جدید کی شاعری میں جن شاعروں کا نام فہرستِ اوّل میں آتا ہے ان میں راجستھان کی سابقہ ریاست ٹونک کے شاعر اختر شیرانی کا نمایاں مقام ہے۔

اختر شیرانی کو ادبیت ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والدِ ماجد حافظ محمود خاں شیرانی اردو کے بہت بڑے عالم اور محقّق تھے اور لاہور کے اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے۔

اختر نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد کے قدم بہ قدم لاہور کی علمی اور ادبی فضا میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحے گذارے اور یہیں سے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی اور لاہور ہی سے 'خیالستان' 'بہارستان' اور 'رومان' جیسے ادبی پرچے نکالے۔ ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے تھے۔ ادبی خدمات کے جذبے کے تحت ۱۹۳۷ء میں انھوں نے اردو کی مشہور 'جامع اللغات' کی ادارت کی۔ لیکن اس ہونہار شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور ۴۳ سال کی عمر میں (۱۹۴۸ء میں) ان کا انتقال ہو گیا اور اردو زبان ایک مخلص خدمت گذار سے محروم ہو گئی۔

اختر شیرانی کو ان کی زندگی ہی میں ان کی خدمت کا کماحقہ صلہ مل گیا اور وہ بہت جلد عوام میں شہرت پا گئے، کیونکہ اختر شیرانی فطرتاً رومانی شاعر تھے اور عوام کی اکثریت شاعری کے اہم موضوع رومان ہی کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ رومان سے ہٹ کر بھی انھوں نے کئی نظمیں مختلف موضوعات پر لکھیں اور کئی ایک نیچرل نظمیں بھی کہیں۔ ان کی کئی نظمیں مختلف جامعات کے اردو کورس میں شامل ہیں۔

جیسا کہ آلِ احمد سرور نے جدید شاعری کے بارے میں کہا ہے کہ جدید اردو شاعری میں اردو کی قدیم روایات کے احساس کے ساتھ فکر و فن کے نئے رنگ و آہنگ کی بھی جلوہ گری ہے حقیقتاً اور یقیناً یہ ساری باتیں اختر شیرانی کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

اختر دراصل نظم گو شاعر تھے۔ گو انھوں نے کئی غزلیں بھی کہی ہیں لیکن فطری میلان نظم کی طرف تھا اور اسی لئے غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں کو شہرت حاصل ہوئی۔ اور ان میں بھی چند نظمیں تو اتنی مشہور ہوئیں کہ زبان زدِ عوام ہو گئیں اور لوگ ان نظموں کو اس طرح گنگنانے لگے جیسے بعض دلکش غزلیں گنگنائی جاتی ہیں۔

اختر نے اپنی نظموں میں اکثر جگہ دو ناموں کا تذکرہ بڑی شد و مد سے اور بہت ہی والہانہ انداز میں کیا ہے۔ ایک 'سلمیٰ' ہے جس کو اختر کی شاعری کی ہیروئن کہنا چاہیئے اور دوسرے 'ریحانہ' جو سلمیٰ کے بعد متاثر کرنے والا کردار ہے۔

بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ سلمیٰ کوئی وجودی شخصیت نہیں ہے بلکہ اختر کا ایک خیالی پیکر ہے جس کی ایک قیاسی کردار سے زیادہ اہمیت نہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک سلمیٰ ایک حقیقی روپ، ایک متاثر کن وجود ہے جس سے اختر اتنا متاثر ہوئے اور اتنے والہانہ انداز میں اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ کیا کہ پڑھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کا والہانہ پن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سلمیٰ کا وجود تھا اور یہ بھی تھا اور ریحانہ کے بارے میں بھی کچھ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا جاتا

ہے اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اختر نے سلمیٰ ہی کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔

چنانچہ اختر اس نظم میں جو سلمیٰ سے معنون ہے یوں رطب اللسان ہیں:

بہارِ حسن کا تو غنچۂ شاداب ہے سلمیٰ
تجھے فطرت نے اپنے دستِ رنگیں سے سنوارا ہے
بہشتِ رنگ و بو کا تو سراپا اک نظارا ہے
تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ
ترا جسم اک ہجومِ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

اس بند میں صورت کو چاند سے تشبیہ کوئی نئی نہیں ہے لیکن جسم کے تعلق سے ہجومِ ریشم و کمخواب کی تشبیہ محبوب کی تعریفی تشبیہات میں ایک نیا اضافہ ہے۔

پھر آگے کہتے ہیں ؎

شبستانِ جوانی کا تو اک زندہ ستارا ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسنِ فطرت کا کنارا ہے
تو اس سنسار میں اک آسمانی خواب ہے سلمیٰ

اس بند میں اختر نے سلمیٰ کو اپنی جوانی کے شبستان کا ایک جیتا جاگتا اور جگمگاتا ستارہ کہا ہے گویا جس سے ان کی تاریک زندگی میں روشنی ہوتی ہے اور سلمیٰ کو حسن کے سمندر کے کنارے سے تشبیہ دی ہے یعنی اس کے بعد حسن کی تلاش بے کار ہے کیونکہ سلمیٰ ہی حسن کی آخری حد ہے۔

اور آگے کہا ہے ؎

جہانِ قدس کا تو ایک نورانی فسانہ ہے
تجھے سلمیٰ دیارِ ناز کی اک ساحرہ کہیئے
صنم آبادِ عفت کی مقدس کافرہ کہیئے
ربابِ حسن کا تو ایک الہامی ترانہ ہے

سلمیٰ گویا جہانِ قدس کا ایک نور بھرا افسانہ ہے (جس کے پڑھنے سے عرفان حاصل ہوتا ہے) اور شہرِ ناز و ادا و عشوہ کے مکینوں میں سے ہے جو اپنے حسن کے سحر سے دوسروں میں امتیاز رکھتی ہے اور ایک ایسی ہستی ہے جو کافر ہونے کے باوجود اہلِ ایمان سے اپنی عفت کا فسانہ کی پرستش کروانے پر قادر ہے۔

آخری بند میں کہتے ہیں ؎

پرستانِ لطافت کی تو اک رنگیں کہانی ہے
جواں فطرت کا تو اک گمشدہ خوابِ جوانی ہے

الغرض سلمیٰ کی تعریف میں اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ کچھ اور کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

دوسری مشہور نظم ریحانہ کے تعلق سے ہے۔ اختر نے اس نظم میں ایک وادی کا تذکرہ کیا ہے جو ریحانہ کے وجود سے آباد تھی۔ کہتے ہیں ؎

یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی
وہ اس وادی کی شہزادی تھی اور شاہانہ رہتی تھی
کنول کا پھول تھی سنسار سے بیگانہ رہتی تھی
نظر سے دور مثلِ نکہتِ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

ایک جگہ اختر نے ریحانہ اور اس کی وادی کی محبت کی یاد میں قسم کھا کر کہا ہے ؎

بربِّ کعبہ اس کی یاد میں عمریں گنوا دوں گا
میں اس وادی کے ذرے ذرے پر سجدے بچھا دوں گا
جہاں وہ جانِ کعبہ عظمتِ بت خانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اس بند میں اختر نے ریحانہ کو 'جانِ کعبہ' اور 'عظمتِ بت خانہ' لکھ کر دیر و حرم کو خوب یکجا کیا ہے۔

اگلے بند میں کیفیاتِ عشق و جذباتِ محبت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اوصافِ والہانہ کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

وہ اس ٹیلے پہ اکثر عاشقانہ گیت گاتی تھی
پرانے سورماؤں کے فسانے گنگناتی تھی
یہیں پر منتظر میری وہ بے تابانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

ریحانہ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

یہیں بستی تھی اے ہمدم مرے ارمان کی بستی
مرے افسانوں کی دنیا مرے وجدان کی بستی
یہیں ریحانہ بستی تھی یہیں ریحانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اختر نے ریحانہ کو اپنے افسانۂ حیات کی دنیا اور رومان و محبت کی بستی کے 'اجتماعی' ناموں سے یاد کیا ہے اور اس کے وجود سے اپنے وجدان کا اکمال ظاہر کیا ہے۔

نظم کے آخری بند میں ریحانہ کی توصیف یوں کی ہے ؎

گدازِ عشق سے لبریز تھا قلبِ حزیں اس کا
مگر آئینہ دارِ شرم تھا روئے حسیں اس کا
خموشی میں چھپائے نغمۂ مستانہ رہتی تھی
یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

اور آخر میں ایک شعر پر نظم اس طرح ختم کی ہے ؎

پیامِ دردِ دل اختر دیئے جاتا ہوں وادی کو
سلامِ رخصتِ غمگیں کیے جاتا ہوں وادی کو

اختر کی ایک اور طویل رومانی نظم 'بستی کی لڑکیوں میں' بہت مشہور ہے جس کو انھوں نے ایک دیہاتی گیت کے نام سے موسوم کیا ہے اس میں بھی سلمیٰ کا ذکر اسی والہانہ انداز میں کیا ہے اور خاص طور سے اپنی رسوائی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی رسوائی ہو رہی ہے محض سلمیٰ سے دل لگانے کی بنا پر، اور وہ بھی بستی کی حسین و شوخ لڑکیوں میں۔ یہی ساری تفصیل اس نظم میں بیان کی ہے اور بہت ہی دلکش انداز میں بیان کی ہے۔

نظم کا پہلا بند ہے ؎

فریادیٔ جفائے ایام ہو رہا ہوں
پامالِ جورِ بختِ ناکام ہو رہا ہوں
سرگشتۂ خیالِ انجام ہو رہا ہوں
بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

بدنام ہو رہا ہوں
سلمیٰ سے دل لگا کر

اپنے بارے میں بستی کی لڑکیوں کی چہ میگوئیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

کہتی ہیں سب "یہ کس کی ترسا گئی ہے صورت
سلمیٰ کی شاید اس کے من بھا گئی ہے صورت
اور اس کے غم میں اتنی مرجھا گئی ہے صورت
مرجھا گئی ہے صورت کمھلا گئی ہے صورت
سنولا گئی ہے صورت
سلمیٰ سے دل لگا کر"

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

نیچے کے بند میں اختر شیرانی کی منظر نگاری بہت خوب ہے۔ دیہاتی لڑکیوں کی شوخیوں اور چنچل پن اور ان کی چھیڑ چھاڑ کو (اپنے اور سلمیٰ کے تعلق سے) یوں پیش کیا ہے ؎

پنگھٹ پہ جبکہ ساری ہوتی ہیں جمع آکر
گاگر کو اپنی رکھ کر گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر
یہ قصہ چھیڑتی ہیں مجھ کو بنا بنا کر
"سلمیٰ سے باتیں کرتے دیکھا ہے اس کو جا کر
ہم نے نظر بچا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

سلمیٰ سے ان کے عشق کا چرچا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ جب لڑکیاں راتوں کو کام کاج سے فرصت پا کر کھیل کود اور رقص و نغمہ کا پروگرام بناتی ہیں تو موضوعِ سخن سلمیٰ اور "شہری نوجوان" ہی ہوتا ہے چناں چہ اس کے متعلق کہتے ہیں ؎

راتوں کو گیت گانے جب مل کر آتی ہیں سب
تالاب کے کنارے دھومیں مچاتی ہیں سب
جنگل کی چاندنی میں منگل مناتی ہیں سب
تو میرے اور سلمیٰ کے گیت گاتی ہیں سب
اور ہنستی جاتی ہیں سب
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!

اور پھر بستی کی لڑکیوں کی سلمیٰ سے چھیڑ چھاڑ کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

کھیتوں سے لوٹتی ہیں جب دن چھپے مکاں کو
تب دہراتے ہیں باہم وہ میری داستاں کو
دہرا کے چھیڑتی ہیں سلمیٰ کو میری جاں کو
اور وہ حیا کی ماری سی لیتی ہے زباں کو

کیا چھیڑتے اس بیاں کو
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں!

اس کے بعد جذبۂ ترحم جو ان کے تعلق سے گاؤں کی لڑکیوں کے دلوں میں پیدا ہوا اس کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

کہتی ہے رحم کھا کر یوں ایک ماہ طلعت
"یہ شہری نوجواں تھا کس درجہ خوبصورت
آنکھوں میں بس رہی ہے اب بھی وہ پہلی رنگت
دو دن میں آہ کیا سے کیا ہو گئی ہے حالت

اللہ تیری قدرت!"
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

اور اس پر ہی بس نہیں کرتیں۔ ان لڑکیوں میں سے ایک چنچل لڑکی آ کر یہ کہتی ہے ؎

اک شوخ چھیڑتی ہے اس طرح پاس آ کر
"دیکھو وہ جا رہی ہے سلمیٰ نظر بچا کر
شرما کے مسکرا کر آنچل سے منہ چھپا کر
جاؤ نا پیچھے پیچھے دو باتیں کر لو جا کر

کھیتوں میں چھپ چھپا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

نظم کا آخری بند اسی چھیڑ چھاڑ کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اس کے اختتام کا انداز بہت خوب ہے ؎

اک شوخ تازہ وارد سسرال سے گھر آ کر
سکھیوں سے پوچھتی ہے جس دم مجھے بتا کر
"یہ کون ہے؟" تو ظالم کہتی ہیں مسکرا کر
"تم اس کا حال پوچھو سلمیٰ کے دل سے جا کر

یہ گیت اسے سنا کر"
سلمیٰ سے دل لگا کر

بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں

ان تینوں نظموں کا ذکر میں نے تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ ان کا اختر شیرانی کی ذات سے بہت زیادہ تعلق ہے۔

ان کی ایک نظم 'آج کی رات' ہے جو رومانی ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔ اس میں انھوں نے وصال کی رات کے سارے جذبوں کو اسی بے ساختگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور پہلے بند میں اس رات کی منظر نگاری کرنے کے بعد ایک جگہ یوں گویا ہیں ؎

غائبانہ جو ہمیں نامے لکھا کرتی تھی
دور سے ہم پہ دل اپنا جو فدا کرتی تھی
داد اشعار جو 'گمنام' دیا کرتی تھی
ہو کے بے پردہ جو پردے میں رہا کرتی تھی

سامنے ہوگی وہی شوخ ادا آج کی رات

اور آگے جذبات سے بھرپور ایک بند میں کہتے ہیں ؎

داستانِ دلِ بیتاب سنائیں گے انھیں
آپ ڈھائیں گے گلے مل کے رلائیں گے انھیں
خود ہی پھر رونے پہ ہنس دیں گے ہنسائیں گے انھیں
اور جرأت کی تو سینے سے لگائیں گے انھیں

ننھے ننھے جذبوں کی ہے نشو و نما آج کی رات

لیکن آخری بند میں غالب کی طرح اس اندیشہ کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ آج کی رات تو ان سے بہت کچھ کہنے سننے کے بارے میں سوچ رکھا ہے۔ لیکن جب سامنا ہوگا یہ سب کچھ ہو بھی سکے گا کہ نہیں چنانچہ اسی اندیشے کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہم میں کچھ جرأتِ گویائی بھی ہوگی کہ نہیں
ہمتِ ناصیہ فرسائی بھی ہوگی کہ نہیں
شرم سے دور شکیبائی بھی ہوگی کہ نہیں
یوسفِ دل سے 'زلیخائی' بھی ہوگی کہ نہیں

آج کی رات اُف اے مرے خدا آج کی رات!

ایک نظم 'اعترافِ محبت' میں اپنی محبت کے اظہار کی جرأت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلسل غم سے تنگ آ کر اپنی محبت کی حقیقت کا افشاء آج مجبور ہو کر رہا ہوں۔ پہلے بند میں اظہارِ محبت یوں کرتے ہیں ؎

لو آؤ کہ رازِ پنہاں کو رسوائے حکایت کرتا ہوں
دامانِ زبانِ خاموشی کو لبریز شکایت کرتا ہوں
گھبرا کے ہجومِ غم سے آج افشائے حقیقت کرتا ہوں
اظہار کی جرأت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اور اب تک کی خاموشی اور مصلحتِ پوشیدگی کو یوں فاش کرتے ہیں ؎

مدت سے محبت کرتا تھا، سو جان سے تم پر مرتا تھا
راتوں کو میں روتا رہتا تھا، راتوں کو میں آہیں بھرتا تھا
ہاں راتوں کو آہیں بھرتا تھا پر تم سے کہتے ڈرتا تھا
آج اس کی جسارت کرتا ہوں
میں تم سے محبت کرتا ہوں

اس نظم کے دوسرے بندوں میں بھی یہی باتیں کہی گئی ہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اتنی کہ اگر تم کہو تو چاند ستارے بھی توڑ کر تمھارے قدموں میں بچھا دوں۔ گو کہ مجھ میں اتنی 'طاقت' نہیں ہے لیکن تم چاہو تو میں اس کی بھی 'ہمت' کر سکتا ہوں۔ بہرحال اپنی محبت کی سچائی کا ہر طرح یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظم 'اے عشق کہیں لے چل' میں انھوں نے عشق سے خطاب کیا ہے اور دنیا سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دنیا پاپ کی بستی ہے اور ہمارا مقدس پیار یہاں پنپ نہیں سکتا اس لئے کسی ایسی جگہ لے چل جہاں پر نفس پرست، کینہ توز اور لعنت گاہ کے باسی نہ بستے ہوں۔ اس لئے اس دنیا میں لے چل جو ؎

آنکھوں میں سمائی ہے اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن، مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا
للّٰہ وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اور پھر آگے کہتے ہیں کہ ایسی جگہ لے چل جہاں ؎

قدرت ہو حمایت پر ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمیٰ بھی ہو پہلو میں سلمیٰ کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی
اے طفلِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے بھی دنیا سے فرار چاہا تھا اور اپنی نظم 'ایک آرزو' میں اس فرار کی بات کہی تھی، ڈاکٹر اقبال ایک فلسفی شاعر تھے اور اختر ایک رومانی شاعر، دونوں کے خیالات اور کہنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ میں نے یہ بات محض اس لئے کہی ہے کہ اختر کی یہ نظم پڑھتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کی نظم 'ایک آرزو' کی طرف بھی دھیان جاتا ہے۔ اختر شیرانی کی یہ نظم بھی کافی مقبول ہوئی اور حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ کے اردو کورس میں شامل رہ چکی ہے۔

اختر کی ایک نیچرل نظم "وادیٔ گنگا میں ایک رات" ہے۔ یہ نیچرل نظموں میں بہت اچھی نظم شمار کی جاتی ہے۔ یہ نظم حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے اردو کورس میں شامل رہ چکی ہے۔

نظم کا پہلا بند ہے ؎

کرتے ہیں مسافر کو محبت سے اشارے
اے وادیٔ گنگا ترے شاداب نظارے
یہ بکھرے ہوئے پھول یہ نکھرے ہوئے تارے
خوشبو سے مہکتے ہوئے دریا کے کنارے

اور اس وادی کے مناظر کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

یہ تارے ہیں یا نور کے میخانے ہیں آباد
معصوم و حسیں حوروں کے کاشانے ہیں آباد
مستانہ ہواؤں پہ پری خانے ہیں آباد
یا دامنِ افلاک میں بے تاب شرارے

اور پھر اسی انداز سے کہا ہے ؎

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے
الماس کی مورت ہے کہ مسند میں دھری ہے
مرمر کی صراحی ہے کہ سیمیں سے بھری ہے
اور تیرگی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

اور آخری بند میں کہا ہے ؎

صحرا ہیں کہ خوابیدہ نظاروں کے شبستاں
دامن میں لئے چاند ستاروں کے شبستاں
فردوس کی پُر کیف بہاروں کے شبستاں
شاعر کو تمنّا ہے یہیں رات گذارے

نیچرل نظموں کے سلسلے میں ایک اور نظم " دنیا کی بہاریں" کے عنوان سے ہے اس میں اختر نے نیچر کی خوبصورتی اور دلکشی سے متاثر ہو کر کہا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے حسین نظارے، فضاؤں کی رنگینی، چاند سورج کے جلوے، ستاروں کی تابندگی، لالہ زاروں کی نزہت، کہساروں کی رفعت، ہواؤں میں بھینی بھینی خوشبو، دریاؤں کی روانی اور آبشاروں کی تیزی، ہجومِ گُل و سبزہ اور اس کی لطافت اور طائرانِ چمن و صحرا کے رقص آفریدہ موسیقی ریز ترانے۔ اور قدرت کی بے مثال تخلیق عین، وجہ تخمیر کائنات یعنی انسان کے مشاغلِ رندانہ، نشاط و طرب، محفلِ شعر و شراب و ساقی اور آرائش مکان و زیبائشِ مکیں، رعنائی حبیب، صحبتِ نازنیں اور ان کفر مآب صحبتوں کے ہمراہ یہ جوانی، یہ بہاریں یہ جام و سبو، یہ رقص و نغمہ اس قدر دل فریب واقع ہوئے ہیں کہ جنت کی آرزو نہیں۔

نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دُنیا ہے تو جنّت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو

اختر نے ایک نظم ایک 'شاعرہ' کی شادی سے متاثر ہو کر کہی ہے جس کا عنوان ہے ' ایک شاعرہ کی شادی پر' ان کے متاثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ موصوفہ نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ دنیا میں محض شاعرانہ زندگی گذارنے آئی ہیں اور انھیں شادی کے مخمصوں سے نفرت ہے لیکن جب کفر ٹوٹا تو انجام شادی ہی ٹھہرا۔ اختر نے اسی بات کو پیشِ نظر رکھ کر شاعرہ موصوفہ سے خطاب کیا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کے ساتھ اس کے حسنِ تحریر اور مختلف اوصاف کو گِن کر آخر میں بس یہی شعر کہنے پر اکتفاء کی ہے ؎

سوگوار اپنی جواں موت کا ہونے دے مجھے
مسکرا تو، مگر اس حال پہ رونے دے مجھے

یعنی شاعرۂ موصوفہ کی شکست اختر کے نزدیک اس کی جواں موت سے کم نہ تھی۔

اختر شیرانی کے یہاں کلاسیکی ماحول بھی ملتا ہے۔ انھوں نے ہندوستانِ قدیم کی موسیقی سے بھری ہوئی ایک رات کا تخیل بھی ایک نظم 'جوگن' میں باندھا ہے۔ نظم قصیدے کی ترکیب میں کل دس بندوں پر مشتمل ہے۔

نظم چونکہ کافی طویل ہے اس لئے یہاں مختلف بندوں سے چند ضروری شعر درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے
موسیقیٔ حزیں کے دریا بہا رہی ہے
سوئی ہوئی فضا کاش نہ ہلا رہی ہے
ہر جنبشِ زباں سے مُردے جلا رہی ہے

دوسرے بند میں کہتے ہیں ؎

اٹھکھیلیوں کا سن ہے ہنس بولنے کے دن ہیں
لیکن نہ جانے کیوں وہ آنسو بہا رہی ہے
آئینہ رنگ سینہ کچھ کھل رہا ہے جس میں
دوشیزگی کی گنگا طوفاں اُٹھا رہی ہے
ہے اک ستار اس کی آغوشِ نازنیں میں
وہ نازک انگلیوں سے جس کو بجا رہی ہے

پانچویں بند میں ؎

جنگل کے جانور کچھ بیٹھے ہیں اس کے آگے
رو رو کے جن کو اپنی بپتا سُنا رہی ہے
خونخوار شیر بھی ہیں، وحشی غزال بھی ہیں
لیکن وہ سب کے دل پر سکّہ جما رہی ہے

چھٹے بند میں ؎

یہ موہنی بنی ہے کس کی لگن میں جوگن
یہ سیلِ درد کس کے غم میں بہا رہی ہے
ہاں شاید اس کی ننھی معصوم آتمائیں
ہر کی پریم[1] اگنی لو سے لگا رہی ہے

[1] پریم بہ وزن نیم ہونا چاہیئے ع-م

یا ہری کی جستجو میں ہیتم کی آرزو میں
کاشی سے آرہی ہے متھرا کو جا رہی ہے
یا جگ کی آفتوں سے تنگ آکے بن میں جاکر
پرماتما کو اپنا دُکھڑا سنا رہی ہے

نویں بند میں ؎

اب نغمے سو چکے ہیں باجا بھی تھک چلا ہے
محشر اُٹھا چکی ہے، فتنے جگا رہی ہے
لو وہ ستار کو بھی نیند آگئی بغل میں
لو وہ ستار اُٹھا کر جنگل سے جا رہی ہے

اور آخری بند میں خود پر بیتی ہوئی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

میں تو مگر کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں
جیسے وہ ظالم اب تک ویسے ہی گا رہی ہے
اب تک میں سر جھکائے حیرت زدہ کھڑا ہوں
اب تک وہی تجلّی آنکھوں پہ چھا رہی ہے
دیکھو وہ کوئی جوگن جنگل میں گا رہی ہے

آخر میں ایک اور مشہور رومانی نظم کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جس کو اختر نے "ایک دیہاتی لڑکی کا گیت" سے معنون کیا ہے۔ اس نظم کی وجہ تخلیق یہ بتلائی جاتی ہے کہ اختر کسی سلسلے میں راجپوتانہ کے ایک گاؤں میں جو 'بجاپنی' کے نام سے موسوم ہے قیام پذیر تھے، وہاں کسی حادثہ میں ان کا ہاتھ زخمی ہو گیا (غالباً بایاں ہاتھ) اس لئے وہ اس رات بالکل سو نہ سکے۔ اور جب صبح ہوئی تو یہ نظم تخلیق ہو چکی تھی۔

اس نظم میں اختر نے گاؤں کی زندگی اور گاؤں کی ایک بیاہتا لڑکی کے جذبات و کیفیات کا ذکر نہایت ہی دل کش انداز میں کیا ہے۔

یہ نظم بھی کافی طویل ہے۔ اس لئے اس کے بھی چیدہ چیدہ ضروری اور مثالی شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

پہلے بند میں کہا ہے ؎

سنو یہ کیسی آواز آ رہی ہے — کوئی گاؤں کی لڑکی گا رہی ہے
سحر کے دھندلے دھندلے منظروں کو — شراب نغمہ سے نہلا رہی ہے
اُٹھی ہے شاید آٹا پیسنے کو — کہ چکّی کی صدا بھی آ رہی ہے

اس نظم کا پس منظر یہ ہے کہ ایک گاؤں کی لڑکی جو اپنے سسرال میں ہے پچھلی شب کو تڑکے ہی آٹا پیسنے کو اُٹھی ہے اور چکّی پر آٹا پیستے ہوئے اپنے میکے کی یاد میں ایک گیت گا رہی ہے مشہور ہے کہ سسرال کتنا ہی تو نگر کیوں نہ ہو میکے کی یاد آ ہی جاتی ہے اور پھر گاؤں کی لڑکیوں کا میکہ ان کی اپنی جنّت سے کم نہیں ہوتا کیونکہ سارا بچپن اور شروع جوانی کا حصّہ میکہ کا ہی ہوتا ہے اور اس سے کئی حسین یادیں وابستہ ہوتی ہیں۔

اسی بات کو اختر آگے توضیحی انداز میں کہتے ہیں ؎

یہ گھر سسرال ہوگا شاید اس کا — جبھی ماں باپ کی یاد آ رہی ہے
جبھی مصروف ہے آہ و فغاں میں — جبھی غمگین لے میں گا رہی ہے

لڑکی جو گیت چکّی پر گا رہی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ موسم برسات کا آخری زمانہ ہے (اور صبح کا وقت ہے ابھی پو نہیں پھٹی ہے) چنانچہ اختر نے لڑکی کے گیت کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے

ہوا جو گاؤں کو مہکا رہی ہے — مرے میکے سے شاید آ رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے
گھٹا کی اودی اودی چُنریوں سے — مری سکھیوں کی بو باس آ رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے
مجھے لینے نہ آئے اچھے بابل — تمھاری یاد آفت ڈھا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے
مری اماں کو ہو اس کی خبر کیا — کہ چھپا اس جگہ گھبرا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے
نہ لی بھیّا نے بھی سدھ بدھ ہماری — جہاں سے چاہ اُٹھتی جا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے
ہوا کی پینگیا جھل جھل کے بجلی — مرے من کی لگن بھڑکا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے
بھلا کیونکر تھمیں آنسو کہ جی پر — اُداسی کی بدریا چھا رہی ہے
یہ برکھا رُت بھی بیتی جا رہی ہے
گیا پینگیں بڑھانے کا زمانہ — وہ امرئیوں پہ کوئل گا رہی ہے
یہ برکھا رت بھی بیتی جا رہی ہے

اس گیت کے ساتھ اختر نے آگے کہا ہے ؎

سیاہی اُڑتی جاتی ہے اُفق کی — عروسِ صبح بڑھتی آ رہی ہے
کوئی بکری کہیں کرتی ہے مَیں مَیں — کوئی بچھیا کہیں چلّا رہی ہے
مگر ان سب سے بے پرواہ لڑکی — برابر گیت گائے جا رہی ہے

اُسے سُن سُن کے کب تک سر دُھنو گے
بس اختر سونے دو نیند آ رہی ہے

اختر شیرانی نے جتنی بھی نظمیں کہی ہیں اُن سب میں ایک پُرکاری لئے ہوئے سادگی اور بے ساختگی ہوتی ہے ۔ اکثر نظموں میں اختر نے وہی موضوعات چُنے ہیں جو عوامی احساسات کے قریب ہوتے ہیں اور جن سے عوام کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے ۔ اس لئے ان کی شاعری نے عوام سے بہت جلد خراجِ تحسین حاصل کر لیا ۔ ان کی عزت اور شہرت کا باعث ان کا خلوص اور سادگی کا فن کارانہ استعمال ہی ہے ۔

اختر شیرانی کا فن ، ان کا لب و لہجہ اردو ادب میں اپنا ایک الگ مقام اور ایک الگ حیثیت رکھتا ہے ۔ کئی نقّادوں نے ان کو ایک منفرد شاعر کہا ہے ۔ بہر حال اردو ادب میں ان کی اہمیت مُسلّم ہے ۔

بمل کرشن اشک

قطعات

(ایک شاعر دوست کے نام)

اشک مجھ ایسے پاسدارِ حیات
ترکِ مے بے سبب نہیں کرتے
آج کل مے کدے کے باشندے
زندگی کا ادب نہیں کرتے

راہِ مستی کے ذرّے ذرّے میں
ضو فشاں کائنات ملتی ہے
منحصر کچھ یہ مے کدے پہ نہیں
ہر قدم پر حیات ملتی ہے

رات ایسی نہ مے کدے کی ہو
ہر حقیقت کو خواب پی جائے
پی مگر اس قدر نہ پی اے دوست
شاعری کو شراب پی جائے

غمِ ہستی کا نام لے لے کر
جام پر جام بھر رہا ہے دوست
کہیں ایسے ہوا ہے غم کا علاج
غم کی توہین کر رہا ہے دوست

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء

غزل

خصوصی لطف فرمائی نہ چھوڑی
اُن آنکھوں نے مسیحائی نہ چھوڑی

رہیں پابندیاں جب تک زباں پر
خموشی نے بھی گویائی نہ چھوڑی

ہوئے پیراہنِ گُل چاک درچاک
صبا نے نازفرمائی نہ چھوڑی

ہمیں تھی آرزوئے نیک نامی
ہوائے کوئے رسوائی نہ چھوڑی

اسی سے چشم ودل کی زندگی تھی
متاعِ ناشکیبائی نہ چھوڑی

ہزاروں رنج وغم رکھ کر بھی دل نے
ترے غم کی پذیرائی نہ چھوڑی

خرد نے لاکھ سمجھایا، ڈرایا
جنوں نے حشر آرائی نہ چھوڑی

حوادث سے گذرنے پر بھی منشاء
غزل نے شانِ رعنائی نہ چھوڑی

وصی سیتاپوری

غزل

پیامِ عیش ملا ہے غمِ حیات کے بعد
نگاہ پھیر لی کس نے نوازشات کے بعد

چمن میں پھول کھلے آسمان پر تارے
وہ مسکرائے بھی کتنے تکلّفات کے بعد

مجھے سمجھنے لگے اجنبی نہ جانے کیوں
تمام اہلِ نظر تیرے التفات کے بعد

خدا گواہ ہم اپنی نظر کو ڈھونڈتے ہیں
ترے حضور و فورِ تجلّیات کے بعد

جہاں پہ حسن خود آتا ہے رہبری کے لئے
ایک ایسی راہ بھی ہے منزلِ حیات کے بعد

گناہ گاروں کو جیسے مجھی سے نسبت تھی
کھلا یہ راز مرے دعویٔ نجات کے بعد

مرے یقین کی گنجائشیں کہاں جائیں
حیات وموت کے مبہم تعلّقات کے بعد

یقین کیجئے عرفانِ زندگی کی قسم
سنور گیا ہے وصی تازہ حادثات کے بعد

۵ سے ۵۰ من

شیخ عبدالغفار اور اس کے پانچ بھائیوں کی کوششیں پھل لائیں اور ان کی زمین کی فی ایکڑ پیداوار دس گنا بڑھ گئی۔ ان کی اس نمایاں کامیابی کی وجہ بہتر کاشت اور ساجھی کھیتی ہے۔

بہار کے موضع وٹ گنج کے ان کاشتکاروں کے دل میں ایک اُمنگ اُٹھی۔ انھوں نے ایک نیا عزم باندھا۔ اپنی ۵۰۴ ایکڑ زمین پر قطاروں میں بیجائی کی، بہتر بیج استعمال کئے، وافر کھاد ڈالی۔ نئے اوزار اور کھیتی باڑی کے جدید طریقے اختیار کئے۔ یہ سب کچھ انھوں نے اپنی کوششوں سے کیا۔

نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا۔ کاشت کے روائتی طریقوں سے وہ کُل چار سے پانچ من فی ایکڑ دھان اُگاتے تھے۔ اب کاشت کے بہتر طریقوں سے دھان کی فی ایکڑ پیداوار ۴۰ سے ۵۰ من ہو گئی۔

آپ بھی اپنی زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتے ہیں۔ کھیتی باڑی کے بہتر طریقے اپنایئے اور بھرپور فصل حاصل کیجئے۔ آپ کی پیداوار بڑھے گی، ملک کو زیادہ اناج حاصل ہوگا۔

پلان کی مدد اپنی مدد ہے
اپنی مدد آپ کیجئے

DA-59/605

نذیر رحمانی

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی سے مُعاف

تم نے اپنے خط میں تو اُن کی بڑی تعریف و توصیف لکھ بھیجی ہے لیکن سعیدہ! جو چولہے کے پاس بیٹھتی ہے جلتی ہوئی لکڑیوں کی تپش اور آگ کی جلن سوزش سے وہی خوب واقف ہوتی ہے۔ میرے اُوپر جو کچھ بیت رہی ہے اسے میں ہی جانتی ہوں، پگلی! بظاہر تو شادی کا تصور بہت سنہرا دلکش اور فردوس آفریں ہوتا ہے لیکن جیسے یہ تحفہ مل جاتا ہے اس کی زندگی ایک وادیٔ پُر خار میں پھنس کر رہ جاتی ہے اور رات کے تارے دن میں نظر آنے لگتے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی اُلجھنوں اور بندشوں سے تو میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اگر سرزمینِ سندھ کی حسینہ سسّی کی بھی شادی پنوں سے ہو جاتی تو سوا مہینے کے بعد ہی وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتی اور قسمت کا رونا روتی۔ ایک زمانہ تھا جب بھائی جان کے نام کسی کی شادی کا اِذن نامہ آتا تھا تو میں حسرت دیاس کے ساتھ بڑی دیر تک اسے پڑھا کرتی تھی۔ اس کے ایک ایک لفظ پر میری نظریں اس طرح جم جاتی تھیں جیسے بھوکے آدمی کی نظریں اس کھانے پر جم جاتی ہیں جو اس کے سامنے تو رکھا ہو لیکن وہ اُسے کھا نہ سکتا ہو۔ میرا حلق خشک ہو جاتا تھا اور عجیب تشنگی محسوس ہوتی تھی جب کسی کی بارات میرے مکان کے قریب سے بینڈ، باجہ اور شہنائی بجاتی ہوئی گزرتی تھی تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا اور میں بے چینی و بدحواسی کے عالم میں اپنی چاندنی پر چڑھ کر بارات کا منظر دیکھا کرتی تھی اور پھر اس رات کی نیند کافور کی طرح اُڑ جاتی تھی۔ اپنی ایک سہیلی کی شادی میں تین چار روز پہلے جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے بڑی لگن اور حوصلہ سے شادی کا کام کاج کیا۔ نکاح کے دن اپنی سہیلی کو دُلہن بنانے میں میری ہی دستکاری و نقش گری کا بڑا حصّہ رہا۔ سارا دن خوشی خوشی میں اس کے آگے پیچھے چکری کی طرح ناچتی رہی جب رات ہوئی اور دولہا سلام کرنے گھر میں آیا اور اپنی متاعِ دل و جان کو اٹھا کر لے جانے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے یہ آنسو دوامی صدمے کے نہیں تھے، خوشی کے بھی نہیں! میں خود ہی نہ سمجھ سکی کہ یہ بادل کون سے سمندر سے اُٹھے تھے اور میری آنکھوں سے کیوں برس پڑے۔ تُم تو میری بہت مخلص سہیلی ہو اب میں تم سے کیا چھپاؤں، سچ کہتی ہوں جب ان کا پیغام میرے لئے آیا اور گھر والوں نے رضامندی کا اظہار کیا تو بس دل میں لڈو پھوٹنے لگے، آنکھوں سے پُھل جھڑیاں چھوٹنے لگیں پھر جو کچھ ہوا تم کو معلوم ہی ہے۔ میں سُرخ ریشمی کپڑوں کی گٹھری بنی شوہر نامدار والا تبار کے گھر آ گئی انھوں نے اپنی تعارفی گفتگو میں پہلی مرتبہ جس قسم کے وعدے وعید مجھ سے کئے اور جن جن خطابوں سے مجھے مخاطب کیا وہ سب اگر میں اس وقت تم کو لکھ دوں تو تم دانتوں تلے اُنگلی دبا لو، مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاؤ۔ مہینے دو مہینے تو واقعی ہم لوگ جیسے زمین پر نہیں بلکہ اس دُنیا سے دُور آسمان پر چاند تاروں کے قریب کسی نئی اور فرحت بخش آبادی میں رہتے ہوں لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا عیش و مسرّت کے نقرئی ورق ایک ایک کر کے اُترتے رہے۔ خانگی پریشانیوں نے تو خیر مقدم کیا ہی، انھوں نے بھی مجھ سے دُوری اور بیزاری شروع کر دی۔ اب میری آنکھیں کھلیں اور شادی کی خوشی کا نشہ ہرن ہوا اور تجربہ ہوا کہ سعدی نے ٹھیک ہی کہا تھا

ہفتۂ عیش غصّہ سالے چند

میرے میاں بڑے چھپے رستم نکلے، کہیں تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ کوئی

لٹھ مارا ور نرم بازہیں اور میری ہڈی پسلی کو سُرمہ بنانے پر ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو مکھیوں اور چیونٹیوں کو بھی مارنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ ایک روز میں نے مُنّے کو مار دیا تھا تو کئی دن تک مجھ سے ناراض رہے۔ وہ ہمیشہ سے گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدّد کے قائل ہیں اور اس پر سختی سے عمل بھی کرتے ہیں۔ مہاتما جی کی ایک بڑی اور خوبصورت تصویر اپنے کمرے میں آویزاں کر رکھی ہے۔ ذات پات بھید بھاؤ اور کسی قسم کے فرق و امتیاز کے سخت مخالف ہیں۔ ہر کسی کی خدمت کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ ایک پڑوسی کو پولیس پکڑے لئے جارہی تھی آپ نے اپنی ضمانت دے کر اسے چھڑا لیا پھر وہ آدمی فرار ہو گیا کئی دن تک آپ کو کچہری کے چکر کاٹنے پڑے۔ بارہا منع کیا کہ دوسروں کے پھڈے میں تم اپنا پیر کیوں اَڑاتے ہو۔ مگر مانتے نہیں وعظ شروع کر دیتے ہیں۔ "گوشت پوست کے اس ڈھانچے کا نام انسان تھوڑا ہی ہے۔ انسان نام ہے عزّتِ نفس، عظمتِ کردار اور خدمتِ خلق کے امتزاج کا جس میں یہ خصوصیات نہ ہوں وہ انسان نہیں کچھ اور ہے۔ اپنی ذات کے لئے انسان جیا تو کیا جیا دوسروں کے لئے زندہ رہنا کارِ مردانہ ہے۔" خرابی اور بُرائی ان میں جو ہے وہ میں کیا بتاؤں بس عجیب و غریب شخصیت ہیں وہ۔ ایک روز ماچس کی تلاش میں میں نے ان کی اٹیچی کھول لی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ تین چار خط کسی لڑکی کے لکھے ہوئے رکھے ہیں۔ میں نے جب ان سے پُوچھا تو کہنے لگے "واہ! تم بھی خوب سمجھیں وہ تو فرضی خط ہیں جو میں نے ہی لڑکی کے نام سے لکھے ہیں۔"

مجھے بالکل یقین نہیں آیا اور میں کئی دن ان سے کھنچی کھنچی رہی پھر جب وہ خط ایک رسالہ میں شائع ہوئے تب میرا غُصّہ ختم ہوا پھر بھی یہ خلش آج تک دل میں موجود ہے کہ کون جانے وہ کسی مدِنظر کے لکھے ہوئے تھے یا واقعی فرضی تھے۔

ان کے طور طریق، عادت و فطرت اور طرزِ بود و ماند کچھ ایسے ہیں کہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اب بھلا تم ہی بتاؤ یہ کون سی ہمدردی اور دوست نوازی ہے کہ کوئی جان پہچان والا آکر کہے کہ مجھے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے۔ بس آپ مجھ سے بھی نہ پوچھیں گے اور فوراً اٹھا کر اسے روپیہ دے دیں گے۔ گئے سال کا ذکر ہے۔ برسات کا موسم تھا کوئی دوست ملنے کے لئے آیا آپ نے اسے کھانا کھلایا اپنے کمرے میں بڑی دیر تک اسے بٹھلایا جب وہ جانے لگا تو اپنی برساتی بھی اسے دے دی۔ میں نے اعتراض کیا تو فرمانے لگے۔ "پانی برس رہا تھا، غریب بھیگتا ہوا جاتا اس لئے برساتی دے دی تم فکر کیوں کرتی ہو، واپس آجائے گی۔" ایک مہینہ ہو گیا۔ برساتی آئی نہ اُس نے درشن دئے۔ میرا کیا بگڑا خود ہی نے تکلیف اٹھائی اور پُرانی چھتری لگائے پھرے۔ ایک سال سردیاں پورے شباب پر تھیں۔ ایک ملاقاتی آئے کہنے لگے ذرا باہر جا رہا ہوں اپنا سوئٹر دے دیجئے جلد ہی واپس لا دوں گا۔ انھوں نے جھٹ اپنا نیا سوئٹر دے دیا۔ لکڑیوں کی گاڑی آئی۔ مزدور نے کاٹ کر ٹپک دی۔ گھر کا ملازم کٹی ہوئی لکڑیاں اٹھا اٹھا کر صحن سے کوٹھری میں بھر رہا تھا آپ باہر سے آگئے اور اس کے ساتھ خود بھی لکڑیاں اٹھانے لگے۔ میں نے کہا تو کہنے لگے "بے چارہ پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ کافی تھک چکا تھا اگر میں نے ذرا اس کا ساتھ دے دیا تو کیا میری ذات کو بٹہ لگ گیا۔" اب انھیں کون سمجھائے کہ اس قسم کی باتوں سے گھر کے نوکر سر پہ چڑھ جاتے ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی بی اے پاس ہے آپ نے اس کی تعلیم پر خوب روپیہ صرف کیا ہے وہ اپنی ملازمت سے جب علیحدہ ہو گیا تو پندرہ روپے ماہوار اس کے خرچ کے لئے دیتے رہے۔ پھر جب اسے ملازمت مل گئی اور وہ تحصیل دار ہو گیا تو ایک روز میں نے کہا اب بیٹھے کیا سوچ رہے ہو گھر میں آٹا دال لکڑی کچھ بھی نہیں اپنے برادرِ عزیز سے ہی کچھ روپیہ منگوا لو۔ بس خفا ہو گئے کہنے لگے "تم نے مجھ کو اتنا نیچ اور ذلیل سمجھ لیا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے سامنے دستِ سوال دراز کروں گا، دامن پھیلاؤں گا۔ اس سے کچھ مانگنا میری خودداری کے خلاف ہے۔" میں بھی جل گئی۔ میں نے کہا اچھا تو تم اپنی خودداری کے لحاف میں لپٹے پڑے رہو اور ہم اپنے معصوم بچّوں پر فاتحہ پڑھ کر بھوکا سلائے دیتے ہیں۔ میرے اس انجکشن سے ان کے جسم میں حرارت اور ہاتھ پیر میں گرمی آئی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے میں سمجھی کہ شاید غیرتِ مردانہ کو ضرب لگی اور اب یہ روپیوں کا انتظام کرنے کہیں جا رہے ہیں۔ جلدی جلدی شیروانی پہنی اور میرے پاس آکر کہنے لگے۔ "لاؤ وہ اپنے سونے کے بُندے دے دو تو میں انھیں گروی رکھ کر آتشِ شکم بجھانے کا بندوبست کروں۔" میں نے کہہ دیا نہیں صاحب! یہ نہیں ہو سکتا میں اپنے زیورات کا سیٹ آپ کے بچّوں کی وجہ سے نہیں بگاڑ سکتی۔ فرمانے لگے "بیگم تم تو ذرا سی بات پہ خفا ہو جاتی ہو۔ میرے افسانوں کا معاوضہ آنے والا ہے

رقم ملتے ہی میں تمہارے مُنہ سے تم کو لا دوں گا۔" بات بڑھ جاتی۔ بچے تماشہ دیکھتے اور باہر جا کر کہتے کہ آج ہمارے پاپا اور امی میں خوب لڑائی ہوئی۔ اس لئے میں نے نا نہیں کی۔ چُپ چاپ مُنہ سے انھیں دے دئے۔ ان کے افسانوں کا معاوضہ آگیا اور ختم بھی ہو گیا۔ دوسرے مضامین کے معاوضے بھی آتے رہے اور پیٹ کے ایندھن بنتے رہے لیکن میرے جو کان مُندروں سے خالی ہوئے وہ پھر کبھی نہ بھر سکے۔ سوچتے ہوں گے کہ میں نے ہی تو بنائے تھے۔ میری چیز ہے واپس لاؤں یا نہ لاؤں۔ ایک سال کتاب لکھی اس پر ایک ہزار روپیہ حکومت کی طرف سے انعام ملا۔ کیا پوچھنی ہو حاتمی و دریا دلی کا عالم! بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہفت اقلیم کی بادشاہت انھیں کو مل گئی ہے مہینہ ڈیڑھ مہینہ میں یہ ایک ہزار روپیہ چٹنی کی طرح پیس ڈالا۔ ان کی سوجھ بوجھ اچھی ہے مگر مصلحت بینی اور دور اندیشی نام کو نہیں۔ زمانے کا سیاہ سفید اور خود اپنا اچھا بُرا دیکھے ہوئے ہیں۔ مگر آنکھیں نہیں کھلتیں۔ خود ہی بتاتے تھے کہ جب ان کی دو ڈھائی سو روپے کی ملازمت ختم ہو گئی اور وہ بے کاری و بے روزگاری کے کٹھن اور صبر آزما دن گزارنے لگے تو اُن کے عزیز رشتہ دار اور دوست احباب، سب نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور آنکھیں پھیر لیں۔ حقیقی چچا اور ماموں نے بھی لعن طعن شروع کر دی تھی۔ بڑے بھائی سے دو روپے منگائے تھے تو انھوں نے نہیں دئے اور صاف کہہ دیا کہ تمہارا تو ہمیشہ سے یہی رونا ہے۔ جن لوگوں کی کبھی یہ امداد کر دیا کرتے تھے وہ لوگ انھیں دیکھ کر اپنا راستہ بدل دیتے تھے۔ آنکھیں چار ہونے کی نوبت نہ آنے دیتے تھے ان سے اس طرح دُور دُور رہتے تھے جیسے خارش کے مریض سے سب دُور رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس دُنیا میں ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن کر رہ گئے ہوں۔ اسی زمانہ میں ان کی بہن کی شادی ہوئی، منگنی سے لے کر رخصتی تک ان سے کسی نے بات نہ پوچھی، کسی قسم کا صلاح مشورہ نہ لیا۔ یہ روٹھے پھولے رہے تب بھی کسی نے انھیں نہ منایا۔ ان کے نزدیک وہ وقت بہت قیمتی تھا۔ بڑے بڑے تجربات اور نئی نئی آزمائشیں ہوئیں۔ اپنے پرائے سب اصلی روپ میں نظر آگئے۔ ان کا ایک دوست تھا۔ اچھا کھاتا پیتا خوش حال، انھوں نے زیادہ نہیں صرف پچاس روپے کے لئے اس سے کہا، روپیہ دینے کا اس نے وعدہ کر لیا اور کہا میں بنک سے رقم نکال رہا ہوں آپ کا روپیہ گھر آ کر دے جاؤں گا تو لیتا آؤں گا۔ آپ ٹھیرے سیدھے سادے نیک منش اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ تین دن تک گھر میں بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کرتے رہے پر وہ نہیں آیا۔ نظیر کے اس شعر کی صحیح تفسیر و تشریح اسی زمانہ میں اُن کی سمجھ میں آئی۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

ان کا عقیدہ ہے کہ انسان تکلیفوں، دشواریوں اور سختیوں کی بھٹی میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کندن اگر بنے ہوتے تو اس کی چمک دمک آج نظر آتی پچھلے اُن دنوں کا عشر عشیر اب بھی ان میں نہیں۔ ہزاروں روپے اگر مل جائیں تو پانی کی طرح بہا دیں۔ پھر تنہا دو میاں بیوی ہوتے تو مضائقہ نہیں۔ ایک لڑکی ایک لڑکا دو جانوں کا ساتھ ہے۔ ان کے مستقبل کا ذرا بھی خیال نہیں بچہ کو تعلیم حاصل کرنا ہے بچی کا بیاہ کرنا ہے مگر انھیں مطلق پروا اور فکر نہیں۔ بچہ کہتا ہے کہ کلاس کی موجودہ کتابوں کے علاوہ چھٹے درجے کی کتابیں منگوا دو تو میں ڈبل امتحان دے کر ساتویں میں چلا جاؤں۔ آپ جواب دیتے ہیں۔ "اس طرح پاس ہونے سے فائدہ ——؟ بنیادی کمزوریاں رہتی ہیں تو آگے کے امتحانوں اور درجوں میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہی آگے کے درجات میں پہنچنا ٹھیک ہے۔" لڑکی کے بارے میں جب کچھ کہتی ہوں تو کہتے ہیں کہ "شادی بیاہ کا ڈھیروں سامان دوکانوں میں بھرا ہے۔ جیب میں پیسہ ہونا چاہیئے۔ جس دن چاہیئں گے خرید لائیں گے۔ سب کچھ پیسے کی لیلا ہے بیگم۔ جنگل میں منگل ہو جاتا ہے اس سے۔" ایک طرف اس طرح مجھے سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف پیسہ جیب میں رکھتے ہیں نہ بنک میں نہ میرے پاس ہی رہنے دیتے ابھی دو دن کی بات ہے اچھے خاصے بیٹھے افسانے لکھ رہے تھے بارش جو شروع ہوئی تو کہنے لگے "کتنا اچھا موسم ہے اس وقت تو تلن ہونا چاہئے۔" گھر میں تیل شکر میدہ نہیں تھا آپ نے جھٹ بنیئے کو پرچے لکھ دیا۔ منا تلن پکوان کا سامان لے آیا۔ اس طرح قرضہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ تقاضوں کے نعوذ سے بیر رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں آدمی بھوکا بیٹھا رہے مگر کسی کا مقروض نہ ہو۔ کبھی جب قرضے کا ذکر کرو تو بگڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "دوکان دار اپنا روپیہ لے گا کسی کی جان لے گا جب روپیہ آئے گا قرضہ ادا

کردیں گے۔ آدمی کو مایوس کبھی اور کسی حالت میں نہ ہونا چاہیئے۔" انھیں تو بس ہتھیلی پر سرسوں جمانا خوب آتا ہے۔ مجھ سے کہیں گے نہ پوچھیں گے جتنے آدمی چاہیں گے لے آئیں گے اور مجھ سے کہیں گے ذرا جلدی سے کھانا تیار کردو یہ میرے بے تکلّف دوست ہیں۔ تمھارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا انھیں بہت مرغوب ہے۔ میری جان جل جل جاتی ہے مگر کیا کروں ہاتھ جلاتی ہوں، کھانا پکا کر دیتی ہوں اور کھانے والے مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے بھئی واللہ! کئی دن کے بعد آج دل خواہی اور شکم سیری کے ساتھ کھانا کھایا۔ دوسرا کہتا ہے فیرنی تو واقعی تمھاری بیوی صاحبہ خوب پکاتی ہیں۔ تیسرے صاحب فرماتے ہیں ایک ہماری بیوی ہے جسے معمولی روٹی ترکاری پکانے کا بھی ڈھنگ سلیقہ نہیں۔ ایک صاحب ہیں روزانہ ٹھیک چار بجے آتے ہیں اور چائے پی کر چلے جاتے ہیں۔ اب مجھے یہ ڈر رہنے لگا ہے کہ کہیں یہ حکم اور نہ دے دیا جائے کہ "صرف چائے کیا بھجواتی ہو ناشتہ کے طور پر کچھ تھوڑا سا کھانے کو بھی دے دیا کرو۔" گرانی ہے کہ بڑھتی جارہی ہے۔ قیمتیں چڑھ رہی ہیں۔ قرضے کی فہرست لمبی ہوتی جارہی ہے مگر شاہ دلی و سیرچشمی میں کمی نہیں کرتے۔ ان کے والد کی کچھ زمینداری تھی وہ ختم ہوگئی سرکار نے اس کا معاوضہ دیا اس معاوضے میں ان کا حصّہ بھی انھیں ملا۔ اس میں سے کچھ روپیہ تو گھر کے خرچے کے لئے مجھے دیا بقیہ سب روپیہ اپنے پاس رکھا۔ نواب بے ملک بنے تانگوں اور ٹیکسیوں میں گھومتے پھرتے، خوب تفریحیں کیں، ہوٹلوں میں گل چھرّے اڑائے۔ میں نے کہا سلائی کی ایک مشین مجھے لے دو۔ مجھ سے خفا ہوگئے۔ گھر میں نہ آنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ دو دن تک صورت نہ دکھلائی رات کو نہ جانے کب آجاتے تھے اور صبح تڑکے ہی چل دیتے تھے۔ کچھ قرضہ ضرور بیباق کیا اور سب روپیہ فضولیات میں برباد کر دیا بعض اوقات ایک ایک سگریٹ کے لئے محتاج بنے بیٹھے رہتے ہیں مگر کیا مجال جو خرچ اخراجات میں احتیاط و اعتدال برتیں۔ رلے ہوئے اتنے ہیں کہ کبھی کوئی کام وقت پر نہیں کرتے۔ تحریری مقابلے کے لئے ایک انعامی مضمون لکھنا تھا۔ آج لکھتا ہوں، کل لکھتا ہوں کرتے رہے اور آخری تاریخ بھی گزر گئی، جب کچھ منگوانے کے لئے روپیہ دو تو بازار سے آکر یہی کہتے ہیں کہ ارے میں تو بھول گیا بالکل یاد نہ آئی زیادہ کچھ کہو تو روپیہ دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی ہی جلدی ہے تو کسی سے منگالو۔ نہ جانے کوئی تہوار تھا یا تقریب، میں زردہ پکا رہی تھی۔ شکر کم تھی میں نے دام دئے کہ کچھ شکر بازار سے ابھی لادو۔ آنجناب چلے چلے ڈوبتے سورج کے ساتھ تشریف لائے۔ اُدھر مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا اور اِدھر آپ گھر میں داخل ہوئے تھے۔ میں باورچی خانے میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی، انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں، کمر دُکھنے لگی مگر آپ کی بلا سے۔ آپ تو جو مصروفِ گفتگو ہوئے تو سب کچھ بھول بھال گئے۔ "میں جب چڑ جاتی ہوں تو بکنے لگتی ہوں۔" اب بازار سے سودا سلف بھی میں خود ہی لے آیا کروں گی۔" یہ سُن کر ذرا نادم و شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ اور کہتے ہیں کہ "ہاں ہاں! ٹھیک تو کہہ رہی ہو، زمانے کے قدم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں نت نئی ترقیاں ہو رہی ہیں۔ یہ برقعہ اور پردہ بھی آخر کب تک بچے گا۔"

ایم۔ اے پاس ہیں اچھی خاصی نوکری مل سکتی ہے۔ دیش میں جگہ جگہ کالج اور یونی ورسٹیاں کھل رہی ہیں۔ بڑے بڑے افسروں سے دوستی اور تعلقات ہیں کہیں بھی پروفیسری مل سکتی ہے۔ دو ایک بار کہا بھی کہ ملازمت کرلو تو فکرِ معاش کی طرف سے ذہنی یکسوئی حاصل رہے۔ مگر نہیں سُنتے: "نوکری میری توہین ہے، غلامی میرے بس کا روگ نہیں، دفتری پابندی مجھ سے نہیں ہوسکتی۔ جب حالات ٹھیک ہوں گے تب میں تو کوئی بڑا اور معیاری اخبار نکالوں گا۔" یہ اُن کا جواب ہوتا ہے۔ میں نے بھی انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ ادیب و شاعر کسی کی سُنتے نہیں اور سُنتے بھی ہیں تو کہتے من کی ہیں۔ اُن کی ان سب باتوں کے باوجود تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں اب ان سے اکتا گئی ہوں۔ وہ مجھے عزیز ہیں، میرے سر کا تاج اور زندگی کے دمساز ہیں۔ اپنی ناآسودگی کے ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی ان کی بُرائی میرے سامنے کر دیتا ہے تو مجھے سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے بارے میں اگر کوئی بُرے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے تو تم یقین کرو کہ ایک ناقابلِ بیان اذیت و تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اگر کسی کانفرنس یا مشاعرے سے واپس لوٹتے ہیں وہ دیر کر دیتے ہیں۔ یا دو تین دن نہیں آتے تو مجھے اختلاج سا ہونے لگتا ہے میں اُن کی خیریت کے ملنے کے لئے بے قرار رہنے لگتی ہوں تاوقتیکہ وہ آنہ جائیں میری حالت دگرگوں رہتی ہے۔ جب وہ آجاتے ہیں

تب مجھے سکون میّسر آتا ہے۔ ان کے وزن کے برابر سونا تول کر بھی اگر کوئی مجھے دے تو میں اس سونے کے بدلے انھیں نہیں چھوڑ سکتی ان سے قطع تعلق نہیں کر سکتی جس طرح ماں باپ کے گھر سے شادی کا ریشمی جوڑا پہن کر میں آئی تھی۔ اسی طرح کفن کی چادر میں لپیٹ کر شوہر کے گھر سے نکلوں گی وہ جس حال میں رکھیں گے میں رہوں گی۔ جیسے ایک باپ اپنے بچے کے بارے میں بالکل نہیں جانتا کہ یہ جوان ہو کر اس کے بڑھاپے میں کیا سلوک کرے گا۔ وہ برابر اس کی خدمت، دیکھ ریکھ اور ناز برداری کرتا رہتا ہے بالکل اسی جذبہ سے میں ان کا ساتھ دے رہی ہوں اور دیتی رہوں گی۔ پتہ نہیں کون سی ایسی کشش ہے جو مجھے ان سے علاحدہ ہونے میں مانع رہتی ہے میں ایک لمحہ کے لئے بھی انھیں چھوڑ کر ان سے دُور نہیں رہ سکتی۔ وہ رَتّن آپا کو تو تم جانتی ہی ہو۔ طلاق دلانے اور شادی کرانے میں کمال و مہارت رکھتی ہیں۔ ایک دن میرے پاس بھی آئی تھیں۔ مجھ سے کہنے لگیں، بٹیا! تیرا یہ آدمی بڑا خراب ہے میں نے تیرے لئے ایک کماؤ اور خوبصورت بر تلاش کر لیا ہے۔ اتنا سنتے ہی میرا تو خون کھولنے لگا میں نے اُسی وقت اُن سے کہہ دیا کہ اب آج کے بعد کبھی ادھر نہ آنا میرا دروازہ تمھارے لئے بند ہو چکا پھر اس دن کے بعد سے وہ میرے یہاں کبھی نہیں آئیں۔ وہ اپنی عادتوں کے کتنے ہی کم زور اپنے فکرے اور لاابالی ہت قلندر سہی لیکن میں جس رشتہ کے ساتھ اُن سے باندھی گئی ہوں وہ بہت مضبوط ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا، کسی طرح نہیں ٹوٹ سکتا، معلوم نہیں کیوں ــــــ؟

کلیم اظہر

پریم چند کے متعلق کچھ نئی معلومات

شری رام رتن لپنک بھون (کتب خانہ) وارانسی (بنارس) میں ہندی سنسکرت، اردو، انگریزی اور بعض دیگر زبانوں کی بہت سی نایاب کتب و دستاویزات کا ذخیرہ ہے۔ اس کتب خانہ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا وہ ذخیرہ ہے جس میں ہندوستانی ادیبوں کی تحریریں، ان کے دستخط، خطوط، تصویریں اور ذاتی استعمال کی چیزیں شامل ہیں۔ یہی ذخیرہ اس کتب خانہ کی اہمیت میں کافی اضافہ کرتا ہے۔ ان میں بیشتر چیزیں ہندی ادیبوں کی ہیں۔ اس کے علاوہ سنسکرت، بنگالی، اردو اور پنجابی زبان کے ادیبوں کی بھی ایسی ہی نایاب چیزیں اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ جن سے تحقیقات کے سلسلے میں کافی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں منشی پریم چند کی بھی کئی کتابیں موجود ہیں جو اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

کتب خانہ میں منشی پریم چند کے دستخط، ان کی تعلیم، امتحانات سے متعلق سرٹیفکیٹ، اسناد، ان کی اکثر کتابوں کے مسودے، ان کا لباس جس میں کرتا، پائجامہ شامل ہے، چشمہ و دیگر کئی چیزیں موجود ہیں۔ یہ سب چیزیں آنجہانی پریم چند کی بیوہ شریمتی شیورانی کا عطیہ ہیں۔ کتب خانہ میں پریم چند کے دھنپت رائے نام سے بھی دستخط موجود ہیں۔

کتب خانہ میں محفوظ اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے پرمانٹ جونیر انگلش ٹیچرس کا امتحان ۱۹۰۴ء میں گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج الہ آباد سے دیا اور فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اس سند میں ان کا ریاضی میں کمزور ہونا ان لفظوں میں تشبیہ ہے۔

Not qualified to teach Math. (ریاضی پڑھانے کے قابل نہیں) اور پرنسپل نے جنرل ریمارکس کے کالم میں لکھا ہے:

He worked honestly and well (انھوں نے محنت اور ایمان داری سے کام کیا) اس سند پر ان کا نام دھنپت رائے لکھا ہوا ہے۔

۱۹۰۷ء ہی میں انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے سپیشل ورنیکلر امتحان پاس کیا۔ اس میں ان کے مضامین ہندی اور اردو تھے۔ امتحان کی سند پر ان کا پورا نام دھنپت رائے سریواستو لکھا ہوا ہے لیکن انٹرمیڈیٹ کی سند پر جس کا امتحان منشی پریم چند نے ۱۹۱۶ء میں دیا صرف دھنپت رائے لکھا ہوا ہے۔ اس وقت وہ بستی میں مدرس تھے۔ اس امتحان میں ان کے مضامین انگریزی ادب، منطق، فارسی اور تاریخ تھے۔

ان اسناد کے علاوہ پریم چند کا کرتا، پائجامہ، کوٹ، ٹوپی اور پنیردانی وغیرہ بھی کتب خانہ میں موجود ہیں۔ یہ کپڑے کھدر کے ہیں۔ اور ان سے پریم چند کی سادہ معاشرت، معاشی حالت اور وضع قطع کا پتہ چلتا ہے۔ روس کی لینن گراڈ یونیورسٹی کے ہندی کے پروفیسر وکٹر بالن تو ان کپڑوں کے ناپ تک لکھ کر لے گئے ہیں۔ وہ پریم چند پر ریسرچ کر رہے ہیں اور جلد ہی وہ پریم چند پر ایک کتاب بھی شائع کرنے والے ہیں۔

پریم چند کی اسناد اور کپڑوں کے علاوہ ایک خاص اور بہت ہی اہم چیز اس کتب خانہ میں موجود ہے یعنی ان کی تصانیف کے مسودات۔ یہ مسودے اردو اور ہندی دونوں میں لکھے ہوئے ہیں اور اکثر مسودوں میں ان کتابوں کا مرکزی خیال یا مرکزی کردار کی سیرت کے بارے میں مختصر طور

پر انگریزی میں بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ مسودے کچھ پورے ہیں اور کچھ ادھورے۔ بعض میں خود منشی پریم چند کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور کچھ پریس کی پروف کاپی، جس پر منشی جی کے قلم سے اصلاح ہوئی ہے۔ یہ عبارت باریک قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ بعض جگہ تو پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند خوش نویس نہ تھے۔ ان مسودوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اپنی ہر کہانی کے آغاز میں اس کہانی کا Synopsis (خاکہ) لکھ لیا کرتے تھے اور وہ بھی انگلش میں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی کے اس عظیم مصنّف نے اپنی عظیم کہانیوں کا پلاٹ یا خاکہ انگریزی میں بنایا تھا۔ 'میدانِ عمل' کے ہندی مسوّدہ کے آخر میں ایک ناول کا خاکہ ہے۔ لیکن یہ ادھورا ہے۔ اس خاکے میں آٹھواں باب پوری طرح انگریزی میں لکھا ہوا ہے مگر نویں باب کا صرف نمبر دے کر رہ گئے ہیں۔ یہ ناول پریم چند لکھ نہ سکے۔ اسی کے آخر میں ایک کہانی ہے جس کا کوئی عنوان نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ کہانی کافی ردّوبدل کے بعد "کالاپانی کا قیدی" کے عنوان سے چھپی۔ اس مسودہ اور مطبوعہ کہانی میں بہت فرق ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منشی پریم چند کبھی کبھی کہانی کے پلاٹ کو اتنا بدل دیتے تھے کہ پوری کہانی ہی بدل کر رہ جاتی تھی۔

'چوگانِ ہستی' کا پورا مسودہ اس کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کے پہلے صفحہ کے بائیں حاشیے پر انگریزی میں 'یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء سے شروع' لکھا ہوا ہے۔ آخر میں بھی انگریزی میں '۱۲۔ اگست ۱۹۲۴ء کو ختم ہوئی' تحریر ہے۔ اس ناول کو انھوں نے 'اوم' لکھ کر شروع کیا ہے اس سے ان کے آریہ سماجی ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس ناول کے آخر میں ان کی مشہور کہانی 'شطرنج کے کھلاڑی' کا مسودہ شامل ہے۔

'پریم آشرم' کا مسودہ بھی اس کتب خانے میں موجود ہے۔ مگر یہ ادھورا ہے۔ اس مسودے کے پندرھویں باب کے صفحہ ۴ اور انیسویں باب کے آخری حصّہ سے اڑتیسویں باب تک کے صفحات موجود ہیں۔ اصل مسوّدہ نیلی روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ مگر کالی روشنائی سے چونتیسویں باب کے آخر میں ۸–۱–۲۵ اور اڑتیسویں باب کے آخر میں ۱۴–۱۰–۲۵ کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان تاریخوں کے متعلق دو باتیں کہی جا سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ تاریخیں ہندی ترجمہ کی ہیں یا دہرانے کی۔ لیکن اس میں پہلی بات اس لئے ممکن نہیں کہ یہ ناول ہندی میں ۱۹۲۲ء میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ دوسری بات بھی اس لئے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کہ اس میں کہیں بھی اصلاح نہیں دکھائی پڑتی جو دہرانے کے سلسلہ میں ضروری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخیں پریس کی کاپیاں تیار ہونے کی ہیں۔

مذکورہ بالا مسودوں کے علاوہ کئی کہانیوں کے مسودے بھی ہیں لیکن ان میں بیشتر کہانیاں ادھوری ہیں۔ ان کہانیوں میں سے جن کے مسودے ادھورے ہیں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔ مطبوعہ کہانیاں مکمل ہیں حالانکہ ان کے مسودے ادھورے ہیں۔ ان اردو مسودوں کے علاوہ 'نرملا'، 'میدانِ عمل'، 'کایا پلٹ' اور کئی دوسری ہندی کہانیوں کے بھی مسودے موجود ہیں جن میں کچھ تو خود منشی پریم چند کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ پریس کی پروف کاپیاں ہیں۔ ان ہندی مسودوں میں ان کا ایک ترجمہ 'دنیا کی ابتدا' (ہندی) بھی شامل ہے جسے منشی جی نے کسی دوسرے سے لکھوایا ہے کیونکہ اس کی تحریر اور دوسرے مسودوں کی تحریر میں کافی فرق نظر آتا ہے۔

ان اردو اور ہندی کے مسودوں سے اس عظیم مصنّف کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 'کایا کلپ' کے مسودے سے اس اہم بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ پریم چند اپنی کہانیوں کے کرداروں کو اپنے ہی ماحول سے چنتے تھے اور یہ حقیقی کردار ہوتے تھے۔ 'کایا کلپ' کے شروع میں جس کا مسودہ ہندی میں ہے انھوں نے بطور یادداشت تحریر کیا ہے:

(۱) Vishal Singh is Bachchan Lal, simple. honest (وشال سنگھ بچن لال ہے، سیدھا اور ایماندار)

(۲) Kalyan Singh is Chandrika (کلیان سنگھ چندریکا ہے)

(۳) Chakra Dher is J. Prssad Very shy (چکردھر جے پرساد ہے بہت شرمیلا)

(۴) Bibudha is Yagya Narain Singh, selfish but serviceful, tactful (بودھا یگیہ نرائن سنگھ ہے مگر مطلبی ہوشیار و محنتی)

پریم چند ناول لکھنے کے بعد اس کو دہراتے بھی تھے اور خامیوں کو دور کرنے کے علاوہ اس میں تبدیلی بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے مسودوں پر جگہ جگہ 'کاپیٹ وٹ' کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پریس کے لئے دوسری کاپی تیار کرتے تھے۔ کبھی کبھی پریس کی کاپی دوسروں سے بھی لکھوا لیتے تھے۔ 'چوگان ہستی' کے مسودہ پر لکھی ہوئی تاریخوں سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

چھوٹی بچتیں

بلا شبہ چھوٹی بچتوں میں روپیہ لگانا ضروری ہے۔ یہ بہت آسان کام ہے۔ کسی بنک میں روپیہ رکھنے یا کمپنی کا حصہ خریدنے سے بہت آسان ہے۔ آپ کو صرف یہ کرنا ہے کہ نزدیکی ڈاک خانے تک چلے جایئے۔ بہت سے دیہاتوں میں بنک نہیں ہوتا لیکن تقریباً ہر دیہات کے آس پاس ڈاک خانہ ضرور ہوتا ہے۔ آپ کو صرف ڈاک خانے کے لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ آپ چھوٹی بچت کرنا چاہتے ہیں اور وہاں کے لوگ اس کے بارے میں ساری تفصیل بتا دیں گے۔

روپیہ لگانے کے چار خاص طریقے ہیں:- نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ دس سالہ ٹریژری سیونگ ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ۔ پندرہ سالہ سالیانہ Annuity سرٹیفکیٹ اور پوسٹ آفس سیونگ بنک۔

(۱) نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ:- نیشنل پلان سیونگ سرٹیفکیٹ خریدنے پر ۱۲ سال کے بعد زرِ اصل مع سود واپس ملتا ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۵ سے لیکر ۵۰۰۰ روپے تک کے ہیں۔ آپ اسے کسی ڈاک خانے یا اختیار پائے ہوئے ایجنٹ سے خرید سکتے ہیں۔ مان لیجئے کہ آپ سو روپے کے یہ سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ ۵ سال کے ختم ہونے کے بعد یہ روپیہ ۱۱۶، ۷ سال کے بعد ۱۲۷، ۱۰ سال کے بعد ۱۴۸ اور ۱۲ سال کے بعد ۱۶۵ ہو جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کس طرح سال گذرنے کے ساتھ سود کی شرح بڑھتی جاتی ہے ۱۲ برس کے بعد جب آپ اس سرٹیفکیٹ کے روپے پائیں گے تو سود کی شرح ۴٫۲۵ فی صدی ہو گی جو کسی بھی بنک کی شرح سے بہت زیادہ ہے۔

مان لیجئے کہ آپ کو روپے کی جلدی ضرورت ہے۔ یعنی ۱۲ سال سے پہلے تو آپ کو اپنے روپے یقیناً واپس مل جائیں گے۔ روپے واپس پانے میں آپ کو کوئی دقت نہ ہو گی۔ آپ صرف ڈاک خانے چلے جایئے۔ سرٹیفکیٹ کی پُشت پر دستخط کر دیجئے۔ آپ کا دستخط خریداری کے وقت کے دستخط سے ملنا چاہیئے اور آپ کو روپیہ فوراً مل جائے گا۔ لیکن اپنی ضرورت کے وقت آپ کو ان سرٹیفکیٹوں کو بیچنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ قابل بھروسہ دستاویز ہیں۔ ان کو آپ بنک یا کوآپریٹو سوسائٹی میں گروی رکھ کر روپیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سود کے علاوہ ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔

(۲) دس سالہ ٹریژری سیونگ ڈیپازٹ سرٹیفکیٹ:- بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کچھ روپیہ چھوٹی بچتوں میں لگا سکتے ہیں لیکن ہمیں ہر سال باقاعدہ سود ملنا چاہیئے ہم ۱۲ سال تک انتظار نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں یہ سرٹیفکیٹ آپ کے لئے موزوں ہوں گے۔ ان پر ۴ فی صدی سالانہ سود ہر سال ادا کر دیا جاتا ہے۔ سود پر انکم ٹیکس معاف ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۵۰ سے لے کر ۱۰۰۰ روپیہ تک کے ہیں چوں کہ ان سرٹیفکیٹوں کے جاری کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ آپ اپنے سارے کنبے کی آمدنی یا اپنی ساری زندگی کی کمائی اس میں لگا دیں اس لئے اس کی اجازت دی گئی ہے کہ ایک آدمی ۲۵۰۰۰ تک اس میں لگا سکتا ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کا روپیہ آپ دس سال کے بعد واپس لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو ایک سال کے بعد بھی اس کو بھنا سکتے ہیں۔ صرف ایک بات یہ ہے کہ اگر میعاد سے پہلے انھیں بھنا لیا گیا تو آپ کو ایک معمولی رقم ادا کرنی ہو گی۔ لیکن یہ رقم ملنے والے سود کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اگر آپ انھیں بھنانا نہیں چاہتے اور قرض پر روپیہ چاہتے ہیں تو آپ انھیں بنک، کوآپریٹو بنک اور سوسائیٹیوں میں گرو رکھ سکتے ہیں۔

(۳) پندرہ سالہ سالیانہ سرٹیفکیٹ:- مان لیجئے کہ آپ نے کافی دنوں میں بہت روپیہ جمع کر لیا ہے۔ آپ اس روپے کو لگانا چاہتے ہیں اور باقاعدہ ماہانہ آمدنی بھی چاہتے ہیں۔ اس کا ذریعہ یہ ۱۵ سالہ سرٹیفکیٹس ہیں۔ آپ اپنے بچوں کی تعلیم کا بہترین انتظام ان سرٹیفکیٹوں کو خرید کر کر سکتے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ ۳۳۲۵ روپے سے لے کر ۶۶۰۰۰ روپے تک کے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ۳۳۲۵ روپے لگائیں گے تو آپ کو ۱۵ برس تک ۲۵ روپیہ مہینہ ملتا رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۱۵ برس میں آپ کو ساڑھے چار ہزار روپیہ ملا۔ حالانکہ آپ نے ۳۳۲۵ روپے لگائے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ۴٫۲۵ فی صدی شرح سے مرکب سود ملا۔

پہلے ماہ کی ادائیگی روپیہ لگانے کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد سے شروع ہو جائے گی۔

(۴) پوسٹ آفس سیونگ بنک:- بہت سے لوگوں کا خیال ہوگا کہ ان کے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہے بعضوں کے پاس ایک وقت میں پانچ روپے بھی نہیں ہوتے وہ ڈاک خانے کے سیونگ بنک میں روپیہ جمع کر سکیں۔ آپ ڈاک خانے میں دو روپے سے اپنا حساب کھول سکتے ہیں۔ کوئی بھی فرد ۱۵۰۰۰ روپے تک جمع کرا سکتا ہے ہفتے میں ایک بار آپ روپیہ نکال سکتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک وقت میں چند آنے بچا سکتے ہیں۔ ان کے فائدے کے لئے ڈاک خانے بچت ٹکٹ دیتے ہیں۔ یہ ۴ آنے، ۸ آنے اور ایک روپیہ کا ہوتا ہے جو تمام ڈاک خانوں میں ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ مفت دیا جاتا ہے جس پر ان ٹکٹوں کو چپکانا ہوتا ہے۔ جب ان ٹکٹوں کی قیمت ۵ روپے ہو جائے تو آپ انہیں نیشنل پلان سرٹیفکیٹ سے بدل سکتے ہیں۔

بچوں کو بچت کی عادت ڈالنے کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا ہے۔

گورنمنٹ نے پلان کی مدد کے لئے ایک دوسری چیز بھی نکالی ہے اور وہ ہے نیشنل سیونگ کوپن۔ اسے آپ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو تحفے کی شکل میں دے سکتے ہیں۔ اس کوپن کو آپ شادی، سالگرہ اور اسی طرح کے دوسرے موقعوں پر دے سکتے ہیں یہ کوپن ۵ سے ۱۰۰۰ روپے تک کے ہوتے ہیں اور ڈاک خانوں سے ملتے ہیں۔ تحفہ پانے والے اسے بارہ سالہ نیشنل پلان سرٹیفکیٹ سے بدل سکتے ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت نے بچت کے ایسے طریقے نکالے ہیں جو ہر طرح کی آمدنی والوں کے لئے موزوں ہیں۔ کسان، فیکٹری میں کام کرنے والا مزدور، گھر والیاں، اسکول میں پڑھنے والے بچے ہر کوئی ملک کی بھلائی میں حصہ لے سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی مالی بھلائی میں بھی۔ اس کے لئے ایک بڑا ادارہ قائم کیا گیا ہے تاکہ چھوٹی بچت کا پیغام ہر جگہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ بعض دفعہ تو آپ کو ڈاک خانے تک جانے کی زحمت بھی نہ اٹھانی ہوگی۔ چھوٹی بچت کے بااختیار ایجنٹ آپ کے پاس آئیں گے۔ کمیونٹی پروجیکٹ کے کارکن بھی چھوٹی بچت کی اسکیم کے متعلق آپ کو مشورہ دیں گے۔ اس کے ماسوا شہروں اور قصبوں میں عورتوں کے بہت سے ادارے بن گئے ہیں جو بڑی سرگرمی سے یہ کام کر رہے ہیں کیونکہ عورتوں کے یہ ادارے جانتے ہیں کہ ان اسکیموں سے خاص طور پر گھر والیوں کو فائدہ ہوگا۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ چھوٹی بچت کی اسکیم عوام کے لئے اور ان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ چھوٹی بچت کی اسکیم ہے لیکن اس سے بڑے بڑے فائدے ہوں گے۔ آپ ایک وقت میں پلان کی مدد اور ساتھ ساتھ اپنی مدد بھی کریں گے۔ آپ کا ہر روپیہ ہندوستان کو خوش حال اور مضبوط بنائے گا۔

مزید صنعتوں میں

میٹرک نظام کا نفاذ

یکم اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میٹرک نظام کے آغاز پر، پٹ سن، لوہا و فولاد، سوتی کپڑے، سیمنٹ، کاغذ، نمک، انجنیری ساز و سامان، کافی، غیر آہن آمیز دھاتوں اور خام ربڑ وغیرہ جیسی اہم صنعتوں نے میٹرک باٹوں اور پیمانوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

ناپ تول کے اس نئے نظام کو اب مزید صنعتیں اپنا رہی ہیں۔

تیل کے ریشوں کی صنعت نے میٹرک نظام کو اکتوبر ۱۹۵۹ء سے اختیار کیا، جبکہ چینی کی صنعت میں اس کا نفاذ یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو ہوا۔

ماہ اپریل ۱۹۶۰ء سے اس نظام کے نفاذ کے کام کو اور بھی تقویت پہنچے گی۔ اس مہینے سے وناسپتی اور رنگ سازی کی صنعتوں میں میٹرک باٹ اور پیمانے استعمال ہونے لگیں گے۔

یکم اپریل ۱۹۶۰ء سے پٹرول، اور پٹرول سے تیار ہونے والی اشیا لیٹروں اور میٹرک یونٹوں میں فروخت ہوا کریں گی۔

ماہ اگست ۱۹۶۰ء میں ایک اور اہم اقدام کیا جائے گا یعنی یہ کہ سنٹرل ایکسائز اور کسٹمز ڈیپارٹمنٹ میں بھی میٹرک نظام نافذ کر دیا جائے گا

اختیار کیجئے

میٹرک نظام

آسانی و یکسانی کے لئے

جاری کردہ بھارت سرکار

DA 59/60

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

مجلسِ ادارت

محمد مجیب جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور حیدر آباد
گوپی ناتھ امن دہلی
خواجہ احمد فاروقی دہلی
رحمان راہی سری نگر
یو۔ ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن
جی ۔ این ۔ ایس راگھون ڈپٹی ڈائرکٹر (ایڈیٹوریل)
جی نرنجنا ناتھ ڈپٹی ڈائرکٹر (پروڈکشن)
بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو (سیکرٹری)

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- مظفر شاہ

جلد ۱۸ - نمبر ۹

چیتر شک سمت ۱۸۸۲

اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

سرورق :- دربار صاحب، امرت سر
رسالے کی پشت پر :- یومِ جمہوریہ کی پریڈ میں فقیروں کا جلوس

سالانہ چندہ :- ہندوستان میں :- چھ روپے / پاکستان میں :- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے :- نو شلنگ یا سوا ڈالر
فی پرچہ :- ہندوستان میں :- ۵۰ نئے پیسے / پاکستان میں :- آٹھ آنے (پاک)

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی ۸

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مُلاحظات

وزیرِ اعظم پنڈت نہرو نے چین کے وزیرِ اعظم مسٹر چو این لائی کو سرحدی مسئلے پر گفت و شنید کرنے کے لئے دہلی آنے کی جو دعوت دی تھی اُسے مسٹر چو این لائی نے قبول کر لیا ہے۔ وہ مارچ کے بجائے اپریل میں آئیں گے۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ دونوں ملکوں کے سرحدی تنازعہ کو پُرامن طریقے سے حل کرنا ضروری ہے۔ چین اور ہندوستان کی دوستی دائمی ہے۔ ہندوستان نے شروع سے ہی اس معاملے میں دُور اندیشی اور صبر کا مظاہرہ کیا ہے، اور تنازعہ کے پُرامن تصفیہ کا خواہاں ہے۔ ہمیں امید کرنا چاہیئے کہ دونوں وزرائے اعظم کی ملاقات کامیاب ثابت ہوگی اور متنازعہ مسائل کا حل نکل آئے گا۔

وزیرِ مالیات شری مرارجی ڈیسائی نے پارلیمنٹ میں نئے مالی سال کا بجٹ پیش کیا۔ اس میں ۱۵۳ کروڑ کا خسارہ دکھایا گیا ہے، دفاعی اخراجات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ۲۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کے نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں۔ پانچ سالہ انعامی بانڈ کی اسکیم پیش کی گئی ہے۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے کا یہ آخری بجٹ ہے چنانچہ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ سال کے آخر میں ملک کی معاشی حالت مضبوط ہے جیسا کہ وزیرِ مالیات نے بتایا خاص طور سے نئے ٹیکس تیسرے پنجسالہ منصوبے کو پیشِ نظر رکھ کر لگائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملک کی معاشیات کو مضبوط کرنے اور ترقیاتی کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لئے یہ اقدامات ناگزیر ہیں۔

دلّی میں مرزا غالب کی برسی کے موقعہ پر غالب سوسائٹی اور انجمن ترقیٔ اردو (دہلی شاخ) کی طرف سے تقریبات ہوئیں، اس سلسلے میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے بھی ایک خصوصی تقریب ہوئی، جس میں دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر وی، کے، آر، وی راؤ نے گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین کو شعبۂ اردو کی طرف سے شائع کردہ "اردوئے معلیٰ" کا غالب نمبر پیش کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تقریر میں مرزا غالب کی زندگی کے ان پہلوؤں پر تحقیقی کام کرنے پر زور دیا جن کے متعلق ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ صدرِ شعبۂ اردو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے شعبہ کی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔ پاکستان، افغانستان، ایران اور دیگر ممالک کے ثقافتی نمائندوں نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ حاضرین میں ہندوستان بھر کے ممتاز ادیب اور شاعر شامل تھے۔

افریقہ کے ملک مراکش میں ۲۹۔ فروری اور یکم مارچ کی درمیانی شب میں جو زلزلہ آیا اس سے بندرگاہ اغادیر کے ۷۰ فی صدی مکانات منہدم ہو گئے اور ہزاروں جانیں ضائع ہو گئیں۔ اس تباہی نے قیامتِ صغریٰ کا نمونہ پیش کیا۔ دنیا بھر میں اغادیر کی تباہی پر انسانی ہمدردی کے جذبات امڈ آئے ہیں اور مصیبت زدگان کے لئے ہر طرف سے امداد بہم پہنچائی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں برطانیہ کے آخری وائسرائے کی اہلیہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا ۲ فروری کو شمالی بورنیو میں اچانک انتقال ہو گیا۔ وہ انسانیت دوست، رحمدل اور جرأت مند خاتون تھیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تقسیم کے بعد پناہ گزینوں کو جو امداد پہونچائی اور ان کی بحالی کے لئے جو کوششیں کیں، اس سے ملک کے عام باشندے متاثر ہوئے۔ ہندوستان سے جانے کے بعد بھی ہندوستان سے ان کی دلچسپی برقرار رہی۔ اس سال جشنِ جمہوریہ کے موقع پر وہ دلّی میں موجود تھیں۔

حال ہی میں احمد آباد میں انجمن ترقیٔ اردو کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ اردو شاعری کے باوا آدم ولیؔ گجراتی کی یادگار قائم کرنے اور اُن کے ادبی کارناموں سے گجرات کو روشناس کرانے کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں۔ اس مقصد کے لئے احمد آباد کے معزز شہریوں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی بنائی گئی ہے۔ یہ نہایت مستحسن اقدام ہے جس سے نہ صرف ولیؔ کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم ہوگی بلکہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں بھی امداد حاصل ہوگی۔

صباح الدین عبدالرحمٰن

شاہانِ دہلی کی بزمِ شاعری

دہلی میں غلاموں کی بادشاہت قائم ہوئی تو ان کے لوازمِ شاہی میں علم دوستی، ادب نوازی اور علم پروری بھی داخل ہوئی۔ ان کا زیادہ وقت سلطنت کے سنوارنے میں گذرا، لیکن انھوں نے غزنیں اور غور کی روایات کے مطابق شعراء، فضلاء اور علماء کو سایۂ عاطفت میں لیا اور اُن کی برابر سرپرستی کرتے رہے۔ وہ جب دربار میں کوئی جشن مناتے تو شعراء کو ضرور طلب کرتے اور ان سے ان کا کلام سن کر اپنے ذوقِ شعری کی تسکین بھی کرتے اور ان کو انعام و اکرام سے بھی نوازتے۔ ایسے موقع پر شعراء زیادہ تر قصائد کہتے کیونکہ غزل اس وقت تک شاعری میں صنفِ سخن کی حیثیت سے داخل نہیں ہوئی تھی۔[1] آج کل کے نقطۂ نظر سے اس زمانہ کے قصائد میں محض غلو اور لفاظی ہوتی، لیکن مبالغہ آمیز مدّاحی کسی خوشامد یا چاپلوسی کی دلیل نہ تھی۔ اس زمانے میں عام طور سے شعراء کے سامنے قصیدے ہی کا میدان تھا اور اسی سرزمین میں وہ اپنے جوشِ طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے، اور ان جولانیوں کے دکھانے میں آسمان و زمین کے قلابے ملایا کرتے تھے۔ ان سے مراد ممدوح کی بے جا اور ناروا خوشامد نہیں ہوتی تھی بلکہ زورِ طبع اور شاعرانہ کمال دکھانا مقصود ہوتا تھا جس سے شاعر کی عزّت و توقیر بڑھتی تھی، اس لئے اس زمانے کے قصیدہ نگاروں کی مبالغہ آرائی کوئی عیب نہیں بلکہ ان کے لئے مایۂ ناز ہے۔ بعض شعراء نے تو مبالغے کو اس قدر ترقّی دی کہ اس سے زیادہ وہم و خیال میں نہیں آسکتا ہے۔ اس طرح یہ ایک مستقل فن بن گیا اور بادشاہوں یا امراء کی ایسی مدح کی جاتی جس کے وہ مطلق مستحق نہ ہوتے لیکن ان کے اوصاف بیان کرنے میں قصیدہ نگار اپنا پورا زور صرف کر دیتے۔ مادح اور ممدوح سمجھتے کہ مدح میں جو خیالات ادا کئے جاتے ہیں ان کا تعلّق حقیقت سے نہیں بلکہ محض فنِ شاعری سے ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو شاعری میں جولانیٔ طبع، زورِ بیان، خیال آرائی، مضمون آفرینی، جدّت طرازی، ترکیبوں کی دل آویزی، بندش کی چُستی، استعارات و تشبیہات کی دلفریبی، الفاظ کی شان و شوکت اور قوتِ ایجاد فارسی قصیدہ گوئی ہی کے ذریعہ آئی۔

قصیدہ گو شعراء کا اجتماع برابر درباروں میں رہا۔ قطب الدّین ایبک کے دربار میں مولانا بہاء الدّین اوشی اپنی خوش گوئی اور فصیح البیانی کی داد دیتے اور ایبک کے فیض و کرم سے سیراب ہوتے۔ اس کے دربار کا ایک دوسرا شاعر جمال الدّین محمد جب اپنے قصائد سناتا تو اپنی بلاغت کی داد پاتا۔ ایک تیسرے شاعر قاضی مولانا حمید الدّین اپنے شاعرانہ کمال کی وجہ سے "افتخار الافاضل" سمجھے جاتے۔ تاج المآثر کے مصنّف حسن نظامی نیشاپوری کو وصف نگاری میں کمال حاصل تھا جس میں صنائع لفظی و معنوی کا پورا آرٹ ہوتا تھا۔

تاتاریوں کے فتنے سے ماوراء النہر اور ایران پر جو قیامت گزری اس کی بنا پر علماء کی طرح بہت سے شعراء نے بھی ہندوستان میں آکر پناہ لی اور جس کی رسائی سلطان شمس الدّین التمش کے دربار تک ہوئی۔

---

[1] جب اردو شاعری کا جنم ہوا، فارسی غزل اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ اردو شاعری کو بیان کردہ جملہ محاسن فارسی قصیدے ہی سے ملے (ادارہ)

وہ اس کے جود و کرم سے اچھی طرح سیراب ہوا۔ یہ شعراء وقتاً فوقتاً اپنا کلام سنانے کے لئے دربار میں طلب کئے جاتے۔ ان ہی میں سے ایک شاعر خواجہ ابو نصر ناصری تھا۔ جب وہ اپنا قصیدہ سنانے لگا اور اس نے مطلع پڑھا تو سلطان التمش مطلع سن کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ ناصری بد دل ہوا لیکن سلطان نے فوراً متوجہ ہو کر کہا ناصری پڑھو اور اس کا مطلع دہرایا۔ ناصری کو سلطان کے حافظے پر تعجب ہوا۔ اس نے قصیدے کے اور اشعار پڑھنے شروع کئے۔ جب وہ ختم کر چکا تو سلطان نے قصیدے کو دوبارہ پڑھنے کو کہا۔ جب وہ پڑھ چکا تو سلطان نے پوچھا کہ اس میں کتنے اشعار ہیں؟ ناصری نے کہا کہ ترپن! سلطان نے اسی وقت حکم دیا کہ اس کو ترپن ہزار چاندی کے سکے انعام میں دئے جائیں۔ ناصری اس غیر متوقع انعام سے بے حد خوش ہوا۔ اسی طرح سلطان نے منڈور اور رنتھنبور فتح کئے تو اس موقع پر شاہی جشن منایا گیا۔ شعراء نے بھی تہنیت میں اپنا اپنا کلام پیش کیا لیکن سلطان کو سب سے زیادہ امیر روحانی کا کلام پسند آیا جس کے صلے میں اس کو بڑے انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔ شاعروں میں التمش تاج الدین ریزہ کو اس کی خداداد ذہانت اور شاعرانہ کمال کی بنا پر بہت محبوب رکھتا۔ تاج الدین ریزہ بھی اپنی ممنونیت کا اظہار سلطان کی شان میں قصائد لکھ کر کرتا رہا۔ اس شاعر کو بڑا عروج سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے عہد میں ہوا۔ وہ اس کا دبیر یعنی سیکرٹری ہو گیا۔ وہ بات بات پر اس کی خدمت میں قصیدے پیش کرتا۔ اس سلطان کی تاج پوشی کے موقع پر جب اور شعراء نے قصائد پیش کئے تو شہاب الدین مہمرہ نے بھی ایک قصیدہ گزرانا جس میں اہم اشعار تھے۔ ہر شعر میں کرگ (گینڈا)، گرگ (بھیڑیا)، پیل (ہاتھی)، اور شیر کے الفاظ لائے گئے۔ ان ہی چاروں الفاظ کی رعایت سے پورے قصیدے میں لزوم ما لا یلزم کی صنعت گری کی گئی ہے۔ وہ مشکل صنعتوں میں قصائد کہنے میں کمال رکھتے تھے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ دربار میں جب کوئی اہم تقریب ہوتی تو شعراء اپنا اپنا کلام سنانے کے لئے ضرور مدعو کئے جاتے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے زمانہ میں ہلاکو خاں کا ایلچی دہلی آیا تو سلطان کے نائب الغ خان نے سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کا شاندار خیر مقدم کیا۔ اس کے استقبال کے لئے دہلی کے باہر دو لاکھ پیادے اور پچاس ہزار سوار زرق برق لباس کے ساتھ کھڑے کئے گئے۔ دربار نقرئی و طلائی فرش فروش سے مرصع و مکلف کیا گیا۔ تخت کی زینت و آرائش پورے کر و فر سے کی گئی۔ اس کے ہر طرف لعل و جواہر آویزاں تھے۔ اس کے ارد گرد ملوک، امراء، مشایخ، شہزادے، قوی ہیکل پہلوان، راجا اور رانا بہترین لباس میں کھڑے تھے۔ پورا دربار بہشت کا نمونہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس وقت اس بزم نشاط میں شعراء بلائے گئے جن میں مولانا منہاج الدین کا قصیدہ بڑے غور سے سنا گیا۔

سلطان غیاث الدین بلبن کو شعراء سے کچھ زیادہ دل چسپی نہیں رہی لیکن اسی کے عہد میں شعراء کو بلبن کے شہزادوں اور امراء کے درباروں میں ایسا ملجا و ماویٰ مل گیا تھا کہ ان کو بلبن کے عدم التفات کا احساس مطلق نہ ہوا۔ شمس دبیر، قاضی اثیر، امیر خسرو اور حسن سنجری نے ان شہزادوں اور امراء کی زر پاشی اور سرپرستی میں فارسی شاعری میں جو چار چاند لگائے وہ ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کا ایک اہم اور شان دار باب ہے۔ سلطان بلبن کے بڑے لڑکے شہزادہ محمد سلطان کا علمی دربار ملتان میں لگتا اور اس کی مجلس فضلاء و شعراء سے بھری رہتی۔ اس میں برابر شاہنامہ، دیوان سنائی، دیوان خاقانی اور خمسۂ نظامی پڑھے جاتے۔ ان پر بحث و تمحیص ہوتی، ارباب ذوق شہزادہ کی شعر فہمی کے بے حد معترف تھے۔ خسرو کہا کرتے تھے کہ سخن فہمی، باریک بینی، ذوق صحیح اور متقدمین اور متاخرین کے اشعار کو محفوظ رکھنے میں محمد سلطان جیسا کسی کو نہ پایا۔ اس کے دربار میں ہر جگہ کے شعراء جمع ہو گئے تھے۔ اور جب خسرو اور حسن سنجری اس کی بزم میں آکر شریک ہوئے، تو مؤرخوں کا بیان ہے کہ شہزادے کی مجلس ادب میں پانچ سال تک بڑی رنگینی اور کیفیت رہی، شعراء اپنا اپنا کلام سناتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہوتے رہتے اور جب یہ شہزادہ چنگیز خان کے ہاتھوں شہید ہوا تو اس دور کے تمام شعراء اس کے ماتم میں خون کے آنسو بہاتے رہے۔ امیر خسرو اور حسن سنجری دونوں نے اس "مجلس یاران" کے درہم برہم ہونے پر اپنے قلق اور اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ اور بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ مجلس کے بچھڑے ہوئے دوست بنات النعش ہو کر رہ گئے ہیں پھر یہ بنات النعش کیسے پروین بن سکتی ہیں۔ یعنی اب بچھڑوں کا جمع ہونا

ممکن نہیں۔

سلطان غیاث الدّین بلبن کا دوسرا لڑکا بغرا خان بھی شعراء کو اپنی زرپاشیوں سے سیراب کرتا رہا۔ ایک بار سلطان غیاث الدّین بلبن کے بھتیجے اور اس کے دربار کے ممتاز ترین خان کشلی خاں کی قیام گاہ پر شعراء کا اجتماع ہوا۔ اس میں بغرا خان بھی شریک تھا۔ شعراء نے اپنا اپنا کلام کشلی خان اور بغرا خان کو مخاطب کر کے سُنایا۔ شعراء میں شمس دبیر اور قاضی اثیر کے علاوہ خسرو بھی تھے۔ خسرو کی زمزمہ سنجی سے بغرا خان اتنا متاثر ہوا کہ صلے کے طور پر ان کو ایک لگن بھر کر روپے دئے۔ یہ بات کشلی خان کو ناگوار ہوئی۔ خسرو اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس لئے اس کو یہ پسند نہ آیا کہ اس کا وابستۂ دولت دوسرے کا ممنون ہو۔ یہ ناگواری اس حد تک بڑھ گئی کہ خسرو اس کے دربار سے علیحدہ ہو گئے اور بغرا خان کے یہاں سامانہ چلے گئے۔ جہاں شمس دبیر کے ساتھ خسرو نے شعر و شاعری کی مجلس گرم رکھی۔ شعراء کے ساتھ کشلی خاں کی فیاضی کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک بار جشنِ نوروز کے موقع پر ایک شاعر خواجہ شمس الدّین کی غزل مطربوں نے گائی۔ کشلی خاں بھی اس جشن میں موجود تھا۔ مطربوں نے غزل ختم کی تو اُس نے پوچھا کہ یہ کس کی غزل ہے ؟ انھوں نے بتایا کہ خواجہ شمس الدّین کی۔ کشلی خاں گھر آیا اور خواجہ شمس الدّین کو بُلا کر اپنی مجلس نوروزی کا تمام پُر تکلّف اور قیمتی سامان خواجہ کو عنایت کر دیا۔ یہ عالی ہمّت امیر اکثر ایسی بخشش کرتا کہ اپنے تمام مال و متاع اور خزانے دے دیتا۔ اور اس کے پاس جسم کے کپڑے کے علاوہ اور کچھ باقی نہ رہتا۔

سلطان جلال الدّین خلجی خود شاعر تھا۔ اس لئے اس کے ارد گرد برابر شعراء کا اجتماع رہتا۔ جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔ امیر خسرو، خواجہ حسن، موید جرجانی، موید دیوانہ، امیر ارسلان کلامی، اختیار الدّین باغی اور باقی خطیب۔ ان میں سے امیر خسرو روزانہ تازہ غزلیں تصنیف کر کے لاتے اور سلطان کی ادبی مجلس میں سُنا کر انعام و اکرام سے مالا مال کئے جاتے رفتہ رفتہ سلطان نے جامہ اور سفید کمر بند عطا کر کے ان کو امراء کے گروہ میں داخل کر لیا۔ امیر خسرو کو علاء الدّین خلجی کے زمانہ میں ایک ہزار تنکے ماہانہ ملتے تھے۔ اور سلطان قطب الدّین مبارک خلجی کے سامنے جب انھوں نے اپنی مشہور مثنوی نہ سپہر پڑھی تو سلطان نے خوش ہو کر ان کو ایک ہاتھی کے برابر تول کر انعام میں روپے دئے۔ امیر خسرو جب تک زندہ رہے ان ہی کا طوطی بولتا رہا۔ گو اس زمانہ کی شاہانہ ادبی مجلسوں میں صدر الدین عالی فخر الدین قواس، حمید الدین راجہ، مولانا عارف، عبد الحکیم اور شہاب الدین صدر نشین جیسے شیوا بیان شعراء بھی شریک ہوتے اور سلاطین کی بخششوں سے فیضیاب ہوتے لیکن ان کی شہرت امیر خسرو کے سامنے ماند پڑی رہی۔

مسالک الابصار کے مُصنّف نے لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کے دربار میں عربی، فارسی اور ہندی کے ایک ہزار باکمال شعراء تھے اور ان کی سرپرستی سلطان کرتا رہا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ فقیہہ شمس الدّین اندگانی نے ایک فارسی قصیدہ سلطان کی مدح میں پڑھا جس میں ۲۷ اشعار تھے۔ سلطان نے اس کو ہر ایک شعر کے بدلے ہزار دینار دئے۔ پہلے کے فرمانرواؤں میں سے بعض نے ہر شعر پر ہزار درہم تو دئے تھے لیکن کسی نے ہزار دینار نہیں دیا تھا۔ اسی طرح عبید زاکانی نے ایک مجلس میں سلطان کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تو مطلع سُنتے ہی وہ چیخ اٹھا کہ عبید! تمھارا ہر شعر سُننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ کیوں کہ تمام اشعار کے لئے میرے خزانے میں روپے نہیں ہیں۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ تھیلیوں میں سونے بھر بھر کر عبید کو پاؤں سے سر تک ڈھانک دیا جائے۔ اور یہی تھیلیاں اس کو انعام میں دے دی جائیں۔

لودی سلاطین نے اتنی فیاضی تو نہیں کی۔ لیکن ان کے دربار میں بھی شعراء کا اجتماع رہا۔ سکندر لودی خود بھی شاعر تھا۔ اس لئے وہ شعراء کو جاگیریں دے کر آگرہ اور اس کے نواح میں آباد ہونے کی ترغیب دیتا رہا۔ اور جب بابر اور اس کی اولاد کی سلطنت قائم ہوئی تو ہندوستان میں ادب نوازی، سخن فہمی، سخن وری، سخن شناسی اور سخن سنجی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور قدرت کی طرف سے شعر و شاعری کا جو پاکیزہ شوق بابر کو عطا ہوا تھا۔ وہ اس کی نسل میں برابر منتقل ہوتا رہا۔

بابر ایک بے مثل ادیب، بلند پایہ نقّاد اور قابلِ قدر شاعر بھی تھا۔ اس نے تزکِ بابری میں علی شیر نوائی، سہیلی، آصفی، صفی بخاری، ہاتفی ہمائی بدخشی، کامی، اور ہلالی وغیرہ کی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے وہ آج بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کی معیت میں برابر شعراء رہتے۔ چناں چہ وہ اپنی ایک ادبی مجلس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "جالہ میں اکثر وہ لوگ تھے جو شعر کہتے تھے مثلاً شیخ ابوالاجد، شیخ زین، ملا علی خان، تردی بیگ وغیرہ اثنائے صحبت میں محمد صالح کا یہ شعر پڑھا گیا۔

محبوبیٔ ہر عشوہ گرے را چہ کند کس　　　جائیکہ تو باشی دگرے را چہ کند کس

اور فرمائش کی گئی کہ اس زمین میں کچھ کہا جائے۔ شاعر اور موزوں طبع لوگ فکر کرنے لگے۔ ملا علی خان سے میں بے حد بے تکلف تھا۔ ہنسی سے میں نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

مانند تو مدہوش گمے را چہ کند کس　　　نرگاؤ کے مادہ خرے را چہ کند کس

اس سے پہلے جو کچھ اچھا بُرا کہتے یا ہزل نظم کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو لکھ لیا جاتا تھا۔ جب سے مثنوی مُبین کو نظم کرنے لگا تو دل میں آیا کہ جس زبان سے یہ پاک الفاظ نکلیں حیف ہے کہ اس سے بیہودہ لفظ بھی نکلیں۔ اور جس دل میں ایسے مقدس مضامین کھلیں، اس میں ایسے ناپاک خیال بھی پیدا ہوں۔ اسی دن سے ہزل کہنا ترک کر دیا تھا۔ مذکورہ بالا شعر کہتے وقت خیال نہ رہا۔ دو ایک روز کے بعد بگرام میں آکر مجھے جاڑے سے بخار چڑھا، کھانسی بھی ہوگئی۔ اور کھنکار میں خون آنے لگا۔ اب میں سمجھا کہ یہ تنبیہہ کس طرف سے ہے اور یہ تکلیف کیوں ہے۔ میں نے بار دگر توبہ کی اور اس نالائق طرز سے دل ہٹا لیا۔"

بابر نے کابل کے ایک مرغزار میں پتھر کا ایک حوض کھدوایا تھا۔ یہاں اپنے خوش طبع دوستوں اور شاعروں کے ساتھ عیش و عشرت کی بزم منعقد کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے ایک شعر کہہ کر حوض پر کندہ کرایا تھا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

نوروز و نوبہار و مے و دلبرے خوش است

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

یہ شعر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے۔ بابر صاحب دیوان بھی تھا۔ جو شعراء اس کے ساتھ برابر رہے ان کے نام یہ ہیں:۔ شیخ ابو الوجد فارغی، سلطان محمد کوسہ، مُرخ وداعی، شیخ زین، ملا علی خان، نردی بیگ وغیرہ۔ ۹۳۹ھ میں گوالیار کی مہم میں وہ سخت بیمار ہو گیا تھا۔ بیماری سے شفا پائی تو ایک جشن منعقد کیا۔ اس میں تمام ایلچی، قزلباش، اوزبک اور ہندو امرا بھی شریک ہوئے۔ بابر نے ان سب کو ترازو کے پلڑے بھر بھر کر چاندی اور سونا دیا۔ ان میں بعض شعراء مثلاً شہاب الدین معمائی بھی تھے۔

بابر ہی کی طرح ہمایوں کی زندگی بھی جنگ و جدل میں گذری، پھر بھی فرصت کے اوقات میں وہ شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھتا۔ اسی لئے شعراء کا ایک گروہ برابر اس کے ساتھ رہتا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ بہت سے نادرۂ روزگار شعراء اس کے دامن میں پلے۔ ان ہی میں مولانا جنوبی بدخشانی، ملّا جیرتی، مولانا نادری سمرقندی، مولانا فارغی ہراتی، طاہر دکنی، خواجہ ایوب اور کاہی کابلی تھے۔ ہمایوں ان شعراء کو اپنی علم پرور صحبتوں میں ہمیشہ شریک رکھتا جس سے شعر و شاعری کی مجلسیں برابر گرم رہتیں اور ان کی نکتہ سنجی اور معانی آفرینی ان صحبتوں میں خوب پروان چڑھی۔ اسی لئے وہ اکثر اساتذہ کے کلام میں بلا تکلف اصلاحیں دیتا تھا۔ ایک بار ملّا جیرتی نے اس کے سامنے یہ شعر پڑھا ؎

ہم چو پروانہ بہ شمعے سرو کار است مرا　　　پس اگر پیش روم بال و پرم می سوزند

ہمایوں نے دوسرے مصرعہ میں یہ اصلاح دی ع می روم پیش اگر بال و پرم می سوزند

ملّا جیرتی اس اصلاح سے بہت محظوظ ہوئے۔ اسی طرح ایک موقع پر جاہی یتمان نے شاہ محمد خان شاہ پور والی کابل سے ناراض ہو کر اس کی ہجو کہی اور جب ہمایوں کے سامنے یہ پڑھی گئی تو اس کا آخری شعر یہ تھا۔

وائے آں کس کہ بہ خیل شعرا بستیزد　　　ہر کہ با ما بستیزد بہ بلا بستیزد

آخری مصرعہ سُن کر ہمایوں نے فی البدیہہ کہا کہ اس کو اس طرح پڑھو

ہر کہ با ما بستیزد بخدا بستیزد

اکبر زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن اس کے ذاتی شوق کا یہ عالم تھا کہ فارسی کی مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہو جو اس کے سامنے پڑھی نہ گئی ہو اخلاقِ ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوبات شرف الدین منیری، گلستان، حدیقہ، مثنوی معنوی، جامِ جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ نظامی، خسرو اور مولانا جامی کے کلیات، خاقانی، اور انوری کے دیوان اس کے سامنے برابر پڑھے جاتے۔ اور وہ پڑھنے والے کو جیب خاص سے انعام دیتا اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کو دیوان حافظ اور مثنوی مولانا روم کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ کبھی کبھی فارسی اور ہندی میں اشعار بھی کہہ لیتا تھا اور بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں بھی کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس کے سامنے فغانی کا یہ شعر پڑھا گیا

مسیحا یا رو خضر ش ہم رکاب و ہم عنان عیسےٰ　　　فغانی آفتاب من بدیں اعزاز می آید

اکبر نے دوسرے مصرع میں برجستہ اصلاح دی۔

فغانی شہسوارِ من بدیں اعزاز می آید

ایک موقع پر طالب صفاہانی کی حسب ذیل رُباعی اس کے سامنے پڑھی گئی۔ اس میں حکیم ابوالفتح گیلانی کی موت پر افسوس اور اس کے بھائی حکیم ہمام کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا گیا تھا۔

مہر و برادرم کہ ز دمساز آمد | او شد بہ سفر وین ز سفر باز آمد
او رفت بد نبالہ او عمر برفت | وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اس رُباعی کو سُنا تو کہا کہ دنبالہ کے لفظ سے شعر میں گرانی پیدا ہو گئی ہے۔ اس لئے یہ مصرع اس طرح پڑھا جائے تو بہتر ہے۔

او رفت و ز رفتنش مرا عمر برفت

اکبر کی فیاضیاں اور زرپاشیاں سُن کر ہر جگہ سے شعراء اس کے دربار میں اُمنڈ آتے تھے۔ خواجہ نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری میں اکیاسی (۸۱) ایسے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے دربار میں پہنچ کر تقرب حاصل کیا۔ اکبر نہ صرف ان پر سیم و زر کی بارش کرتا، بلکہ ان کے ذوقِ سخن کو بلند کرنے کی خاطر ملک الشعراء کا خاص عہدہ مقرر کیا جس پر سب سے پہلے غزالی مشہدی، اور اس کے بعد فیضی مامور ہوا، فیضی اکبر کا محبوب ترین دوست رہا۔ اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور اس کی ہمہ گیر قابلیت سے برابر فیض یاب ہوتا رہا۔ فیضی بھی اکبر کو بہت محبوب رکھتا تھا۔ اس کو بڑے بڑے عہدے دئے گئے۔ لیکن وہ اکبر کے قریب ہی رہ کر علمی و ادبی مشاغل میں زندگی بسر کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ایک بار ایران سے شاہ عباس صفوی نے اکبر کے پاس قیمتی تحائف لے کر اپنے ایک ایلچی کو بھیجا۔ مؤخر الذکر نے دربار میں آتے ہی ایک مکتوب پڑھا جس کے سرورق پر یہ رُباعی تھی۔

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد | رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پُر از زر نازد | عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

جب یہ رُباعی پڑھی گئی تو دربار کا ہر شخص چونک اٹھا۔ اکبر نے فیضی کی طرف دیکھا۔ فیضی اپنے محبوب کی سبکی برداشت نہ کر سکا اور فی البدیہہ یہ رباعی کہہ کر سرِ دربار پڑھی

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد | دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد | کونین بہ ذاتِ پاک اکبر نازد

اس کو سُن کر دربار میں مسرّت و افتخار کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اکبر کی محبت فیضی سے آخر وقت تک قائم رہی اور جب فیضی کا انتقال ہوا تو اکبر نے غایت اضطراب اور صدمہ میں سر سے دستار اُتار کر زمین پر پھینک دی۔

شعراء کے ساتھ اس کی زرپاشی کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں خواجہ حسین مروی نے شہزادہ سلیم کی ولادت کے موقع پر ایک قصیدہ پیش کیا تو اکبر نے اس قصیدہ پر دو لاکھ ٹنکے انعام میں دئے۔ گھوڑا، ہاتھی، خلعت اور جاگیر دینا تو معمولی بات تھی۔

اکبر کے دربار کی روایت اس کے امراء نے بھی اپنے اپنے دربار میں قائم کی۔ غزالی مشہدی عراق سے ہندوستان آیا تو اکبر کے درباری امیر خان زمان حاکم جونپور نے ایک ہزار روپے زادِ راہ بھیج کر اس کو اپنے دربار میں بُلایا۔ یہاں ایک مثنوی نقش بدیع لکھ کر خان زماں کی خدمت میں پیش کی۔ جس میں ایک ہزار شعر تھے۔ سخن فہم اور سخن سنج خان زماں کو یہ مثنوی اس قدر پسند آئی کہ فی شعر ایک اشرفی انعام میں دی۔ خانخاناں بیرم خان کو ہاشمی قندھاری کی ایک غزل بہت پسند آگئی تھی۔ اس نے ہاشمی کو ایک لاکھ ٹنکہ دے کر یہ غزل اپنی طرف منسوب کر لی۔ بیرم خان کے لڑکے خانخاناں عبدالرحیم کی سخن سنجی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ اپنے مشہور ہم عصر شعراء نظیری، عرفی، شکیبی اور انیسی کے مقابلہ میں غزلیں کہتا اور بعض اوقات سب میں ممتاز رہتا۔ اس کے دربار میں برابر مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ ایک بار طرح تھی چند است پند است فرزند است، تمام شعرائے اکبری نے اس زمین میں طبع آزمائی کی۔ مگر میدان خانخاناں کے ہاتھ رہا۔ حتیٰ کہ نظیری بھی اس کے کلام کی صفائی اور دل آویزی میں اس سے بازی نہ لے جا سکا۔ اس زمانہ کے اکثر شعراء اس کی زرپاشی سے سیراب ہوئے۔ اس کی فیاضی کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نوعی شیرازی کو سونے میں تُلوا دیا۔ نظیری نے ایک بار کہا کہ اس نے ایک لاکھ روپے کا ڈھیر نہیں دیکھا ہے۔ خانخاناں نے یہ ڈھیر دکھا کر اس کے گھر بھجوا دیا۔ ایک ہندی شاعر گنگ کوی کو اس نے ایک بار چھتیس (۳۶) لاکھ روپے انعام میں دئے۔ خانخاناں عبدالرحیم ہی کی طرح اکبری دربار کے ایک دوسرے عظیم المرتبت امیر حکیم ابوالفتح گیلانی نے اپنے یہاں شاعری کی ایک اکیڈمی قائم کر رکھی تھی۔ جہاں اس زمانے کے اکثر شعراء مثلاً خواجہ حسین ثنائی، مرزا قلی میلی، فیضی، عرفی شیرازی، حیاتی گیلانی اور مرزا نورالدین قراری وغیرہ فنِ شعر و شاعری پر بحث و تمحیص کرتے رہتے اور اسی محاکمہ و محاسبہ کی بدولت ان شعراء نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعتِ ایہام، استعارات و تشبیہات، فلسفیانہ خیالات

اور نئی نئی ترکیبوں میں طرح طرح کی جدّت پیدا کی، جو اس زمانہ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا تو شاہی دربار باکمال شعراء سے بھرا ہوا تھا لیکن اس نے جوہر شناسی سے کام لے کر طالب آملی کو ملک الشعراء بنایا۔ وہ طالب کی تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی لطافت سے برابر متاثر رہا، اس نے طالب آملی کے دیوان سے کچھ اشعار منتخب کئے۔ جن کے متعلق مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا۔ جہانگیر کے پاکیزہ ذوق کی یہ دلیل تھی کہ وہ کبھی یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ اس کے سامنے شاعری میں کسی قسم کی بدمذاقی کی جائے۔ ایک دفعہ ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا حضور نہیں۔ جہانگیر نے کہا اچھا ہوا۔ ورنہ تمہارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے۔ "لت بر سرت" اور یہ سخت بے ادبی ہے۔

اسی زمانے میں مٹے تخلص کا ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا۔ کلال کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی۔ مٹے نے نور جہاں بیگم کے توسل سے جہانگیر کے دربار میں شاعری کی تقریب سے رسائی پیدا کرنی چاہی۔ جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے۔ ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن نور جہاں کی خاطر عزیز تھی۔ اجازت دی، مٹے نے یہ شعر پڑھا ؎

مٹے بہ گریہ سحر ار دلے نصیحت گر کنارہ گیر کہ امروز روزِ طوفان است

جہانگیر نے کہا۔ دیکھا وہی اپنے پیشہ کی رعایت۔ دوسرے موقع پر پھر نور جہاں بیگم نے تقریب کی۔ مٹے نے مطلع پڑھا

من می روم و برق زنان شعلۂ آہم اے ہم نفساں دور شوید از سرِ راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اتر کہاں جا سکتا ہے۔

ایک بار ایک ہندو شاعر نے ہندی میں جہانگیر کے سامنے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی، جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی۔ کیوں کہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اُس کا بیٹا اُس کے بجائے عالم افروزی کرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد کو خدا نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا۔ آفتاب کو رشک ہے کہ آپ کے طالع کی روشنی اور عدالت کے نور سلطنت میں کہیں رات نہیں۔ جہانگیر اس اچھوتے خیال کو سُن کر بہت محظوظ ہوا۔ اور ایک ہاتھی انعام دیا۔ پھر اس کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

جہانگیر کی شہزادگی کے زمانہ ہی سے شعراء اس کے یہاں ملازم تھے۔ اور اس کی مجلس شعر و شاعری سے ہمیشہ گرم رہی۔ ایک بہت ہی کمسن شاعر جس کی عمر تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی، شہزادہ سلیم کے دربار میں اپنی سخن گستری کی داد لیتا تھا۔ سلیم ہی نے اس کا تخلص طفلی رکھا تھا۔ عرفی جب ہندوستان پہنچا تو شہزادہ سلیم نے بھی اس کے کلام کی شان و شوکت، استعارات کی طرفگی بندش کی چُستی، مضامین کی نازک خیالی اور خیالات کی رفعت کی بڑی شہرت سُنی۔ چناں چہ اس نے عرفی کو اپنے دربار میں بُلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی، اس دعوت پر وہ بڑا نازاں رہا۔ جہانگیر تخت پر بیٹھا تو طالب آملی اس کے دربار میں حاضر ہوا۔ مگر جب وہ جہانگیر کے حضور میں پہنچا تو ایسا مخمور اور مسحور ہو گیا کہ اس کی کسی بات کا جواب نہ دے سکا۔ لیکن رفتہ رفتہ جہانگیر اس کے شاعرانہ کمالات سے خود بخود متاثر ہوتا گیا۔ نظیری نیشاپوری نے جہانگیر کی شان میں ایک قصیدہ کہا تو اس کے صلے میں ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کیا۔ حیاتی گیلانی تو اس قدر محبوب تھا کہ وہ اس کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا۔ اور اس کی شاعری سے لُطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس نے خسرو شیریں کی بحر میں قصّہ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا تو جہانگیر نے خوش ہو کر اس کو سونے میں تُلوا کر سونا انعام میں دے دیا۔

جہانگیر کے فوجی کیمپ میں بھی شعراء ساتھ رہتے۔ ۱۰۲۴ھ میں وہ اجمیر گیا تو لشکر کے ساتھ شاہی جلو میں شعراء بھی تھے۔ ایک روز شیخ فیروز کی قیام گاہ پر تمام اصحابِ سخن مثلاً طالب آملی، ملا عطائی جونپوری، انور لاہوری طفیلی فتح پوری وغیرہ جمع ہوئے۔ شیخ فیروز کو مقبولیت اس لئے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ یہ مجلس جاری تھی کہ اس دور کا مشہور شاعر شیدا بھی آ پہنچا۔ وہ بہت ہی ذہین، بزلہ گو اور ذی علم شاعر تھا۔ مگر تمام شعراء اس کی خردہ گیری، عیب جوئی اور ہجو گوئی سے عاجز تھے وہ فتح پور آگرہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے ایرانی شعراء اس کو ہندوستانی سمجھتے تھے۔ لیکن اس نے تمام ایرانی شعراء حتیٰ کہ طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزا سے

پنجیر کیا۔ مذکورہ بالا مجلس میں شیدا پہنچا تو تمام شعراء نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ شیدا نے یہ شعر پڑھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے　　حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے۔

عشق را نی ہیمبر ولیکن　　حسن را آفریدگار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا، لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا۔

زبسکہ کرد غمت تند بر جگر ناخن　　چو پشت ماہیم از پائے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثائی حلوائی کا چربہ ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن درو نشست　　چو پشت ماہیست سراپائے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا مگر ایک اور شعر پڑھ کر داد چاہی

گر بہ صحرا موفشانی وشت بر سنبل شود　　در بدریا رو بشوی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولا کہ یہ تو ملا کانبی کے شعر سے توارد ہے

گر بدریا فتد از عکس جمال او فروغ　　خار ماہی آورد در قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑ کر کہا کہ اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد　　از روی ادب مہر خدا بر پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا، شیدا نے زچ ہو کر بد کلامی شروع کر دی لیکن اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے تو اس نے یہ شعر پڑھا

زلف او را رشتۂ جان گفتم و گشتم خجل　　زانکہ این معنی چو زلفش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ مہمان کی دل آزادی مراد نہیں لیکن اس مضمون کا ایک شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہے

کس نیا بد مصرعۂ پیچیدۂ زلف کجت　　گرچہ این مضمون ترا در پیش پا افتادہ است

بالآخر شیدا پہ مہر سکوت لگ گئی۔ اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی۔ اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا۔

اکبر اور جہانگیر نے شعراء کی سرپرستی میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں۔ ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہا تھا۔ ایران سے شعراء ہندوستان امڈے چلے آ رہے تھے۔ اور بقول مولانا شبلی ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے۔ چناں چہ شاہجہان کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی۔ بلکہ وہ اپنی فیاضی و قدردانی میں اکبر اور جہانگیر دونوں سے بازی لے گیا

حاجی محمد جان قدسی اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ وہ مکہ معظمہ سے تعلیم پا کر ہندوستان آیا تو پہلے شاہجہانی دربار کے ایک امیر خواجہ عبداللہ خان زخمی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ اس وقت خواجہ عبداللہ ایک فوجی کیمپ میں تھا۔ وہ قصیدہ سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا اور قدسی کو اپنی جگہ پر بٹھایا پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ، اس کے تمام متعلقات اور لشکر کی تمام چیزیں قدسی کو انعام دے دیں۔ قدسی نے شاہجہان کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک قصیدہ کہا۔ بادشاہ عبداللہ خان کی بخشش کا حال سن چکا تھا۔ اس نے کہا "حاجی! عبداللہ خان نے تم کو جو انعام دیا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے۔" لیکن اس نے جواہرات کی مختلف قسمیں طلب کیں اور حکم دیا کہ قدسی کا منہ بار بار موتیوں سے پُر کیا جائے۔ سامنے سونے کا طشت رکھا گیا۔ قدسی کا منہ بھر جاتا تو اس طشت میں موتیوں کو گرا دیتا تھا۔ ۱۰۳۵ھ میں قدسی نے جشن نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تو شاہجہان نے انعام میں اس کو روپے میں تُلوایا جو وزن میں پانچ ہزار پانچ سو تھے۔ ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہان نے ایک کروڑ روپے کی لاگت سے تختِ طاؤس تیار کرایا اور آگرہ میں جشنِ نوروز کے موقع پر اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو دربار کے شعراء نے اس تقریب میں قصائد کہہ کر اپنی لیاقت و ذہانت کا ثبوت دیا۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیم نے بھی ایک قصیدہ کہا جو شاہ جہان کو سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس کے صلہ میں کلیم کو روپے کے برابر تُلوایا جو ۵۵۰۰ وزن میں آئے اور اس کو عطا کئے۔ شاہجہان نے کلیم کو اس کے پسندیدہ اشعار پر خدا جانے کتنی اشرفیاں دی تھیں۔ ایک موقع پر قیصر روم نے شاہجہان کو خط لکھ کر یہ اعتراض کیا کہ صرف ہندوستان کا بادشاہ ہو کر شاہجہان کا لقب اختیار کرنا صحیح نہیں۔ اس اعتراض پر شاہجہان کچھ پریشان ہوا۔ اور اپنا لقب بدلنے کے لئے تیار بھی ہو گیا۔ لیکن کلیم نے ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس میں لقب کی یہ توجیہہ کی۔

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکے است
شہ را خطابِ شاہ جہانی مبرہن است

شاہجہان نے خوش ہو کر کلیم کو روپے میں تُلوایا۔ شاہ جہان جب تخت پر بیٹھا تھا تو صائب نے ایک تاریخی قطعہ کہا جس کے صلہ میں شاہجہان نے اس کو بارہ ہزار روپے دئے۔ کچھ دنوں کے بعد منصب اور خطاب بھی عطا کیا۔ اور جب صائب ایران چلا گیا تو شاہ عباس ثانی نے بھی اس کی بڑی قدردانی

کی لیکن صائب کو ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔

بعض شعراء شاہجہان جیسے باوقار اور متین بادشاہ کی خدمت میں گستاخ بھی تھے۔ ان ہی میں شیدا بھی تھا۔ ایک بار شاہجہان نے اس سے پوچھا کہ تم شعر اچھا کہتے ہو یا حکیم حاذق گیلانی، شیدا نے بادشاہ کے اس سوال کو ناپسند کیا کیوں کہ وہ حکیم حاذق گیلانی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتا تھا اور اس کی ہجو کہہ چکا تھا۔ اس لئے جل کر بولا "ہم دونوں سے واسطے پاسٹے واس بہتر کہتا ہے" واسطے پاسٹے واس شاہی دربار کا ادنی ملازم تھا۔ جو مضحک اشعار کہتا تھا۔ شاہجہان اس جواب سے بہت کبیدہ خاطر ہوا، اور شیدا کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا ایک موقع پر شیدا کا یہ مشہور شعر شاہجہان کو سنایا گیا

بیعت دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے　　حسن را پروردگار و عشق را پیغمبرے

شاہجہان نے ام الخبائث شراب کی یہ توقیر اپنے قلمرو میں پسند نہیں کی لیکن شیدا نے اپنی برأت میں جامی کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا۔

از صراحی دو بار قلقل مے　　پیش جامی بہ از چہار قل است

عالمگیر کو شعراء سے کم دلچسپی رہی۔ لیکن دربار میں جو ادبی روایت بن گئی تھی۔ وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ کچھ ایسے شعراء بھی ہوئے جو دربار سے وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ مثلاً مرزا عبدالقادر بیدل دربار میں جاکر قصیدہ خوانی کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ اور جب عالم گیر کے جانشیں شاہ عالم بہادر شاہ نے ان سے قصیدہ کہنے کی فرمائش کی تو وہ اس کی ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے اور بقیہ عمر توکل میں گذار دی۔

جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو محمد شاہ، شاہ عالم اور بہادر شاہ میں اسلاف کی علم پروری اور ادب نوازی کا خمیر ضرور موجود تھا مگر اس وقت شمع سحر میں ان کے اسلاف کے آفتاب نصف النہار کی ضوفشانی کہاں سے آتی۔ دربار میں شعراء تو ضرور ہوتے لیکن ان کی اگلی سی قدردانی نہیں رہی۔ شاہ عالم ثانی سید انشاء اللہ خاں کو خاص طور سے بہت محبوب رکھتا تھا۔ ان کی ایک لمحہ کی جدائی اس کو گوارا نہ ہوتی۔ مگر بقول محمد حسین آزاد عبرت کا مقام یہ تھا کہ جس کے اسلاف ایک ایک شعر کے صلہ میں شعراء کا منہ زر و جواہر سے بھر دیتے تھے اور ان کو سونے چاندی میں تلواتے تھے۔ آج ان کے وارث کے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ اپنے محبوب شاعر کے بچوں کے لئے دو دو کھجوروں کے لئے کچھ رقم دیتا۔ اس زمانے میں دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے۔ شاہ عالم بھی اپنی غزل ان مشاعروں میں بھیجا کرتا۔ ایک بار شاہ عالم سے سید انشاء نے کہا کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں یہ سن کر شاہ عالم کو دکھ ہوا اور اس نے مشاعروں میں اپنی غزل بھیجنی بند کر دی۔ سید انشاء کی یہ حرکت اور شعراء کو ناگوار گذری، ایک مشاعرہ میں ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا۔

مجلس میں چکے چاہئے جھگڑا شعراء کا　　ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا　　اکبر تیئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

انشا کب چوکنے والے تھے۔ اسی مشاعرہ میں انھوں نے اپنے معترضین کو مخاطب کرتے ہوئے فخر، تعلی اور پندار سے بھری ہوئی ایک غزل پڑھی جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکما سب　　چڑیوں کی طرح کہتے ہیں چوں چوں مرے آگے
لپٹے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں　　بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

شاہ عالم کے لڑکوں میں مرزا جہاندار شاہ، مرزا احسن بخت، مرزا سلیمان شکوہ، مرزا فرخندہ بخت اور مرزا فخر الدین کو شعر و شاعری سے بڑا لگاؤ رہا، یہ سب شاعر بھی تھے۔ اس لئے ان کے یہاں برابر شاعروں کا جمگھٹا رہتا۔ گلزار ابراہیم کے مصنف نے لکھا ہے کہ مرزا جہاندار اپنے یہاں مہینے میں دو بار مشاعرہ کرتا اور شعراء کو چوبدار بھیج کر بلواتا اور نہایت التفات و عنایت سے پیش آتا۔ لیکن اس زمانہ میں شعر و شاعری کا سب سے بڑا مرکز مرزا سلیمان شکوہ کا دربار ہو گیا تھا۔ اس کے یہاں تمام ممتاز شعراء کا اجتماع برابر رہتا۔ محمد حسین آزاد کی روایت ہے کہ ایک روز مرزا سلیمان شکوہ کے پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ شرفا اور شعراء کا حسب معمول مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے۔ کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ ان کی پرانی وضع اور لباس کو دیکھ کر مرزا شکوہ مسکرایا، مزاج پرسی کی حقہ پیش کیا۔ مرزا شکوہ نے سودا کو مخاطب کر کے کہا کہ کچھ ارشاد فرمایئے۔ سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے مخمس کہا ہے۔ سلیمان شکوہ نے کہا وہ کیا ہے؟ سودا نے میر ضاحک پر اپنی ہی کہی ہوئی، ہجو کا پہلا بند پڑھا کہ میر ضاحک اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بے چارے پریشان تھے کہ کیا آفت آگئی سب اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں کو الگ کیا سودا کنارے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ

نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ میں اپنی بزم سجائی، تو لکھنؤ کی سرزمین پر چھوٹی دہلی بسا دی انشاء، جرأت، سوز اور مصحفی ان کے دربار میں ملازم رہے ان سب میں بڑے بڑے شاعرانہ معرکے رہے۔ پہلے تو یہ شاعرانہ چشمک رہی۔ پھر نوبت جنگ و جدل اور فحش اور جھگڑے تک پہنچ گئی، انشاء اور مصحفی کی مشہور چوٹیں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ مرزا سلیمان شکوہ پہلے مصحفی سے اصلاح لیا کرتا تھا۔ لیکن جب سیّد انشاء بھی اس کے دربار سے منسلک ہوئے تو مصحفی کا چراغ گل ہو گیا اور ان کی تنخواہ میں بھی تخفیف ہو گئی جس پر مصحفی نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔

استاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر   ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اسی کے بعد مصحفی اور انشاء میں برابر چھیڑ چھاڑ رہی۔ سلیمان شکوہ کے یہاں ایک مشاعرہ ہوا تو مصحفی نے بھی اپنی غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا۔

زہرہ کی جو آئی کف ہاروت میں انگلی   کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی

اور جب انشاء نے اپنی غزل پڑھی تو مصحفی ہی کے مطلع کو سامنے رکھ کر اپنا مطلع کہا۔

دیکھ اس کی پڑی خاتم یاقوت میں انگلی   ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

مصحفی کی غزل کا مقطع یہ تھا

تھا مصحفی پہ مائل گریہ کہ پس از مرگ   تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفی مشاعرہ سے جا چکے تو غالباً انشاء ہی کے اشارہ پہ مصحفی کے اشعار کو الٹ پلٹ کر اس کی مٹی پلید کی گئی اور مقطع کو اس طرح کر دیا گیا۔

تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو پس از مرگ   رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس کی خبر مصحفی کو پہنچی تو انھوں نے ایک فخریہ غزل پڑھی اور انشاء اور دوسرے شاعروں پر چوٹ کی۔

پھبتا نہیں ہے بزم امیران دہر میں   شاعر کو مرے سامنے غوغائے شاعری
ایک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے   سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

بات بڑھی، سیّد انشا نے ایک بحر طویل میں مصحفی کی ہجو کہی۔ اور پھر نوبت یہ پہنچی کہ مشاعرہ میں جیسی بھی طرح ہوتی، دونوں ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے۔ چنانچہ انشاء نے مصحفی پر اپنی غزل میں ایک شعر یہ بھی کہا

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے   سر خرس کا، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

مصحفی کے شاگرد بھی میدان میں اتر پڑے۔ انشاء دو بیڑے لگے میں ڈالے رہتے تھے۔ اس طرح کہ ایک سرا آگے اور دوسرا پیچھے پڑا رہتا اسی کو سامنے رکھ کر مصحفی کے شاگردوں نے ہجو اشعار کہے اس کا ایک مصرع یہ تھا

باندھی دُم لنگور میں لنگور کی گردن

لیکن سیّد انشا کب دب کر رہنے والے تھے انھوں نے یہ سن کر اُسی وقت کہا

سفرہ پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو   سر لون کا سر، منہ بیانہ کا، اچھوڑ کی گردن

پھر اس جھگڑے کی نوعیت اس طرح بدل گئی کہ دونوں طرف سے سوانگ بھر بھر کر ایک دوسرے کے مکان پر دھاوا بولنے لگے۔ مصحفی کے شاگرد شہدوں کا سوانگ بھر کر ہجو پڑھتے ہوئے ان کے گھر پر پہنچے۔ اس کا جواب سیّد انشا نے اس طرح دیا کہ ایک نقلی بارات سجائی، لوگوں کو ہاتھیوں پر بٹھایا جو ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا پکڑے دونوں کو لڑاتے اور زبانی ہجو پڑھتے جاتے، جس کا ایک شعر یہ ہے

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن   لڑتے ہوئے آتے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں مرزا سلیمان اور اُس کے درباری امراء سیّد انشا کا ساتھ دیتے رہے۔ اس سے رنجیدہ ہو کر مرزا سلیمان شکوہ کی خدمت میں مصحفی نے ایک غزل گذرانی جس کا مطلع یہ تھا

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں   کچھ اس کے سوا اب میری تدبیر نہیں یاں

مغلیہ خاندان کے آخری دور میں شاید ہی کوئی شہزادہ ایسا تھا جو اردو میں اشعار نہ کہتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایسے شہزادے جو اردو کے شاعر ہوئے ان کی فہرست بڑی طویل ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ سپہر شکوہ اسرار، مرزا وجیہہ الدّین اختر، مرزا محی الدّین اشکی، مرزا غلام حسین انداز، مرزا رحیم الدّین ایجاز، مرزا فخر الدّین حشمت مرزا رحیم الدین حیا، مرزا اخضر، مرزا رفعت، مرزا فخر الدّین سیادہ، مرزا غیاث الدّین شرر، مرزا نصیر الدّین حیدر شہرہ، مرزا عالی بخت عالی، مرزا عزیز الدّین عزیز، مرزا کلن عشرت، مرزا قادر شکوہ قادر، مرزا قادر شکوہ خادر، مرزا غلام نصیر الدّین قناعت، بہرام شاہ محب، مرزا منگو مخزون، مرزا محمود محمود وغیرہ ان کے یہاں برابر شعر و شاعری کی مجلسیں آراستہ کی جاتیں۔ جن سے سلطنت کو تو نقصان پہنچا لیکن اردو شاعری کی غیر معمولی آبیاری ہوتی رہی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں تو لال قلعہ مستقل ایک مشاعرہ کی مجلس بن کر رہ گیا تھا۔ اس زمانہ کے تمام شعراء بہادر شاہ ظفر کے حضور میں جمع رہتے

لیکن ان میں سب سے زیادہ تقرب ذوق کو حاصل رہا۔ محمد حسین آزاد نے اپنے استاد سے غایت عقیدت میں کہہ دیا ہے کہ ضخیم دیوان کا زیادہ تر حصہ ذوق ہی کا کہا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ لیکن اس بحث میں پڑنے کی ضرورت اس وقت نہیں۔ ذوق و ظفر ایک دوسرے سے ایسے وابستہ رہے کہ دونوں کی نوکِ زبان پر اشعار رہتے تھے۔ ایک بار برسات کا موسم تھا۔ بہادر شاہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ قطب صاحب گیا ہوا تھا۔ مرزا فخرو اور ذوق بھی ساتھ تھے۔ دونوں چاندنی رات میں ایک تالاب کے پاس چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ مرزا فخرو کی زبان سے نکلا۔

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ذوق سے کہا گیا کہ مصرع لگایئے۔ انھوں نے فوراً کہا

تابِ عکسِ رخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر

ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغا جان عیش نے اپنی غزل پڑھی تو اس میں ایک شعر تھا

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے ۔۔۔ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

حکیم صاحب کے بعد ہی ذوق کے سامنے شمع پیش کی گئی تو انھوں نے اپنی غزل کا ایک شعر اس طرح پڑھا۔

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات ۔۔۔ رو کر گذار یا اسے ہنس کر گذار دے

لوگوں نے اسی وقت اندازہ لگایا کہ ایک منزل پر دونوں صاحب پہنچے مگر کس کس انداز سے پہنچے۔ ایک دن معمولی دربار تھا۔ ذوق موجود تھے۔ ایک شہزادہ آیا اور بادشاہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ کر چلا گیا۔ حکیم احسن اللہ نے عرض کیا کہ یہ آنا کیا تھا اور جانا کیا تھا۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا ع

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

ذوق نے اُسی وقت کہا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ۔۔۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اسی دربار میں بہادر شاہ کی موجودگی میں ذوق اور غالب میں برابر چوٹیں ہوتی رہتیں۔ غالب نے ذوق ہی پر طنز کیا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اور پھر جب غالب نے مرزا جوان بخت کی شادی کے موقع پر سہرا کے مقطع میں یہ کہا کہ

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ۔۔۔ دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

تو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ذوق نے بھی اس کی چبھن محسوس کی، اور ذوق نے اپنے سہرا میں یہ کہہ کر جواب دیا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دو اس کو ۔۔۔ دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اور آخر میں غالب کو یہ کہنا پڑا

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

جگن ناتھ آزاد

غزل

تڑپ کہیں ہو چکی تھی پیدا ظہورِ بزمِ جہاں سے پہلے
کہ اپنے جلووں میں خود گھرا تھا مکیں نمودِ مکاں سے پہلے

ضیائے شمس و قمر سے پہلے، تجلّیٔ کہکشاں سے پہلے
دل اپنے جلوے لٹا رہا تھا فروغِ بزمِ جہاں سے پہلے

ادھر میں وابستۂ ازل ہوں ادھر ابد سے مرا تعلّق
مرا فسانہ تھا ہر زباں پر فسانۂ دو جہاں سے پہلے

ترے لئے میرے دل میں وہم و گماں کی گنجائشیں کہاں تھیں
کہ بس چکا تھا یقین دل میں نمودِ وہم و گماں سے پہلے

بہار والو! اسی گلستاں کے ایک گوشے میں شاخِ گُل پر
مرا بھی اک آشیاں تھا لیکن بہار کی داستاں سے پہلے

لبِ زمانہ پہ آئے گا کیا بیانِ فرہاد و قیس کا اب
ہوئے ہیں فرہاد و قیس لیکن یہ تھے مری داستاں سے پہلے

کہیں سے چھیڑوں میں اپنا قصّہ یہ دردِ فرقت کی داستاں ہے
سناؤں بھی میں یہ قصّۂ غم اگر تو آخر کہاں سے پہلے

جو بے خودی کی یہی ہے صورت جو سرخوشی کا یہی ہے عالم
تو رازِ دل کا نہ فاش کر دوں کہیں میں خود رازداں سے پہلے

غزل میں حسنِ بیاں بڑی شے ہے شک نہیں مجھ کو اس میں لیکن
میں سوزِ جذبے کا دیکھتا ہوں غزل میں حسنِ بیاں سے پہلے

مری جبینِ نیاز آزاد! ایک سجدہ بنی ہوئی تھی
وجودِ ہر سنگِ در سے پہلے نمودِ ہر آستاں سے پہلے

زکی انور

ایک ایکٹ کا ڈراما

رحمت کے فرشتے

کردار :-

عشرت : پروفیسر فیروز کی بیوی، "رحمت کے فرشتوں" سے نالاں، عمر بائیس سال

نسیم - عشرت کی چھوٹی نند، عمر گیارہ سال

لی لی اور نیلی - عشرت کی بچیاں، عمر بالترتیب چار سال اور سات ماہ

کریمن اور ظہور - عشرت کی ملازمہ اور ملازم

خالہ خفقن، رادھا، ناصر، ایک آدمی، رضیہ اور نعیمن چچی - رحمت کے فرشتے

پروفیسر فیروز - کسی اور شہر میں ملازم، پروفیسر، عمر ۳۰ سال

مقام - ہندوستان کا کوئی شہر

وقت - آخر نومبر --- گیارہ بجے دن سے ۲ بجے دن تک

نوٹ :- اس ڈرامے میں کچھ مکالمے چھوٹے بریکٹ "( )" میں لکھے گئے ہیں، وہ دل کی آوازیں ہیں اور وہ آوازیں بیک گراؤنڈ سے آتی ہیں۔

[پردہ اٹھتا ہے تو ایک ایسا کمرہ نظر آتا ہے جس کی سجاوٹ مغربی اور مشرقی طرزوں کا امتزاج ہے - عشرت کمرے کے پوربی گوشے سے کسی قدر ہٹ کر پڑے پلنگ پر بائیں ہاتھ کی کہنی تکئے پر ٹیکے کچھ لکھ رہی ہے - لی لی پاس ہی چٹائی پر بیٹھی ممّی، پلاسٹک اور المونیم کے ننھے ننھے برتنوں سے کھانا پکانے کا کھیل کھیل رہی ہے - نیلی کمرے کے وسط میں پنگوڑے پر لیٹی ایک سرخ بیلون سے کھیل رہی ہے اور غوں غاں کر رہی ہے - نسیم صوفے پر لیٹی بچوں کا کوئی ناول پڑھ رہی ہے --- کلاک گیارہ بجا رہا ہے -]

عشرت [لکھتے ہوئے] (فیروز صاحب کو خط بھی لکھنا ضروری ہے --- اچھا الٹے سیدھے چند جملے لکھ دوں، پھر نیلی کا سوئٹر مکمّل کر دوں گی - اُف اسے کتنی سردی لگتی ہوگی - لیکن یہ بھی میرا خبط ہی ہے نا کہ بازار کا سوئٹر پسند نہیں آتا - بھلے ہی تو فیروز صاحب بازار سے لے آئے تھے - خواہ مخواہ میں نے واپس کروا دیا - وہ بھی ہوتا اور پھر بُن بھی دیتی --- اور ہاں - ابھی ایک کتنا ضروری کام باقی ہے - فیروز صاحب کی نئی کتاب کل سے آئی پڑی ہے اور مجھ بدنصیب کو دیکھو کہ ایک ورق بھی نہیں پڑھ سکی - کاش رحمت کے فرشتے آج کرم کریں تو خط لکھ کر شام تک سوئٹر مکمّل کر لوں اور پھر ساری رات جاگ کر فیروز صاحب کی کتاب پڑھ ڈالوں - لیکن یہ رحمت کے فرشتے - یا اللہ!)

لی لی - [پلاسٹک کی ننھی سی پیالی میں چائے لے کر آتی ہے] ممی چائے لو، ممی جلدی سے پی لو نا - پھر مجھے بہت سارا کام ہے - گڈّو کو نہلانا ہے، کپڑے دھونے ہیں، برتن مانجھنے ہیں، خود نہانا ہے اور پھر پپّا کو خط لکھنا ہے - ارے ممّی تم پپّا کو خط لکھ رہی ہو نا --- لاؤ تو کاغذ اور قلم میں بھی لکھوں گی [پلنگ پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے]

عشرت : بیٹیا ذرا مجھے خط لکھ لینے دو پھر تم لکھ لینا، ہے نا ؟

لی لی - پپّا کب آئیں گے ممّی ؟

عشرت - جلد ہی آئیں گے بٹیا - تم کھیلو نا - پھر خط لکھ لینا، ابھی کھیلو نا، میری راجہ بیٹی!

لی لی - [منہ بنا کر] نہیں ممّی، جب پپّا کی یاد آجاتی ہے تو کھیل دیل اچھا

نہیں لگتا۔

[عشرت لی لی کو پلنگ پر اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتی ہے]

عشرت۔ میری راجہ بیٹی کتنی اچھی ہے۔ اب راجہ بیٹی بندر کا تماشہ دیکھنے جائے گی۔ اور میں خط لکھوں گی۔ پھر لی لی بیٹی واپس آ کر اپنے پپا کو خط لکھے گی — ہے نا بیٹی؟ نسیم — بھئی ذرا لی لی کو بندریا کا ناچ نہیں دکھا دوگی۔

نسیم۔ پر بھابی آج تو بندر والا آیا ہی نہیں۔

عشرت۔ ارے واہ! ڈمرو کی آواز آ رہی ہے اور تم کہتی ہو بندر والا آیا ہی نہیں
[نسیم کو آنکھ مار دیتی ہے اور نسیم مسکرانے لگتی ہے]

لی لی۔ چلئے باجی [وہ پھوپھی کو باجی کہتی ہے] بندریا کا ناچ دیکھ لیا جائے۔

نسیم۔ ہاں ہاں ضرور۔ اور آج بندریاں بھی اتنی ساری آ رہی ہیں کہ میں کیا بتاؤں۔

[لی لی کو ساتھ لئے نسیم باہر چلی جاتی ہے، عشرت پھر خط لکھنے لگتی ہے۔ لیکن اسی وقت نیلی کا بیلون پھٹ پڑتا ہے اور وہ رونے لگتی ہے]

عشرت۔ کریمن — او کریمن — [کریمن آتی ہے] کریمن ذرا نیلی کو سنبھالو بھائی۔

کریمن۔ بھوک لگی ہوگی بی بی۔ پلا دیجئے پھر اطمینان سے مالک کو خط لکھیے گا۔
[مسکراتی ہے]

عشرت۔ ارے نہیں بھائی، بھوک نہیں لگی ہے۔ بیلون پھٹ گیا ہے۔ دوسرا بیلون ہوا بھر کے دے دو، چپ چاپ کھیلتی رہے گی۔ (یہ کریمن بھی کم بخت عجیب ہے، جب بھی کچھ لکھو سمجھ لیتی ہے کہ مالک کو خط لکھا جا رہا ہے — مسکراتی ہے کس انداز سے! کاش یہ بے چاری بھی پڑھی لکھی ہوتی اور اپنے مالک کو خط لکھ سکتی۔ کس قدر دلچسپ کام ہے مالک کو خط لکھنا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جن کے مالک ان سے دور ہیں اور جنہیں اپنے مالک کو خط لکھنے کی لذت ملتی ہے۔ اُف کتنا لذت بخش ہے یہ کام — لیکن آج تو مجھے جلدی جلدی اس لذت سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اُف — نیلی کا سوئٹر — اور فیروز صاحب کی نئی کتاب! کاش آج رحمت کے فرشتوں سے خدا محفوظ رکھے!)

[کریمن بیلون میں ہوا بھر کے نیلی کو تھما دیتی ہے۔ وہ پھر کھیلنے لگتی ہے اور عشرت مطمئن ہو کر خط لکھنے لگتی ہے]

[یک بیک خالہ حفظن کمرے میں داخل ہوتی ہے]

خالہ حفظن۔ اری بیٹی عشو تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمھیں جمیلہ کے ہاں پوچھ رہی تھی!

عشرت۔ اوہ۔ حفظن خالہ — آئیے آئیے (لیکن اب انھیں کس بندر کا تماشہ دیکھنے کے لئے بھیج دوں — یا اللہ یہ کب بیلون سے پھٹنے والی ہیں) بیٹھئے خالہ!

خالہ حفظن۔ ہاں بیٹی، بیٹھوں گی تو ضرور — پر تم ذرا جلدی سے مجھے پان کی ایک گلوری کھلا دو۔ اوہ ورجن سے اوپر نانی پوتے گھر میں پل بھر آرام کب لینے دیتے ہیں، سوچا کچھ دیر تمہارے ہاں بھاگ جاؤں، سو چلی آئی (اب آرام ہے چار بجے تک)

عشرت۔ [بلند آواز سے] کریمن — او کریمن — بھئی حفظن خالہ کے لئے پان لیتی آؤ۔

خالہ حفظن۔ اے لو۔ ارے تم خود بنا دو نا بیٹی — وہ کیا جانے گی پان بنانا، منہ کاٹ کے رکھ دے گی (یہ لکھنے پڑھنے والی لڑکیاں بڑی کام چور ہوتی ہیں)

عشرت۔ لیکن خالہ، میں تو پان کھاتی نہیں، مجھ سے ہی منہ کٹنے کا اندیشہ ہے۔ (کیا مصیبت بھیج دی میرے اللہ تو نے!)

خالہ حفظن۔ اچھا بھئی، یوں ہی سہی — (ذرا اس سے تو پوچھوں جمیلہ کا قصہ۔ جانتی ہے یا نہیں) اے بیٹی عشو کچھ سنا تم نے۔ یہ موئی جمیلہ کیا کہتی ہے اپنی شادی کے بارے میں؟ یا اللہ کیسا زمانہ آ گیا۔ لڑکی خود کہے کہ بر پسند نہیں، سوچو تو سہی کتنا اچھا لڑکا ہے رؤف سو سو کماتا ہے اور سوٹ بوٹ میں رہتا ہے تو بالکل انگریز لگتا ہے، انگریز!

عشرت۔ لیکن جمیلہ کی پسند تو ضروری ہے نا خالہ (اب یہ بلا ٹلتی نظر نہیں آتی!)

خالہ حفظن۔ توبہ کرو، تم بھی ایسی بات کرتی ہو بیٹی۔ بھلا لڑکیاں اور زبان ہلائیں اپنی شادی کے بارے میں! (سب پڑھی لکھی لڑکیاں کرستان ہوتی ہیں)

عشرت۔ (اس وقت اگر میں جمیلہ کی حمایت میں باتیں کروں گی تو خالہ حفظن

کی نصیحت اور بحث طویل ہو جائے گی لہٰذا یہی بہتر ہے کہ ان کی ہاں میں ہاں ملا کر قصہ ختم کر دیا جائے) نہیں خالہ [مسکراتی ہے] میں نے طنزاً کہا کہ جمیلہ کی پسند ضروری ہے ویسے میرا بس چلے تو جمیلہ کو گولی مار دوں، بھلا یہی طریقے ہیں شریف گھرانے کی بیٹیوں کے، کیا نام روشن کر رہی ہے خاندان کا!

خالہ حفظن۔ جُگ جُگ جیو میری بیٹی، کتنا اچھا خیال ہے تمہارا، تم بھی تو آخر پڑھی لکھی ہو لیکن خاندانی شرافت تھوڑے کبھی ختم ہوتی ہے — لیکن ایک بات کہوں بیٹی، جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ تم اپنی بڑی بچّی کو ڈاکٹر بناؤ گی، سچ کہتی ہوں میرا دل کھٹّا ہو گیا ہے۔ ارے ڈاکٹری میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیسی بُری بات ہے۔ تم کیسے برداشت کرو گی؟

عشرت: (ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا)
نہیں خالہ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں لی لی کو ڈاکٹر بناؤں گی (جھوٹ کا سہارا لینا چاہیئے — اور کوئی چارہ کار نہیں) بس یہی تھوڑا بہت مذہبی تعلیم دلوا دوں گی، بہشتی زیور وغیرہ رٹوا دوں گی ہو گئی چھٹی۔ لڑکیوں کو اس سے زیادہ کی کیا ضرورت ہے؟

خالہ حفظن۔ اے لو — میں بھی نگوڑی کیسی اوٹ پٹانگ باتوں پر کان دیتی رہتی ہوں، اپنی عشّو بیٹی کتنی شریف ہے کتنی پختہ مذہبی — لیکن ایک بات اور کہوں گی بیٹی — یہ تم لوگ کرستان لوگوں کی طرح سب کی سالگرہ مت منایا کرو۔

عشرت۔ (ہوں — تو آپ آج مجسّم نصیحت نامہ بن کر تشریف لائی ہیں — یا خدا مدد! — لیکن حفظن خالہ کے مقابلے میں خدا بھی کیا مدد کرے گا۔ شیطان سے مدد لینا ہو گی اور پھر وہی — زندہ باد اے جھوٹ!) خالہ ہم لوگ تو اپنی سالگرہ کرتے نہیں (کرتے تو ضرور ہیں، لیکن آپ سے نجات تو پانا ہے بس جھوٹ کے ہی سہارے) رہی نسیم اور لی لی کی سالگرہ تو اس سلسلے میں میں بالکل مجبور ہوں کیونکہ یہ شوق فیروز صاحب کا ہے!

خالہ حفظن۔ ہائے اللہ تم جیسی شریف لڑکی اور نام لیتی ہو خصم کا؟

عشرت: (یا وحشت یہ کیا کر ڈالا میں نے؟) نہیں خالہ، بات دوسری ہے۔ آپ تو جانتی ہیں لی لی کے والد کے نام کے آخر میں بھی فیروز ہے، اور لی لی کے چچا کا نام ہے ساجد فیروز لیکن لوگ اُن کو ساجد نہ کہہ کر فیروز ہی کہتے ہیں اور لی لی کے والد کو اختر فیروز کے بدلے صرف اختر (بات بن گئی!) — توبہ کیجئے میں ان کا نام لینے لگی! (خدا کرے نصیحت کا یہ نیا باب جو ابھی میری حماقت سے کھل گیا تھا بند ہو جائے!)

خالہ حفظن: وہ تو میں مان گئی — لیکن بنّو، ابھی تو تم نے ان کا پورا نام اختر فیروز......

عشرت: [جلدی سے بات کاٹ کر] وہ صرف آپ کو سمجھانے کے لئے خالہ۔ ویسے میں ان کا نام کبھی نہیں لیتی، کیا آپ نے مجھے بھی کرستان سمجھ رکھا ہے؟ (لیکن ایسا لگتا ہے کہ بلا آسانی سے ٹلنے والی نہیں۔ اچھا اب ایک سازش کرنا ہو گی — کیوں نہیں انہیں زرینہ کے پاس بھجوا دیا جائے! یہی صورت ہے ان سے نجات پانے کی!)

[اتنے میں کریمن پان لے کر آ جاتی ہے۔ خالہ حفظن منہ میں پان کی چار گلوریاں ڈال بہت سا تمباکو پھانک، دونوں پاؤں صوفے پر چڑھا کر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور عشرت بڑی بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے]

خالہ حفظن۔ سنا تم نے بیٹی! امام علی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی — کتنی نیک تھی بے چاری۔ موا جہنم میں جلے گا۔

عشرت۔ (اگر آپ جہنم میں نہ ہوں گی تو مجھے بھی وہاں جانے سے اعتراض نہیں کاش میں اس وقت آپ کو طلاق دے سکتی — یا اللہ — خط — سوئٹر — اور وہ نیا ناول!) ہاں خالہ امام علی نے بہت بُرا کیا میرا بس چلے تو اسے گولی مار دوں (جیسے میں نے سارے زمانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے) اچھا خالہ — ایک عجیب قسم کی بات میں نے سنی ہے۔ یقین تو نہیں آتا لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں پوچھ لوں۔

خالہ حفظن۔ [کان کھڑے کر کے] پوچھو — پوچھو بیٹی۔

عشرت۔ زرینہ خود مجھ سے کہہ رہی تھی کہ شاید آپ زرینہ کے والد منشی حسین بخش صاحب سے عقد کرانے کی فکر میں ہیں اور زرینہ کو یہ پسند نہیں وہ کسی طرح اس بات کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ "قصہ کیا ہے؟"

خالہ حفظن - یہ تم کیا کہہ رہی ہو [بہت چونک کر] کس ماں جادی نے یہ بات اڑائی ہے - ابھی میں اس زرینہ کی بچی چڑیل کے ہاں جاتی ہوں —— ابھی —— ابھی جاؤں گی ! [بجلی کی سی سرعت سے اُٹھتی ہے اور جانے لگتی ہے]

عشرت [اُن کا ہاتھ پکڑ کر] جانے بھی دیجئے خالہ - جب بات غلط ہے تو پھر چھوڑیئے پوچھ تاچھ، زرینہ نے دل لگی کی ہوگی !

خالہ حفظن - میں کون ہوتی ہوں اس کی جو دل لگی کرے گی — ابھی جاتی ہوں - ابھی [ہاتھ چھڑا کر باہر نکل جاتی ہے]

عشرت [جلدی سے] کریمن — او کریمن — ذرا جلدی آؤ — [کریمن دوڑی آتی ہے] سنو بھئی، تم ذرا لپک کر زرینہ کے ہاں چلی جاؤ، چوک سے رکشا پکڑ لینا سمجھی — زرینہ سے کہنا کہ میں نے حفظن خالہ سے جو کچھ کہا ہے، صرف ان سے نجات پانے کے لئے - وہ کسی نہ کسی طرح بات بنا لے، لیکن ایسا نہ ہو کہ پوچھ تاچھ کے لئے وہ پھر آ دھمکیں ! [کریمن چلی جاتی ہے اور عشرت طویل سانس لیتی ہے] (زبیدہ بودبلا ئے کے بخیر تو نہیں لیکن وے بگذشت - زرینہ شیطان ہے بڑی عقلمند بات بنا لے گی (عشرت پھر پہلے کی طرح کہنی ٹیک کر خط لکھنے لگتی ہے) [لیکن فوراً ہی بعد رادھا کمرے میں داخل ہوتی ہے]

رادھا - ہیلو عشی — کیا کر رہی ہو بھئی — غضب ہو گیا — تم کمنٹری نہیں سن رہیں ؟ (کتنی بد ذوقی ہے کہ آدمی اتنے بڑے میچ کی کمنٹری نہیں سنے ! کیا بال بچوں والی عورت ایسی بدذوق ہو جاتی ہے ؟)

عشرت - ارے رادھا ! — آؤ آؤ (تمہیں بھی اسی وقت نازل ہونا تھا، کر دیا نا بیڑا غرق ! اب کیا کروں میرے معبود ؟) کمنٹری تو سن رہی تھی لیکن فیروز صاحب کا ایک بہت ارجنٹ خط آ گیا، فوراً جواب مانگا ہے انھوں نے - اس لئے خط لکھنے لگی اور پھر ابھی تو لنچ ہو گا ؟ (تم کیا سمجھو گی کہ کرکٹ کی کمنٹری سننے سے بھی زیادہ لذت بخش کام ہے خاوند کو خط لکھنا ! اور پھر بچی کے لئے سوئٹر بُننا، اور پھر خاوند کا لکھا ہوا نیا ناول پڑھنا ! — لیکن سب کچھ تو تب ممکن ہے، جب تم، رحمت کے فرشتو اس کا موقع دو -)

رادھا : لنچ ہی تو ہوا ہے جو میں یہاں آ گئی، گھر پر اکیلی سننے میں مزا نہیں آ رہا تھا - کمنٹری سننے کا مزا تو تب ہی آتا ہے جب کوئی ساتھ تالیاں بجانے والا ہو، ہٹر ہٹر کرنے والا ہو - اور پھر کمنٹ کر سکے کیسا کھیل زوروں پر ہے - ڈرا بھی ہو جائے تو پھر مزا آ جائے گا - [چونک کر] ارے تم شاید کچھ نہیں سن رہیں ؟

عشرت : ایکسکیوز می ردھی — تم کمنٹری سنو، میں ذرا ایک خط لکھ لوں !

رادھا - او مائی گاڈ — ہاؤ اسٹرینج — وھاٹ اے اسٹوپڈ گرل — اری بھاگیہ وان، خط تو پھر کبھی لکھا جا سکتا ہے، لیکن اس وقت کا میچ تو پھر نہیں ہو سکتا !

عشرت - رادھا پلیز — پلیز رادھا ڈارلنگ — (مان بھی جا میری جان، تو حفظن خالہ تو ہے نہیں، پڑھی لکھی لڑکی ہے، تجھے تو کسی کا وقت ضائع کرنا اچھا نہیں لگنا چاہیئے — اور اگر تو نہیں مانتی تو پھر اے —— زندہ یاد، اے مشکل کشا — حضرت دروغ !) — ارے ہاں ایکسیلنٹ آئیڈیا — پھر ایسا کرو رادھا ادھر اولگا نے فون کیا تھا کہ آ جاؤ اکٹھی بیٹھ کر کمنٹری سنیں، وہ بھی اکیلی ہے — اور ادھر تمہیں ساتھی کی تلاش — یا تو اولگا کو بلا لو یا پھر وہیں چلی جاؤ -

رادھا [خفگی کے ساتھ] مینی مینی تھینکس، فور دس ایکسیلنٹ آئیڈیا ! ڈارلنگ عشی میں خود بھی اولگا کے پاس جا سکتی تھی — ہے بھگوان شادی اگر اس قدر ہوریبل بد ذوقی کا نام ہے تو پھر مجھے معاف ہی رکھنا (بدتمیز لڑکی !)

عشرت - بُرا نہ مانو رادھا - دن کے گیارہ بجے سے تین بجے تک میں عام طور پر کچھ لکھا پڑھا ہی کرتی ہوں اور اس مدت میں سوا کھانے کے میں اور کسی کام کے لئے نہیں اُٹھتی - ویسے کرکٹ میچ ایک ایکسٹرا آرڈینری بات تھی، لیکن کیا کروں کہ اس سے بڑا کام نکل آیا — تم تو پڑھی لکھی ہو ردھی ڈیر، تمہیں مجھ سے بدظن نہیں ہونا چاہیئے - بلکہ تمہیں بھی چاہیئے کہ ملنے ملانے کا ایک وقت بنا لو

رادھا : جی نہیں ! یہ روٹین بازی آپ بڑی ہستیوں کو ہی زیب دیتی ہے ! (روٹین ! ہُنہ یہ روٹین کتنی بد ذوق قسم کی غیر شاعرانہ چیز ہے — کون شریف آدمی یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اپنی ہی بنائی ہوئی روٹین کا غلام ہو جائے !) [خفگی میں پاؤں پٹکتی ہوئی چلی جاتی ہے - عشرت

کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ لیکن پھر خط لکھنے لگ جاتی ہے اور تقریباً پانچ منٹ بعد ناصر آتا ہے۔]

ناصر: آداب عرض ہے بھابھی جان! (خدا کا شکر ہے کہ کام تو کر رہی ہیں لکھنے ہی کا!)

عشرت۔ اوہ۔ ناصر میاں! آؤ بھئی آؤ (ہاں تم نے ہی کیا قصور کیا تھا جو نہیں آتے رحمت کے فرشتے بن کر اور اس عظیم فیض سے محروم رہ جاتے۔) کیسے آنا ہوا؟

ناصر۔ بھابھی جان! سائیکولوجی آپ کا سبجکٹ تھا نا؟

عشرت ہاں بھئی، تھا تو ضرور، تمہیں کچھ اعتراض تو نہیں؟

ناصر۔ بھابھی! ذرا مجھے نروس سسٹم سمجھا دیجئے!

عشرت۔ بھیّا! اس وقت تو میں بہت ضروری کام کر رہی ہوں۔ شام کو آ جاؤ نا، اطمینان سے سمجھا دوں گی، ہے بھی کم سے کم دو گھنٹے کا کام، بس شام کو آ جاؤ — ہے نا؟

ناصر۔ لیکن بھابھی! شام کو تو مجھے پروفیسر رانا صاحب کے پاس جانا ہے اور کل ہی سائیکولوجی کا ٹسٹ ہے۔ بھابھی! — پلیز بھابھی — نروس سسٹم اونلی — (اور آپ کو کام بھی بھلا کون سا ہو سکتا ہے۔ الٹی سیدھی کہانیاں لکھنا، یا پھر پرویز صاحب کو خط لکھنا!)

عشرت: (اچھا تو حضور بھی دماغ چاٹنے کی قسم کھا کر آئے ہیں۔ اب اس بلا سے کیسے نجات ملے؟) [کچھ دیر تک کچھ سوچتی رہتی ہے .... پھر ....] اور اگر میں تمھیں نروس سسٹم پڑھانے کے لئے خود سے بہتر آدمی کے پاس بھیج دوں تو؟

ناصر۔ کس کے پاس بھیجیں گی آپ؟

عشرت۔ ڈاکٹر خورشید صاحب کے پاس، میں ایک پرزہ لکھ دیتی ہوں، وہ بہت اچھی طرح سمجھا دیں گے — کہو منظور؟ (بھیّا تمہیں منظور کیوں نہیں ہوگا، مجھے معلوم ہے ڈاکٹر خورشید تمھاری دُکھتی رگ ہیں!)

ناصر۔ [چونک کر] کیا خورشید صاحب کے پاس؟ — ضرور ضرور۔ لکھ دیجئے پرزہ مجھے اعتراض کیا ہو سکتا ہے، مجھے تو نروس سسٹم سمجھنے سے مطلب ہے نا! (بھابھی ڈارلنگ آپ تو یہ سب کچھ ٹالنے کے لئے کر رہی ہیں، لیکن میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ آپ کی بدولت مجھے ریحانہ کے گھر تک پہنچنے کی راہ مل گئی۔ اُف آپ کو کیا پتہ بھابھی کہ کس قدر رشک سے وہ دیکھا جاتا ہے جو مس ریحانہ خورشید کے گھر تک پہنچ جائے) [عشرت ایک سلپ لکھ کر ناصر کے حوالے کرتی ہے اور ناصر خوش خوش چلا جاتا ہے اور عشرت پھر خط لکھنے کے لئے جھک جاتی ہے۔ لیکن اسی وقت ظہور آتا ہے.....]

ظہور۔ میم صاحب، صاحب کے پاس سے ایک آدمی آیا ہے، باہر کھڑا ہوا ہے!

عشرت [بُری طرح چونک کر] ہائیں! صاحب کے پاس سے، یعنی فیروز صاحب کے پاس سے؟ کیا بات ہے؟ خیریت ہے نا؟ [ایک حد تک اُچھل کر پلنگ سے نیچے اترتی ہے لیکن آنچل درست کر کے بیٹھ جاتی ہے] (یا خدا میرا تو سارا جسم سن سن کر رہا ہے بس تو ایک قدم بھی نہیں چل سکتی) ظہور! جلدی سے اس آدمی کو یہیں بھیج دو۔ [ظہور جاتا ہے اور چند لمحوں بعد ایک آدمی اندر آ کر ہاتھ جوڑے کھڑا ہو جاتا ہے]

آدمی۔ میم صاحب.... (کیسے کہوں، ہمت نہیں ہوتی)

عشرت۔ ہاں ہاں کہئے نا آپ رُک کیوں گئے۔ کیا بات ہے؟ آپ فیروز صاحب کے پاس سے آئے ہیں نا؟ وہ تو خیریت سے ہیں نا؟ (یا خدا یہ جلدی سے کہتا نہیں کیا بات ہے؟ یا اللہ اس کی تاخیر تو میرے قلب کی حرکت روک دے گی)، کہئے بھی کیا بات ہے؟

آدمی: صاحب بالکل خیریت سے ہیں آپ گھبرائیے نہیں (لیکن مطلب کی بات کیسے کہوں؟)

عشرت۔ [اطمینان کی ٹھنڈی سانس لے کر] خیر اب آپ آگے کہہ دیجئے جو کچھ کہنا ہے!

آدمی۔ حضور! میرے لڑکے کے سارے پرچے بہت اچھے ہیں۔ یقیناً اُسے ڈسٹنکشن آئے گا.... لیکن

عشرت۔ لیکن ایک فیروز صاحب کا پرچہ خراب ہو گیا ہے؟ ہے نا یہی بات؟

آدمی۔ بات تو سچ مچ یہی ہے حضور، لیکن اگر آپ کی کرم فرمائی ہو جائے تو....

عشرت (واہ ری قسمت - جیسے سارے کے سارے رحمت کے فرشتے ایک مجھ ہی میں کھڑے ہیں، اب ان حضرت سے کیسے رستگاری ہو سکتی ہے ؟ سوا اس کے کہ جھوٹ بولا جائے !) لیکن جناب کاپی دیکھنا اور نمبر دینا فیروز صاحب کو ہے - اگر میرا بس چلتا تو میں کاپی آپ کے حوالے کر دیتی کہ دے دیجئے اپنے ہاتھ سے جتنا نمبر دینا ہو! لیکن آپ کو تو علم ہی ہوگا کہ فیروز صاحب کتنے سخت آدمی ہیں !

آدمی - اسی لئے تو حضور کے پاس آیا ہوں کہ ایک سفارشی ....

عشرت - ارے باپ رے باپ — دیکھئے صاحب اگر آپ کو ہماری ازدواجی زندگی سے ذرا سی ہمدردی ہے تو خدا کے لئے ایسی رائے ہرگز نہ دیجئے۔

آدمی - لیکن میم صاحب (اب تھوڑی بٹرنگ کرنا چاہیئے) میں نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے کہ آپ بڑی رحم دل واقع ہوئی ہیں اور اسی لئے میں بڑی امید کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں - اور مجھے امید قوی ہے کہ آپ کی رحم دلی مجھے خوش خوش لوٹنے کا موقع بخشے گی !

عشرت (اچھا — تو حضور بٹرنگ کرنا بھی جانتے ہیں — بہت خوب — اس طرح نجات کی ایک راہ تو نکل آئی، کیوں نہیں میں بھی ان کا دل خوش کر دوں !) [مسکرا کر] تو گویا آپ کو فیروز صاحب کے طالب العلموں نے میرے بارے میں سب کچھ بتلا دیا ہے - تو پھر سنیئے حضرت - میں فیروز صاحب کے نام آپ کو تو خط دینے سے رہی ہے کیونکہ وہ سرکاری کالج میں ہیں اور دنیا میں دوست دشمن کی کمی نہیں — آپ کو جب میری رحم دلی کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے تو یہ بھی معلوم ہی ہوگا کہ میں فیروز صاحب سے بیس پچیس نمبر تو ضرور ہی بڑھوا سکتی ہوں اور ذرا کوشش کرنے پر پچاس - ساٹھ بھی! آپ پورے بھروسے کے ساتھ لڑکے کا رول وغیرہ مجھے دے کر چلے جائیے اور یہ یقین مان لیجئے کہ اسے ڈسٹنکشن مل گیا!

آدمی - (عورت اپنی تعریف سن کر کس قدر خوش ہو جاتی ہے!) میم صاحب، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں ؟

عشرت - (زبان تو حضور کے پاس بہرحال ایک ہی ہے، لیکن شکریے کی ضرورت نہیں، میں ہی پیشگی بہت سا شکریہ ادا کرتی ہوں اگر آپ مجھے بخش دیں!) شرمندہ نہ کیجئے، شکریہ کی کیا ضرورت ہے آپ اتنی دور سے آئے ہیں، آپ کی مدد تو میرا فرض ہے - اور پھر اگر میری ذرا سی کوشش سے قوم اور ملک کا ایک ہونہار سپوت بی اے ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کر لیتا ہے، تو سمجھئے مجھے بہت بڑا انعام مل گیا، محنت کی قیمت مل گئی، پھر شکریے کی کیا ضرورت! (ہنہ — قوم اور ملک کا سپوت!)

آدمی - تو پھر اجازت ؟

عشرت - واہ صاحب! لڑکے کا رول نمبر وغیرہ تو ایک پرزے پر لکھ کر دے دیجئے (جسے میں آپ کے جانے کے پندرہ منٹ کے بعد چاک کر دوں گی!)

[وہ آدمی جیب سے نکال کر ایک پرزہ دیتا ہے، پھر جھک کر سلام کرتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔ عشرت ایک بہت طویل، مطمئن ٹھنڈا سانس لیتی ہے اور پھر لکھنے کے لئے جھک جاتی ہے..... لیکن کچھ ہی دیر کے بعد کچھ گنگنانے کی آواز آتی ہے اور پھر رضیہ داخل ہوتی ہے ....]

رضیہ - اچھا تو پریم پتر لکھا جا رہا ہے ؟ اس تنہائی میں (دیکھو تو دو بچوں کی ماں ہو گئی ہے لیکن پریم پتر کی بیماری نہیں گئی اس کی)

عشرت - اوہ — رضیہ، آؤ بھئی بیٹھو (خدا کرے تم نہ بیٹھو)

رضیہ - [شلف سے ایک کتاب اٹھا کر] فرار — ارے کس کا ناول ہے؟ ..... ارے فیروز بھائی کا ؟ — قسم خدا کی عشرت تم بھی خوب ہو، کبھی تذکرہ تک نہیں کیا!

عشرت بھئی، یہ کتاب بالکل نئی ہے، ابھی کل ہی تو میرے پاس آئی ہے (لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ فیروز صاحب کی تمام مطبوعات کی اطلاع سرکار کو دی جائے)

رضیہ : بھئی یہ کتاب میں لئے جاتی ہوں !

عشرت [بڑی مایوسی سے] ابھی ؟ نہیں رضیہ، ابھی نہیں — ابھی میں نے دیکھی تک نہیں (لیکن تم کیوں مانو گی، تمہارے ہی خاوند کی لکھی ہوئی کتاب تو ہے، جیسے جلد سے جلد پڑھنے کے لئے تم بے قرار ہو — یا اللہ کیسے غیر ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں : خیر یوں ہی سہی، لیکن کتاب لے کر تو دفع ہو جاؤ میری جان)

رضیہ : نہیں بھئی بہانہ نہیں چلے گا، میں لے جاتی ہوں رات کو پڑھ

لوں گی ۔ صبح کتاب تمھیں واپس مل جائے گی (لیکن حامد صاحب تو ضرور پڑھنے لگیں گے پھر ایک ہفتے کی خیر ہے ....)

عشرت ۔ کل ضرور ۔ ہے نا رجّی ! (لیکن لاکھ خوشامد کروں تمھاری، کون سی کتاب تم نے ایک مہینے سے پہلے لوٹائی ہے ؟ اور وہ بھی کیسی خستہ حالت میں ! کاش مجھ میں اتنی جراُت ہوتی کہ ہر کسی کو کہہ سکتی کہ کتابیں مانگ کر پڑھنا اُس کے لئے گناہ ہے جو خریدنے کی صلاحیت رکھتا ہو ۔ گناہ ہے، اخلاقی جرم ہے، بدتمیزی ہے)

رضیہ ؛ ہاں بھئی کتاب مل جائے گی ۔ اچھا سنو ضروری کام یہ ہے کہ ایک دن کے لئے مجھے ذرا سلائی کی مشین بھیج دینا، تین عدد لحاف کے پلّے سی کر لوٹا دوں گی !

عشرت ۔ (لاکھ عہد کرو کہ مشین اور ریڈیو کسی کو نہیں دوں گی لیکن یہ نامعقول لوگ کب عہد نبھانے دیں گے ؟) رجّی ایسا کرو نا، یہیں آکر سی لو (نہیں نہیں ۔ اللہ میاں غلطی ہوگئی ۔ خدا نہ کرے کہ وہ یہیں آجائے) اچھا خیر میں ابھی بھیجے دیتی ہوں، لیکن پھر تم ناول کیسے پڑھ سکوگی (کاش یہ ظالم کتاب تو رہنے دے !)

رضیہ : اُفوہ ۔ بھئی سارا دن پڑا ہے، پلّے دن بھر میں سی لوں گی اور رات کو ناول پڑھ لوں گی ۔ صبح کتاب اور مشین دونوں ہی واپس کر دوں گی ۔

عشرت : [بہت ہی کمزور آواز میں] اچھا ۔ ظہور ۔ او ظہور ۔ سلائی کی مشین لے کر ان کے ساتھ چلے جاؤ ۔

رضیہ ۔ دھاگے ہیں نا ؟ (کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے چھ آنے کی ریل خریدنا پڑے)

عشرت : [پکار کر] بھئی ظہور ۔ الماری سے ایک ریل بھی نکال لینا ۔ (پھر ایسا کیوں نہ ہو سرکار کہ لحاف کے تین عدد پلّے بھی حضور کے حوالے کر دئے جائیں ۔ خیر اس وقت جان بخش دینے کی قیمت میں اگر تین پلّوں کے ساتھ تینوں لحافوں کی روئی کا بھی تم مطالبہ کرتیں تو کس کم بخت کو اعتراض ہو سکتا تھا !)

[رضیہ چلی جاتی ہے ۔ عشرت چند لمحوں تک گُم سُم بیٹھی رہتی ہے لیکن پھر خط لکھنے کے لئے بدستور جھک جاتی ہے .... لیکن کچھ ہی دیر بعد نصیبن چچی وارد ہوتی ہے]

نصیبن ۔ دُلھن ذرا ایک کام تو کر دو !

عشرت ۔ آداب چچی ۔ (اب انھیں کیسے ٹالا جا سکتا ہے ؟ انھیں تو بھلا فیروز صاحب کو دودھ پلانے اور میری ساس بن بیٹھنے کا فخر حاصل ہے ! ۔ او میرے معبود میری پوجا کرنے والی قابلِ ہزار پرستش ساس کو تو تو نے اٹھا لیا اور رہ گئیں یہ دماغ چاٹنے والی اور میری ہر بات میں کیڑے نکالنے والی ! اب کیا کروں میرے معبود ! فیروز صاحب کی کتاب تو خیر جانے کب پڑھنا نصیب ہوگی لیکن خط ۔ اور پھر نیلی کا سوئٹر ؟ ۔ اُف اب میں کیا کروں ؟) تشریف رکھئے چچی !

نصیبن [کسی قدر رعب کے ساتھ] دلھن ذرا ایک خط تو لکھ دو اس بدمعاش افضل کو ۔ جب سے کلکتے گیا ہے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں بھیجا ۔ اور تمھارے چچا ہیں کہ کہتے کہتے تھک گئے مگر کم بخت کو کچھ لکھتے ہی نہیں ۔ اُلٹا ہوگا سینما تھیٹر میں روکنے والا کون ہے وہاں ؟ پورے سو روپے کماتا ہے ۔ ! سوچتی ہوں کچھ پیسے جمع کر لے تو شادی کر دوں، آدمی بن جائے گا ۔ لیکن کاہے کو آدمی بنے گا پھر ہڑتال کرے گا اور نوکری سے نکالا جائے گا ۔ لکھو تو دُلھن ایک بڑا سا خط ۔

عشرت : تو پھر چچی، رات کو آیئے تو اطمینان سے خوب لمبا چوڑا خط لکھ دوں گی (اس وقت تو بخش دیجئے، خدا آپ کو اس کا اجرِ عظیم دے گا، کروٹ کروٹ جنت دے گا !)

نصیبن ۔ دُلھن ! فرصت تو بس اسی وقت تھوڑی سی ملتی ہے ۔ اب چلو بہانہ نہ بناؤ، لکھ بھی دو جلدی سے ۔ میں نے تمھارے میاں کو دودھ پلایا ہے ۔

عشرت ، (مجھے زہر پلا دیجئے چچی آپ کا بڑا احسان ہوگا ۔ اور اگر بدلہ ہی چاہیئے آپ کو تو کہیئے میں آپ کو ایک بکری خرید دوں، لیکن میرا خون کیوں چوسنے کے درپے ہیں آپ) ؟ [کراہتی ہوئی سی آواز میں] لائیے چچی، لکھ دوں !

نصیبن ۔ کیا مانگتی ہو ؟ اری دلھن اتنے سارے خط لکھتی رہتی ہو دن بھر

ایک پوسٹ کارڈ بھی نہیں ہے تمھارے پاس۔ میں تمھاری ساس ہوں۔ ہاں!

عشرت:۔ (ہاں چچی۔ جب شین کے ساتھ دھاگا دینا فرض ہے تو پھر خط لکھنے کے ساتھ ساتھ پوسٹ کارڈ کیوں نہیں دیا جائے۔ ضرور دوں گی۔ آپ تو بھلا میری ساتھ ہیں)
کوئی بات نہیں چچی پوسٹ کارڈ ہے پاس!

[پاس ہی پڑے ایک بیگ سے پوسٹ کارڈ نکال کر عشرت نصیبن چچی کا خط لکھنے کے لئے تیار ہی ہوتی ہے کہ کریمن آجاتی ہے...]

کریمن [پُرخلوص اور بزرگانہ غصّے کے ساتھ] بی بی! اتنی دیر ہو گئی اور آپ نے بٹیا کو دودھ نہیں پلایا، کیسی ماں ہیں آپ؟ بے چاری سیدھی سادھی ہے، چُپ چاپ پڑی رہتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو بچّہ روئے نہیں اُسے دودھ نہیں ملے! [پنگوڑے سے نیلی کو اٹھا کر عشرت کی گود میں ڈال دیتی ہے]

نصیبن۔ اے کریمن تجھے بھی مجھ سے عداوت ہے لا میں سنبھالوں مُنی کو!

عشرت۔ نہیں چچی بس ذرا دیر میں دودھ پلادوں، سچ مچ بہت دیر سے بھوکی ہے! [نیلی کو چومتی ہے اور پھر آنچل میں چھپا لیتی ہے]
(میری بچی آج پھر تو سویٹر نہیں پہن سکتی)

نصیبن۔ (ایک نگوڑا خط لکھنے میں ٹال مٹول! آئے تو ذرا اس کا مرد۔ وہ آگ لگاؤں گی کہ نصیبن کو جنم بھر یاد کرے گی۔ میں اس کی ساس ہوں۔ مذاق ہے کیا؟ اب جاتی ہوں۔ مگر دیکھ لوں گی رانی صاحبہ کو!)
[غصّے سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور جانے لگتی ہے] اچھا تو میں چلی دُلھن! تم ٹال رہی ہو۔ میں نے اپنے بال دھوپ میں نہیں سفید کئے! [کریمن کچھ بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی ہے]

عشرت۔ [جلدی سے اُس کا دامن تھام لیتی ہے] نہیں چچی ایسا نہ سمجھو، میں ہرگز نہیں ٹال رہی ہوں۔ سچ مچ بچی بہت دیر سے بھوکی تھی! ابھی لکھتی ہوں خط!

[نصیبن منہ پُھلائے بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں نسیم اور لی لی آجاتی ہیں]

لی لی ۔ ممّی کہیں بھی تو بندریا نہیں ہے۔ بے چاری باجی نے کہاں کہاں کھوجا لیکن کاہے کو ایک بھی بندریا ملتی!

عشرت اور تم کیا ہو لی لی؟! (ہنستی ہے)

لی لی میں بندریا ہوں ممّی؟ جب تو میں ناچتی ہوں۔ تم ڈمرو بجاؤ۔ بجاؤ نا ممّی!

عشرت بھئی ڈمرو کہاں سے لاؤں؟ (ڈمرو ہوتا تو صبح سے اب تک بجاتی نہ ہوتی کتنے سارے بندر بندریوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے!)

نسیم آؤ لی لی میں سگریٹ کے ٹین کا ڈمرو بجاتی ہوں، تم ناچو!

لی لی نئی بھئی۔ اب تو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ممّی مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دو نا!

نصیبن (اچھا۔ تو گویا یہ سب کے سب سکھلائے ہوئے ہیں! خیر میں بھی مزا چکھا دوں گی) [پھر اٹھنا چاہتی ہے] میں چلی دُلھن!

عشرت۔ بیٹھئے نا چچی ابھی لکھتی ہوں، ابھی، فوراً!

لی لی۔ نہیں ممّی۔ پہلے مجھے کھانا کھلا دو۔ کھلا دو نا ممّی بڑی بھوک لگی ہے!

عشرت۔ بٹیا تم ظہور یا نسیم سے کھالو۔ میں تمھاری دادی کا خط لکھ دوں۔

لی لی۔ نہیں ممّی۔ میں تو تمھارے ہاتھ سے کھاؤں گی! دادی کا خط ظہور لکھ دے گا!

عشرت۔ ضد نہیں کرتے میری راجہ بیٹی! تم تو بڑی اچھی بیٹی ہو نا؟ کھالو میری راجہ بیٹی ظہور کے ہاتھ سے یا پھر۔ نسیم۔ او نسیم کھلا دو لی لی کو کھانا۔

لی لی۔ خیر ممّی یوں ہی سہی۔ بیٹا ہوتے تو میں تمھاری کیوں خوشامد کرتی؟ جاتی ہوں!

عشرت۔ واہ میری بیٹی۔ کتنی اچھی بیٹی ہے میری لی لی۔

[لی لی نسیم کے ساتھ جانے لگتی ہے لیکن اُسی وقت ظہور خوش خوش دوڑا ہوا آتا ہے....]

ظہور صاحب آگئے۔ صاحب آگئے۔ میم صاحب، صاحب آ رہے ہیں۔

عشرت چل بھاگ بدمعاش! [لیکن چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی ہے]

ظہور۔ نہیں میم صاحب، سچ کہتا ہوں۔ وہ دیکھئے آگئے نا۔

[پروفیسر فیروز مُسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور لی لی دوڑ کر ان سے

پلٹ جاتی ہے]

عشرت ۔ واہ تم کیسے آ گئے، کوئی اطلاع نہیں :

فیروز ۔ کمال ہے ! کیا میرا تار نہیں ملا ؟

عشرت : نہیں تو ۔ لیکن سچے دل سے یہ دعا ضرور کر رہی تھی کہ خدا کرے تم آ جاؤ تاکہ یہ خط جو صبح سے لئے بیٹھی ہوں اور پانچ سطروں سے آگے نہیں لکھ سکی، وہ تو لکھنے سے بچوں ۔ سچ کہتی ہوں فیروز آج تو میں نے دل سے تمنا کی ہے کہ بیٹے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

فیروز ۔ کیوں ؟ کیا بات ؟

عشرت ۔ سب کچھ اطمینان سے بتاؤں گی ، سب سے پہلے تم ایک کام کرو ۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھا لو اور سیدھے بازار چلے جاؤ ، کم سے کم نیلی کے لئے ایک سوئٹر . . . . .

فیروز [پکار کر] ظہور ! میرے سوٹ کیس میں سب سے اوپر کچھ سوئٹر اور ٹافی کے ڈبے ہیں لانا تو جلدی سے ۔ عشی ۔ میں نے تین سوئٹر لی لی کے لئے اور تین نیلی کے لئے خرید لئے ہیں ۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ رحمت کے فرشتے . . . . [نعیمین کی طرف دیکھ کر زبان نکال کر چپ ہو جاتے ہیں]

عشرت : اوہ ۔ ویری گڈ ۔ ہاؤ نائس یو آر مائی فیروز ۔ تھینک یو ویری مچ ۔ آؤ بچی اب اطمینان سے تمہارا لمبا چوڑا خط لکھ دوں ۔

[بیگم نعیمین بغیر کچھ کہے سنے اٹھتی ہے اور آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے ۔ فیروز ، عشرت ، لیلی اور ظہور زور سے ہنستے ہیں . . . . . اور پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے . . . .]

★

غلام ربانی تاباں

غزل

نا صحو! راہ نوردانِ طلب ہیں یہ لوگ
فکرِ فردا نہ غمِ دوش عجب ہیں یہ لوگ

خلوتِ خاص ہیں جو ہم ہیں وہی واعظ و شیخ
مجمعِ عام میں گو پیش بلب ہیں یہ لوگ

اہلِ مسجد سے کراماتِ مغاں کیا کہئے
نا شناسائے مقاماتِ ادب ہیں یہ لوگ

نامناسب ہے یہ رندوں سے تغافل ساقی
تیرے مے خانہ کی شہرت کا سبب ہیں یہ لوگ

تیرے سائل کبھی تجھ سے بھی نہ کر پائے سوال
کتنے پابندِ رہ و رسمِ طلب ہیں یہ لوگ

ناخداؤں پہ اگر چھوڑ دی کشتی تاباں
ڈوب ہی جائے گی الیاس لقب ہیں یہ لوگ

صدر متحدہ عرب جمہوریہ جمال عبدالناصر

ممبئی کی جھانکی

دلّی کی جھانکی

دِلّی میں یومِ جمہوریہ کی پریڈ کے مناظر
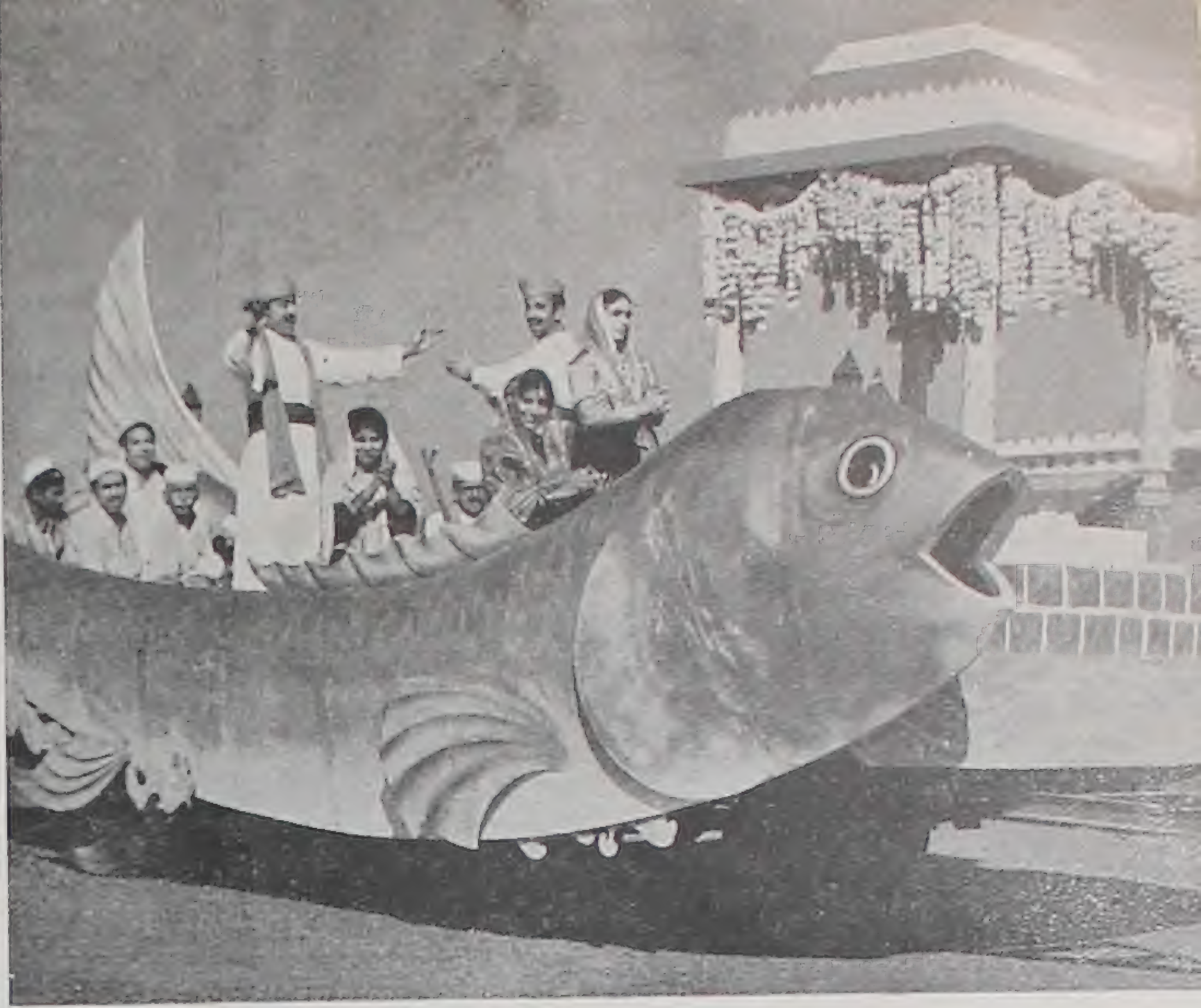
اسکول کے بچّوں کا مارچ پاسٹ

راجستھان کی جھانکی
(ڈھولا مارو کی داستانِ عشق)

بہار کی جھانکی
(جھجھیا ناچ)
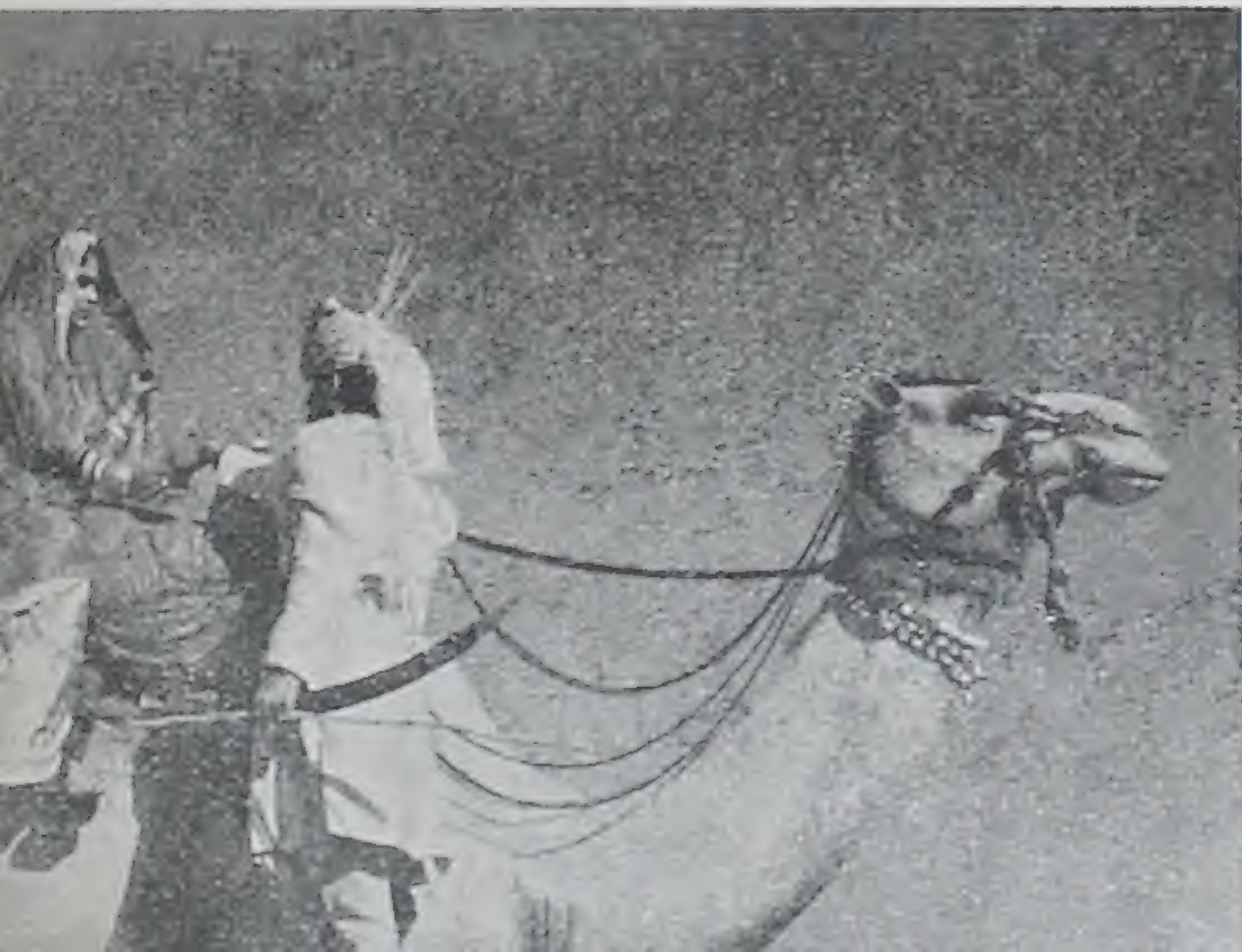
اتر پردیش کی جھانکی
(ساون جھولا)

مدھیہ پردیش کی جھانکی

صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجیندر پرساد
رُوس کے وزیراعظم مسٹر خروشچیوف
کا خیر مقدم کر رہے ہیں

دِلّی کے لال قلعہ میں جشن جمہوریہ کا مشاعرہ
حضرت جوشؔ ملسیانی اپنا کلام سُنا رہے ہیں
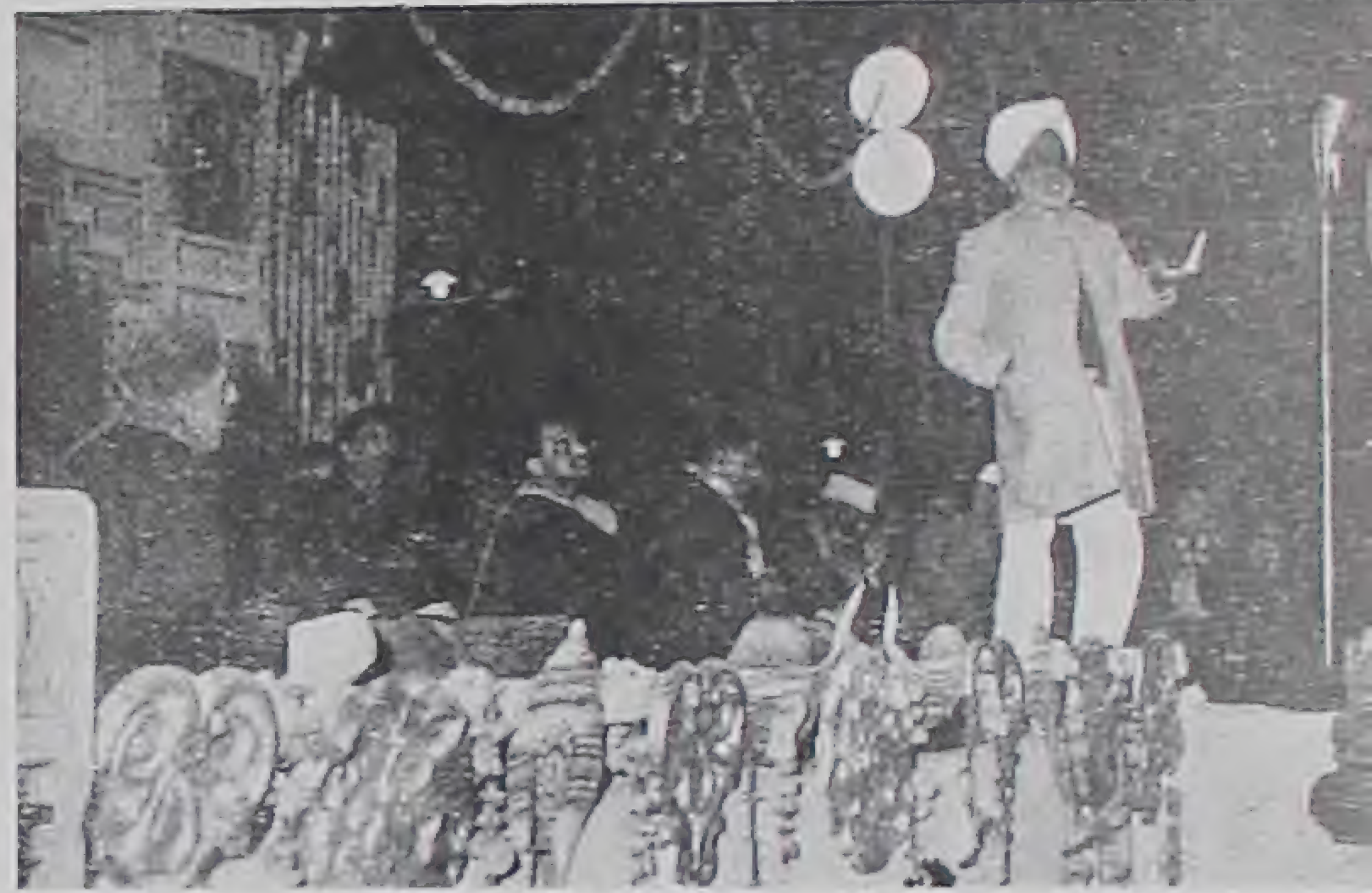
(اوپر بائیں طرف) وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو
سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کو اُن کی تصنیف
اُردو ڈراما اور اسٹیج پر ساہتیہ اکادمی کا انعام دے رہے ہیں۔

پاکستان کے ہائی کمشنر جناب اے کے بروہی
مہاتما گاندھی کی سمادھی پر پھول چڑھا رہے ہیں۔

حمیدالدین محمود

جمال عبدالناصر

ابتدائی حالات

جمال عبدالناصر مصر کے ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک شمالی صوبے کے مقام نبی مور میں آباد تھا۔ یہیں ۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو جمال عبدالناصر کا جنم ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے آپ کو قاہرہ کی ایک درسگاہ النہضۃ المصریۃ میں داخل کر دیا گیا۔ ابھی وہ آٹھ سال ہی کے تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی شخصیت اور اندازِ فکر پر اُن کی محبوب ماں کا بہت گہرا اثر تھا اور اُن کی رحلت سے ننھے ناصر کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا اور وہ بچپن ہی سے تنہائی پسند اور خاموش بن گئے۔ ساتھیوں سے الگ تھلگ اپنا وقت لائبریری ہی میں گذارتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں اُن کے والد اپنے اور تین بچوں کے ساتھ قاہرہ چلے آئے اور اسی سال ناصر نے امتیاز کے ساتھ میٹرک پاس کیا۔ انھیں بچپن ہی سے بڑے لوگوں کے سوانح اور قانون سے بڑی دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں وہ ملٹری کالج میں داخل ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اینگلو مصری معاہدۂ ۱۹۳۶ء ہو چکا تھا جس کی رو سے برطانیہ کو منطقۂ سویز میں اپنی افواج رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے خلاف سارے مصر میں غم و غصّے کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ ناصر کے جذبات بھی اس معاملے میں شدید تھے۔ ملٹری کالج کی تعلیم و تربیت نے ناصر کی شخصیت کو جلا دی۔ اُن میں نظم و ضبط، غور و فکر، ڈسپلن، خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی۔ اب اُن کے جذبات و خیالات اور سامراج کے خلاف اُن کے محسوسات دوسروں تک پہنچنے لگے۔

فوجی خدمات

ملٹری کالج کا امتحان پاس کر کے وہ تھرڈ رائفل بریگیڈ میں شریک ہو گئے اور منقباد پر پوسٹ کیے گئے۔ یہاں اُن کی ملاقات انوارالسعادات اور ذکریا محی الدین جو اس وقت انقلابی کونسل میں ہیں، اور احمد انور جو اس وقت چیف آف ملٹری پولس ہیں، سے ہوئی۔ یہ روابط بعد میں بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔

۱۹۳۹ء میں انھیں اسکندریہ بھیجا گیا اور یہاں ان کی ملاقات عبدالحکیم امر سے ہوئی جو آج نہ صرف انقلابی کونسل کے رُکن ہیں بلکہ مصری افواج کے کمانڈر انچیف بھی ہیں۔ بعد ازیں ۱۹۴۲ء میں انھیں ال الامین کے میدانِ جنگ میں بھیجا گیا۔ اور پھر اسکندریہ بھیج دیئے گئے۔ یہاں انھیں مصری سیاست اور عرب سیاست کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا اتفاق ہوا۔ وفدی جماعت اپنی لاحاصل مساعی میں مصروف تھی۔ ایک کے بعد ایک سیاسی قتل ہو رہے تھے اور دوسری طرف فلسطین میں یہودیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی زمانے میں وہ پانچویں بریگیڈ میں لفٹننٹ تھے اور ان بدعنوانیوں کی مزید تاب نہ لا کر انھوں نے اپنا تبادلہ سوڈان کروا لیا جہاں جبل الاولیاء کے مقام پر آپ عبدالحکیم امر کے ساتھ کام کرتے رہے۔ یہاں نہ صرف دونوں کی دوستی اور مضبوط ہوئی بلکہ دونوں کو مصر کے قومی اور بین قومی معاملات پر دل کھول کر تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملا اور نتیجتہً دونوں میں ایک زبردست یکسانیت نظر و فکر کی پیدا ہوئی جو آگے چل کر انقلاب کی پلاننگ میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

اس کے بعد وہ ملٹری کالج میں لکچرر بنا دیئے گئے اور پھر وہ اسٹاف کالج میں شریک ہوئے جہاں انھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی۔ یہاں انھیں جو مشقیں کرائی گئیں وہ تھیں قاہرہ اور اُس کے مضافات کی بری اور ہوائی حملے سے مدافعت۔ یہ تجربے بھی آپ کے لئے بہت اہم ثابت ہوئے کیوں کہ اُن کو اپنے فوجی انقلاب کی تکنیک اور Strategy کے متعین کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بلکہ ایک

طرح وہ ایک یہ ہرسل کی صورت رکھتے ہیں۔

انقلاب کی راہ پر

دوسری عالمی جنگ کے بعد مصری سیاسیات میں زبردست تلاطم آیا۔ ایران، شام، مصر اور فلسطین ان چاروں مقامات پر صورت حال خراب ہوتی گئی۔ سیاسی قتل، سازشیں، خفیہ تحریکیں، وحشت، جراوہ دیاؤ، رشوت خوری وبد اعمالی، مفاد پرستی اور شاہی عیاشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین تقسیم کر دیا گیا اور ایک یہودی ریاست "اسرائیل" کا جنم ہوا اس کے ساتھ ہی لڑائی شروع ہو گئی جو ۱۹۴۹ء تک جاری رہی اور جس میں مصری فوج کو زک اٹھانی پڑی۔ آٹھ لاکھ عرب بے گھر اور بے سہارا ہو گئے۔ ایک معاشی اور معاشرتی ابتری پھیلی جس کی سب سے زیادہ ذمہ داری شاہی حکومت اور اس کی مفاد پرست کابینہ پر آتی تھی جنھوں نے نہ صرف عرب افواج کو بے ہتھیار لڑنے پر مجبور کیا بلکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مصری فوج اسمبل فتح نہیں کر سکتی، اس کی فتح" کا حکم دیا۔ یہ جنگ کی پلاننگ کی خامی نہ تھی بلکہ ایک ایسا اقدام تھا جو بادشاہِ وقت نے قصداً اس لئے کیا کہ مصر کی قوت مفلوج ہو جائے۔ اس جنگ میں والنیٹر کے طور پر حصہ لینے کے لئے ناصر نے استعفیٰ پیش کیا لیکن وہ قبول نہیں کیا گیا، ایک بار وہ زخمی ہو کر آئے تو انھیں دو ماہ تک بستر پر پڑے رہنے کی ہدایت کی گئی لیکن وہ ایک ہفتے کے بعد ہی محاذِ جنگ کو فرار ہو گئے اور اپنی آنکھوں سے شاہی حکومت کے ہاتھوں مصریوں کی قربانی اور ذلت دیکھی۔ ان مسلسل مشاہدوں نے ناصر کے دل میں سخت ترین نفرت پیدا کی اور انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب اس راج کو اور اس بربادی کو یک لخت ختم کر دینا چاہیئے۔ انھیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا کیونکہ ۱۹۴۹ء میں مصطفیٰ نحاس پاشا کے ۱۹۳۶ء کے اینگلو مصری معاہدے کی تنسیخ کے اعلان کے ساتھ ہی مصر میں وزارتی تعطّل کا ایک سلسلہ شروع ہوا شام میں آئے دن انقلاب ہونے لگے، ایران میں ڈاکٹر مصدق نے قدم جما لئے۔ ناصر کو صرف وقت کے اشارے کی ضرورت تھی۔

انھوں نے اپنے تمام رفقاء کو جن سے انھیں پہلے ہی تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا اور جن پر انھیں اعتماد تھا یکجا کیا۔ شاہی محل، کابینہ اور فوج میں اپنا جال بچھا دیا اور تمام معلومات مہیا کر کے ایک منظم منصوبہ بنایا۔ ۲۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کی صبح کو اچانک قاہرہ کے مضافات میں گڑگڑاہٹ ہونے لگی۔ قاہرہ میں مقیم بیرونی سفارت خانوں اور شہریوں کو علم تک نہ ہو سکا کہ فوج اسکندریہ سے قاہرہ کی طرف مارچ کر رہی ہے۔ قاہرہ کا مکمل محاصرہ کر لیا گیا اور فوج کے لوگ شاہی محل کے اطراف اپنی لمبی لمبی توپیں لگائے کھڑے تھے سنگینوں کے سایے میں فاروق نے اپنی معزولی کا اعلان لکھا۔ مصر کو ایک بدترین حکومت سے نجات مل گئی۔

انقلاب کے بعد

نئے دور میں ایک انقلابی کونسل نے اقتدار سنبھالا۔ ناصر نے جو کہ اس انقلاب کا اصل ہیرو تھا، درپردہ رہنے پر اکتفا کرتے ہوئے جنرل نجیب کو صدر نامزد کیا۔ محض شہنشاہیت کو ختم کرنے سے انقلاب مکمل نہیں ہوا تھا بلکہ وہ تو پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ناصر نے مصر کے ناسوروں کو چیرنا شروع کیا۔ غداروں کو پھانسیاں دی گئیں، سیاسی پارٹیاں تحلیل کر دی گئیں، رشوت ستانی اور بدعنوانی کو بیرحمی سے کچل دیا گیا۔ زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں اور اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں سرزمینِ مصر کو غیر ملکی برطانوی افواج سے پاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد جب کرنل ناصر نے محسوس کیا کہ جنرل نجیب کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو انھوں نے جنرل کو برطرف کر کے خود صدارت سنبھال لی۔ ایک نیا قومی دستور پیش کیا جس کے تحت جون ۱۹۵۶ء میں نئے انتخابات ہوئے اور کرنل ناصر کو مصر کا صدر منتخب کیا گیا۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں منعقدہ بنڈونگ کانفرنس میں جس ایشیائی افریقی اتحاد کا مظاہرہ ہوا تھا اس نے صدر ناصر کو تقویت دی۔ اسی اثنا میں اسرائیل نے غازہ پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ تب ناصر کو احساس ہوا کہ کمزوری حملہ آور کو اُبھارتی ہے۔ انھوں نے فوجی استحکام کے لئے مغرب سے اسلحہ کی درخواست کی جس کے جواب میں مغربی ممالک نے اسرائیل کو مزید ہتھیار فراہم کئے۔ تب لازماً انھیں روس اور چیکوسلواکیہ سے اسلحہ خریدنا پڑا جس پر یہ مضحکہ خیز تہمت لگائی گئی کہ انھوں نے ایشیا میں توازنِ قوت کو متاثر کیا ہے اور ان کی کتاب 'فلسفۂ انقلاب' کو ہٹلر کی 'میری جدوجہد' کے مشابہ بنایا گیا۔ مصر کی معاشی ناکہ بندی کی گئی، اس کی روئی کا بائیکاٹ کیا گیا حتیٰ کہ صدر ناصر کے خلاف شخصی پروپیگنڈے کی مہم چلائی گئی۔

اسوان بند، سویز اور جنگ

مصر کی زرعی خوشحالی کو بڑھانے کے لئے ہمیشہ نیل کی طرف دیکھا

گیا۔ اسوان بند کی تعمیر صدر ناصر کا ایک پرانا خواب تھا اس کے لئے عالمی بنک نے دو ارب ڈالر کی امداد منظور کی تھی اور اتنی ہی رقم امریکہ و برطانیہ بھی صرف کرنے والے تھے۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ صدر ناصر اُن کے حلقہ بگوش ہونے کی بجائے مسٹر نہرو کے ہم نظر ہو کر غیر جانب داری کی طرف مائل ہیں تو انھوں نے نہ صرف اپنا حصہ دینے سے انکار کیا بلکہ عالمی بنک کو بھی اپنی پیش کش واپس لینے پر مجبور کیا۔ تب صدر ناصر نے اپنے ہی ذرائع کی طرف توجہ کی اور نہر سویز کمپنی کو جو کہ مصری قانون کے تحت مصر ہی میں رجسٹر شدہ کمپنی تھی، قومیانے کا اعلان کر دیا۔ (۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء)۔ اس پر سارے یورپ میں تہلکہ مچ گیا اور یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ مصر نے نہر سویز ہی کو قومیا دیا ہے۔ پہلے تو برطانیہ نے نہر سویز کے مقاطعے کا اعلان کیا اور جب یہ نہ ہو سکا تو مصری اتھارٹی کو تسلیم نہ کر کے بغیر محصول ادا کئے نہر کا استعمال کرنے کی کوشش کی، اپنے پائلٹوں کو واپس بلا لیا تاکہ نہر سویز کام نہ دے سکے۔ پھر اقوام متحدہ میں مقدمہ لے گیا اور وہاں پر بحث کی نوبت آئی تو کہنے لگا کہ بند دروازے سے میں بحث کی جائے اور جب اِدھر بحث جاری رہی اور سمجھوتے کے امکانات پیدا ہو گئے تو اُدھر فرانس اور اسرائیل کے ساتھ مل کر اکتوبر میں مصر پر حملہ کر دیا۔ سول آبادی کو ہراساں کیا، ہسپتالوں اور مدارس پر بمباری کی اور سر انتھونی ایڈن نے اعلان کیا کہ ناصر کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا۔ مصریوں نے ایک جانباز قوم کی طرح اس وحشیانہ حملے کی مزاحمت کی برطانوی فوجیں پورٹ سعید سے آگے نہ بڑھ سکیں اور بالآخر برطانیہ کو جنگ بند کر دینی پڑی۔

متحدہ عرب جمہوریہ کی تشکیل

جنگ سویز نے یہ واضح کر دیا کہ جب تک عرب کمزور اور متفرق رہیں گے اس وقت تک ہمیشہ ایسی کوششیں کی جائیں گی۔ ہر بار کوئی نہ کوئی خونخوار، کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ملک کو اپنی ہوسِ ملک گیری کا نشانہ بنائے گا۔ اس کے نتیجے کے طور پر متحدہ عرب قومیت کا تصور جڑ پکڑتا چلا گیا۔ اور بالآخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو شام و مصر نے ایک ریاست "متحدہ عرب جمہوریہ" میں اپنے آپ کو ضم کر کے عرب تحریک قومیت کی پہلی نشانی قائم کی اور جمال عبدالناصر اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

خورشید احمد جامی

غزل

مایوس تیرگی سے نہ ہو اے غمِ وطن
لے تجھ کو دے رہا ہوں چراغِ شعورِ فن

پگھلا دئے ہیں تلخ حقائق کی آگ نے
خوابوں کی چاندنی سے بنائے ہوئے بدن

آیا ترا خیال تو محسوس یہ ہُوا
رقصاں ہے زندگی کے اندھیروں میں اک کرن

اک عمر خارزارِ الم میں کٹی، مگر
مہکا دئے ہیں فکر و نظر سے کئی چمن

اس زندگی کے اور بھی کچھ نام ہیں نئے
کب تک شبِ فراق کا افسانۂ کہن

حالات خود ہی پاؤں کی زنجیر بن گئے
ورنہ کچھ اتنی دُور نہ تھی تیری انجمن

یہ کیا ہُوا کہ صبحِ بہاراں کے پاس بھی
پھولوں کی دل کشی ہے نہ گیتوں کا بانکپن

صحرائے آرزو کی مسافت طویل تھی
پہنچے ترے قریب تو بڑھنے لگی تھکن

اب جی رہا ہوں اے غمِ دوراں کچھ اس طرح
جیسے مری حیات ہے بس ایک حُسنِ ظن

ہر تلخ تجربے کو دیا میری فکر نے
الفاظ کا حسین و دل آویز پیرہن

اب کس کے انتظار میں جامی تمام رات
جلتی ہے خونِ دل سے مرے مشعلِ سخن

خواجہ بدیع الزّماں

دِنکر کی شاعری

(ایک جائزہ)

رام دھاری سنگھ دِنکر کی شاعری سے ہندی شاعری میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ سامراجی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہندوستان کی تمناؤں، حسرتوں اور مجبوریوں کا جتنا بھرپور اظہار دنکر کی شاعری میں ہوا ہے ہندی کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہوا۔ جس طرح بنگلہ میں نذرالاسلام نے، اُردو میں اقبال اور جوشؔ نے آزادی کے ترانے گائے اور اپنے نغموں سے قوم میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی اسی طرح دِنکر نے ہندی میں شعلہ بار نظمیں لکھ کر قومی حوصلہ کو بلند رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو قوت و توانائی بخشنے کا اہم تاریخی فریضہ انجام دیا۔ نذرالاسلام اور اقبال نے جس دَور میں نئی زندگی کے ترانے گائے اور قوم کو انقلاب کی دعوت دی اس دور کی بنگلہ اور اردو شاعری کی فضا اس بلند آہنگ اور انقلابی شاعری کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی اور ان شاعروں میں سماجی شعور اور اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اپنی تمام شاعرانہ صلاحیتوں کے باوجود ان کے قلم سے وہ نظمیں نہ نکل سکتیں جو غلامی افلاس اور بدحالی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اور آزادی کے لئے تڑپتے ہوئے بھارت کی جیتی جاگتی علامت ہیں۔ دِنکر کو بھی کچھ ایسی ہی فضا سے دوچار ہونا پڑا۔ جب ان کی شاعری کا آغاز ہوا اس زمانے میں چھایا واد اپنے شباب پر تھا۔ چھایا واد کی شاعری ایک فرار پسند رومانی شاعری تھی جس میں سماجی مسائل پر غور و فکر کرنے کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی داخلیت سماجی موضوعات پر کھل کر بحث کرنے کی اجازت بھی نہ دیتی تھی۔ چھایا وادی کوی کا تصوّر ہمیشہ آکاش میں اڑتا رہتا تھا، اس کے پاؤں دھرتی پر ٹکے ہوئے نہیں تھے۔ زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کا اس میں دم نہ تھا اس کے طریقِ اظہار میں بھی بے ساختگی اور صفائی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہتا تھا اس پر ابہام اور اشاریت کی اتنی موٹی تہہ چڑھی ہوئی تھی کہ عام آدمی کے لئے اسے چیر کر اصل مفہوم تک پہونچنا ممکن نہ تھا۔ دِنکر کی شاعری نے چھایا واد کی اسی فضا میں آنکھ کھولی۔ کسی بھی شاعر کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے عہد کے شاعرانہ ماحول اور مزاج سے اپنے آپ کو دفعتاً الگ کرے۔ کسی نہ کسی حد تک وہ ان سے متاثر ہوتا ہی ہے لیکن ایک عظیم شاعر کا ذہن ان اثرات کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کرتے ہوئے بھی اپنے لئے ایک نئی راہ نکا لنے میں لگا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کی ابتدائی تخلیقات میں اس عہد کے شاعرانہ مذاق کی گہری چھاپ ملتی ہے لیکن ساتھ ہی ان میں ایک ایسا عنصر بھی موجود ہوتا ہے جو ایک نئی راہ، ایک نئے منظر اور ایک نئی طرز کی غمازی کرتا ہے۔ دِنکر اگر ایک عظیم شاعر بننے کی صلاحیت اور سماجی شعور سے محروم ہوتے تو وہ بھی چھایا واد کی بھول بھلیوں میں گم ہو کے رہ جاتے اور اپنی تخلیقات سے ہندی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ نہ کر سکتے۔ فطرت نے دِنکر کو ایک حسّاس دل اور قوتِ فکر دی تھی۔ ان کی ذہانت بہت اونچی سطح کی تھی جس نے انھیں لکیر کا فقیر بننے سے باز رکھا۔ اپنی ابتدائی تخلیقات میں دِنکر نے 'چھایا واد' کا اثر قبول کیا ہے جس کا اعتراف انھیں بھی ہے۔

"رینوکا रेणुका میں میرے قومی جذبے کا اظہار

کرنے والی دو تین ہی تخلیقات ہیں۔ باقی اس مجموعہ میں ایسی ہی نظموں کی کثرت ہے جن میں یا تو بھارت کے ماضی کا رونا ہے یا زندگی کی بے ثباتی پر ماتم — اور یہ دونوں خصوصیتیں چھایا واد کے اثر سے آئی تھیں۔ رینوکا میں ایک تیسری قسم کی نظمیں بھی ہیں جن میں فطرت کی جذبات سے بھری ہوئی مصوّری کی گئی ہے اور یہ خصوصیت بھی مجھے چھایا وادیوں کی اس محبّت سے ملی جو انھیں فطرت سے تھی۔"

(چکروال' کی بھومیکا، صفحہ ۳۲)

'رینوکا' دنکر کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن اس پہلے مجموعہ میں ہی ایک ایسے شاعر کا روپ اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کی شخصیت میں شدّتِ احساس، جستجو اور شاعرانہ لطافت کا حیرت انگیز اجتماع ہے۔ 'رینوکا' کی نظمیں ہمیں بے ساختہ اقبال کی ابتدائی نظموں کی یاد دلاتی ہیں جن میں کبھی تو فطرت کے حُسن کو تحیّر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے، کبھی حال کا ماتم کیا گیا ہے اور کبھی سنہرے ماضی کی حسین یادوں کو تازہ کیا گیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ 'رینوکا' کی وہ نظمیں بھی جن میں چھایا واد کا اثر صاف جھلکتا ہے ایک نئے آہنگ کا پتہ دیتی ہیں۔ اظہار کی بے ساختگی اور صفائی، دل کو چھو لینے والی خصوصیت، زبان کی روانی اور غیر مبہم اندازِ بیان ——— یہ سب باتیں انھیں چھایا وادی کویتاؤں کی صف سے الگ کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ 'رینوکا' کی کویتائیں جس زمانے میں لکھی جا رہی تھیں اس وقت بھارت کی سیاست نے کوئی واضح اور معین شکل اختیار نہیں کی تھی۔ ہندی ادب میں بھی، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، چھایا واد کا غلبہ تھا۔ پھر یہ دنکر کا عہدِ شباب تھا۔ ان تمام باتوں کا اثر ان کی شاعری پر پڑنا فطری ہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود 'رینوکا' کی نظموں میں سماجی شعور اور وطنیت کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ 'منگل آہوان' میں جہاں شاعر 'سور سمراٹ' سے یہ درخواست کرتا ہے۔

جلدھی[1] سانس، پکشی کے کلرو[2] — जलधि-सांस, पक्षी के कलरव
انل[3] سنن، الی[4] کا گن گن — अनिल-सनन, अलि का गुन-गुन

۱۔ سمندر ۲۔ میٹھے بول ۳۔ ہوا ۴۔ بھنورا

میری ونشی کے چھدروں[1] میں — मेरी वंशी के छिद्रों में
بھر دو یہ مدھر سور چن چن — भर दो ये मधुर स्वर चुन-चुन

وہاں یہ تمنّا بھی کرتا ہے!

کر آدیش[2]، پھونک دوں شرنگی[3] — कर आदेश, फूक दूं शृंगी
اُٹھے پربھاتی راگ مہان — उठे प्रभाती-राग महान्।
تینوں کال دھونت ہوں سور میں — तीनों काल ध्वनित हों स्वर में
جاگیں سپت[4] بھوون[5] کے پران — जागें सुप्त भुवन के प्राण।

'منگل آہوان' میں ہی شاعر بیداری کا پیغام دینے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے:

پر ہوں وِوش[6]، گان[7] سے کیسے — पर हूं विवश गान से कैसे
جگ کو ہائے جگاؤں میں — जग को हाय! जगाऊं मैं
اس تمسر[8] یگ بیچ جیوتی کی — इस तमिस्र युग बीच ज्योति की
کون راگنی گاؤں میں؟ — कौन रागिनी गाऊँ मैं?

'رینوکا' کی نظموں میں ہم شاعر کو ایک ذہنی کش مکش میں گرفتار دیکھتے ہیں۔ ایک طرف حُسن کی دلآویز ادائیں ہیں جو شاعر کو اپنی طرف کھینچتی ہیں لیکن سماج کی ٹھوس حقیقتوں سے بھی شاعر کنارہ کش نہیں ہو سکتا۔ اس کا شعور بیدار ہے۔ سماج کی جانب سے جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں وہ انھیں بالکل نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دل اور دماغ کی یہ جنگ بہت سے عظیم شعراء کے یہاں ملتی ہے اور اس کش مکش سے کتنی ہی امر تخلیقات عالم وجود میں آئی ہیں۔ اسی کش مکش سے دنکر کو بھی دوچار ہونا پڑا ہے اور اس کے نقوش ان کی نظموں میں صاف نظر آتے ہیں۔ 'کلاتیرتھ' میں جو 'رینوکا' میں ہی شامل ہے، اس کش مکش کی مصوّری بہت ہی حُسن اور فن کاری کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے حُسن اور حقیقت کو بہت ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور علٰحدہ علٰحدہ ان کی تشریح کرنے کے بعد دونوں کے امتزاج سے ایک نئے رُخ کی تشکیل کی ہے۔ اس نظم میں بلا کی اثر انگیزی ہے۔ محاکات نے اسے حد درجہ دل کش بنا دیا ہے

۱۔ سوراخ ۲۔ حکم ۳۔ ایک طرح کا باجا ۴۔ خفتہ
۵۔ دنیا ۶۔ مجبور ۷۔ گانا ۸۔ تاریک

یہ نظم شاعرانہ صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس نظم کے کچھ اشعار نیچے دیئے جاتے ہیں۔ شاعر 'سُندرتا' یعنی حُسن سے مل چکا ہے، اب 'کرتویہ' یعنی فرض سے اس کی مُلاقات ہوتی ہے:

میں نے کہا "کون تم؟" بولا وہ کرتویہ[1]، ستیہ کا پیارا
मैंने कहा, "कौन तुम ?" बोला वह, "कर्तव्य, सत्य का प्यारा,
کرِشی سینچن[2] کے لئے جاتا ہوں یہ نرجھر[3] کی دھارا
कृषि-सिंचन के लिए लिये जाता हूं यह निर्झर की धारा
میں بلشٹھ آشا کا سُت[4] ہوں ستت[5] مگن جیون کے رن میں
मैं बलिष्ठ आशा का सुत हूं, सतत मग्न जीवन के रण में
تندرا[6]، السں مجھے کیوں گھیریں؟ میں اوِرت[7] تلین[8] لگن میں
तंद्रा, अलस मुझे क्यों घेरें ? मैं अविरत तल्लीन लगन में

سُندرتا پر کبھی نہ بھولو، شاپ بنے گی وہ جیون میں
सुन्दरता पर कभी न भूलो, शाप बनेगी वह जीवन में
لکشیہ وِمکھ[9] کر بھٹکائے گی، تمہیں ویرتھ پھولوں کے ون میں
लक्ष्य-विमुख कर भटकायेगी, तुम्हें व्यर्थ फूलों के वन में

وہ رَت[10] ہوا کرم میں اپنے، میں شرم شتھل[11] بڑھا نج پتھ پر
वह रत हुआ कर्म में अपने, मैं श्रम-शिथिल बढ़ा निज पथ पर
"سُندرتا یا ستیہ شریشٹھ[12] ہے؟" اٹھنے لگا دوندو[13] پگ پگ پر
"सुन्दरता या सत्य श्रेष्ठ है ?" उठने लगा द्वन्द्व पग-पग पर
سندرتا آنند مورتی ہے، پریم ندی موہک متوالی
सुन्दरता आनन्द-मूर्ति है, प्रेम नदी मोहक, मतवाली
کرم کُسُم کے بِنا کِنتو، کیا بھر سکتی جیون کی ڈالی
कर्म-कुसुम के बिना किन्तु, क्या भर सकती जीवन की डाली

---

[1] فرض [2] کھیتی کی سینچائی [3] جھرنا [4] بیٹا
[5] ہمیشہ [6] نیند [7] لگاتار [8] مصروف [9] گمراہ
[10] مصروف [11] محنت سے تھکا ہوا [12] عمدہ [13] کش مکش

اور آخر میں شاعر کو ایک سنگم مل جاتا ہے جہاں حقیقت اور حُسن ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ یہ نظم "کلا کا بھون" ہے:-

ایک وِردھ[1] پر چلے مارگ دو آکر دو پرتی کول[1] وِجن[2] سے
سنگم پر تھا بھون کلا کا سندر گھنی بھوت گائن سے

'رینوکا' کی نظمیں ایک حسّاس نوجوان شاعر کی سیماب صفت فطرت کی مظہر ہیں۔ وہ کبھی فطری مناظر کے حُسن میں کھو جاتا ہے، کبھی اس کا ذہن حال کی تلخیوں سے گھبرا کر ماضی کی حسین یادوں میں سکون کا جویا ہے اور کبھی بغاوت کا جذبہ اسے سب کچھ پھونک دینے پر اُکساتا ہے۔ رومانیت اور حقیقت پسندی، ان دونوں کا امتزاج 'رینوکا' میں ملتا ہے۔

'ہنکار' میں دِنکر کی وہ نظمیں شامل ہیں جو قومیت اور وطنیت کے جذبے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں وہی جوش، قوت اور اثر انگیزی ملتی ہے جو اردو میں جوش کی نظموں میں نظر آتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح جوش کو شاعرِ انقلاب کہہ کر ان کی انقلابی نظموں کو ہی زیادہ سراہا گیا اور دوسری نظموں کی اہمیت کو ایک حد تک نظر انداز کیا گیا بالکل اُسی طرح دِنکر کی انقلابی نظموں کو ہی نسبتاً زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ یہ نظمیں مُلک کی اہم ترین سیاسی ضرورت یعنی آزادی کے حصول میں معاون ثابت ہوتی تھیں۔ خالصتاً فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو جوش اور دِنکر کی دوسری نظمیں ان کی انقلابی نظموں سے کہیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

'ہنکار' کے بعد 'رس ونتی' دِنکر کی نظموں کا ایک اور قابلِ ذکر مجموعہ ہے۔ اس کی نظمیں موضوعات کے اعتبار سے 'ہنکار' سے بہت مختلف ہیں۔ 'رس ونتی' کی نظموں کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاعر کی فرار پسندی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دِنکر جس زمانے میں 'ہنکار' کی جوش آفرین نظمیں لکھ رہے تھے اسی زمانے میں وہ 'رس ونتی' کی کویتاؤں کی بھی تخلیق کر رہے تھے۔ 'رس ونتی' کی نظمیں شاعر کے لطیف جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اس میں شاعر کا لہجہ فطری طور پر وہ

---

[1] مخالف [2] سنسان علاقہ

نہیں ہے جو 'ہنکار' کی نظموں میں ملتا ہے۔ ان میں نرمی ہے، مٹھاس ہے اور دل کی گہرائی کو چھو لینے والی خصوصیت ہے۔ 'رس ونتی' میں دنکر نے عورت کی زندگی کے مختلف رُخوں کی عکاسی کی ہے لیکن کہیں بھی انھوں نے عیش کوشی اور ہوس پرستی کو راہ نہیں دی۔ شاعر نے عورت کو مختلف روپوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں بھی اس کے تصورات میں کوئی آلودگی نہیں ہے۔ "رس ونتی" کی نظموں میں بہت اعلیٰ درجہ کی مصوّری ملتی ہے۔ 'بالِکا سے ودھو' میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھئے جس کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے:

ماتھے میں سیندور پر چھوٹی دو بندی چم چم سی
پتلی پر انسو کی بوندیں موتی سی، شبنم سی
لدی ہوئی کلیوں سے مادک[1] ٹہنی ایک نرم سی
یووَن[2] کی وِنتی[3] سی بھولی، گم سُم کھڑی شرم سی

. . . .

بھینگ رہا میٹھی امنگ سے دل کا کونا کونا
بھیتر بھیتر ہنسی دیکھ لو، باہر باہر رونا

دنکر کی تمام تخلیقات میں 'کروکشیتر' کو افضلیت حاصل ہے۔ یہ ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس کا موضوع مشہور مہا کاویہ 'مہا بھارت' سے لیا گیا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اور اس کے بعد جنگ کو موضوع بنا کر ہندی میں بے شمار نظمیں لکھی گئی ہیں لیکن ان میں دو چار نظمیں ہی ایسی ہیں جو جاندار ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ زیادہ تر نظموں میں ذاتی تجربہ اور شدّتِ احساس کا فقدان ہے۔ دنکر نے جنگ کو ایک وسیع پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے جو سوالات اُٹھائے ہیں ان کی نوعیت ہنگامی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ 'کروکشیتر' کی تخلیق ہندوستانی روایات اور تاریخ کے دائرے میں رہ کر کی گئی ہے جس کی بنا پر یہ ہندوستانی ذہن کے لئے ایک خاص کشش کی حامل ہے۔ فکر اور جذبے کی آمیزش نے اس نظم میں بے حد حسن اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ شاعر کے اپنے الفاظ میں "یہاں اس کا اندیشوں سے بھرا دل ہی دماغ کی سطح پر آ کر بول رہا ہے۔"

[1] نشیلی [2] جوانی [3] جھکی ہوئی

اس میں مہا بھارت کی جنگ کا مفصل بیان نہیں ہے۔ کروکشیتر کی جنگ تو یہاں صرف ایک پس منظر کا کام دیتی ہے۔ شاعر نے اسے ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ نظم ان شکوک اور اندیشوں کا اظہار ہے جو حسّاس انسانوں کے دل میں دوسری جنگِ عظیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں جنگ کے جواز اور عدم جواز سے بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے شاعر نے یدھشٹر اور بھیشم کو ان دونوں رخوں کی نمائندگی کے لئے چُنا ہے۔ یدھشٹر عدم تشدد اور امن کے نمائندہ ہیں۔ وہ جنگ کو کسی بھی حالت میں جائز اور مناسب نہیں سمجھتے۔ بھیشم ناانصافی اور ظلم کے انسداد کے لئے جنگ کو جائز اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کا سہارا لے کر شاعر نے جنگ سے متعلق اس کے دل میں اُٹھنے والے شکوک، اندیشوں اور سوالوں کا اظہار بہت ہی مؤثر انداز میں کیا ہے۔ کروکشیتر کی جنگ اور اس کے اسباب کی جو تشریح شاعر نے کی ہے اس کا اطلاق موجودہ دنیا کی جنگوں پر بھی ہوتا ہے۔ کروکشیتر کی جنگ کی ذمہ داری صرف یدھشٹر اور دریودھن پر ہی نہیں تھی وہ تو پورے بھارت ورش میں صدیوں سے پھیلی ہوئی باہمی نفرت اور دشمنی کا نتیجہ تھی۔ دنکر کا یہ شعر دوسری جنگِ عظیم کی کتنی سچی تصویر ہے:

نہ کیول یہ کو پھل کرو ونش کے سنگھرش[1] کا تھا
وِکٹ وسپھوٹ[2] یہ سمپورن بھارت ورش کا تھا

(न केवल यह कुफल कुरु वंश के संघर्ष का था
विकट विस्फोट यह सम्पूर्ण भारत वर्ष का था)

یدھشٹر اور بھیشم کی زبان سے جنگ کے متعلق ان دونوں نظریوں کی وضاحت کرنے کے بعد شاعر مہا بھارت کے میدانِ کارزار سے ہٹ کر دوسری جنگِ عظیم کی طرف آتا ہے اور جنگ کے مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہے۔ اس کے خیال میں سائنس کی ترقی انسان کو کبھی بھی جنگ کی ہولناکیوں سے آزاد نہیں کر سکتی۔ جنگ کے انسداد کی ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان میں محبت اور رفاقت کے جذبہ کی فراوانی۔ دنیا پر جب تک صرف عقل کی حکمرانی رہے گی، اور دل کی رہبری قبول نہیں

[1] تصادم [2] شدید دھاکہ

کی جائے گی تب تک جنگ کا خطرہ باقی رہے گا:

کِنتو ہے بڑھتا گیا مستشک[1] ہی نہ شیش[2]
چھوٹ کر پیچھے گیا ہے رہ ہردے[3] کا دیش
نرمناتا[4] نِتیہ[5] نوتن بُدھی کا تیوہار
پران میں کرتے دکھی ہو دیوتا چیتکار[6]
چاہیئے ان کو نہ کیول گیان
دیوتا ہیں مانگتے کچھ سنیہہ[7] کچھ بلیدان
موم سی کوئی ملائم چیز
تاپ پاکر جو اُٹھے من میں پسیج پسیج

किन्तु है बढ़ता गया मस्तिष्क ही निःशेष
छूट कर पीछे गया है रह हृदय का देश,
नर मनाता नित्य नूतन बुद्धि का त्यौहार
प्राण में करते दुखी हो देवता चीत्कार।
चाहिए उनको न केवल ज्ञान,
देवता हैं मांगते कुछ स्नेह, कुछ बलिदान
मोम सी कोई मुलायम चीज
ताप पाकर जो उठे मन में पसीज-पसीज

'کروکشیتر' بہت ہی بلند پایہ نظم ہے اس میں دِنکر کی شاعرانہ صلاحیت اپنے اَوج پر نظر آتی ہے۔ اس میں غضب کا جوش اور روانی ہے، تشبیہات واستعارات حددرجہ خیال انگیز ہیں اور اندازِ بیان بہت ہی شستہ اور مؤثر ہے۔ بھیشم کی زبان سے کہلوائے گئے اس شعر میں ناانصافی اور ظلم کی بنیاد پر قائم امن کی کتنی پُرمعنی تصویر پیش کی گئی ہے۔

آنن[8] سرل، وچن مدھومے[9] ہے، تن پر شبھر[10] وسن[11] ہے
بچو یدھشٹر! اس ناگن کا وِش سے بھرا دشن[12] ہے

आनन सरल, वचन मधुमय है, तन पर शुभ्र वसन है
बचो युधिष्ठिर! इस नागिन का विष से भरा दशन है

ہندی میں دنکر کی شاعری پر بہت سے تنقیدی مضامین لکھے گئے ہیں جن میں اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے لیکن میرے خیال میں ان کی شاعری کے ایک بہت ہی اہم پہلو کا ابھی تک سیر حاصل تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ میرا اشارہ دِنکر کے اندازِ بیان اور اسلوب کی طرف ہے۔ دِنکر ہندی میں ایک نئی طرز کے مُوجد ہیں۔ ان کا سا اتنا صاف، واضح اور غیر مبہم اندازِ بیان ہندی کے کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ہی نظر آئے گا۔ ان کے اسلوب میں پہاڑی جھرنے کی سی روانی اور صفائی ہے۔ ہندی میں کھڑی بولی کی شاعری کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ دنکر نے ہندی شاعری کو کھڑی بولی کے قالب میں ڈھالنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے میں جو مدد دی ہے وہ حددرجہ قابلِ تعریف ہے۔ مشکل اور پیچیدہ خیالات کا اظہار وہ بہت صفائی اور سادگی کے ساتھ کر جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی طرح ان کی زبان بھی بہت سادہ اور شُستہ ہے۔ ہندی کے بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح انھوں نے صرف سنسکرت کے مشکل الفاظ کو ہی فوقیت نہیں دی ہے اردو اور عام بول چال کے الفاظ کو بھی اپنی شاعری میں نمایاں جگہ دی ہے۔ دنکر کی شاعری نے چھایا واد کے شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی دِنکر نے اپنے لئے شاعری کی ایک نئی راہ نکالی جو موضوع، مواد اور اسلوب کے اعتبار سے چھایا وادی شاعری سے بہت مختلف ہے۔ یہی ایک بات ان کی شاعرانہ عظمت کو منوانے کے لئے کافی ہے۔

---

[1] دماغ [2] بے انتہا [3] انسان [4] روز [5] ہرچیز [6] محبّت [7] سادہ چہرہ [8] میٹھا [9] سفید لباس [10] ڈسنا

'آج کل' اگست ۱۹۶۰ء کا شمارہ 'ہندوستانی مصوری نمبر' ہوگا

واہی

بانیانِ مشاعرہ سے

اے منتظمِ بزمِ سخن، بانیٔ صحبت — کچھ تجھ سے مقامی شعراء کو ہے شکایت
بہتر ہے فریقین میں ہو جائے صفائی — بہتر ہے کہ باقی نہ رہے دل میں کدورت
یہ بات مسلّم کہ تجھے دردِ سخن ہے — اور یہ بھی بجا، تجھ کو میسّر ہے فراغت
اوقات گذاری کے لئے تیری نظر میں — بہتر مے و مینا سے ہے اشعار کی لذّت
پرہیز اگر رقص و غنا سے ہے بظاہر — کچھ مصلحت و فتنہ ہے کچھ پاسِ شریعت
پھر اس کے علاوہ یہ کھلی بات ہے اب تو — بزمِ شعراء کرتی ہے دونوں کی نیابت
القصّہ ترا ذوق جو اُکساتا ہے تجھ کو — مائل بہ سخن ہوتی ہے جب تیری طبیعت
کرتا ہے بپا اپنے یہاں مجلسِ شعری — بیشِ شعراء بھیج کے بیہ دانہ دعوت
گھر پر ترے جُٹ جاتے ہیں دس بیس خوش آہنگ — موقع ہو تو واہی کی بھی ہو جاتی ہے شرکت
ہوتی ہے تمام آخرِ شب تک کہیں جا کر — جمتی ہے سرِ شام سے اکثر جو یہ صحبت
جی کھول کے اشعار سناتے ہیں سخن ور — اور داد کی تقسیم بھی ہوتی ہے بہ کثرت
لیکن کبھی اس بات پہ بھی غور کیا ہے — تو اُن کی کیا کرتا ہے کس طرح ضیافت
پنواڑی کی دوکان کی دو ایک گلوری — یا چائے کی اک آدھ پیالی بہ کراہت
چھ گھنٹے جو محبوس رہیں بزم میں تیری — کیا اُن کے تحمّل کی یہی ہوتی ہے قیمت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ ہیں شاعر ولی اللہ — کھانے کی ضرورت ہے نہ پینے کی ضرورت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ انھیں ضعفِ جگر ہے — بیچاروں کو ہے بھوک نہ لگنے کی شکایت
کیا تجھ کو گماں ہے کہ وہ ہیں قحط کے مارے — اور قحط کے ماروں کو تو فاقوں کی ہے عادت
مطبخ جو ترا ہو، دلِ واہی کی طرح سرد — ہوٹل کو تو کاشانۂ احساں سے ہے قربت

واہی کی ہے یہ نظم وکالت شعراء کی
واللہ کہ خود اُس کو نہیں کوئی شکایت

تحسین سروری

سالک اور غالب

مرزا غالب کے شاگردوں میں مرزا قربان علی بیگ سالک کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ غالب کے اب تک جتنے خطوط دستیاب ہوئے ہیں اُن میں سالک کے نام اگرچہ صرف دو ہی خطوط ہیں۔ لیکن انھیں سے ان کے مراسم دوستی باہمی اتحاد و ارتباط اور خلوصِ بے پایاں کا اندازہ ہوتا ہے۔ سالک کی شاعرانہ حیثیت بھی مسلّم ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو محض غالب کے دوست اور شاگرد ہونے کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سالک، نواب مرزا عالم بیگ خان کے بیٹے اور مرزا عاشور بیگ خان غالب جنگ کے پوتے تھے۔ وہ اُوزبک تُرک قوم کی نسل سے تھے۔ ان کا خاندان مدّت سے دہلی کو اپنا وطن بنائے ہوئے تھا۔

مرزا عالم بیگ خان روزگار کے سلسلے میں حیدرآباد بھی گئے تھے۔ جہاں مرزا قربان علی بیگ خان سالک پیدا ہوئے۔ جب سالک چھ برس کے تھے ان کے والد ملازمت ختم کرکے اپنے وطن دہلی آ گئے۔ اس لحاظ سے سالک کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشو و نما دہلی ہی میں ہوئی۔ غدر کے بعد مہاراؤ راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور کی سلکِ ملازمت میں منسلک ہوئے۔ جہاں خدمتِ وکالت ان کے ذمّہ کی گئی۔ الور کی ملازمت ترک کرکے سیدھے حیدرآباد پہنچے۔ حیدرآباد میں اُن کے چچا پہلے سے مقیم تھے اور وہ نواب صاحب ناظرِین، نواب دن بہادر خان کے ہاں ملازم تھے اور بعد میں انھیں کی دُختر سے شادی کرکے خانہ داماد ہو گئے تھے۔ سالک نے انھیں کے پاس اپنا مستقل قیام رکھا۔

حیدرآباد پہنچنے کے بعد سالک نے محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ داری کا عہدہ سنبھالا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حیدرآباد میں تعلیمی اور معاشرتی بیداری پیدا ہو چلی تھی۔ اُس وقت محکمۂ تعلیمات کے ناظم نواب عماد الملک مولوی سیّد حسین بلگرامی تھے۔ سالک نے نواب صاحب کی سرپرستی میں ایک رسالہ "مخزن الفوائد" ۱۸۸۰ء میں جاری کیا۔ غالباً اردو کا یہ پہلا رسالہ تھا جس میں جدید علوم و فنون اور سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی طرح تحقیقی و تاریخی مضامین بھی فراہم کرکے چھاپے جاتے تھے۔

سالک کو شعر گوئی کا شوق پندرہ برس کی عمر سے ہوا۔ شروع میں حکیم مومن خان کو اپنا کلام دکھلایا۔ پھر چند روز بعد غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا ابتدا میں قربان تخلص رکھا تھا لیکن غالب کو یہ تخلص پسند نہ آیا۔ انھیں کے ایماء سے سالک تخلص اختیار کیا۔ ۵۷ برس کی عمر پا کر ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ قدر بلگرامی شاگرد غالب نے تاریخ وفات کہی۔

"نواب قربان علی سالک ہزار افسوس مُرد۔"

سالک کے چھوٹے بھائی مرزا شمشاد علی بیگ رضواں بھی غالب کے شاگرد تھے، ان کے نام بھی غالب کے دو خطوط ہیں[1] دونوں بھائی شطرنج

---

[1] مولانا غلام رسول مہر، خطوط غالب (طبع دوم) میں تحریر فرماتے ہیں "رضوان بھائی (یعنی سالک) کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکے ۱۸۷۶ء میں وہ بھی چل بسے۔" لیکن یہ تحقیق سراسر غلط ہے۔ دراصل رضوان خود سالک کی زندگی میں فوت ہوئے۔ اس واقعہ کے پانچ سال تک سالک زندہ رہے اور رضوان کی وفات پر قطعہ تاریخ اور ۴۲ ابیات کا جو مرثیہ لکھا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی خوب کھیلتے تھے اور "جلسۂ شطرنج دہلی" کے رکن تھے۔ یہ جلسہ نواب علاؤالدین احمد خان بہادر نے ۱۸۶۶ء میں قائم کیا تھا۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر کلیّاتِ سالک کا مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں اکمل المطابع دہلی سے سید فخرالدّین کے زیرِ اہتمام زیورِ طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ یہ کلیّات (۳۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں غزلیات و قصائد قطعات و رُباعیات، مخمس و مسدّس، واسوخت و ترجیع بند اور دیگر اصنافِ سخن شامل ہیں۔

جناب مالک رام صاحب نے "تلامذۂ غالب" میں لکھا ہے کہ "سالک کے دو دیوان ہنجارِ سالک اور میخانۂ سالک کے نام سے تھے۔" لیکن زیرِ نظر کلیات کو ان دونوں سے علیحدہ مجموعۂ کلام خیال کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ اوّل کے دو دواوین کو یک جا کر کے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارے اس خیال کی بنیاد سالک کے فرزند مرزا خان عابد اور راجہ گنیش پرشاد[1] بہادر شاد کے قطعات تاریخ طبع کلیات پر قائم ہوئی ہے۔ عابد کا قطعہ یہ ہے ؎

ہے ولی نعمی کے تصنیفات سے	یہ کتاب نادرلے دل چھپ گئی
ہیں سخن کی زمزمہ پرداز یاں	لو یہ تعلیم عنادل چھپ گئی
کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ لیں اہلِ نظر	کس کی یہ سعی انامل چھپ گئی
پہلے تو تھے چند جزو اس کے مگر	اب کلامِ نو کے شامل چھپ گئی
سال کی تھی فکر، عابد نے کہا	دیکھ نظم قبلہ، کامل چھپ گئی

یعنی نہ صرف پہلے کے دو مجموعوں کو ہی ملا کر چھاپا گیا ہے۔ بلکہ کلیات میں بعد کا کلام بھی شامل کیا گیا۔ راجہ گنیش پرشاد کے قطعہ تاریخ سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے ؎

اب کے پوری نظمِ سالک چھپ گئی	مژدہ باد اے ناظرین ذی کمال

غالب کے دوسرے شاگردوں کی طرح سالک کو بھی اپنے اُستاد سے والہانہ محبّت تھی۔ وہ بھی غالب کو یگانۂ روزگار جانتے تھے اور اُن کے علم و فن اور ذہانت و ذکاوت کو دل سے مانتے تھے۔ ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

روشن بیاں کہیں مرے اُستاد سا نہ پائیں
سالک اگر لئے پھریں اہلِ جہاں چراغ

جب غالب کا انتقال ہو گیا تو معلوم ہوتا ہے کہ تادمِ زیست اُن کے غم میں نجور و ملول رہے۔ چناں چہ کلیات میں غالب کے انتقال پر جو قطعات درج ہیں اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

اسد اللہ خاں بہادر کا	بھر گیا کیوں حیات کا ساغر
اِس ضعیفی و ناتوانی میں	کیوں عدم کی طرف کیا ہے سفر
حیف اے آسمانِ ناہنجار	وائے اے روزگارِ کیں پرور
ہائے وہ تاجدارِ مُلکِ سخن	ہائے وہ اوستادِ اہلِ ہنر
اُس کے غم میں ہوا ہے ماتمِ عام	پھر نہ کیوں کر سیاہ ہو دفتر
گمرہانِ رہِ معانی کا	آج دُنیا سے گم ہوا ہے خضر
پاؤں رکھنا سنبھال کر سالک	اب طریقِ سخن ہے بے رہبر
کس کو اہلِ زمانہ جانیں گے	بہترینِ زمانہ سے بہتر
اُن کے اوصاف کیا رقم ہوں کہ ہیں	میری حدِّ بیان سے باہر
فکر اُن کی گئی وہاں کہ جہاں	طائرِ سدرہ کا رہے شہپر
اُن کے اندیشے کی بلندی سے	قصرِ معنی ہے آسماں منظر
نثر دیکھو تو معدنِ معنے	نظم دیکھو تو رشکِ عقدِ گہر

(پچھلے صفحہ سے آگے) اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھائی کی مفارقت کا داغ عمر بھر اُن کے دل پر رہا۔ اس سانحہ سے متعلق اُن کی آٹھ رُباعیات بھی موجود ہیں۔ قطعۂ تاریخِ وفات یہ ہے ؎

روزِ یکہ برادر از جہاں رفت	گفتیم کہ وائے وائے رضواں [۱۲۹۳ھ]
از عالمِ بے مدار بگذشت	گردید بہ خلد جائے رضواں [۱۸۷۶ء]

مذکورہ رباعیات میں سے دو ملاحظہ ہوں

رضواں سے جُدا ہو کے جو نکلا گھر سے	آنسو نکل آئے مِرے چشمِ تر سے
اب چھٹ کے نہ مل سکیں گے باہم سالک	یہ بات ہویدا تھی دلِ مضطر سے

کیا دارِ فنا میں ہم نے آ کر دیکھا	آغاز سے انجام برابر دیکھا
ایّامِ طفولیت میں ماں سے چھوٹے	اب پیر ہوئے داغِ برادر دیکھا

اسی طرح مولانا قہر نے سالک کا سالِ وفات بھی غلط لکھا ہے۔ دراصل وہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں فوت ہوئے۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

[1] کلیات کے آخر میں سالک کی تاریخِ طبع سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ گنیش پرشاد کی سعی و امداد سے اس کی طباعت عمل میں آئی۔

اُن کے اجمال سے عیاں توضیح   اُن کے انداز میں ادا مضمر
ہائے وہ لُطف یاد آتے ہیں   جی میں ہوتی ہے کاوشِ نشتر
مجھ کو سودا نہیں کہ اس غم میں   در و دیوار سے نہ پھوڑوں سر
کور ہو جائے بس ابھی یا رب   گر نہ دریا بہائے دیدۂ تر
ہوں نہ اس غم سے جس کے دو ٹکڑے   میرے سینے میں ہے کہاں وہ جگر
مجھ سے کیا پوچھتے ہو سالِ وفات   ہوش کب ہیں بجا کہ ہوں مضطر

۱۱۴۱   ۱۴۴۰

دیکھ لو رنجِ حسرتِ دوری   دلِ نومید پر ہجومِ آور

(۱۲۸۵)

قطعہ دوم

غمِ مرگِ دبیر الملک عام است   سپہر ابوابِ غم در دہر بکشاد
ریاحینِ سخن پژمردہ گشتند   خیابانِ معانی رفت بر باد
ز دل پرسیدم از سالِ وفاتش   بہ تسالک[۱۱۱] داغِ نجم الدولہ[۱۱۷۴] بنہاد
نظر کردم سرِ ہر مصرعے را   بنائے عیسوی تاریخ افتاد[۱۲۸۵]
۱۸۶۹

قطعہ سوم

صدمۂ مرگِ حضرتِ غالبؔ   سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
اور اُسی سال میں چھپی یہ کتاب   طبع کا اس کی اختتام ہوا
خوب ہے سالِ طبع و سالِ وفات   آج اُن کا سخن تمام ہوا

(۱۲۸۵)

مولانا حالیؔ اور میر مہدی مجروحؔ نے غالبؔ پر مرثیے لکھ کر جو حقِ شاگردی ادا کیا ہے سالکؔ بھی اس ادائے حق میں پیچھے نہیں ہیں۔ اس میں شک ہی نہیں کہ حالیؔ کا مرثیہ اردو کے بلند ترین مرثیوں میں شمار کرنے کے لائق ہے لیکن یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سالکؔ کا مرثیہ بھی کسی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ کم از کم میر مہدی کے مرثیے کی ٹکر کا مرثیہ تو ضرور کہا جا سکتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سالکؔ کے پورے مرثیے کو یہاں نقل کیا جائے۔

ترجیع بند در نوحہ سرائی وفات جناب استادی نجم الدولہ
دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان بہادر نظام جنگ غالبؔ

شب کو اختر شمار ہوتا تھا   روز آنکھوں میں تار ہوتا تھا
اب کہاں گُل فشانیٔ مضموں   خامہ حسرت نگار ہوتا تھا
شب، شبِ انتظار بنی تھی   روز، روزِ شمار ہوتا تھا
حشر برپا ہوا تو خوب ہوا   یہ بھی اے روزگار ہوتا تھا
کیوں بر آئے مری کوئی اُمید   نا اُمیدی شعار ہوتا تھا
نفسِ چند کیوں رہے باقی   دہر میں شرمسار ہوتا تھا
ہر ستم میرے واسطے لے چرخ   خنجرِ آبدار ہوتا تھا
تیغِ بیداد تیز ہوتی تھی   اور مجھ پر ہی وار ہوتا تھا
نغمۂ سنجِ نشاط کیا ہوتا   زیبِ لب بار بار ہوتا تھا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

اب نہیں ہوش میں رہا کوئی   کیا مرا حال پوچھتا کوئی
کوئی آزارِ چرخ کا گلہ مند   شاکیٔ بختِ نارسا کوئی
چشمِ تر سے ہے کوئی طوفاں خیز   ضبط سے ہے بھرا ہوا کوئی
ہے کسی کی فغاں شرر افشاں   سوزِ پنہاں سے جل گیا کوئی
جو نہ مانگے کبھی کوئی مجبور!   لب پہ لاتا ہے وہ دُعا کوئی
اپنے عالم میں مبتلا ہے جہاں   کوئی دشمن نہ آشنا کوئی
نہیں چھٹنے کا زندگانی تک   غم کی سمجھا نہ انتہا کوئی
راز اتنا تو کھول دے مجھ پہ   نہیں اسرار داں ملا کوئی
اب یہ کیوں آسماں کو ہے گردش   فتنہ اس سے بھی ہے سوا کوئی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

جس میں رہتا تھا ہائے جلوۂ یار   ہے وہی آنکھ غم سے طوفاں بار
تھا سکوں میں جو مرکزِ خاکی   نہیں اس دل کو مثلِ برق قرار
جان لب پر کبھی نہ آئی تھی   اب لبوں سے بھی ہو گئی بیزار
اب وہ پیمانۂ حیات ہُوا   زیبِ کف تھا جو ساغرِ سرشار
یک نفس زندگی محال ہوئی   کاش آساں ہو مُردنِ دشوار
رات بدتر ہے روزِ ماتم سے   روز ظلمت میں غیرتِ شبِ تار
مرگ کا اب خدا سے طالب ہوں   پہلے کیا کیا تھی مانگنے میں عار
زہر کھانے میں خوف تھا کیا کیا   اب سمجھتا ہوں چارۂ آزار

سببِ گریہ پوچھتے ہیں لوگ ۔۔ مجھ کو کہنا پڑا یہی نا چار

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

نہ کروں گا علاجِ دردِ جگر ۔۔ زندگی موت سے نہیں بہتر
دلِ گم گشتہ کا کہوں کیا حال ۔۔ کہ مجھے جان کی نہیں ہے خبر
سطحِ خاک کی الٹی خیمہ ۔۔ آج رُکتے نہیں ہیں دیدۂ تر
شمعِ بزمِ سخن کی خاموشی ۔۔ دے گئی نالہائے صور اثر
بیکسِ آتشِ زباں کا مرنا آہ ۔۔ کر گیا برق سے سوا مضطر
کشتِ اُمید ہو گئی تاراج ۔۔ خرمنِ صبر پر چلی صرصر
نخلِ حرماں میں تازگی آئی ۔۔ شجرِ آرزو ہوا بے بر
مجھ پہ سو بار حشر بھی گزرا ۔۔ پر نہ اس حادثہ سے تھا بڑھ کر
ہو گیا ہے مرا یہ تکیہ کلام ۔۔ پہلے ہر بات سے ہے یہ لب پر

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

خضرِ راہِ سخن جہاں سے گیا ۔۔ ہادیٔ راہ کارواں سے گیا
مرگ کا زندگی میں تھا کھٹکا ۔۔ یہ بھی غم ہائے جاوداں سے گیا
شعلے ہر بات میں نکلتے ہیں ۔۔ ضبط اب سوزشِ نہاں سے گیا
شکر ہے موت جلد اگر آ جائے ۔۔ شکوہ اب مرگِ ناگہاں سے گیا
دہر ہی پر نہیں ہے رونقِ دہر ۔۔ باعثِ زیبِ دہر یہاں سے گیا
گل ہیں لیکن نہیں بہارِ نظر ۔۔ رنگ گویا کہ گلستاں سے گیا
دل ہے لیکن نہیں ہے دل کو قرار ۔۔ صبر گویا کہ اپنی جاں سے گیا
خاک میں مل گیا عروجِ سخن ۔۔ ہنرِ معنی کے آسماں سے گیا
یاد ہے وہ عذوبتِ گفتار ۔۔ اب سخن کا مزا زباں سے گیا

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

غمِ استاد ہے اگر، یہ ہی ۔۔ یا خدا کیونکہ زندگی ہو گی
مبتلائے الم ہوں، کیا جانوں ۔۔ عیش کیا شے ہے اور خوشی کیسی
دمبدم اپنے حال پر رونا ۔۔ اور رونے پہ گاہ گاہ ہنسی
میں ہوں اور رنج بے کسی افسوس ۔۔ وہ بھی دن تھے کہ خوش گزرتی تھی

ایک دن دہر میں مری فریاد ۔۔ ہائے ہو جائے گی کہانی سی
آسماں گر پڑے تو گرنے دو ۔۔ سر پہ ایک بوجھ اپنے یہ بھی سہی
شق اگر ہو زمیں تو ہو جائے ۔۔ میں ہوں پیوند کاش جیتے جی
کیجیئے نالہ اور مر رہیئے ۔۔ زندگی کی ہے کائنات یہی
کیا کہوں کون مر گیا سالک ۔۔ آپ کہتے ہیں طالب و عرفی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خان غالب مُرد

یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے شعراء کے مقابلے میں شاگردانِ غالب نے اپنے استاد کی غزلوں پر بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چند معروف و غیر معروف شعراء نے غالب کے رنگ میں شعر موزوں کرنے کی مشق کی لیکن شاگردانِ غالب میں سے ایک بھی ایسا نہیں ملتا جس کی یہ کوشش رہی ہو کہ وہ اپنے استاد کا طرز اختیار کرے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود شاگردانِ غالب کو غالب کا رنگِ شاعری پسند نہ تھا، لیکن چونکہ دُور دُور تک اُن کی شہرت تھی اور ساتھ ہی اُن کے بہرۂ علم اور سخن سنجی و سخن دانی کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا، اس لئے لوگ اُن کی دوستی یا شاگردی کو اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھتے تھے اور پھر غالب کا طرزِ اصلاح بھی کچھ ایسا تھا کہ ان کی ندرتِ بیان، بلندیٔ فکر اور "غیب سے آنے والے مضامین" شاگردوں کے افکار سے ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس موقع پر یوں کہنا مناسب ہوگا کہ سب کے سب غالب کے رسمی طور پر شاگرد تھے۔ زیادہ تر اُن میں ایسے تھے جنھیں دوست یا عقیدت مند احباب کہا جا سکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سالک نے بھی چند غزلیں استاد کی غزلوں پر کہی ہیں لیکن ایک شعر میں بھی غالب کی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لیکن چونکہ بہر حال غالب کے ایک مشہور شاگرد کا کلام ہے اور غالب کی زمینوں میں ہے اس لئے کچھ غزلوں کے منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں:

نالہ جو دل سے نکلا اثر افشاں نکلا ۔۔ کرۂ نار مرے سینے میں پنہاں نکلا
میں نکلتا تری محفل سے اکیلا اے کاش ۔۔ غم یہ ہے ساتھ مرے غیر کا ارماں نکلا
جذبۂ دل کا اثر دیکھ کے کھائے سو تیر ۔۔ پر کوئی توڑ کے سینے سے نہ پیکاں نکلا

دل خلشِ دوست ہے اور جگر ہے حاصل کش   پاؤں سے یاں کوئی خارِ مغیلاں نکلا
پیچ میں اس بُتِ عیّار کی آیا افسوس
سالکِ غمزدہ سیدھا سا مسلماں نکلا

کچھ ہو پر اس کو جانب دیوار دیکھنا   اک بار منہ کیجیے تو سو بار دیکھنا
ہمسایہ میں وہ آئے ہیں یاں لگ رہی ہے آگ   کچھ روشنی سی ہے سرِ دیوار دیکھنا

کیجیے کیا، ناتوانی مانعِ پرواز ہے   ورنہ دروازہ قفس کا رہ گیا اکثر کھلا

ہو کار رنگ مری چشمِ تر میں خاک نہیں   کہ دل میں حال نہیں اور جگر میں خاک نہیں
تمھارے جی میں ہے، باقی غبار کچھ اب بھی   دم آج عاشقِ شوریدہ سر میں خاک نہیں

گیا ناپسند کر دی آسماں نہیں   لیکن، زمینیوں پہ خدا مہرباں نہیں
بُو آ رہی ہے آمدِ فصلِ بہار کی   رنجِ خزاں نتیجۂ فصلِ خزاں نہیں
تنکے جلے ہوئے نہیں اے برق کس جگہ   باندھا چمن میں ہم نے کہاں آشیاں نہیں
سالک خموش بیٹھ رہے پڑھ کے چند شعر
پورا ہُوا فسانۂ غم کا بیاں نہیں

بنایا دوست اک مدّت میں ہم نے دل سے دشمن کو
کنوئیں لاکھوں جھکا کر راہ پر لے آئے رہزن کو
ابھی ہم کو ملا دے خاک میں اے چرخِ کیں پرور
ابھی اس شہسوارِ ناز نے چھیڑا ہے توسن کو
جنوں سے کم نہیں یہ بخیہ سازی چارہ گر میری
رفو تارِ گریباں سے کیا ہے چاکِ دامن کو

آپ کی چال قیامت ہی سہی   داد خواہی مری عادت ہی سہی
مے کدہ کی نہیں ملتی گر راہ   آؤ مسجد کی زیارت ہی سہی
کوئی تو بات ہنسی کی نکلے   خندۂ صبحِ قیامت ہی سہی
وصل اس بُت کا نہیں گر سالکؔ   آج کی رات عبادت ہی سہی

یوں حال اس گلی کا سنانا نہ تھا مجھے   آخر یہ حیلہ چھوڑ گیا رہنما مجھے
انصاف کا گماں ہے شبِ وصل کی امید   ہے شکوۂ درازیٔ روزِ جزا مجھے
گرداب کا ہے کشتیٔ عمرِ رواں کو خوف   گھیرے ہوئے ہے بحرِ محیطِ فنا مجھے

کیا رشک ہو کہ دیکھنے کی کس کو تاب ہے
عارض پہ تیرے فرطِ تجلّی نقاب ہے
دیدارِ حسنِ یار ہے دامانِ چشمِ تر
کاش نہ سوزِ شبنمِ گلُ آفتاب ہے
یاں ہو گئی ہے بند زباں رعبِ حسن سے
وہ جانتے ہیں بات مری لاجواب ہے
لو خون ہو کے اور زیادہ ہوا عزیز
آنکھوں میں مسکنِ دلِ خانہ خراب ہے
چُن چُن کے میں نے لکھے ہیں اوصافِ حسنِ یار
ہر شعر اس غزل میں مرا انتخاب ہے
اس قلزمِ گناہ میں سالکؔ ہوں آشنا
ساحل پہ جس کے زورقِ جامِ شراب ہے
اس نالہ و زاری سے یہ آیا مرے آگے
آتش مرے سر پہ ہے تو دریا مرے آگے
بہلاتے ہیں دن رات مشایہ ترے بن کر
کرتے ہیں مہ و مہر تماشا مرے آگے
روتے ہی بن آئی مجھے بازار میں ناچار
قاصد نے کیا ذکر کچھ ایسا مرے آگے
ناصح کی بھی سنوا ہیں اے عشق ملامت
احباب تو سب بن چکے دانا مرے آگے
کس شہر میں ہو حضرتِ سالکؔ کا ٹھکانا
کل جھاڑتے تھے گوشۂ صحرا مرے آگے

کھاتے ہر زخم پہ سوزِ غم یاں یہ دل میں ہے
واں نزاکت تیغ کے بدلے کفِ قاتل میں ہے

حُسنِ حیرت خیز نے بے ہوش سب کو کر دیا
آج خلوت میں ہے گویا جو تری محفل میں ہے

غلط کی راہ گھر سے ڈھونڈنے کو جب کہ ہم نکلے
چلے تھے اس گلی کو جانبِ ملکِ عدم نکلے
جو ہم سے رندِ مفلس کو کبھی قسمت سے مل جائے
تو بکنے کے لئے دو روز ہی میں جام جم نکلے
دلِ آشفتہ گر پائے بُتاں میں خون ہو جائے
تو ہر قطرے سے آوازِ انا بیت الصنم نکلے
شکایت کس زباں سے ہو سکے اس زلفِ پیچاں کی
بڑے اپنے مقدر ہی میں لاکھوں پیچ و خم نکلے
کہو الزام دیں کیا کہہ کے ان کو ہم نے دیکھا کیا
اُدھر دشمن نے محفل میں قدم رکھا کہ ہم نکلے

سوزشِ محبت سے جسم و جاں نے کیا پایا آگ میں جلا دیکھا خاک میں ملا پایا

غالب نے چکنی ڈلی کی تعریف میں جو قطعہ کہا تھا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ ان کے بعض معاصرین نے اس کی تقلید میں قطعات لکھ کر دادِ سخن دی ہے۔ سالک نے یہ جدت کی ہے کہ "فلفلِ سُرخ" کے عنوان پر طبع آزمائی کی ہے۔ بحر و ردیف وہی غالب کی چکنی ڈلی والی ہے لیکن قافیہ غالب سے الگ ہے۔ اگرچہ سالک کی یہ کوئی مستحسن کوشش نہیں کہی جا سکتی تاہم اس قطعہ میں جو نادر تشبیہیں استعمال کی گئی ہیں وہ یقیناً دل چسپی کا باعث ہو سکتی ہیں۔ یہ قطعہ ضیافتِ طبعِ ناظرین کے لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے ؎

"قطعہ بفرمائش دوستے بہ تعریفِ فلفلِ سُرخ"

فلفلِ سُرخ بھی ہے خوانِ زمیں پر اک چیز
اس کی تعریف میں جو کچھ کہ ہے شایاں کہئے
لبِ پاں خوردۂ معشوق سے نسبت دیجیے
سرِ انگشتِ حنا بستۂ خوباں کہئے
بے تکلف قدِ گلرنگِ البا ساں لکھئے
مد شنجرفیٔ یاقوتِ رقم خاں کہئے
سبز رنگی میں سزاوار ہے جو کیجئے فرض
سبز فولاد کا نو ساختہ پیکاں کہئے
سُرخ رنگی میں نہ کہئے کہ اسے کیا لکھئے
خنجرِ تر شدۂ خونِ شہیداں کہئے
سببِ سُرخیٔ منقارِ ببباں گر کیجے
تو اسے لقمۂ طوطیٔ سخنداں کہئے
دیکھ لیجیے جو لٹکتے ہوئے اُلٹا اس کو
سبزۂ حلقۂ گوشِ چمنستاں کہئے
سرنگوں شاخ میں ہے مثلِ حیا مندوں کے
ہاتھ آ جائے تو اک شوخِ ستمراں کہئے
دانت رکھتے ہیں بہت اس پہ حریفانِ جہاں
اس کو ہم لذتِ بوسِ لبِ جاناں کہئے
رکھیئے گر ہاتھ پہ وہ چار اُٹھا کر سالک
ہاتھ کو رشکِ دہِ پنجۂ مرجاں کہئے

دیوانِ سالک کے آخری صفحات میں اساتذۂ فارسی و اُردو کی غزلوں پر مخمس بھی ملتے ہیں۔ ان میں غالب کی بھی دو غزلوں پر تضمینیں لکھی گئی ہیں۔ چند بند آپ بھی سُن لیجئے۔

ہیں کون ہم جو یہ کہوں مجھ سے نباہ ہو ہو جس پہ لطف اس پہ کرم کی نگاہ ہو
چلیئے اسی سے آپ کا جو نیک خواہ ہو تم جانو تم کو غیر سے گر رسم و راہ ہو
مجھ سے بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

دل ہی نہیں بچا تو پھر اب کیا جگہ کی قید چھوٹے بس آشنا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
سب سے ہوا جدا تو پھر اب کیا جگہ کی قید جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

تقریبِ زاہدوں کی سمجھتے ہیں کب درست ہر اک جہان کہنے لگا سن کے جب درست
اس اجتہاد پر نہ یقیں کیوں ہو اب درست سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غرقاب سطحِ خاک اگر ہو تو ڈر نہیں   گر جائے آسماں بھی تو اتنا خطر نہیں
حاجب کسی کی دید میں سالک اگر نہیں   غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

طالع نہ مہر ہے نہ اذاں زیبِ گوش ہے   نے طائروں کو زمزمہ سنجی کا ہوش ہے
آغاز صبح کا ہے نہ پیدا خروش ہے   ظلمت کدے میں اپنے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
سنتا ہے کون کس سے کہوں جا کے اپنا حال   کٹتے ہیں رنج و غم میں شب و روز و ماہ و سال
کہیے تو کس طرح سے نہ ہو زندگی محال   نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے
اک عمر تک نگاہ بد و نیک پر نہ کی   گویا تھی ایک چادرِ غفلت پڑی ہوئی
آخر کو ہوش آئے تو آیا نظر یہی   ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
رکھتا تھا دل کشی کا اثر گوشۂ بساط   تھا غیرتِ بہار مگر گوشۂ بساط
سمجھے ہوئے تھے باغِ نظر گوشۂ بساط   یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
بکسو صلائے بادہ و یکسو نوائے چنگ   وہ جلوہ ہائے دلکش و وہ نغمہائے چنگ
دل میں ہوس شراب کی سر میں ہوائے چنگ   لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
نے دورِ جام ہے نہ وہ ساقی نہ وہ خوشی   افسردہ اہلِ بزم ہیں بیزار زندگی
اب کس سے پوچھیے کہ ہوئی کیا یہ برہمی   داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
تولیفا اس غزل کی ہمارے مقال میں   گویا کہ آبِ خضر ہے جامِ سفال میں
سالک کہے پھنسا نہ ہو گر اپنے حال میں   آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

سالک نے جن لوگوں کی شان میں قصائد لکھے ہیں اور جن اشخاص کی کسی تقریبِ مسرت یا انتقال پر تاریخی قطعات لکھے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو غالب کے مربی، شاگرد، دوست یا قریبی عزیز تھے۔ ان میں چند ایسے بھی ہوں گے جن سے غالب کے راس تعلقات نہ تھے، لیکن مکاتیبِ غالب میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ملتا ہے۔

ا۔ قصائد و قطعاتِ تہنیت

۱۔ ثنائے نواب کلب علی خان بہادر والیٔ رام پور
۲۔ قصیدہ و سہرہ بتقریبِ شادی راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور۔
۳۔ قصیدہ محمد تفضل حسین خاں کوکبؔ
۴۔ مسند نشینی والیٔ الور
۵۔ کدخدائی میرزا احمد سعید خاں خلف نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر
۶۔ تولد فرزند میاں داد خاں سیاحؔ

ب۔ قطعات جو دیگر مواقع پر کہے گئے

۱۔ طبع بوستانِ خیال ترجمہ اردو از خواجہ بدر الدین
۲۔ یافتن خطاب نواب غلام بابا خان لقب خانی و بہادری
۳۔ طبع دیوان نواب مرزا خان داغؔ موسوم بہ گلزارِ داغ
۴۔ طبع شرح دساتیر مصنفہ مولوی نجف علی ساکن جھجر

ج۔ وفات کے تاریخی قطعات

۱۔ محمد نصیر الدین معروف بہ کالے صاحب
۲۔ میرزا زین العابدین خاں عارفؔ
۳۔ یوسف میرزا
۴۔ نواب امین الدین احمد خان بہادر رئیس لوہارو
۵۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ
۶۔ میرزا شہاب الدین احمد خان بہادر ثاقبؔ
۷۔ محمد تفضل حسین خان کوکبؔ
۸۔ مرزا یوسف علی خان عزیزؔ
۹۔ میرزا باقر علی خان کاملؔ خلف زین العابدین خان عارفؔ
۱۰۔ میرزا شمشاد علی بیگ رضوانؔ برادر سالکؔ
۱۱۔ خواجہ بدر الدین خان عرف خواجہ امان مترجم بوستانِ خیال
۱۲۔ مولوی غلام امام شہیدؔ

چاہیئے یہ تھا کہ ان قطعات میں سے چند اہم قطعات کا انتخاب دے دیا جاتا، لیکن چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے اس لئے ان قطعات کی فہرست ہی پر اکتفا کیا گیا۔

ڈال ڈال کے پات

قطعاتِ تاریخ

کسریٰ منہاس

بروفاتِ اعتبار الملک حکیم الشعراء لسان الدہر حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہانپوری
جانشین امیر مینائیؒ

اے وائے حکیم ضمیر حسن خان دلؔ

۱۹ ء ۵۹

چھبیسویں ماہِ دسمبر، روزِ ہفتہ، دوپہر
جب چل دیئے اس دارِ فانی سے سوئے ملکِ جناں
کسریٰ لکھو تم ان کی رحلت کا یہ سالِ عیسوی
آہ اعتبار الملک دلؔ تھے شاعرِ نازک بیاں

۱۹ ء ۵۹

ولہ

آہ کسریٰ! شمعِ مینائیؒ بجھی
دل نہ کیوں ہو ان کے غم میں مضمحل
شاعرانِ خلد کی محفل میں ہیں
نور افروز اعتبار الملک دلؔ

۱۳ ھ ۷۹

کتبہ برائے سنگِ مزار

مرقدِ اعتبار الملک دلؔ جانشین امیر مینائیؒ

۱۹ ء ۵۹

(نیرنگِ خیال)

اسد ملتانی

ماہر القادری

جناب اسد ملتانی مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے دلّی میں ہوئی تھی اسے بھی سولہ سترہ سال ہونے کو آئے۔ ان کے لب و لہجہ اور وضع قطع سے میں شروع شروع میں یہ سمجھا کہ ان کی سنجیدگی تشنگی لئے ہوئے ہے۔ مگر جب ان سے بار بار ملنا ہوا تو مجھ پر میرے اندیشہ کی یہ غلطی کھلی۔ وہ سنجیدہ ضرور تھے مگر خشک اور بے لچک نہ تھے۔

اسد صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع تو کراچی میں میسر آئے بعض دفعہ ان کے یہاں کئی کئی گھنٹہ کی صحبتیں اور علمی مذاکرے رہے ہیں، مگر طبیعت نے گرانی محسوس نہیں کی۔ میں ان کی محفل سے کبھی ملول، مکدّر اور دل برداشتہ ہوکر نہیں اُٹھا۔ جاتے وقت ایسا لگا جیسے تشنگی اس بزم میں کشاں کشاں لے آئے گی اور یہ جانا دوبارہ آنے کی تمہید ہے!

اسد ملتانی کا مطالعہ غیر معمولی تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ ملتان ان کا وطن اور مولد و منشا تھا، مگر اردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ دلّی اور لکھنؤ کے زبان دانوں سے وہ آنکھیں ملاکر اور سر افتخار بلند کرکے زبان، محاورہ اور مصطلحات و روزمرہ پر گفتگو کر سکتے تھے۔ اردو اور انگریزی کا کس قدر پاکیزہ خط تھا۔ اردو تحریریں کتنی شُستہ اور دل کش و سادہ ہوتی تھیں۔ دفتری ملازمت کے بجائے اگر کوئی علمی ادارہ ان کو سونپ دیا جاتا تو اسد ملتانی کی قابلیت کے جوہر وہاں کھُلتے۔

اسد ملتانی بڑے نستعلیق آدمی تھے، شریف، وضعدار، مہذب اور مؤدب! انھوں نے بڑے معرکہ کی طویل مزاحیہ نظمیں کہی ہیں، مگر گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے، بازاری مذاق کی انھیں ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ہلکی اور

گویا بات ان کے منہ سے نکلتی ہی نہ تھی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند، دینداری ان کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے فدائی اور شیدائی، صوفیا کرام کے عقیدت مند مگر شرک و بدعت سے کوسوں دُور اور انتہائی بے زار، پاکستان کو کتاب و سنت کی بنیاد پر صحیح اسلامی حکومت دیکھنے کے تمنائی! سابق جماعت اسلامی جن دنوں اسلامی دستور سازی کے لئے جدوجہد کر رہی تھی اس مسئلہ پر ان سے گفتگو ہوتی تو بڑی خوشی کا اظہار کرتے!

ماہنامہ "طلوعِ اسلام" میں اسد ملتانی کی برسوں نظمیں چھپتی رہی ہیں اس لئے اوروں کا کیا ذکر کیجئے خود میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسد صاحب منکرینِ حدیث کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے ملنے کے بعد یہ غلط فہمی دُور ہوئی کہ وہ تو "انکارِ حدیث" کو دین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے ہیں اور سنتِ رسول کے دین میں حجت ہونے کا محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسٹر پرویز کے وہ بہت مخالف تھے اور شکوہ کرتے تھے کہ یہ شخص علامہ اقبال کو اپنے مسلک کی تائید میں غلط طور پر پیش کرتا ہے۔

اسد ملتانی نے عاشقانہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ جو شخص غزل کا ایسا مطلع کہہ سکتا ہو ؎

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اس کے کمالِ غزل گوئی سے کون انکار کر سکتا ہے! مگر انھوں نے اس انداز پر غزلیں کہنا بہت دنوں سے چھوڑ دیا تھا۔ ان کی شاعری دین و اخلاق کی ترجمان اور اسلام کے مقدس پیغام کی حامل بن کر رہ گئی تھی۔ مقصدیت ہی مقصدیت، مگر تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ۔ فرماتے ہیں:

کی فرنگی نے ترقی جو مسلماں بن کر

یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

وہ ایک مصلح اور صاحبِ پیغام شاعر تھے ان کی شاعری میں زبان کی سادگی و سلاست، بندش کی چستی اور صفائی کے ساتھ گہرا خلوص اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال سے وہ شدید متاثر تھے مگر ان کی شاعری میں خود اپنا رنگ بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے، اسد ملتانی کے اٹھ جانے سے اخلاق و شرافت اور شعر و ادب کو اتنا بڑا نقصان پہنچا ہے کہ اس کی تلافی کے لئے ایک ایک شاعر پر نگاہ جاتی ہے اور لوٹ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسد ملتانی کی قبر کو حجلۂ عروسی بنا دے کہ وہ "عروس" کی طرح قیامت تک چین کی نیند سوتے رہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ کی شفاعت سے حصۂ وافر پائیں۔ (نیرنگِ خیال)

'آج کل'

'ہندوستانی مصوّری نمبر'

کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات اور ان سے متعلق موضوعات پر مضامین درکار ہیں

۱۔ مغل دَور سے پہلے کی مصوّری

۲۔ مغل راجپوت اور دکھنی مصوّری

۳۔ پہاڑی مصوّری (کانگڑہ، بسوہلی اور گڑھوال)

۴۔ ہندوستانی مصوّری کی نشاۃ ثانیہ۔

۵۔ ہندوستانی مصوّری کے جدید رجحانات

۶۔ عوامی مصوّری یعنی لوک چتر کلا

مضامین اس پتہ پر ارسال فرمائیں

ایڈیٹر 'آج کل' (اردو) اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

ع۔م

نئی کتابیں اور رسالے

میری غزلیں

مصنف علی جواد زیدی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط، کتاب جلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔
ناشر۔ ڈاکٹر علی سجاد زیدی، ڈاک خانہ کرہان ضلع اعظم گڑھ، یو۔پی
قیمت ۴ روپے

علی جواد زیدی اردو نثر و نظم کے دو گھوڑوں پر سوار ہیں۔ عام طور پر دو گھوڑوں کی سواری خطرناک ثابت ہوتی ہے لیکن زیدی بڑے چابک دست اور پُرکار ہیں اور ان کا یہ کمال ہے کہ نثر و نظم دونوں پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ یوں تو 'نظمیں' آپ کا موضوعِ محبوب رہا ہے لیکن 'غزلیں' بھی کچھ کم منظورِ نظر نہیں۔ سب سے بڑی بات ان کی غزلوں میں یہ ہے کہ ان کی جہد و عمل کی زندگی کی پرچھائیاں ان میں ملتی ہیں۔ کلاسیکی انداز چھوڑا نہیں لیکن ہمہ جدّت نظر آتے ہیں۔ طرزِ فکر پُرانی نہیں سوچنے کا دھارا تیز بھی ہے اور گہرا بھی۔ خوش فکر اور باعمل انسان جو آزادیٔ ملک کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں بھی سہہ چکا ہو بورژوا نہیں ہو سکتا۔ ان کی پرولتاریت ملاحظہ فرمائیے

میکدے بھر پہ مراحق ہے مگر پیرِ مغاں — اک کسی چیز پہ رندوں کا اجارا بھی تو ہو

ہم اہلِ دل نے معیارِ محبت بھی بدل ڈالے
جو غم ہر فرد کا غم ہے اسی کو غم سمجھتے ہیں

خراج فطرت سے لے چکی ہے نگاہ شوخ عوام اکثر
ہم ایسے مستوں کی لغزشوں سے بدل گئے ہیں نظام اکثر

ان غزلوں میں بہت سے اشعار ملتے ہیں جو جہدِ عمل کا سبق دیتے ہیں بیاسی اشاریت بھی جا بجا نظر آتی ہے لیکن بڑی صحت منداور حوصلہ پرور۔ لطف یہ ہے کہ تغزّل بہ ہر صورت قائم ہے۔

اب نہ وہ شورشِ رفتار نہ وہ جوشِ جنوں — ہم کہاں پھنس گئے یارانِ سبک گام کے ساتھ

اس میں ساقی کا بھی دربردہ اشارہ تو نہیں — آج کچھ رند بھی تھے واعظِ بدنام کے ساتھ

کس سے کہتا دل کی باتیں کس سے سنتا ان کا راز
بزم میں تو سب نظر آتے تھے بیگانے مجھے

منزلِ دل کہاں ملی ختمِ سفر کے بعد بھی — رہگذر ایک اور تھی راہگذر کے بعد بھی

رندوں سے باز پُرس کی پیرِ مغاں سے دل لگی
آج یہ محتسب نے بھی پی ہے کہیں شراب کیا

شہبازوں سے ہم کترا کے چلے زنجیر و قفس سے بچ نکلے
لیکن یہ نکتہ بھول گئے دانے ہی سے ملحق دام بھی ہے

آ ہی جائے گی سیہ خانوں میں بھی کوئی کرن
روشنی اب تو در و بام تک آ پہنچی ہے

یہی صحیح تغزّل ان کے یہاں صحت مندی کے ساتھ ملتا ہے۔ چند منتخب شعر ملاحظہ فرمایئے

یہ قشقۂ خلوص ہے زخم جبیں نہیں — ہر چند ہم بھی کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

جس درد کو سمجھتے تھے ہم ان کا فیضِ خاص — اس درد کے بھی لاکھ خریدار ہو گئے

جن حوصلوں سے میرا جنوں مطمئن نہ تھا — وہ حوصلے زمانے کے معیار ہو گئے

وہ کیسے کم نگاہ تھے جو ظلمتوں سے ڈر گئے — ہمیں تو روشنی ملی جہاں گئے جدھر گئے

شاخ سے ٹوٹ کر سکوں نہ ملا — خشک پتی ہوا میں تھرائی

ہمیں سر یہ سر توجہ کبھی بے سبب کشیدہ   انھیں خوب جانتا ہے مرا عشق خوش عقیدہ

وفائے یار جفا سے بھی جاں گسل نکلی

نہیں ہے عشق ستم دوست کو فراغ ہنوز

ہجوم غم میں تبسم کا کھیل دیکھ لیں   میں کہہ رہا تھا مرے غم کا اعتبار نہ کر

اب نہ چھیڑو کہ جی بھر آتا ہے   دل گیا دل لگی کی بات گئی

میں ہوں اب اور اک خلائے وجود   تم گئے ساتھ کائنات گئی

قصہ گوئے فراق اب سو جا   صبح ہونے کو آئی رات گئی

یہ مجموعۂ نظم شائستہ غزل کا ایک اچھا نمونہ ہے اور اس دور میں جب کہ سستی غزل پروان چڑھ رہی ہے اور مشاعرے اس بد ذوقی میں اضافہ کر رہے ہیں، اس مختصر مجموعے کا شائع ہونا بھی مغتنمات میں سے ہے۔

باغ و بہار

تالیف کیا ہوا میر امن دلّی والے کا۔ مقدمہ و فرہنگ از ممتاز حسین صدر شعبۂ اردو اسلامیہ کالج کراچی۔ ناشر اردو ٹرسٹ کراچی۔ کاغذ، طباعت (ٹائپ)، جلد، جلد پوش عمدہ، تقطیع ٢٢/٨، ضخامت تقریباً تین سو صفحے قیمت چھ روپے آٹھ آنے۔ مقدمہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

تالیف نسخہ سے متعلق، داستانوں کی بابت، باغ و بہار کا ماخذ، میر امن کے حالاتِ زندگی، میر امن کے ترجمے کی نوعیت اور اہمیت، قصۂ چہار درویش کا تنقیدی مطالعہ، زبان و بیان، باغ و بہار میں دلّی کی معاشرت کی جھلکیاں۔

اس کے بعد جان گلکرسٹ کے مقدمے کے ساتھ اصل کتاب، اس کے بعد فرہنگ، اختتامیہ اور غلط نامہ۔

باغ و بہار کا یہ ایڈیشن یونی ورسٹیوں کے طلبا کے لئے بہت مفید ہے۔ فاضل مؤلف ممتاز حسین صاحب نے مقدمہ بڑی محنت سے لکھا ہے۔ اس میں ان کی ادبی بصیرت بھی شامل ہے۔

رسالے۔ آندھرا پردیش حکومت آندھرا پردیش کا یہ رسالہ ایک مدت سے جاری ہے، لیکن اب اس کی حیثیت ایک ادبی رسالے کی بھی بن گئی ہے۔ ریاستی معلومات کے علاوہ معیاری منظومات اور مضامین اس میں درج ہوتے ہیں۔ رسالے کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے۔ حکومت آندھرا پردیش اردو کی اس سرپرستی کے لئے قابلِ مبارکباد ہے۔ رسالہ مصور ہے کاغذ کتابت عمدہ۔ چندہ سالانہ ۲ روپے ١٦ نئے پیسے۔

ترتیب

سرورق: ۔ کالی بدریا چھائی

رسالے کی پشت پر۔ پنگھٹ پر

سالانہ چندہ: ۔ ہندوستان میں: ۔ سات روپے
پاکستان میں: ۔ سات روپے (پاک)

غیر ممالک سے: ۔ ۱۰ شلنگ ۶ پنس یا ڈیڑھ ڈالر

فی پرچہ: ۔ ہندوستان میں ۔ ۷۰ نئے پیسے
پاکستان میں ۔ دس آنے (پاک)
غیر ممالک میں ۔ ۱ شلنگ یا ۱۵ سینٹ

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: ۔ مظفر شاہ

جلد ۱۸ ۔ نمبر ۱۲

اشاڑھ شک سمت ۱۸۸۲

جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر، آج کل، اردو اولڈ سیکرٹریٹ دہلی ۸

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ملاحظات

چار بڑی طاقتوں کے سربراہوں کی کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ختم ہوگئی جس کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کی تلخی کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کانفرنس کی ناکامی کے وجوہ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بڑی طاقتوں کو ایک دوسرے پر کوئی اعتماد نہیں رہا اور ان کی باہمی عداوت عالمی مسائل کے حل کی راہ میں حائل ہے۔ ان حالات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ صرف بڑی طاقتیں امن کے مسئلہ سے نہیں نپٹ سکتیں۔ یہ کام وہ چھوٹی طاقتیں جو کسی گروہ میں شامل نہیں زیادہ اچھی طرح انجام دے سکتی ہیں۔

اس کانفرنس کی ناکامی سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کی نزاکت کا شدت کے ساتھ احساس کیا جا رہا ہے۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو اور صدر ناصر کی حالیہ گفتگو کے بعد جو مشترکہ اعلان نکلا ہے اس میں کہا گیا کہ اگر صورت حال کو اور زیادہ خراب ہونے سے نہ روکا جا سکا تو عالمی جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں امنِ عالم کے استحکام کی کوششوں کو تیز تر کرنے کی ضرورت ہے۔

روس نے یکم مئی کے یو ٹو جہاز کے واقعہ کی بنا پر امریکہ کے جارحانہ رویہ کی سلامتی کونسل میں شکایت کی۔ روس کی یہ قرارداد منظور نہ ہوئی۔ سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد منظور کی جس میں چار بڑی طاقتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ مشترک مسائل پر جس قدر جلد ممکن ہو ادارۂ اقوامِ متحدہ سے کام لیتے ہوئے دوبارہ گفتگو شروع کریں۔ اس نے یہ بھی اپیل کی کہ تمام حکومتیں اپنے بین الاقوامی تعلقات میں طاقت کے استعمال کی دھمکی دینے سے پرہیز کریں، ایک دوسرے کے اقتدارِ اعلیٰ کا احترام کریں اور ایسے اقدام نہ کریں جن سے کشیدگی بڑھے۔

لندن میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس ہوئی، جس میں باہمی مفاد کے معاملات پر خاص کر گفت و شنید کی گئی۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کی جس پالیسی پر عمل کیا جا رہا ہے اور اسی کے نتیجے کے طور پر حال ہی میں جس بربریت کا مظاہرہ ہوا۔ اس کی آواز بازگشت یہاں تک پہونچی، وزرائے اعظم نے غیر رسمی گفتگو میں اس پر غور و خوض کیا۔ چنانچہ کانفرنس کے بعد اعلانیہ میں کہا گیا کہ دولتِ مشترکہ کی برادری میں مختلف رنگ و نسل کے ممالک شامل ہیں اور ان ملکوں میں اچھے تعلقات رہنا چاہئیں۔ اعلانیہ میں یہ بھی کہا گیا کہ دولتِ مشترکہ کے تمام ملکوں کا مقصد عالمی امن ہے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار ہیں اور تمام امن پسند ممالک سے اشتراک عمل کرنا چاہتے ہیں۔

روس نے ایک اور مصنوعی سیارہ چھوڑ کر خلائی سفر کی دشواریوں پر قابو پانے کے لئے ایک اور قدم بڑھایا ہے۔ اس سیارہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مصنوعی انسان کو بٹھایا گیا جس پر وہ تمام اثرات مرتب ہوں گے جو خلا کے سفر میں اصلی انسان پر ہو سکتے ہیں۔ اس مصنوعی سیارے کا وزن چار ٹن سے زائد ہے۔ اس سے خلاء میں سفر کرنے والے خلائی جہاز کے لئے راستہ ہموار ہوگیا اور آئندہ اصلی انسان محفوظ طریقے پر خلاء میں بھی جا سکے گا۔ یہ بڑا اچھا تجربہ ہے اور اس سے انسانی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوگا۔

فضا ابنِ فیضی

اک چراغ اور جلایا میں نے

ہونٹ کلیوں کے کھلے رخِ چمن بول اُٹھی
بات شبنم سے جو پوچھی تو کرن بول اُٹھی
گیسوئے شوق کی ایک ایک شکن بول اُٹھی
خال و خط سے مرے رعنائی فن بول اُٹھی
جلوۂ فکر کو صد رنگ بنایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

جادۂ غم مرے قدموں میں سکوں پاتا ہے
کون پھولوں سے یہ تلوے مرے سہلاتا ہے
نفسِ عزمِ جواں راہ کو مہکاتا ہے
چہرۂ منزلِ مقصود نکھر آتا ہے
قافلے کو نئی راہوں پہ لگایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

ہر قدم خلدِ صفا خلدِ یقیں ملتی ہے
پاؤں کے نیچے ستاروں کی زمیں ملتی ہے
دل کہیں اور، نظر اور کہیں ملتی ہے
اس سے آگے تو فضا اور حسیں ملتی ہے
ہو کے سرشارِ طلب پاؤں بڑھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

دیکھ تو شوخیٔ آغاز کہاں تک پہنچی
میری تہذیبِ وطن ساز کہاں تک پہنچی
لبِ جمہور کی آواز کہاں تک پہنچی
وقت کی شبنمیں پرواز کہاں تک پہنچی
وقت کو شیوۂ پرواز سکھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

پی گیا وقت وہ دیرینہ روایات کا رس
نئے ذہنوں میں ہے اب تازہ خیالات کا رس
لب سے غیروں کے بھی ٹپکا ہے مری بات کا رس
بھر کے پیمانوں میں خود اپنے ہی جذبات کا رس
تشنہ کامانِ زمانہ کو پلایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

بزم میں تشنہ لبی کس کی نشہ تاب نہیں
کون سی کشتِ تمنا ہے جو شاداب نہیں
بربطِ زندگی حسرت کشِ مضراب نہیں
کوئی عالم بھی ہو افسوں زدۂ خواب نہیں
گدگدا کر غمِ دوراں کو ہنسایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

زندگی زمزمہ پیرائے سکوں اور سہی
عصرِ حاضر کا یہ بیدار فسوں اور سہی
شمعِ محرابِ نظر، سوزِ درِ دل اور سہی
موسمِ گل! کوئی تقریبِ جنوں اور سہی
سرِ آتش کدہ فردوس سجایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

کون یہ نغمہ زناں دیکھئے محفل سے اُٹھا
درد ہنستا ہوا آغوشِ غمِ دل سے اُٹھا
ہنس پڑی صبح کہ پردہ رُخِ منزل سے اُٹھا
شورِ طوفانِ بلاخیز جو ساحل سے اُٹھا
موجِ طوفاں کو کناروں پہ سلایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

وہ قفس ہے نہ وہ بے بال و پری کی باتیں
پھول ہیں اور نسیمِ سحری کی باتیں
مہر و شبنم میں ہیں پھر ہمسفری کی باتیں
ختم ہیں دورِ پریشاں نظری کی باتیں
دھوپ کو غم کی کیا عیش کا سایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

چھاؤں آفات کی دیکھی ہے گھنی میں نے بھی
کی ہے فرہاد صفت کوہ کنی میں نے بھی
تازہ کی ہے خلشِ سینہ زنی میں نے بھی
برگِ گل کو کہا ہیرے کی کنی میں نے بھی
مختلف بول میں یہ گیت سنایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

یہ ہر اک سانس پہ لو دیتی ہوئی شمعِ عمل
انجمن میں یہ تمدن کے منظر تاب کنول
یہ مہکتے ہوئے قوموں کی سیاست کے محل
زندگی ہے کہ جگر کی کوئی بھرپور غزل
وقت کو خواب جوانی کا دکھایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

شبنم افروز ہے شعلوں کی وہ برسات ہوں میں
جو کفِ گل میں ہے کانٹوں کی وہ سوغات ہوں میں
صبح کے سینے سے لپٹی ہے جو وہ رات ہوں میں
روشنی مانگے خضر جس سے وہ ظلمات ہوں میں
راستہ چشمۂ حیواں کا بتایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

مہکے مہکے یہ مری زلفِ سخن کے سائے
یہ جواں چاندنی یہ نخلِ چمن کے سائے
آنکھیں ملتے ہوئے یہ عہدِ کہن کے سائے
اس کے شاہد ہیں یہاں گنگ و جمن کے سائے
اے خرابات وطن! تجھ کو بسایا میں نے
اک چراغ اور جلایا میں نے

یومِ غالب

خطبۂ استقبالیہ جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو نے
دہلی یونیورسٹی کے یومِ غالب کے موقع پر پڑھا

عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، محترم وائس چانسلر ڈاکٹر راؤ،
عزت مآب سفیرانِ گرامی، خواتین اور حضرات!

میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور یومِ غالب کی اس تقریب میں آپ کی تشریف آوری پر مسرت اور شادمانی کے جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور پوری گرم جوشی اور صمیمِ قلب کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

در دل ز تمنائے قدم بوسِ تو شورے است
شوقت چہ نمک دادہ مذاقِ ادبم را

ہماری خوش بختی ہے کہ یومِ غالب کے افتتاح کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار تشریف لائے ہیں جو دیدہ ور ادیب، بالغ نظر ماہرِ تعلیم اور ہندوستانی تہذیب کے بڑے دل نواز ترجمان ہیں۔ ان کے ذہن کی جودت، نظر کی بلندی، دل کا گداز اور شخصیت کا جادو ہماری قومی زندگی کا انمول سرمایہ ہے۔

قمریاں پاسِ غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بانداِم تو نیست

انھوں نے جامعہ ملیہ کو اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ علی گڑھ کے پیکر میں نیا خونِ زندگی دوڑایا ہے اور ہمیں فکر و نظر اور علم و حکمت کے وہ معیار دئے ہیں جو ناقۂ شوق کو منزلِ مراد تک پہونچا سکتے ہیں۔

ان کے یمنِ قدم سے یقین ہے کہ ہمارے کام کا بھی حوصلہ بڑھے گا اور ان کی پسند ہمارا سب سے بڑا انعام اور ان کی ہدایت ہمارے لئے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔

میں ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر چند جملے اپنے شعبہ کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں اور وہ اس لئے کہ ان سے وہ گرمیٔ قلب حاصل ہوگی جو مایوسیوں میں امیدوار اور تہی دستی میں دل کو غنی بنا دیتی ہے۔ جو بارِ حیات کو ہلکا کر دیتی ہے، کام کا حوصلہ بڑھا دیتی ہے اور جس کا نتیجہ ہمیشہ "ز کنارِ تو جواں برخیزم" ہوتا ہے۔

حضورِ والا! ہماری یونیورسٹی کو اس دہلی سے نسبت ہے جو ہندوستان کا قلب و جگر، جمہوریۂ ہند کا دارالخلافہ اور ہماری رنگا رنگ تہذیب کا علامتی مرکز ہے۔ جنتِ عدن است کہ آباد باد۔ اس کے علاوہ دہلی ہند آریائی زبانوں کا گہوارہ ہے۔ آریوں، راجپوتوں، ترکوں اور مغلوں کے زمانے سے دہلی اور اس کے گرد و نواح ہی کی بولی ہندوستان کی معیاری زبان رہی ہے۔ اردو کی بنیاد بھی جس بولی پر قائم ہے اس کا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ اس لئے اردو کا اگر کوئی مصدر و ماخذ ہے تو دہلی، مبدء و مخرج ہے تو دہلی، گہوارہ و آستانہ ہے تو دہلی۔ حاتم سے حالی تک سارے اسالیب یہیں وجود میں آئے ہیں۔ یہاں کے چپہ چپہ پر اردو کی تاریخ کھدی ہوئی ہے۔

ایک ایسے شہر میں جس کو ہندوستانی تہذیب سے اتنا گہرا تعلق ہے ایک ایسے شہر میں جس کو مومن و غالب، ذوق و ظفر اور پیارے لال آشوب، رام چندر

اور پنڈت کیفی سے اتنی گہری نسبت ہے۔ اس میں اور بالخصوص اس کی یونیورسٹی میں، جو تہذیبی اور علمی ادارہ ہے اردو کی خدمت کے ذرائع اور وسائل پیدا کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ صدر جمہوریۂ ہند اور دہلی یونیورسٹی کے وزیٹر عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرساد صاحب بالقابہ کے اعلان مورخہ ۹۔ نومبر سنہ ۱۹۵۹ء کی رو سے ہماری دانش گاہ میں اردو کا علیحدہ شعبہ قائم ہو گیا ہے۔ اس اعلان میں ان جاں افروز کوششوں کا پرتو ہے جو ایک نئے معاشرہ کی تعمیر اور ایک نئی تہذیب کے فروغ کے لئے ہمارے ملک میں کی جا رہی ہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ ہماری قومی زندگی کی تشکیل میں تمام عناصر کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور اس کی عمارت وسیع اور مضبوط بنیاد پر قائم ہوگی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ہندوستانی سماج برابر کثرت میں وحدت کو تلاش کر رہی ہے اور وہ لالہ و گل و نسرین سب ہی کے رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ دینا چاہتی ہے۔

ہمارے لئے یہ بات بھی بڑے فخر کی ہے کہ یہ کام شعبۂ ہندی کی خوش دلی، امداد اور تعاون سے ہوا ہے اور ان رفیقوں نے ہمارے کام کو ایک اہم تہذیبی قدر سمجھ کر اس میں اعانت کی ہے۔

شعبۂ اردو کے قیام کے سلسلہ میں عالی جناب ڈاکٹر دی کے آر، دی راؤ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی نے جو کوششیں کی ہیں وہ ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ ان کی ذاتِ گرامی، ادب اور تہذیب کی بہترین اقدار کی مظہر ہے اور وہ نئے ہندوستان کی تہذیبی ترقی کے لئے جدید ہندوستانی زبانوں کے فروغ اور حسنِ اختلاط کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر راؤ اس نکتہ کے بھی رمز شناس ہیں کہ ہندوستان کی گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ ہے وہ عارفوں کے وجدان، فلسفیوں کی فکر اور فن کاروں اور شاعروں کے تخیل ہی کی مدد سے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ احسان دہلی پر اور ہماری آئندہ نسلوں پر ہے۔

اس وقت ہمارے شعبہ کی عمر تین مہینے اور اٹھارہ دن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تھوڑی سی مدت میں کوئی بڑا علمی کام پیش کرنا ناممکن ہے۔ آپ تعلیمی اور تحقیقی کاموں کے درد سے آشنا ہیں ان میں تفصیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ کام کو برسوں پر اور بہت سے منصوبوں پر پھیلانا ہوتا ہے اور جب بنیادیں نیچی رکھی جائیں تو عمارت کا جلد نظر آنا بھی ممکن نہیں۔

تاہم میں چند بنیادی مقاصد کی طرف چشمِ سخن سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ اردو کا مطالعہ جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ ہو۔ اور اس کے مرقع کو ہندوستانی تہذیب کی محراب پر آراستہ کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اردو کی جڑیں ہماری گنگا جمنی تہذیب میں دور تک چلی گئی ہیں اور وہ شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ ہے جو ہمیں بارھویں صدی کے قریب ملا ہے۔ ہندوستان میں چودہ بڑی قومی زبانیں ہیں جن کے پاس لائقِ فخر ادبی دولت ہے ان میں اردو بھی شامل ہے بلکہ اس اعتبار سے اردو سب سے ممتاز مقام رکھتی ہے کہ ہندوستان کی کوئی دوسری زبان سرکاری زبان یعنی ہندی سے اتنی قریب نہیں جتنی اردو ہے۔ اردو اور ہندی کے ۷۵ فی صدی الفاظ و اسما مشترک ہیں۔ اس کے ضمائر اور حروف ایک ہیں۔ اصول و قواعد ایک ہیں۔ دونوں کا مبدأ و مخرج ایک ہے۔ دونوں نے ایک ہی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے ہیں۔ یہ شرف کسی اور زبان کو حاصل نہیں۔

آزادی سے پہلے دلوں کی تقسیم کی جو نامبارک کوشش کی گئی اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اردو والوں کا ہندوستان کی دوسری زبانوں سے وہ گہرا تعلق باقی نہیں رہا جو پہلے تھا۔ حالانکہ عبدالرحمٰن اور امیر خسرو سے لے کر انشا اللہ خاں انشا اور سید طالب علی بلگرامی رس نایک تک سب ایک سے زیادہ زبانوں کے عالم تھے اور ان کی تخلیقات میں کئی زبانوں کی توانائی تھی۔

حضور والا! ہندوستان کے چمن زار میں بہت سے خوش رنگ پھول ہیں۔ اس کی تزئین و آرائش صرف ایک پھول سے نہیں ہو سکتی۔ ہم اردو کا رشتہ جدید ہند آریائی زبانوں اور اپنی رنگا رنگ تہذیب سے جوڑنا چاہتے ہیں اس لئے کہ سوال ان تہذیبی منطقوں کو ختم کر دینے کا نہیں بلکہ ان میں زیادہ ارتباط اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا ہے۔

اس وقت اردو کی تعلیم کا انتظام دہلی کے سات کالجوں میں ہے اور ان میں طالب علموں کی تعداد ایسی ہے کہ اس کی نظیر دہلی کی تاریخ میں نہیں - لیکن ہم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی بنیاد تحقیقی کام پر اٹھانا چاہتے ہیں -

پچھلے پانچ سالوں میں ہمارے یہاں سے تین پی ، ایچ ، ڈی کے مقالے منظور ہو چکے ہیں جن کو ہندوستان کے مشاہیر اہلِ علم نے متفقہ طور پر سراہا ہے -

اردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کے عناصر

اردو اور پنجابی کا لسانیاتی رشتہ

میسور میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء ، ٹیپو سلطان کے زمانے سے ۱۹۴۷ء تک

اس وقت آٹھ ریسرچ اسکالر کام کر رہے ہیں - ان کے بھی موضوعات ایسے ہیں جن سے انشاء اللہ ہندوستانی کلچر کی بصیرت اور معرفت میں اضافہ ہوگا -

جناب والا ! آپ سے زیادہ اس حقیقت کا محرم اور کون ہوگا کہ ہمارے بیش قیمت مخطوطات یورپ کی لائبریریوں کی زیب و زینت ہیں -

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

عنی روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

میں نے اپنے یورپ کے قیام میں بعض نایاب اور نادر مخطوطات کے عکس حاصل کئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم ڈاکٹر راؤ ، وزارتِ تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی امداد و اعانت سے اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان کو تعلیقات اور حواشی کے ساتھ اور ایک پلان کے تحت شائع کر سکیں - اس سلسلہ کی پہلی کتاب انشاء اللہ جلد منظرِ عام پر آ جائے گی -

دوسرا کام جو ہم کر رہے ہیں وہ دہلی کے دبستان Delhi School of Urdu Literature کی چند اہم شخصیتوں پر Monographs کی تیاری ہے - اس کام کو بھی ہم تہذیبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہتے ہیں - اس لئے کہ سماج کا حال فرد کا سا ہے - اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے - اس کی الگ صبح و شام ہوتی ہیں - اس کو کچھ چیزیں وراثت میں ملتی ہیں کچھ گرد و پیش سے حاصل ہوتی ہیں - ان سب کا اس طرح جائزہ لینا کہ مرکز و محیط کا فرق مٹ جائے اور نفسِ اجتماعی کے ساتھ تخیل اور جذبہ کے نقش و نگار بھی سامنے آ جائیں ازبس ضروری ہے - اس کے علاوہ دبستانِ دہلی کی شخصیتوں پر دہلی کی آب و ہوا اس کی سرزمین لا حقہ و عارضہ ، اشجار و اثمار ، جمادات اور نباتات کا اثر ان کی شاعری اور لب و لہجہ پر بہت گہرا پڑا ہے اور ان کی آب و گل میں یہ طبعی خصوصیتیں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہیں کہ ان کے اسالیب الفاظ و محاورات اور اندازِ فکر کو اسی تہذیبی پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے -

اس سلسلے کا پہلا مانوگراف پروفیسر رام چندر پر ہوگا جو قدیم دلی کالج کی بڑی ممتاز شخصیت تھے -

شعبۂ اردو کے علیحدہ قیام کے بعد اس ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا گیا کہ کوئی رسالہ ایسا ہو جو اردو کو ہندوستانی تہذیب اور ادب کے مرقع میں سجائے - اردو زبان و ادب کے متعلق تحقیقی اور تہذیبی مضامین شائع کرے اور اہلِ اردو کو ہندوستان ، ایشیا اور یورپ کی دوسری زبانوں کی تخلیقات سے روشناس کرائے - دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے 'اردوئے معلیٰ' کا اجراء ان ہی مقاصد کے پیش نظر ہوا ہے جس کا غالب نمبر ابھی تھوڑی دیر میں وائس چانسلر ڈاکٹر راؤ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں پیش کریں گے ——
شاہاں پہ شاہاں دہند ——

ذاکر صاحب قبلہ ! اس صحیفۂ یادگار کو پیش کرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے - یہ بہت ہی حقیر کام ہے لیکن کبھی کبھی یوسف کی خریداری کی کوشش ایک سوت کی اٹیا سے بھی کی جاتی ہے -

اسی طرح شعبۂ اردو کے جن منصوبوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کی اہمیت کے ساتھ مجھے اپنے وسائل اور ذرائع کے محدود ہونے کا بھی شدید احساس ہے - لیکن اردو کی خدمت ایک سرمایۂ سعادت ہے جو ہم تہی دستوں تک پہنچا ہے - اگر ہم اس نیکی کے فروغ دینے میں کچھ بھی مدد کر سکے تو یہ خدائے کریم کی بخشش خاص ہوگی - اپنی بے ہنری اور کم مائیگی کا بھی احساس ہے لیکن دل میں لہو کی ایک بوند اور تھوڑی سی آشفتگی ہے جو اس جہدِ حیات میں بہت بڑا سہارا ہے - اگر یہ شاخِ آرزو برومند

ہوگئی اور ہم اپنے حلقہ میں دید و دریافت اور تنقید اور تحقیق کا صحیح ذوق پیدا کر سکے تو یہ اردو کی اور ہندوستانی تہذیب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اردوئے معلیٰ کی ابتداء غالب سے کرنا نہایت مبارک اور مستحسن ہے۔ ان دونوں میں ہے بھی صدف و گوہر یا جسم و جان کا سا تعلق۔ لیکن ہماری یہ خواہش ہے کہ نئے ادب کا خمیر اس طرح اٹھایا جائے کہ اس میں ماضی کے لائقِ رشک ورثہ کو سمو دیا جائے اور ادبی تاریخ کی روایتیں اس میں بندھ جائیں۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم ماضی کے صحت مند عناصر کو پہچانیں اور دید و دریافت سے کام لے کر اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کریں۔ لطیفہ کے طور پہ عرض کرتا ہوں کہ

بعض حلقوں میں یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ غالب کو اپنے زمانے کا بہت بڑا صوفی اور درویش دل ریش ثابت کیا جائے۔ حالانکہ وہ فارسی خطوط جن کو پہلی دفعہ اس نمبر میں شائع کیا جا رہا ہے ان میں غالب صاف صاف حضرت غمگیں کو لکھتے ہیں ——

حضور میں سپاہی زادہ ہوں۔ میرے اجداد صحرا نشین ترک تھے۔ میری کل قابلیت بس اس حد تک ہے کہ ایک دو مصرعے موزوں کر لیتا ہوں اور ایک دو گرہ ہر فن کے یاد کر رکھے ہیں۔ مجھ کو تصوف سے کیا علاقہ اور درویشی سے کیا نسبت۔ واللہ میرا حال اس سے زیادہ نہیں کہ وجودِ باری تعالیٰ کی وحدانیت اور یکتائی اور دیگر اشیا کی عدمیت میرے دل پر منقوش اور مرتسم ہے۔ نہ ریاضت اور مجاہدہ۔ اس عاصی کی ہمت ایک یاد و پیمانہ شراب پر منحصر ہے۔ رات کو پی کر بے خبر سو جاتا ہوں۔ نہ دین سمجھتا ہوں اور نہ دنیا۔ اللہ بس باقی ہوس۔"

یہ اعتراف تو خداوند کے سامنے تھا۔ اب دیکھئے خدا کے حضور میں عرض کرتا ہے :-

حساب مے و رامش و رنگ و بو   ز جمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند   دلِ دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ   بدریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ

مجھے غالب کی جو ادا سب سے زیادہ پسند ہے وہ ان کی بشریت اور اس پر فخر و ناز ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام

ان کی عظمت کا راز ان کی دل کش انفرادیت انسان دوستی اور آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں ڈالے اور پردہ کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا۔ وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ "آنچہ می نمایم ہستم"۔ یہی بے باک صداقت مہذب رندی، سنجیدہ ظرافت اور تصور اور تجربہ کی تازہ کاری ہے جو اردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اور اسی لئے ضروری ہے کہ ان کی یاد سے برابر دل کو روشن رکھا جائے۔

غالب رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں۔ شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں۔ ان کے یہاں اصل چیز عقیدہ سے وفاداری ہے۔ ملتیں اہم نہیں ہیں ان کے ملنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنار و تسبیح کا فرق مٹ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

" میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔"

ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی۔ کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ مرزا ہر گوپال تفتہ بھی، نور چشم میر مہدی اور انگریز بھی۔ جن میں کوئی ان کا امیدگاہ تھا کوئی دوست کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا غالب نے جس وقت ہوش کی آنکھ کھولی مغلیہ سلطنت کی شمع ٹمٹما رہی تھی۔ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں۔ انگریزی نظم و نسق قائم ہو چکا تھا اور شہنشاہ عالم و عالمیان کی حکومت قلعۂ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ پرانا نظامِ حیات درہم برہم تو ہو رہا تھا لیکن نیا وجود میں نہیں آیا۔ پرانی قدریں مضمحل ہو ہو کر ختم تو ہونے لگیں لیکن نئی وجود میں نہیں آئیں۔ اس وقت نقشِ جادہ ناپیدا تھا اور زندگی منزل و محمل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست و ریخت کے زمانے میں جب موجِ خوں ہمارے سر سے گزر رہی تھی مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا۔ انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ

ایک ہمت عطا کی اور نئے نظام اور نئے زمانہ کی اس وقت تائید کی جب سرسید کو بھی اس کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے۔ زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین اور شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکرِ الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ مرزا کا عطیہ ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے خیالات دیئے۔ ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لئے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لئے تنقیدی شعور۔ اس طرز میں منی قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پیرمعنی اختصار ہے۔ اس کا نرکانہ بانکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لئے اہم ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ دیوانِ غالب کا ترجمہ چیک اور انگریزی زبانوں میں ہو رہا ہے اور 'یومِ غالب' اب ایشیا اور یورپ کے مختلف ملکوں میں منایا جاتا ہے۔ آج بھی کابل ریڈیو سے ایک خاص پروگرام غالب کے اعزاز میں نشر کیا جائے گا۔ اس سے قبل ایران کے "تالارِ فردوسی" میں غالب کی نوّے سالہ برسی کا جشن منایا جا چکا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے بھی ہمارے 'یومِ غالب' کو ریکارڈ کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق ہیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی منائیں اور اس موقع پر غالب کی اردو نظم و نثر کو ایک مجلّہ میں بہت خوبصورت شائع کریں اور اس تقریب میں ان تمام ملکوں کا تعاون حاصل کریں جو اس مرتبہ تنگیٔ وقت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے اور ان تہذیبی نمائندوں کا بھی تعاون وسیع پیمانے پر حاصل کریں جنھوں نے اس موقع پر کرم فرمایا ہے۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں آپ حضرات کا پوری گرم جوشی کے ساتھ خیرمقدم کرتا ہوں۔

مٹے آغا ذکی

غزل

سوزشِ زخمِ دل بڑھی بھی نہیں — ہاں مگر درد میں کمی بھی نہیں

اُٹھ رہی ہے یہ کیوں گھٹا یہ گھٹا — ہم نے توبہ ابھی تو کی بھی نہیں

چشمِ ساقی کی گردشیں توبہ — پی لی جی بھر کے اور پی بھی نہیں

مجھ سے تو ماسوا محبت کے — اور کوئی خطا ہوئی بھی نہیں

اُن کے آنے کی کیا کریں اُمید — اب تو تاروں میں روشنی بھی نہیں

دل کے مٹنے کا جان جانے کا — غم نہیں ہے مگر خوشی بھی نہیں

کروٹیں لے رہا ہے پروانہ — شمعِ محفل ابھی جلی بھی نہیں

کیا ہوا کس لئے خموش ہیں آپ
بزم میں آج تو ذکی بھی نہیں

اَیشَس کمار

قصّۂ درد سُناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ہماری بستی میں ایک انسانوں کی مجلس ہے جسے 'بزمِ ادب' کہتے ہیں اس کے حسبِ معمول ایک سیکرٹری ہیں، اچھے خاصے پہلوان۔ ادب سے پہلوانوں کا ویسے تو بس پیٹ کا بیر ہوتا ہے مگر یہ سچ مچ سیکرٹری ہیں۔ بدقسمتی سے یونیورسٹی میں نوکر ہیں اور میرے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ایک دن راستہ میں روک لیا اور کہنے لگے۔ "سنا ہے آپ کو شعر و شاعری کا شوق ہے۔"

"کہاں سے سُنا ہے آپ نے ؟" میں نے سہم کر پوچھا۔

"آپ کے دوستوں سے، آپ کے شاگردوں سے۔"

"یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔"

"آپ کسرِ نفسی کرتے ہیں۔"

"کسرِ نفسی! واہ صاحب۔ شعر لکھنا بھی کوئی فخر کی بات ہے۔ یہ تو ایک دیا ہے مجھے بھی تیس پینتیس سال ہوئے چھٹی تھی۔ ڈفرنشل کیلکولس کے تمام فارمولے بھلا دئے۔ پھٹے ہوئے کپڑے، بکھرے ہوئے بال۔ بانگِ درا بغل میں دبائے نیو ہوسٹل کی تیسری منزل پر چکر لگایا کرتے تھے ...... عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ کیسی یادیں تازہ کرادیں۔ دفتر سے آرہا تھا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ آپ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ خود تو پہلوان ہی بنے رہیں گے اور ہمارا تمام دن، تمام رات ہفتہ بھر وہ گت بنے گی جو تیس سال پہلے بنا کرتی تھی۔ اس وقت کم از کم شعر لکھ کر تو دل بہلا لیا کرتے تھے۔ کہاں سے لائیں گے ہم وہ ماحول اور وہ جوانی کی غیر ذمہ دارانہ روشیں ...... آپ بزمِ ادب کے سیکرٹری ہیں یا ہنگامہ خیزیاں۔ معلوم ہوتا ہے دفتر میں آپ کو کچھ کام نہیں۔ ابھی سوچ رہا تھا کہ فزکس ڈیپارٹمنٹ کے تیسرے پنجسالہ پلان کے دوران میں ضرورت کے مطابق پورے دو کروڑ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ کہ آپ نے وہ آگ لگائی کہ بجھائے نہ بنے۔ مشکل سے شاعری سے چھٹکارا پایا تھا۔ اب تو تخلص بھی بھول چکا ہوں۔ بچپن سال کا سن۔ تیس سال کی متواتر گورنمنٹ سروس۔ جانتے ہو گورنمنٹ سروس کیا ہوتی ہے۔ تمام شیخی اور شوخی کا کچومر نکال دیتی ہے۔ شعر و سخن — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے — اب تو اتنی بھی جرأت نہیں کہ کہہ سکیں 'رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے'!"

سیکرٹری طرف میری طرف دیکھ رہے تھے اور متحیر تھے کہ کس بلا کو چھیڑ لیا۔ 'یوں راگ سے جیسے باجا' والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ظاہراً کیسے سنجیدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ایک معزز عہدے پر ممتاز ہیں۔ پُر رعب شکل بنا رکھی ہے۔ کسے معلوم کہ ان کے اندر کیا ہنگامے برپا ہیں۔ کتنے ایسے مرحلوں سے گذر چکے ہیں 'ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی سے'۔ لیکن اب تو 'ایسی لگتی ہیں جیسے خواب کی باتیں'

شام کو کھانا بالکل نہ بھایا۔ کچھ بیوی سے خفا ہوئے کچھ بچوں کو ڈانٹا۔ رات جوں توں کاٹی۔ صبح سر تھام کر جب بیٹھے تو جی چاہا کہ دفتر سے چھٹی لے لیں۔ لکھ دیں کہ رات کو نیند نہیں آئی۔ لیکن صاحب بہادر کیا کہیں گے۔ سائنس دان ہیں۔ جذبات پر قابو ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ 'ہر اک تارِ بستر خارِ بستر' کیا ہوتا ہے۔ نیند نہیں آئی۔ چھٹی چاہیئے کیسی غیر معقول بات ہے۔ ادھر خیال آیا کہ اگر آج ہم دفتر نہ گئے تو

بے چاری فزکس لیبارٹری کا کیا بنے گا جس پر پونے دو کروڑ روپیہ خرچ ہونا ہے۔ آنے والی نسلیں کیا کہیں گی۔ ایک سیکرٹری کی نادانی کی وجہ سے ایک دوسرے سیکرٹری کو ایک رات نیند نہ آئی اور ہندوستان چاند کے تعاقب کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ حبِّ وطن نے زور مارا اور جھٹ سے تیار ہو کر دفتر پہنچ گئے۔

میز پر ایک چھپا ہوا کارڈ پڑا تھا جس پر اُسی سیکرٹری کا نام کولرج کا ایلبٹراس یاد آ گیا۔ کہیں نہیں چھوڑے گا کم بخت۔ آج ہی صاحب بہادر سے کہیں گے کہ اس دفتر میں ایک ہی سیکرٹری رہ سکتا ہے۔ دیکھا تو دعوت نامہ تھا۔ جان میں جان آئی۔ سنیچر کے روز چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ نہیں ہم چائے پر نہیں جائیں گے۔ نہیں، نہیں جائیں گے۔ نہیں جائیں گے ہرگز نہیں جائیں گے۔ اتنا سوچتے سوچتے ہم فزکس لیبارٹری کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔

دو دن بعد ہی سنیچر وار آ پہنچا اور ہم صاحب موصوف کے گھر میں وارد ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں چند احباب پہلے سے ہی موجود تھے۔ مستورات بھی تھیں۔ تعارف شروع ہوا۔ پہلے مجھے پیش کیا گیا اور پھر..... یہ ہیں پریذیڈنٹ بزمِ ادب۔ زمین نیچے سے نکل گئی۔ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ پریذیڈنٹ صاحب نے میرؔ کا ایک شعر پڑھ دیا۔ انھیں کیا معلوم کہ

"یاں تو اک مصرع میں پہلو سے نکل جاتا ہے دل۔"

آ گئے...... صاحب کی باری آئی۔ انھوں نے اُلٹے میری تعریف کرنا شروع کر دی۔ شاعر کی حمد و ہجو دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ دونوں سے خوب واقف ہوں۔ غصّہ تو بہت آیا اور جی چاہا کہ بھاگ نکلوں مگر چائے کی بلوری پیالیاں سامنے دھری تھیں اور ان پر چمچوں کی جھنکار۔ یہ ایک ایسی ترغیب ہے جس کا میں کبھی مقابلہ نہیں کر سکا اور پھر مستورات کے سامنے بزدلی دکھانا ایک مرد کے شایاں نہیں۔

تعارف کا سلسلہ جاری ہُوا۔ جناب..... صاحب..... جناب..... صاحب۔ کوئی تخلص چھوڑا بھی ہے ان شاعروں نے۔ سات اختر ہیں، چھ شاد ہیں، چھ شمس اور چھ بسمل۔ آزاد، بیتاب اور ظفر پانچ پانچ ہیں۔ حسن، رضا، سحر، شوق اور نسیم چار چار۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

اتنے میں ہمارے لئے بھی چائے کی پیالی آ گئی۔ مجمع میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ گفتگو ٹولیوں میں بٹ گئی اور ہلکی ہلکی دھیمی باتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ اتنے میں ایک کونے سے یہ فقرہ

رند کرتے نہیں گناہ زاہد جتنے پرہیزگار کرتے ہیں

اتنا کہنا تھا کہ شعرا کے خون نے جوش مارا اور ان کے ہاتھ جیب میں رکھے کاغذ کے پُرزوں، نوٹ بکوں اور ڈائریوں پر جا پڑے۔

پھر کیا تھا۔ وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مصرع طرح تھا ع

اک پُرفریب شام لباسِ سحر میں ہے

مصرع طرح، مشاعرے کی غزلیں، پرانی یادیں پھر تازہ ہونے لگیں ع

مجھ کو بیمار کیا تجھ کو مسیحا کر کے

یہی تھا نا مصرع طرح۔ ۱۹۲۴ء کے کسی مہینے کی کسی شام کو جب میں نے پہلے پہل مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ حکم تھا کہ مقررہ تاریخ کے پانچ بجے شام تک تمام غزلیں تیار ہو جائیں۔

کیا غزل بھی کوئی اچکن ہے جو حسب وعدہ معین وقت پر تیار ہو جائے۔ لیکن جب دن آیا بیسیوں غزلیں تیار تھیں۔ کتنا آسان ہے مشاعرے کی غزل لکھنا۔ ردیف مسیحا لیں لکھتے جاؤ، دریا، قطرہ، صحرا، دنیا، عقبےٰ، کعبہ، لیلےٰ، سودا، فردا، چرچا، لالہ، زیبا، صہبا، رسوا۔ اور آگے بڑھو تو اوجِ ثریا، زلفِ چلیپا، چاہے چار صفحے لکھ ڈالو۔ سب شاعرانہ الفاظ ہیں۔ پھر دیکھو کہ بیمار اور مسیحا کی طرح کون سا لفظ کس کے ساتھ موزوں ہے۔ قطرہ کو دریا کر کے، معنے ہوں یا نہ ہوں، مشاعرے کی محفل میں سر دھنیں گے۔ لیلےٰ کو محمل سے جوڑ دو۔ لالہ کو صحرا سے۔ کہ اس ورڈ پزل ہے اردو شاعری۔ متعدد شاعرانہ الفاظ ہیں اور شاعرانہ استعارے۔ تربت، آنسو، گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیریں فرہاد، شیخ و برہمن، رند و زاہد، ساقی، نشیمن..... وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے بھی تو اسی طرح غزل لکھی تھی اس دن۔ کچھ یاد نہیں۔ صرف ایک ہی شعر یاد ہے جس پر مجلس میں خوب ہنگامہ مچا۔ سر دھنے گئے دستِ تحسین بلند ہوئے۔ واہ واہ کے نعرے لگے۔ "کیا خوب شعر ہے"۔ "کلّی شعر ہے صاحب"، "معشوق کی سنگدلی کا نقشہ"، "کیا کہنے"۔ "غضب کر دیا"۔ تین چار دفعہ شعر پڑھنا پڑا۔ اب تو اُسے اپنانے میں بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ یہ تھا وہ شعر ـــــ

تجھ کو یوں بزم میں جل جانے سے کیا ملتا ہے
شمع نے پوچھا یہ پروانے کو رُسوا کر کے

کیا ہے اس شعر میں۔ چند الفاظ ہیں۔ بزم، جل جانا، شمع پروانہ، رُسوا اور اُن کی تُک بندی۔ سچ پوچھیے۔ جب میں نے یہ شعر لکھا کسی قسم کی بے اعتنائی یا سخت دلی کا تجربہ میرے دل میں نہیں تھا۔ دماغی کاوش کا نتیجہ تھا جو لفظوں کے ہیر پھیر کرنے میں ہوتی ہے۔ استعارہ تو سینکڑوں سالوں سے بار بار کھیلا جا چکا ہے اور مرنے میں نہیں آتا۔

مشاعرے کی شاعری سے اس کا ماحول زیادہ دل کش ہوتا ہے۔ شعر تو وہی داد پاتے ہیں جو سطحی ہوں اور لفاظی میں رہیں۔ گہرائیوں میں جانے کی کسے فرصت ہوتی ہے۔ جہاں تیس چالیس غزلیں ہر مضمون پر ہر لہجہ میں کہی جاتی ہوں وہاں کوئی کیا کاوش کرے اور کیا جذب۔ سامعین دلجوئی کے لئے آتے ہیں درس کے لئے نہیں۔

کئی قسم کے خیالات دل میں گزر رہے تھے کہ...... صاحب نے پُر ترنّم شعر برسانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ جھڑی لگ گئی۔ ایک کے بعد دوسرا، پھر تیسرا۔ دو غزلے، سہ غزلے۔ ایک طوفان برپا ہوا۔ تمام مجلس لطف سے جھوم رہی تھی۔ مستی کا عالم تھا۔ کیا کہا گیا کچھ یاد نہیں۔' 'حرفوں سے حرف کٹ گئے فردِ گناہ میں' دو گھنٹے تک دھما چوکڑی مچی رہی۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ شعر جتنا دروغ آمیز ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ تحسین کا مستحق۔ کون تھا وہ شاعر جس نے اپنے عقیدہ کی حقیقت کا یقین دلانے کے لئے کہا تھا۔ ع 'جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ ان میں نہیں'۔ اردو شاعری میں جھوٹ ہی اشعار کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ بے چارے افلاطون کا کیا قصور تھا کہ اس نے اپنی ریپبلک میں شاعر کو اس لئے جگہ نہ دی کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔ حقیقت بیان نہیں کرتا نقل پیش کرتا ہے۔

اردو شعراء کی اصطلاح میں جھوٹ کا ایک نام شوخی ہے۔ خدا سے شوخی، واعظ و زاہد سے شوخی، شیخ و برہمن سے شوخی۔ جس دن ابلیس نے بغاوت کا علم بلند کیا اس دن شاعر کا جنم ہوا۔ بار بار خدا کو للکار کر دعوے کرتا ہے کہ دنیا میں نہ صرف سوز بلکہ رنگینی بھی جن پر شاعر پلتے ہیں میری وجہ سے ہے تیری وجہ سے نہیں۔

می تپد از سوزِ من خونِ رگِ کائنات
تو بہ بدن جاں دہی شور بجاں من دہم
تو بہ سکون رہ زنی۔ من بہ تپش رہبرم

جبرئیل کو مخاطب ہو کر آپ فرماتے ہیں کہ تمھارا عالم
'کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کُو'
اور میرا عالم 'سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو'
اور آگے

گر کبھی فرصت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

شاعر نے نہ صرف 'سوز و ساز و درد و داغ و آرزو و جستجو' ہی ابلیس سے سیکھا ہے بلکہ شیخی اور شوخی بھی۔ ابلیس نے ہی تو پہلے پہل نافرمانی اور گستاخی سکھائی تھی۔ پھر کیا تھا ؂

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلا رکھتا ہوں میں
تو شب آفریدی چراغ آفریدم...... وغیرہ وغیرہ

علاّمہ تو یہاں تک کہہ گئے ؂ 'می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر'
ایک شاعرِ گستاخ کا منھ کون بند کر سکتا ہے۔

واعظ و زاہد سے گستاخی بھی اردو شاعری میں ایک فیشن ہے۔ گستاخی پر داد ملتی ہے شعر پر نہیں۔ اسی شعر نے ان تمام شعراء کو بھڑکایا تھا

رند کرتے نہیں گناہ زاہد
جتنے پرہیزگار کرتے ہیں

اگر اکبر الہ آبادی کہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ وہ تو ظریف تھے اور کچھ کچھ شاعر بھی۔ یہاں تو غالب اور اقبال بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پہ زباں دراز کرے

اقتباس فضول ہے۔ اردو شاعری کا بیشتر حصہ زہد کی مذمت پر ہی مشتمل ہے جسے شاعری کی انتہا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں سوائے ہزار بار دہرائی ہوئی شوخی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

جھوٹ کا دوسرا نام مبالغہ ہے۔ مبالغہ شعر کی جان سمجھا جاتا ہے جتنا زیادہ مبالغہ اتنا قیمتی شعر۔ شاعر جب آہ بھرتا ہے تو تمام کائنات کے

تختے اُلٹا دیتا ہے۔ 'چرخ کیا اور چرخ کی اوقات کیا'۔ جب آنسو بہاتا ہے تو طغیانی سے حضرت نوح بھی نہیں بچ سکتے۔ شاعر کا نالہ وہ بگولہ ہے۔ 'جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں'۔ اس کے معشوق کے پاؤں اتنے نازک ہیں کہ 'اُٹھا سکتے نہیں رنگِ حنا کو' اس کی تصویر اس لئے نہیں کھچوائی کہ 'چہرہ نہ کہیں عکس کے بدلے اُتر آئے'۔ اس کے کمر تو ہے ہی نہیں 'خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں'۔ اکبر الہ آبادی کی حسبِ معمول ظرافت ملاحظہ ہو۔

مغرب نے خوردبیں سے کمر اُن کی دیکھ لی

مشرق کی شاعری کا مزا کرکرا ہوا

غلو کسی حد تک پُرلطف ضرور ہوتا ہے۔ مشاعرے کے شعر بھی پُرلطف ہوتے ہیں۔ ان میں شعریت کتنی ہوتی ہے یہ اور بات ہے۔ مشاعرے میں ترنم ہوتا ہے۔ شاعر کی شخصیت ہوتی ہے اس کی حرکات ہوتی ہیں اور سامعین کی نرالی ادائے تحسین۔ ایک ایسا ماحول ہوتا ہے جسے دلجوئی کا بہترین ذریعہ شمار کیا جائے۔ کبھی کوئی اچھا شعر بھی سننے میں آتا ہے ورنہ وہی تشبیہیں اور ان تشبیہوں کا وہی استعمال۔ صرف الفاظ کے سلسلے کا ادل بدل ہوتا ہے۔ بلبل روتی ہے اور گل بے اعتنائی سے خاموشی اختیار کئے رکھتا ہے۔ پروانے کا جلنا عاشق کی قربانی کی انتہائی حد ہے۔ فرہاد کی کوہ کنی سے کہیں بڑھ کر۔

تشبیہ شعر کی جان ضرور ہے۔ لیکن تشبیہ مردہ نہیں ہونی چاہیئے۔ یہاں تو تشبیہ رسم بن چکی ہے۔ دماغ سے نکلتی ہے دل سے نہیں۔ اس کی تہ میں حس نہیں ہوتا، تجربہ نہیں ہوتا، شخصیت نہیں ہوتی۔ شعر شاعر کا اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اسی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ سودا کا شعر ذوق کا شعر ہو سکتا ہے اور ذوق کا شعر انشاء کا۔ غالب سے پہلے صرف میر ہی ایک شاعر ہے جس کے کلام میں شخصیت پائی جاتی ہے۔ جہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شعر میر کا ہے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ غالب اقبال، حالی میں انفرادیت ہے۔ اکثر اردو شاعری کا تو وہی حال ہے جو انگریزی ادب میں اٹھارھویں صدی کے کلاسیکی شعراء کا تھا۔ وہی نتاڑی ہوئی بے جان تشبیہیں، وہی شاعرانہ 'الفاظ کا شوق۔

شعر میں تجربہ اور شخصیت کا احساس تبھی ہوتا ہے جب شاعر تشبیہوں کا مالک ہو ان کا غلام بن کر نہ رہ جائے۔ میر غلام نہیں، غالب غلام نہیں، اقبال غلام نہیں۔ غالب کا شعر غالب کا شعر ہے اور دور سے پہچانا جاتا ہے۔ اقبال نے تمام پُرانی تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ درجنوں ہر ایک صفحہ پر موجود ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تشبیہ ہی اقبال کی شاعری کا سب سے قیمتی جوہر ہے لیکن اقبال نے ان میں نئی جان ڈال دی ہے۔ نئے رنگ میں ڈھالا ہے۔ ہر قسم کے مضامین میں ان کو کھینچا ہے جس سے نہ صرف مضمون پر نئی روشنی پڑی ہے بلکہ تشبیہوں میں بھی نئی روح۔ موجودہ تعلیم کی بابت کہتا ہے ؎

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما

لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

شکوہ کی مجبوری یوں بیان کرتا ہے ؎

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں

ہم نوا میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں

ہندوستان کی پھوٹ کا نتیجہ بربادی ہے ؎

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں

تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

کہاں تک اقتباسات پیش کئے جائیں۔ تشبیہ اقبال کے ہاتھ میں گیند کی طرح کھیلتی ہے۔ ہمارے اکثر شعراء تو گیند کے پیچھے ہی بھاگتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اقبال بھی نہ بچ سکا۔ مصرع ملاحظہ ہو ع

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے

ٹپک، شمع، آنسو، پروانہ شاعری کے سب پُرزے موجود ہیں۔ شعر نہیں ہے۔

مشاعرہ ایک تفریحِ طبع کی بزم ہے جس میں میں اکثر شریک ہوتا ہوں اور گھنٹوں محظوظ رہتا ہوں۔ لیکن جب وہی نظمیں کتابی صورت میں سامنے آتی ہیں تو وہ بات نہیں ہوتی ان کا مشاعرہ پن اُڑ جاتا ہے اور باقی کھوکھلی نظر آتی ہیں۔ نظم وہ ہے جو بار بار پڑھی جا سکے اور جتنی پڑھی جائے اتنی پُرلطف ہو۔ کیٹس کی اوڈ بار بار پڑھی جاتی ہیں اور باسی نہیں ہوتیں۔ اقبال کا 'فلسفۂ غم' یا 'شمع و شاعر' کبھی بے لطف نہیں ہوگی۔

غزل کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ایک شعر کا دوسرے شعر سے تعلق نہیں ہوتا۔ ایک شعر میں شاعر ہجر کے غم میں مبتلا ہے تو دوسرے میں شراب کے نشہ میں چُور اور تیسرے میں گل و گلزار کی رعنائیوں میں مست۔ یہاں تک کہ ہر ایک شعر دوسرے شعر سے مختلف اور اکثر متضاد ہوتا ہے کیونکہ وہ دماغی کاوش کا نتیجہ ہے کسی تجربے پر مبنی نہیں۔ جذباتی تجربہ تو بیک وقت ایک ہی قسم کا ہوتا ہے۔ ماتم اور شادی دونوں سے لگاؤ نہیں رکھتا۔

تشبیہہ شعر کی جان ہے بذاتِ خود شعر نہیں۔ غالب کا یہ شعر دیکھئے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں   ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

کیا ہے اس شعر میں۔ سادہ سا ہے۔ تشبیہہ کے لحاظ سے قطعی مبرا ہے۔ بچوں کا سا لگتا ہے۔ ہر ایک شعر گو سمجھتا ہے کہ اس نے سینکڑوں ایسے شعر لکھ ڈالے ہیں یا ہیچ سمجھ کر لکھنے سے گریز کیا ہے۔ آسمان کیا ہے، زمین کیا ہے، انسان کیا ہے۔ مان لیا کہ یہ فلسفے کے بنیادی اور پیچیدہ سوالات ہیں جن کا ابھی تک حل نہیں مل سکا۔ لیکن ان میں شعریت کیا ہے۔ کون سی انوکھی بات ہے جس کے لئے غالب کی تعریف کی جائے۔ ایسے شبہات اُن لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جو شعر کی اصلیت کو نہیں جانتے جو سمجھتے ہیں کہ شعریت خیال یا تصور میں ہے۔ کیسا انوکھا خیال ہے، کیا گہرائی ہے اس شعر میں صاحب، کہاں پہنچ گئے ہیں آپ۔ ایسے کلماتِ تحسین اکثر سننے میں آتے ہیں۔ شعریت خیال کا متمنی نہیں ہے۔ گو خیال کا تعمق بھی ایک اچھی نظم کا جزو ہے۔ شعریت صوتی مٹھاس نہیں۔ گو صوتی مٹھاس بھی اس کا جزو ہے خیال کا تعمق فلسفہ ہے۔ صوت کی مٹھاس موسیقی ہے۔ شعریت فلسفہ اور موسیقی دونوں کا مرکب ہے۔ شعریت الفاظ ہیں۔ کولرج نے ڈیڑھ سو سال ہوئے کہا تھا۔ شعریت الفاظ ہیں، بہترین الفاظ بہترین سلسلہ میں۔ الفاظ کیا ہوتے ہیں یہ سمجھنا بھی کون آسان کام ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لغت اُٹھاؤ اور لفظ کے معنی دیکھ لو اور بس۔ سائنس اور حساب میں بلاشبہ لفظ یہی مقام ہوتا ہے آکسیجن ایک گیس کا نام ہے۔ نفع قیمت خرید پر قیمت فروخت کی زیادتی کا نام ہے۔ قدم آگے بڑھانے کا نام چلنا ہے۔ سائنس دان لفظوں کو معنوں کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کا مقصد معنوں کا صحیح اظہار ہے۔ اسے کچھ غرض نہیں کہ کن کن الفاظ میں اور کس زبان میں وہ اظہار ہوتا ہے سائنس کی کتاب ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کی جاتی ہے اور اُسے کچھ ایذا نہیں پہنچتی۔ شاعری کی یہ حالت نہیں۔ شاعری وہی الفاظ ہیں جن میں شعر ادا ہوا ہے۔ سادہ سے سادہ شعر اپنی شخصیت رکھتا ہے جو انھیں الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

Whence have flowers & verdure sprung ?

What is cloud ? What is air ?

کیا یہ غالب ہے۔ کیا یہ شعر ہے۔ خیال کا تعمق یا غیر تعمق وہی ہے۔ تصور بھی وہی۔ اور نہ اس سادہ شعر میں کوئی تشبیہی یا معنوی تعلق ہے جس میں ترجمہ کی مشکل پیش آئے جو مثال کے طور پر ایسے اشعار میں پیش آتی ہے۔

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

اردو اور فارسی کے علاوہ کون سی زبان ہے جو ہمنوائی، بلبل کی نالہ سنجی، گل کی خاموشی میں جو صدیوں کی شاعرانہ روایات اور جذبات پوشیدہ ہیں ان کی ترجمانی کر سکے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

یہ اردو یا قدرے فارسی کا شعر ہے۔ اردو زبان کا جزو ہے۔ اس کا جدا کرنا اتنا مشکل ہے جتنا قالب کا جان سے۔ ذرا اس چھوٹے سے پنجابی مصرع کو دنیا کی کسی زبان میں ترجمہ کر دیجئے تو جانوں — شالا جوانیاں ماڑیں۔ تین عام فہم الفاظ ہیں کوئی تشبیہہ نہیں۔ کوئی شاعرانہ لفظ نہیں۔ لیکن کس قدر زور ہے، خلوص ہے، درد و اثر ہے ان لفظوں میں۔ جو ترجمہ کرنے سے اڑ جاتا ہے۔ پھول جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے۔ جو دروازہ کھل سم سم سے کھلتا ہے۔ وہ کھل گندم یا کھل جو سے نہیں کھلتا۔ شعر کے الفاظ میں بھی اسی قسم کا جادو ہے جو تبدیلی برداشت نہیں کر سکتا۔ ملاحظہ ہو یہ مصرع

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے۔

عام فہم مصرع ہے جسے ہر ایک رکشا ڈرائیور گاتا پھرتا ہے۔ کچھ فلسفہ نہیں کچھ خیالات کی گہرائی نہیں، کچھ تصور کی بلندی نہیں، کچھ تشبیہوں کی

ندرت نہیں۔ لیکن کچھ جادو ہے اس مصرع میں، جو تڑپا دیتا ہے۔ جو سینکڑوں بار دہرانے کے باوجود اسے تازہ رکھتا ہے۔ ذرا اس مصرع کی اصلیت ملاحظہ ہو۔

ڈولی۔ کون سی زبان ڈولی کا ترجمہ کر سکتی ہے کچھ عرصہ کی بات ہے کہ ایک انگریز دوست جو پنجابی زبان سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے، پوچھنے لگے ڈولی کیا ہوتی ہے؟ دس منٹ کی کوشش کے باوجود میں ان کو کوئی حقیقی تصور نہ دے پایا اور آخر کہہ دیا کہ کسی شادی کے موقع پر دکھاؤں گا۔ لیکن لاہور میں تو ان دنوں بھی دُلھن کو لے جانے کے لئے موٹر کا عام رواج ہو چکا تھا اور میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ کون سمجھ سکتا ہے ڈولی چڑھنے کو جس نے پنجابی شادی کا نقشہ نہیں دیکھا۔ ڈولی چڑھنے کا پنجابی زبان سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دُلھن اب موٹر میں سوار ہوتی ہے۔ لیکن ہم اس رسم کو اب بھی ڈولی ہی کہتے ہیں۔

ہیر۔ ایک عورت کا نام ہے۔ کیا یہ کسی عورت کا نام ہے۔ جب ہم ہیر کا لفظ بولتے ہیں تو صرف ایک پنجابی ہی جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا جذباتی تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ رومانی کیفیتوں کی ایک رستخیز اُبھرتی ہے۔ راج کماری بھی ایک عورت کا نام ہے۔ راج کماری کہنے سے آپ کے دل میں کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ آپ کی ہمشیرہ یا والدہ یا بیوی کا نام ہو تو صرف ایک عورت کا نام نہیں رہتا کچھ جذباتی سا لفظ بن جاتا ہے۔ اور اگر راجکماری ایک ایسی عورت ہو جس کے پاس ————
"آ کے بیٹھے بھی نہ تھے ہم کہ نکالے بھی گئے" تب اس لفظ کے بولنے سے ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا ہے۔ ہیر پنجابی زبان کا حصہ ہے پنجابی ماحول کا حصہ، پنجاب کی رومانی تاریخ کا حصہ جسے پنجاب کا ہر فرد بشر محسوس کرتا ہے۔

چیکاں۔ اس مصرع کا مرکزی لفظ ہے۔ میرے انگریز دوست جنھوں نے دو سال رومانی محبت کے بعد شادی کی تھی اس مصرع کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے انگریز دُلھن چرچ سے برفانی سفید لباس میں ملبوس گلدستہ ہاتھ میں لئے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اسے حقیقی خوشی ہوتی ہے اُسے کیا معلوم کہ شادی کے موقع پر چیکاں کیسے نکلتی ہیں۔ ذرا اُن کم سن بچیوں سے پوچھئے جو والدین کے گھر اور ان کی محبت سے پہلی بار ہمیشہ کے لئے جدا ہوتی ہیں۔ ان کے والدین سے پوچھئے۔ عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ سخت سے سخت دل پگھل جاتے ہیں۔

لَے چلے۔ ہمیں سمجھ سکتے ہیں۔ لَے چلے کیا ہوتا ہے۔ انگریز عورت جاتی ہے لے جائی نہیں جاتی۔ لیکن پنجابی عورت اور خاص کر ہیر کے وقت کی پنجابی عورت "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں"۔ کچھ سال ہوئے بیک وقت دو قسم کی اٹھنیاں رواں تھیں۔ ایک چاندی کی اور دوسری نِکل کی، ایک چلتی تھی، ایک چلائی جاتی تھی۔ معاف کیجئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پنجابی عورت نِکل کی اٹھنی ہے۔

بابلا۔ باپ، باپو، پیو، بابل، بابلا ہم معنی الفاظ ہیں لیکن باپو اور بابل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسے بھرا اور ویر میں۔ اور یہاں تو بابلا میں ایک بیاہی جاتی ہوئی لڑکی کی درد بھری پکار ہے جس میں مٹھاس ہے، پیار ہے، جادو ہے، پیارا سا لفظ ہے کوئی اور لفظ اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ کھل سم سم والا معاملہ ہے۔

'لَے چلے' کا دہرانا جذباتی ہیجان میں ایک لامحدود اضافہ کر دیتا ہے الفاظ کا دہرانا بھی شاعر کا ایک ہتھیار ہے جس سے وہ کئی کام لیتا ہے۔ مختلف قسم کے تاثرات پیدا کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو

'نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب' کیسی حسرت ہے اس کے دہرانے میں

یہ شعر ملاحظہ ہو جو صرف دہرانے سے ہی شعر بن گیا ہے ؎

اے محتسب نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

کولرج کو دیکھئے

Alone, alone, all, all, alone
Alone on a wide, wide, sea.

ایک وسیع سمندر میں اکیلا پن، اس اکیلے پن میں بے پناہ اداسی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ معمولی چھوٹے چھوٹے الفاظ اکیلے اکیلے کھڑے ہیں۔

یہ تھے الفاظ۔ اب ان سے مرکب مصرع کو لیجئے۔ کیا دردناک نظارہ ہے۔ ہیر کی حالت ایک عام پنجابی دلھن کی نہیں ہے۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب ایک گاؤں کی پنجابی لڑکی سوائے نزدیکی رشتہ داروں اور سکھی سہیلیوں کی محبت کے دنیا میں کوئی خوشی نہیں رکھتی تھی جس نے شاید پانچ میل پر دوسرا گاؤں بھی نہیں دیکھا تھا۔ جھنگ سے رنگ پور کھیڑیاں، اونٹ کا کجاوہ، ایک اجنبی خاندان، اس وقت کے رواج، شاید چھ ماہ تک واپس آنا نصیب

نہ ہو اور طرّہ یہ کہ ہیر صرف ماں باپ اور سکھی سہیلیوں کی جدائی کے لئے نہیں رو رہی جیسے ایک عام لڑکی روتی ہے۔ ہیر کیدارے سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس کے دل کا مالک اس سے زبردستی ہمیشہ کے لئے چھینا جا رہا ہے۔ وارث شاہ کا یہ سادہ مصرع ہیر کے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں کا عکس ہے۔ ایک رسمی پکار نہیں ہے۔ ایک مجروح جگر کی چیخ ہے۔ ٹریجیڈی کا کلائمکس ہے۔

یہ ہیں الفاظ جسے شاعری کہتے ہیں۔ معنوی لحاظ سے ان الفاظ کے دو حصّے ہیں۔ ایک لفظی جو لغت میں ملتا ہے دوسرا جذباتی یا ماحولی Suggestive or associational جس کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ جو شاید ہر ایک کے لئے مختلف ہوتا ہے۔ میرے لئے جس کی پیدائش رنگ پور کھیڑیاں میں ہوئی اور جس نے اس بڑ کے درخت کے نیچے بنٹے کھیلے ہیں جس کے نیچے رانجھا نے جوگی کے لباس میں آکر دھونی لگائی تھی اور جو سو ہی قدم پر اس پیپل کے درخت کے نیچے گھنٹوں تقریباً ہر روز تماش کھیلتا ہے جہاں ہیر سہیلیوں کے ساتھ پینگ جھولنے آتی تھی۔ ہیر کا لفظ کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے۔

لفظ صرف معنوی ہی نہیں ہوتا صوتی بھی ہوتا ہے۔ گل اور پھول کے معنی ایک ہی ہیں۔ گل اپنے اندر ایرانی روایات لئے ہوئے ہے۔ اس کے جذباتی معنے کچھ مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن صوتی لحاظ سے بھی ان دو لفظوں میں فرق ہے۔ جو مٹھاس اور گھلاوٹ گل و بلبل سے پیدا ہوتی ہے پھول اور بلبل سے پیدا نہیں ہوتی۔ بعض ماہرِ لسانیات تو یہ سمجھتے ہیں کہ اکثر الفاظ کی بنیاد صوتی ہی ہے۔ بڑبڑانا، دھماکا، بھونکنا، آہٹ، کانا پھوسی سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جن کی صوتی بنیاد جھٹ پہنچانی جاتی ہے۔ شیکسپیئر لاکھ کہے کہ نام میں کیا دھرا ہے۔ گلاب کو کسی نام سے پکارو گلاب ہی ہے۔ ذرا روز Rose کو ہپپا پوٹمس Hippopotamus پکار دو تو پتہ چلے۔ جس نے یہ جانور دیکھا ہے وہی جان سکتا ہے کہ کتنا صوتی اور لسانی ماہر تھا وہ شخص جس نے یہ نام ایجاد کیا۔

صوتی لحاظ سے لفظ نہ صرف انفرادی حیثیت رکھتا ہے بلکہ سماجی بھی۔ وہ ایک مصرع کا حصّہ ہے جہاں نہ صرف وہی لفظ استعمال ہو سکتا ہے بلکہ اسی جگہ پہ۔ ابھی میں نے بانگ درا کھولی ہے اور پہلا ہی مصرع پڑھا ہے،

پرستشِ اعمال سے مقصد تھا رسوائی میری

ذرا رسوائی کی جگہ بدنامی، بربادی پڑھیئے۔ ایک ہی معنے ہیں۔ سکتہ بھی نہیں پڑتا۔ لیکن شعر ٹھیک کر آسمان سے زمین پر گر جاتا ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ پرستشِ اعمال اور مقصد کے ساتھ رسوائی کی فارسیت ہی جچتی ہے اور نہ صرف اس لئے کہ دونوں لفظوں میں صوتی لحاظ سے ستارہ اور کیچڑ کا فرق ہے بلکہ اس لئے بھی کہ صوتی لحاظ سے بدنامی مصرع کی روانی (Rhythm) میں کچھ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ کولرج نے کہا تھا بہترین الفاظ بہترین سلسلہ میں۔ سلسلہ میں ہی تو روانی ہے۔ ذرا وارث شاہ کے مصرع کو اس طرح پڑھیئے ڈولی چڑھدیاں ہیر چیکاں ماریاں کیا ہو گیا ہے۔ ماریاں کا لفظ ایک جگہ سے دوسری جگہ بدل دیا گیا ہے۔ وہی الفاظ ہیں وہی معنی، وہی خیال، وہی تصور۔ لیکن وہ جادو نہیں ہے جسے شعر کہتے ہیں۔ یہ سماجی حیثیت لفظ کا جو تھا حصّہ ہے۔ شاعری میں لفظ ایک شہری کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ہمسایوں سے مل جل کر رہے۔

"ان" الفاظ" سے شعر بنتا ہے خیالات سے نہیں، تشبیہات سے نہیں جذبات سے نہیں، موسیقی سے نہیں، فلسفہ سے نہیں۔ گو یہ سب چیزیں الفاظ کا حصّہ ہیں۔

اب پڑھیئے غالب کے شعر کو

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

چیز کا لفظ معنوی اور صوتی دونوں لحاظ سے غیر شاعرانہ معلوم ہوتا ہے۔ انگلستان کے اٹھارھویں صدی کے شعراء اسی مغالطہ میں پڑے رہے اور سینکڑوں الفاظ کو غیر شاعرانہ قرار دے کر خارج کر دیا۔ لیکن یہ لفظ یہاں دونوں لحاظ سے ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے۔ شعر کی جان ہے ذرا ہٹا کر دیکھئے ابر کیا شے ہے مضحکہ خیز بن جاتا ہے اس لئے کہ شعر الفاظ ہیں وہی الفاظ جو شاعر استعمال کرتا ہے۔

حامد چھپروی

اقبال، فردوس میں حوروں کے درمیان

[فردوس کی فضا نور و نکہت میں شرابور ہے اور اس کی بہار آفرینیوں اور رنگینیوں میں کھویا ہوا ایک بھاری بھرکم بدن کا انسان محوِ خیال ہے البتہ گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ آواز بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اچانک چند حوریں آپس میں اٹھکیلیاں کرتی، فردوس کی خوش گوار فضا میں محوِ خرام ہیں۔ یکایک گنگنانے کی آواز سن کر اور اس اجنبی کو فردوس میں اس حالت میں دیکھ کر حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھتی ہیں]

حور۔ دنیائے آب و گل سے یہاں آنے کے بعد یہ کون شخص ہے جو یہاں بھی متفکر نظر آتا ہے دنیا والے تو ساری عمر "لطفِ فردوس" اور "وصالِ حور" کی امید پر گذار دیتے ہیں۔ پھر یہ کون ہے جو یہاں بھی "یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک" کی فکر میں ہے۔

دوسری حور۔ بہت زمانہ گذرا یہاں سے آدم و حوا سطحِ ارض پر بھیجے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انھیں کی ایک اولاد ہے۔

(حوریں اقبال کے پاس جاتی ہیں)

اقبال۔ (حوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر)

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

[حوریں سن لیتی ہیں اور اقبال کے پاس آکر نہایت توبہ شکن ادا سے دیکھ کر پوچھتی ہیں]

حور۔ کیا تو وہی گستاخ اقبال تو نہیں جس نے ایک مرتبہ اپنا 'شکوہ' بھیج کر آسمانوں میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا؟

اقبال۔ اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے۔

حور۔ اچھا وہ نہ سہی! تو ابھی زمین سے آ رہا ہے بتا مظلوم 'حوا' کی بیٹیوں کا دنیا میں کیا حال ہے؟

اقبال

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ "مسئلۂ زن" رہا وہیں کا وہیں

دوسری حور۔ کائنات میں 'وجودِ زن' کی اہمیت کیا ہے؟

اقبال۔

'وجودِ زن' سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

حور۔ اے محترم ہستی! تو ہر چیز پر غور و فکر کرنے کا عادی ہے۔ کیا صرف یہ ہی کہہ دینا ہماری جنس کے لئے کافی ہے؟ 'ایشیائی عورت' ایک عرصہ سے سسک سسک کر اپنی مظلومیت پر آنسو بہا رہی ہے لیکن آج تک کسی ادیب، شاعر اور مفکّر کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ اس کی مجروح و شکستہ زندگی میں تبدیلی لانے کے لئے انقلاب کا پیام دے۔ ظلم کی حد تو یہ ہے کہ مردوں نے اپنی محفلوں سے ہماری عزیز "حوا" کی بیٹیوں کو "ناقص العقل" کہہ کر نکال دیا۔ اے محترم شاعر! اب تو ہی بتا کہ کیا 'ایشیائی عورت' اپنی خرابی کی خود ہی ذمہ دار ہے؟

اقبال۔

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں

حور۔ تو اے مردِ خردمند! آخر اس کا راز کیا ہے؟

اقبال - اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں مردانِ خردمند

[حوریں اس مفکرِ اعظم کی بے چارگی پر مسکرا دیتی ہیں - ایک حور آگے بڑھتی ہے اور اقبال سے سوال کرتی ہے]

حور:- اے محترم ہستی! سنا ہے کہ آج کل دنیا میں "حوا" کی بیٹیاں آزادی کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں - جلوت کو خلوت پر ترجیح دے کر گھر کی چار دیواری سے نکلنا چاہتی ہیں اور "سوشل" حیثیت حاصل کرنے میں مصروف ہیں - کیا یہ صورتِ حال ایشیائی عورتوں کے لئے خوش آئند ہے؟

اقبال
رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر ولیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسّر
ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب است
کشادش در نمود رنگ و آب است

اس لئے ایشیائی عورتوں کو میرا مشورہ ہے کہ
جہاں تابی ز نورِ حق بیاموز

حور:- گویا آپ بھی ایشیائی "عورت" کو دنیا کے دیدار کے بدلے گھر کی چار دیواری میں قید رکھنے کے حق میں ہیں - آپ کی نظر میں ایشیائی "عورت" کے لئے خلوت ہی جلوت سے بہتر ہے -

دوسری حور:- تو پھر "آزادیٔ نسواں" کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟

اقبال - اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
"آزادیٔ نسواں" کہ زمرد کا گلوبند؟

حور:- "زمرد کا گلوبند" یعنی وہ طوقِ غلامی جو بڑی سختی سے آدم کے بیٹوں نے حوا کی بیٹیوں کے گلے میں ڈال رکھا ہے؟ آپ بھی اسی طوقِ غلامی پر ایشیائی عورتوں کو راضی و آمادہ رکھنا چاہتے ہیں؟ آپ بھی ایشیائی "عورتوں" پر مردوں کے بے جا تسلط کو جائز قرار دیتے ہیں؟

اقبال - بالکل -

حور - کیوں؟

اقبال - اس لئے کہ ؎

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منّتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذّتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اس آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

اس لئے ع "نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد"

حور - میں نے تو سنا تھا کہ آپ "انسانیت" کے بڑے ہمدرد ہیں اس لئے انسانوں میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم روا نہیں رکھتے -

اقبال - جس تفریق و تقسیم کو خود خدا نے متعین کیا ہے اس کو کون انسان ہے جو مٹا دے - الرجال قوامون علی النساء مرد عورتوں پر ایک غالب اور بالا رہنے والی طاقت ہے -

دوسری حور - آپ تو خود مفکر ہیں - غور و فکر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور لوگوں کو اس کی تلقین بھی کرتے ہیں - علم جو غور و فکر کے لئے ضروری ہے اور جسے خود قرآن نے بھی انسان کے لئے ضروری قرار دیا ہے کیا آپ ایشیائی عورت کے لئے اسے ضروری سمجھتے ہیں؟

اقبال - جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

حُور۔ اے محترم ہستی! آپ یہ بتائیں کہ آپ کی نظر میں ایشیائی عورت کا کیا مقام ہے؟ اس کا کیا فرض ہے؟ اور اس کے لئے آپ کا کیا پیغام ہے؟

اقبال۔
ملت از تکریمِ ارحام است و بس ورنہ کارِ زندگی خام است و بس
از امومت گرم رفتارِ حیات از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما موج و گرداب و حبابِ جوئے ما
آں دہِ رستاق زادے جاہلے پست بالائے سیطرے بدگلے
نا تراشے پرورش نا دادہٴ کم نگاہے کم زبانے سادہٴ
دل ز آلامِ امومت کردہ خوں گردِ چشمش حلقہ ہائے نیلگوں
ملت ار گیرد ز آغوشش بدست یک مسلمانِ غیور و حق پرست
ہستیٔ ما محکم از آلامِ اوست صبحِ ما عالم فروز از شامِ اوست
واں تہی آغوش نازک پیکرے خانہ پرورد، نگاہش محشرے
فکرِ او از تابِ مغرب روشن است ظاہرش زن باطنِ او نا زن است
بندہائے ملتِ بیضا گسیخت تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزاد ویش از حیا نا آشنا آزاد کیش
علمِ او بارِ امومت بر نتافت بر سرِ شامش یکے اختر نتافت،

این گل از بستانِ ما نارستہ بہ
داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

لالہ گریاں چو انجم بے شمار بستہ چشم از ظلامِ روزگار
پا نبردہ از عدم بیروں ہنوز از سوادِ کیف و کم بیروں ہنوز
مضمر اندر ظلمتِ موجودِ ما! آں تجلی ہائے نا مشہودِ ما
شبنمے بر برگِ گل ننشستہٴ غنچہ ہائے از صبا نا خستہٴ
بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات از خیابانِ ریاضِ امہات
قوم را سرمایہ اے صاحب نظر نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست
حافظِ رمزِ اخوت مادراں! قوتِ قرآن و ملت مادراں

حُور۔ اے محترم ہستی! عرصۂ دراز سے ظلم و ستم کے تیر و نشتر تو اس نیم جاں کو جاں بلب کرتے رہے۔ تیری اس بات نے تو اور پیچیدگی پیدا کر دی اس لئے اے محترم ہستی تو 'ایشیائی عورت' کو زندگی بسر کرنے کے لئے ایک مکمل اور صحیح 'ماڈل' عطا فرما۔

اقبال۔ اے فردوس کی حُور! میں حوا کی بیٹیوں کو زندگی بسر کرنے کا مکمل اور صحیح نصب العین دے کر آیا ہوں۔ وہ "مادرِ اولادِ آدم" ہے اور تندرست و توانا بچے سے ہی رابطۂ ملی کو تقویت ہوتی ہے۔ ایشیائی عورتوں کو مریم اور فاطمہ کی زندگی کو اپنا نمونہ بنانا چاہیئے۔

حُور۔ کیوں؟ دنیا میں بہت سی ایسی عورتیں گذری ہیں جنہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ تو پھر مریم اور فاطمہ ہی کی زندگی کو کیوں نمونہ بنایا جائے؟

اقبال۔ اس زمانے کے کور چشم انسان، جو تہذیب اور شرافت کے مدعی ہیں، درحقیقت راست بازی اور یقین سے کوسوں دور پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی عقل اندھی ہے، دل مردہ ہے، روح بے حس ہے اور یہ کوتاہ نظر صرف مادی کشش ہی میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں اس لئے ایشیائی عورتوں کو مریم اور فاطمہ کی زندگی کو اپنا نمونہ بنانا چاہیئے کیونکہ ؎
"مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز" اور فاطمہ کی اس لئے کہ ؎

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم حافظِ جمعیتِ خیر الامم
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں قوتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسین اہلِ حق حریت آموز از حسین
سیرتِ فرزند ہا از امہات جوہرِ صدق و صفا از امہات
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول مادراں را اسوۂ کامل بتول

دوسری حور۔ آپ نے مردوں کو 'حیاتِ دوام' کا پیغام دیتے ہوئے 'زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز' کی تلقین کی ہے لیکن ایشیائی 'عورتوں' کو کیا حکم ہے؟

اقبال۔ از سرِ سود و زیاں سودا مزن

حُور۔ سُنا ہے کہ آپ نے آدم کے بیٹوں کو "تقلید" سے انحراف کی تلقین کی ہے۔ اس ضمن میں "حوا" کی بیٹیوں کے لئے کیا پیغام ہے؟

اقبال۔ یہ کہ ؏ گام جز بر جادۂ آبا مزن

ایک حُور۔ میں نے سُنا ہے کہ کسی آسمانی عورت نے زمینی عورت کو پیغام دیا

ہے کہ :-

ای زناں، ای مادراں، ای خواہراں / زیستن تا کے مثالِ دلبراں؟
دلبری اندر جہاں مظلومی است / دلبری محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما / مرد را نخچیرِ خود دانیم ما
مرد صیادی و نخچیری کند / گردِ تو گردد کہ زنجیری کند
خود گدازیہائے او مکر و فریب / درد و داغ و آرزو مکر و فریب
گرچہ آں کافر حرم سازد ترا / مبتلائے درد و غم سازد ترا
ہمرہِ او بودن آزارِ حیات / وصلِ او زہر و فراقِ او نبات
مارِ پیچاں! از خم و پیچش گریز / زہرہایش را بخونِ خود مریز

[اقبال مسکراتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ]

اقبال - ہاں میں نے بھی یہ پیغام سنا ہے مگر اس سے اس مادرانہ محبت پر کوئی حرف نہیں آتا جس کو میں 'عورت' کے لئے ضروری قرار دیتا ہوں۔ میں نے اس بارے میں عورتوں کو اپنا صحیح مشورہ دے دیا ہے کہ

چہرہ اش روشن دلے بے نورِ جاں / معنیٔ او بر بیانِ او گراں
حرفِ او بے سوز و چشمش بے نمے / از سرورِ آرزو نامحرمے
فارغ از جوشِ جوانی سینہ اش / کور و صورت ناپذیر آئینہ اش
بے خبر از عشق و از آئینِ عشق / صعوۂ رو کردہ شاہینِ عشق
زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست / عشقِ یک بیں در تماشائے دوئی است

مرد و زن وابستۂ یک دیگراند / کائناتِ شوق را صورت گراند
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات / فطرتِ او لوحِ اسرارِ حیات
آتشِ ما را بجانِ خود زند / جوہرِ او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکناتِ زندگی / از تب و تابش ثباتِ زندگی
شعلۂ کز وے شررہا در گسست / جان و تن بے سوزِ او صورت نبست
ارجِ ما از ارجمندیہائے او / ما ہمہ از نقش بندیہائے او
حق ترا داد است اگر تابِ نظر / پاک شو قدسیتِ او را نگر

حور - اے محترم شاعر! تو سارے انسانی نظام ہائے زندگی میں انقلاب لانے کی سعی کرتا رہا لیکن تو نے ایشیائی عورتوں کی مشکلات کی گرہ نہیں کھولی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

اقبال - میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

[حور ایک اندازِ بیزاری کے ساتھ اٹھتی ہیں اور نظریں جھکائے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہیں۔ اقبال انھیں جاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں تو اپنا مصرع گنگنانے لگتے ہیں
—— یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا]

— پردہ — گرتا — ہے —

سکندر علی وجد

گہوارۂ مسیح

اے شب چراغ، تجھ سے منور دلِ چمن — کھلنے سے تیرے دولتِ کون و مکاں ملی

پُر کیف و دل نواز تبسم کا شکریہ — تیری مہک سے میرے قلم کو زباں ملی

خوش قسمتی سے دیدۂ محرومِ دید کو — گلشن میں تیری ہستیٔ راحت نشاں ملی

کس نے عطا کئے یہ نقوشِ نظر فریب — یہ حُسن، یہ ادا، یہ نزاکت کہاں ملی

شفاف چاندنی سے بنی ہے تری قبا — ضو بار پتیوں میں تری کہکشاں ملی

تاروں کو رشک ہے ترے رُوئے صبیح پر — تیری جِلو میں روحِ چمن نغمہ خواں ملی

آغاز ہے شباب کے رنگین دور کا — تجھ کو حسین شب کی دلھن تو جواں ملی

لیکن ترا لباسِ عروسی کفن بھی ہے — مثلِ حباب کم تجھے عمرِ رواں ملی

نیرنگِ صبح و شام نہیں ہے ترے لئے — کیوں دو گھڑی کے واسطے تاب و تواں ملی؟

یوں مسکرا کے چھوڑ نہ بزمِ طرب ابھی

اے ماہِ نو، جوان ہے لیلائے شب ابھی

ء سفید کیکٹس کا پھول جولائی، اگست اور ستمبر کے مہینوں میں رات کے ابتدائی حصے میں کھلتا ہے اور صرف چار پانچ گھنٹے اپنے حسن کی بہار دکھا کر صبح سے پہلے مُرجھا جاتا ہے۔ رنگ، ساخت اور خوشبو کی لطافت و نزاکت کے اعتبار سے پھولوں کی دنیا میں اس دولتِ مستعجل کا جواب ملنا مشکل ہے۔ اس پھول کی پنکھڑیوں کی اندرونی ترتیب میں بچّے کے جھولے کی شکل بنتی ہے اس لئے اس کو "گہوارۂ مسیح" بھی کہتے ہیں۔

شاعر، پیامِ زیست بقا ہے فنا نہیں
دنیائے رنگ و بو کی بنا پائدار ہے

ہر لحظہ تازہ شکل ہے پیشِ نظر یہاں
ہر مظہرِ وجود تغیر شعار ہے

ہر ذرّہ بے خودی میں بدلتا ہے رنگِ رُخ
عالم رہینِ گردشِ بے اختیار ہے

ہر برگِ گل پہ ثبت ہے بربادیٔ خزاں
موجِ سموم طرّہ کشائے بہار ہے

ہے آب و رنگِ دہر حوادث کی دھوپ چھاؤں
مستِ خرامِ ابلقِ لیل و نہار ہے

میری نمود بھی ہے چمن میں ندی طرح
فرصت، بقدرِ حوصلۂ انتظار ہے

چہرہ ہے ماہتاب کا دل آفتاب کا
رگ رگ میں خونِ شام و سحر بے قرار ہے

یہ مختصر، معطّر و پُر نور مرحلہ
سرشاریِ دوام کا آئینہ دار ہے

لاکھوں ہیں حُسن کاریِ فطرت کے معجزے
اس کا ہر ایک نقشِ عمل شاہکار ہے

دن رات ظرفِ وقت میں ڈھلتی ہے زندگی
مٹتی نہیں لباس بدلتی ہے زندگی

رعنائیِ حیات کا باعث ہے ارتقاء
ایسا نہ ہو تو روپ نکھرتا نہیں کوئی

بے ربطیوں کی جان ہے ترتیبِ دل نشیں
یہ بر ہمی نہ ہو تو سنورتا نہیں کوئی

آئینِ گلستاں ہے کہ بے نذرِ خونِ دل
ہرگز رہِ نمو سے گزرتا نہیں کوئی

تعبیر جس کو موت سے کرتے ہیں بے خبر
تبدیلیِ مقام ہے مرتا نہیں کوئی

دریائے زندگی ہے دما دم رواں دواں
ڈوبے بغیر، پار اُترتا نہیں کوئی

جب تک نہ ہو عناصرِ ہستی میں کشمکش
لوحِ زمیں پہ عکس اُبھرتا نہیں کوئی

تصویرِ کائنات ابھی ناتمام ہے
قدرت کو روز نقش بدلنے سے کام ہے

پھول کا ایک رُخ

کیکٹس کا پودا

کیکٹس کا پھول

گہوارۂ مسیح

(کیکٹس کا پھول)

اس عنوان سے سکندر علی وجد
کی نظم صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ فرمائیں

برسات کی بہاریں

پھیلائے دامِ دستِ قضا نے کہاں کہاں

نے نواز پنا لال گھوش

ہندی کے مشہور شاعر بال کرشن شرما نوینؔ

بنگلہ کے مزاح نگار پرشورام
(فوٹو بشکریہ آنند بازار پتریکا)

راز یزدانی

اردو داستانوں پر کام کا تجزیہ اور تبصرہ

بڑے اندوہ اور تاسف کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں اور ہمارے ادب کے مؤرّخوں نے اردو کی داستانوں کی طرف جیسی توجہ کرنا چاہیئے تھی ابھی تک نہیں کی اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ بڑے سائز کے تقریباً ساٹھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے اس مواد کو اوّل سے آخر تک پڑھنا اور پڑھ کر صحیح رائے قائم کرنا جتنی مہلت اور فرصت کا کام ہے وہ ہمارے نقّادوں اور مؤرّخوں کو میسّر نہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب" فنِ داستان گوئی " میں اس کا اعتراف کیا ہے!

" اردو میں داستان گوئی کی معراج داستانِ حمزہ ہے فرصت کہاں کہ کوئی اس کبھی نہ ختم ہونے والے سلسلہ کا مفصل جائزہ لے سکے" (صفحہ ۱۳)

اردو داستان حمزہ صاحبقران کے ایک حصّہ طلسم ہوشربا کے متعلق بھی ان کی رائے حسب ذیل ہے!

" طلسم ہوشربا کی سات جلدیں ہیں اگر اس کے سارے محاسن و معائب پر روشنی ڈالی جائے تو ایک بھاری بھرکم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ میں صرف چند اہم پہلوؤں کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں" (صفحہ ۱۳)

لیکن وقت کی کمی اور عدیم الفرصتی ان میں سے کوئی عذر ایسا مضبوط نہیں جس کو قابلِ ذکر وقعت حاصل ہو۔ ہم اپنے نقّادوں سے بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ بڑے چھوٹے ہر کام کی طرف پوری طرف توجہ دیں۔ کیا یہ عذر کوئی قیمت رکھتا ہے کہ کام بڑا ہے اس لئے نہیں کیا جا سکتا؟ بڑے کام کو چھوٹی چھوٹی قسطوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ صفحات کا نام سُن کر ہمّت ہار دینا اور بات ہے۔ ورنہ دنیا میں وہ کون سا کام ہے جو مستقل مزاجی اور آہستہ روی کے ساتھ کیا جائے اور ختم نہ ہو۔ داستان سے تغافل کی وجہ تو غالباً وہی ہے جو کلیم الدین احمد صاحب نے اپنی کتاب میں لکھی ہے اس لئے ابھی تک اردو کی داستانوں پر کوئی مفصل اور جداگانہ کام تو ہوا نہیں پھر بھی جو کچھ ہُوا اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مولانا شرر لکھنوی کا ایک مضمون لکھنؤ کی داستان گوئی پر۔

(۲) خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا ایک مضمون" لکھنؤ کی داستان گوئی " مطبوعہ نگار مئی ۱۹۳۵ء

(۳) "تاریخ ادب اردو حصّہ نثر میں مختصر سا ذکر صفحات (۱۰۰/۱۰۱)

(۴) داستان تاریخ اردو میں " بوستانِ خیال" ترجمہ خواجہ امان دہلوی کا مختصر ذکر

(۵) سیّد وقار عظیم کی کتاب " ہماری داستانیں"۔

(۶) ڈاکٹر کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب" فنِ داستان گوئی"

(۷) ڈاکٹر گیان چند کی کتاب " اردو کی نثری داستانیں"

بس اتنا کام ہے جس کا پتہ مجھے مل سکا۔ ممکن ہے کہ کچھ کام اور بھی ہوا ہو بہرحال مولانا شرر لکھنوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس وقت میرے سامنے نہیں۔

لکھنؤ میں داستان گوئی

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے یہ مقالہ نہایت سرسری طور

پر اپنے حافظے کے اعتماد سے لکھا ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی داستان نویسی کا سہرا علامہ فیضی کے سر باندھ دیا ہے جو قطعی غلط ہے۔ عہد شاہی کے کئی داستان گویوں کا ذکر انھوں نے کیا ہے۔ مثلاً مرزا طور، بڑے منشی منشی فدا علی، نواب ہادی علی خاں شاہ پوری، امیر خاں، نواب آغا حیدر رفسوں رسالدار نواب محمد حسین خاں، مولوی احمد حسن ساکن وزیر گنج لیکن اس مقالہ میں بہت سی باتیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں مثلاً

(۱) لوگ کہتے ہیں کہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے نواب صاحب رام پور کے ارشاد سے ایک داستان لکھی تھی جس کا نام 'شگوفۂ محبت' تھا۔

(۲) منشی احمد حسین قمر نے ہوشربا کی جلدیں ختم کر کے صندلی نامہ شروع کیا یہ ہوشربا کے بعد کا طلسم ہے...... اس کے بعد تورج نامہ کا سلسلہ قائم کیا جس میں امیر کی نقاب دار سے کشتی.... پھر دوسری جلد تورج نامہ کی لکھی۔

(۳) قمر کے بعد انھوں نے (شیخ تصدق حسین سے مراد ہے) داستان لکھنے کا سلسلہ قائم کیا اور طلسم آفتاب شجاعت لکھا.... اس کے بعد طلسم خیالِ سکندری کی تین جلدیں لکھیں.......

محسوس ہوتا ہے کہ خواجہ عشرت لکھنوی نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان کے ٹائیٹل پیج دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی ورنہ ظاہر ہے کہ وہ ٹائیٹل پیج دیکھ کر ہی جان جاتے کہ صندلی نامہ منشی محمد اسمٰعیل اثر نے لکھا ہے اور نہ صندلی نامہ کسی طلسم کا نام ہے بلکہ کوچک باختر اور بالا باختر کی طرح دفاتر داستانِ حمزہ کے چھٹے دفتر کا نام ہے نہ قمر نے تورج نامہ لکھا ہے نہ تورج نامہ میں صاحبقران اور نقابدار کی کشتی ہوئی ہے۔ یہ کشتی صندلی نامہ میں ہوئی ہے اسی طرح دفتر آفتاب شجاعت کسی طلسم کا نام نہیں بلکہ لعل نامہ کے بعد کے دفتر کا نام ہے جس میں صاحبقرانِ ثالث بدیع الملک کی صاحبقرانی کے حالات طلسم ایوان نہ طاق وغیرہ کی فتح کا ذکر ہے طلسم خیالِ سکندری شیخ تصدق حسین کی نہیں بلکہ قمر لکھنوی کی تصنیف ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے مقالے میں داستان گویوں کا جو حال تحریر ہے اس پر کسی دوسری شہادت کے بغیر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے جبکہ سرور نے شگوفۂ محبت بھی نواب صاحب رام پور کی فرمائش پر نہیں لکھی بلکہ احمد علی خاں رئیس سندیلہ ضلع ہردوئی کی فرمائش پر لکھی اور مطبع محمدی میں چھپی (دیباچہ صفحہ ۶)

تاریخ ادب اردو

یہ کتاب درحقیقت رام بابو سکسینہ کی کتاب (ہسٹری آف اردو لٹریچر) کا ترجمہ ہے اس میں داستان حمزہ صاحبقراں اور بوستانِ خیال کے متعلق حسب ذیل مواد ملتا ہے:

داستان حمزہ صاحبقرانؑ۔

ایک حجیم اور ضخیم کتاب - اصل کتاب فارسی میں شیخ ابوالفیض فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے واسطے تیار کی تھی - اس کے آٹھ دفتر ہیں اور ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدیں ہیں جن کی مجموعی تعداد سترہ اور تعداد صفحات اٹھارہ ہزار سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ سب سے مشہور دفتر اول مسمی بہ نوشیروان نامہ دو جلدوں اور دفتر پنجم موسوم بہ طلسم ہوشربا سات جلدوں میں ہے اور موخرالذکر بہت مقبول عام ہے۔ طلسم ہوشربا کی اول چار جلدوں کا ترجمہ سید محمد حسین جاہ اور آخری تین جلدوں کا ترجمہ احمد حسین قمر کا ہے۔ ایک منظوم ترجمہ تو طارام شایاں نے بھی کیا تھا۔ نوشیرواں نامہ کا ترجمہ منشی نول کشور کی فرمائش سے شیخ تصدق حسین داستان گو نے کیا تھا۔ اس کتاب میں ایک فرضی و طویل افسانہ امیر حمزہ کا ہے جو پیغمبر اسلام صلوٰۃ اللہ علیہ والسلام کے عم بزرگوار تھے جس میں ایک قصہ سے سینکڑوں قصے پیدا ہوتے چلے گئے ہیں (۱۰۰ صفحہ)

<u>بوستانِ خیال</u> - اس کی ۹ ضخیم جلدیں ہیں - اس کے مصنف میر تقی خیال سمجھے جاتے ہیں جو اصل میں گجرات کے رہنے والے تھے اور آخر میں دلی آ گئے تھے - یہ قصہ مصنف نے اپنی معشوقہ کی دلچسپی کے لئے داستانِ حمزہ کے رنگ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کتاب کو محمد شاہ رنگیلے نے بہت پسند کیا اور انھیں کے زمانے میں اُن ہی کے حکم سے اختتام کو پہنچی - اس کے تقریباً چار ہزار صفحات ہیں پانچ جلدوں کا ترجمہ اردو میں خواجہ بدرالدین عرف خواجہ امان اور دو جلدوں کا ترجمہ لکھنؤ میں چھوٹے آغا نے کیا اور پوری کتاب پر نظر ثانی بھی کی (۱۰۱) صفحہ

اصل کتاب کے مصنف اور اردو کے مترجم دونوں غلط فہمیوں کا شکار

ہوئے ہیں۔ ان غلطیوں پر مفصل بحث تو ہیں ڈاکٹر گیان چند کی کتاب کے سلسلہ میں کروں گا۔ یہاں صرف غلطیاں گنوائے دیتا ہوں (۱) داستانِ حمزہ کو علامہ فیضی کی تصنیف یا تالیف یا تیار کردہ سمجھنا (۲) ہر دفتر میں صدہا صفحات کی کئی کئی جلدوں کا ذکر کیوں کہ کوچک باختر، بالا باختر اور صندلی نامہ صرف ایک ایک جلد پر مشتمل ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر دفتر.. کا لفظ غلط ہے (۳) تعداد دفاتر اور تعداد صفحات بھی غلط ہے۔ دیکھئے

(۱)	نوشیرواں نامہ	۲ جلد	۱۷۸۰ صفحات
(۲)	کوچک باختر	۱ جلد	۷۰۸ صفحات
(۳)	بالا باختر	۱ جلد	۸۲۰ صفحات
(۴)	ایرج نامہ	۲ جلد	۱۴۲۶ صفحات
(۵)	طلسم ہوشربا	۷ جلد	۷۲۷۲ صفحات
(۶)	صندلی نامہ	۱ جلد	۴۷۲ صفحات
(۷)	تورج نامہ	۲ جلد	۲۰۶۴ صفحات
(۸)	لعل نامہ	۲ جلد	۱۹۰۰ صفحات
		۱۸ جلدیں	۱۶۴۴۲ صفحات

ان آٹھ دفتروں میں دوسرے ایسے متعلقات کا ذکر نہیں جن کے بغیر داستان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مثلاً ہرمز نامہ، آفتاب شجاعت اور گلستانِ باختر وغیرہ سب کو گنا جائے تو ۴۹ جلدیں اور تقریباً پینتالیس ہزار صفحات ہوتے ہیں (۴) طلسم ہوشربا کو ترجمہ کہنا بھی غلط ہے (۵) بوستانِ خیال کے مصنف میر تقی خیال نہ صرف مصنف سمجھے جاتے ہیں بلکہ حقیقتاً وہی مصنف ہیں (۶) یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ بوستانِ خیال کو مصنف نے اپنی محبوبہ کے لئے تصنیف کیا (۷) یہ بھی غلط ہے کہ کتاب محمد شاہ کے عہد میں ختم ہوئی بلکہ مرشد آباد میں سراج الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی (۸) یہ بھی صحیح نہیں کہ چھوٹے آغا نے خواجہ امان دہلوی کے ترجمہ پر نظر ثانی کی انھوں نے "ہندی" کے مسودہ پر نظر ثانی کی ہے لیکن اس ترجمہ کا ذکر ہی تاریخ ادب اردو نے نہیں کیا ہے (۹) مصنف اور مترجم دونوں کی حساب دانی بھی قابلِ داد ہے ۹ ضخیم جلدوں کا ذکر ہے پانچ خواجہ امان کی ترجمہ کردہ بتائی ہیں اور دو چھوٹے آغا کی گویا مصنف اور مترجم دونوں کے نزدیک پانچ اور دو مل کر ۹ ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس کتاب کی بنیاد اتنی غلط اطلاعات پر مبنی ہو اس کتاب کی رائے کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے اور جو مصنف اتنی غلط اطلاعات سے کام لے اس سے ہم یہ توقع کیوں کر رکھ سکتے ہیں کہ اس نے کتاب کو پڑھ کر اس پر صحیح رائے قائم کی ہوگی پھر بھی اس کی رائے پر کچھ نہ کہنا غلط سا ہے، دیکھئے

رائے - ان کتابوں میں بڑا عیب یہ ہے کہ جذبات نگاری اور کیریکٹر نویسی ان میں مفقود ہے۔ کوئی معین پلاٹ نہیں ہے۔ چند مشہور لوگوں کے بعید از قیاس افسانے ہیں جن میں جنات اور دیوزادوں سے لڑائی اور ساحروں سے مقابلے کا ذکر ہے۔ کبھی کبھی وہ سحر و طلسم میں بھی پھنس جاتے ہیں مگر آخر میں کامیاب نکلتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلاتے ہیں۔ قصے کے تمام واقعات میں ایسی یکسانی ہے کہ جی اکتا جاتا ہے کوئی تنوع اور جدت نہیں اور روزانہ واقعاتِ زندگی کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔

(صفحہ ۱۰۱) حصہ نثر

اگر یہ رائے کسی عام آدمی کی ہوتی تو پڑھنے والا اپنا سر پیٹ کے خاموش ہو جاتا کیوں کہ 'قہرِ درویش بجانِ درویش' مگر مشکل تو یہ ہے کہ جس کتاب کی یہ رائے ہے وہ اور اس کا ترجمہ دونوں ادب کے طلباء کو کورس میں پڑھائے جاتے ہیں اور اس طرح اپنے ادبی ذخیرے کے اس حصہ کے متعلق ہماری آیندہ نسلوں کی رائے غلط بنیادوں پر قائم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے۔

'داستانِ حمزہ' ہو یا 'بوستانِ خیال' حقیقت یہ ہے کہ داستانِ حمزہ میں زیادہ اور بوستانِ خیال میں نسبتاً کم پوری داستان ہی جذبات کے سہاروں پر آگے بڑھتی ہے۔ ہاں جذبات نویسی اور کردار نگاری کا اگر یہ مقصد نہیں کہ جیسے حالات ہوں ان کے موافق اعلیٰ جذبات اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری داستانوں میں جذبات نگاری اور کردار نویسی نہیں ہے۔ قدم قدم پر ہماری داستانوں میں واقعات کا سہارا اور جذبات کی پناہ لی جاتی ہے اور اس کے بغیر ان داستانوں کا اس قدر طویل ہو جانا ممکن بھی کسی طرح ہوتا۔ داستانوں میں یہی ہونا چاہیئے تھا

اور یہی ہوا ہے کہ کسی خاص واقعہ سے خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں جو کردار کو چند اقدامات پر مجبور کرتے ہیں۔ ان اقدامات سے اور دوسرے واقعات پیدا ہوتے ہیں اور پیدا شدہ واقعات سے دوسرے جذبات۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ تقریباً ساٹھ ہزار صفحات کے دو سلسلوں میں واقعات، جذبات اور کردار نہ ہوں گے تو کیا جان متی کے پٹارے ہوں گے اور واقعات اور جذبات کے بغیر یہ لامتناہی سلسلہ کس طرح قائم رہ سکے گا یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ کسی معین پلاٹ سے رائے دہندہ کا مقصد کیا ہے، بغیر کسی معین پلاٹ کے افسانوی ادب میں چار صفحے لکھنا تو مشکل ہے اتنے صفحے کسی معین پلاٹ کے بغیر کون لکھ سکتا ہے۔ مجذوب کی بڑ بھی تو اتنی لمبی نہیں ہو سکتی۔ رہی دیو، جنات اور ساحروں سے لڑائی تو ہم نے اپنے قدیم افسانوی ادب سے یہ حصہ نکال دیا تو باقی کیا رہ جائے گا۔ شہزادہ آرام دل، شہزادہ جان عالم، تاج الملوک اور حاتم وغیرہ کا نام۔ نہ ملکہ ماہ نوش شکرلب دختر شام احمر جادو کے عشق کی مہمات ہوں گی نہ گل بکاولی کو حاصل کرنے کے لئے باغ بکاولی میں حمالہ دیونی کی مدد سے جانا ہوگا نہ انجمن آرا وغیرہ کو ساحروں سے چھڑانا اور ہمارا تمام افسانوی ادب قصۂ یوسف کے اس خلاصہ کی طرح دو سطری ہو کر رہ جائے گا کہ "پیرے بود، پسرے داشت، گم کرد باز یافت"۔ آخر قصۂ یوسف میں اور ہے بھی کیا۔ یہی کہ ایک بوڑھے کا ایک بیٹا تھا جو گم ہو کر پھر مل گیا۔ اسی طرح حمزہ صاحبقران مکہ میں پیدا ہوئے۔ مہرنگار کے جوشِ عشق میں دنیا فتح کی اور مر گئے۔ اگر ادب سے ایڈونچرس (مہمات) کا خاتمہ کر دیا جائے تو دنیا کے افسانوی ادب کی یہی سادہ سی صورت رہ جائے گی اور یہ اس کو پھانسی دے دینے کے مرادف ہوگا۔ دنیا کا مختصر ترین افسانہ کچھ اس طرح ہے:

دو مسافر ریل کے ایک ہی ڈبہ میں سفر کر رہے تھے۔ ایک نے کہا میں بھوتوں کا قائل نہیں۔ دوسرے نے جواب دیا "اچھا" اور غائب ہو گیا۔

اس مختصر ترین افسانے میں بھی واقعات کی بھرمار ہے۔ پچاس ہزار صفحوں میں کیا نہ ہونا چاہیئے اور کیا نہ ہوگا جبکہ خود صاحب کتاب کے دو تین سو صفحات میں۔ اردو کی ابتداء سے موجودہ دور تک کے حالات ہیں اب رہا یہ امر کہ قصہ کی یکسانیت اُکتا دینے والی ہے یعنی تنوع اور جدت نہیں یہ دعویٰ بھی افسوس ناک بے خبری کی دلیل ہے مثلاً طلسم ہوشربا میں ایک ساحرہ ہے ملکہ بہار جادو جو ہمیشہ بہار کا سحر کرتی ہے لیکن معتوّر جادو سے اس کی لڑائی جس، فتح پر واقع ہوتی ہے (دوسری جلد) وہی، فتح۔ ملکہ بہار زنگین سے مقابلہ پڑنے پر نہیں رہتا (ساتویں جلد) یہ سب تنوع اور جدت نہیں تو مجھے حیرت ہے کہ تنوع اور جدت کا مفہوم کیا ہے۔ درحقیقت دنیا کی ہر چیز کی طرح تنوع اور جدت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کلی اور ضمنی۔ تنوع کلی اور جدتِ کلی تو ایک کردار میں جمع ہی نہیں ہو سکتیں نہ ان کا کسی ایک فن کار کے فن میں امکان ہے۔ البتہ تنوع ضمنی کسی ایک فن کار کے فن میں نمایاں ہو سکتا ہے اور اس کی مثال ملکہ بہار جادو کے سحر سے ہی نمایاں ہے کہ سحر تو بہار کا ہے مگر نوعیت ہر موقع پر جداگانہ۔ نتائج کے لحاظ سے تو ہر کردار کا ہر فعل اس کے تخلیق کرنے والے کے مقصد سے مربوط ہونا ہی چاہیئے مثلاً داستان کی ہر رزم اور ہر بزم کا نتیجہ صرف ایک ہی ہوگا یعنی خیر کی فتح اور شر کی شکست لیکن اس کی ہر رزم اور ہر بزم اپنی فضا کے لحاظ سے جداگانہ نوعیت رکھتی ہوگی بس اتنے ہی تنوع اور اتنی ہی جدت کی ہم ایک داستان میں توقع کر سکتے ہیں اور یہ تنوع اور یہ جدت ہم داستان حمزہ اور بوستانِ خیال میں پاتے ہیں۔ رہے روزانہ واقعاتِ زندگی تو معلوم نہیں کہ روزانہ واقعاتِ زندگی کے تحت صاحب کتاب کیا چاہتے ہیں اگر انھوں نے ہر انسان کے لئے روزانہ واقعاتِ زندگی کا کوئی خاص پروگرام بنا لیا ہے، مثلاً صبح چھ بجے بستر سے اُٹھنا، سات بجے ناشتہ کرنا، نو بجے تک گھر کا انتظام، ساڑھے دس بجے تک دفتر پہنچ جانا۔ سوا بجے لنچ۔ چار بجے دفتر سے واپسی کے بعد چائے۔ شام کے سات بجے تک تفریح۔ نو بجے رات کا کھانا اور دس بجے بستر پر چلے جانا — تو ہمیں افسوس ہے کہ ان روزانہ واقعات کا یہ معین پروگرام نہ انھیں کسی داستان میں ملے گا نہ افسانوی ادب کے کسی دوسرے مجموعہ میں۔ لیکن اگر روزانہ واقعاتِ زندگی کا یہ مقصد نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عوامی زندگی کے متوقع واقعات، تو ظاہر ہے کہ داستان ان ہی متوقع واقعات کو حسب مرضی بنانے کی کوشش میں کامیابی حاصل کرنے اور موانع کو دور کرنے کے واقعات کا نام ہے۔ اگر اس کا مقصد داستان میں پیش کردہ کرداروں کے واقعاتِ زندگی سے ہے تو وہ موجود ہیں۔ جس جس طبقہ کے کردار داستانوں

میں پیش کئے گئے ہیں ان تمام طبقوں کے عمومی واقعاتِ زندگی کا تذکرہ ان داستانوں میں ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک عمومی زندگی کے روزانہ واقعات سے داستانوں میں بحث کی گئی ہے۔ "تاجروں کا صحراؤں میں خیمہ انداز ہونا، ڈاکوؤں کا ڈاکہ مارنا، فوجوں کی منزلوں اور شب گزاری کے اذکار، مسجدوں اور مندروں میں عبادتوں کے مناظر، درباروں کے مرقعے، بازاروں کی تصویر کشی، سقوں، دھوبیوں، حلوائیوں، بنیوں، جوہریوں اور سوسائٹی کے دیگر طبقات کی عام زندگی کے مناظر۔ کیا ہے جو داستانوں میں نہیں۔ مگر چشمِ جستجو اور دیدۂ شوق کا ہونا شرط ہے ان چیزوں کی تلاش کے لئے۔ آنکھ بند کر کے لکھ دینے سے کچھ نہیں ملتا۔

داستان تاریخ اردو میں داستان حمزہ کا تو ذکر ہی نہیں بوستانِ خیال کے ترجمہ خواجہ امان کا ذکر ہے وہ بھی مختصر اور تشنہ۔ تاریخ نثر اردو میں یہ بھی نہیں جھلکتی ہے کہ ہمارے سنجیدہ نگاروں کی رائے میں داستانیں اصنافِ ادب میں شامل ہونے کے قابل ہی نہ ہو —— سید وقار عظیم کی کتاب "ہماری داستانیں" سید صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے 'باغ و بہار' وغیرہ پر مختلف رسائل میں لکھے۔ بوستان خیال اور داستان حمزہ پر اس کتاب سے کوئی روشنی حاصل نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر کلیم الدین احمد کی کتاب "فنِ داستان گوئی" کا بھی کچھ مختلف حال نہیں "مجلّہ معاصر" میں ان کے جو مضامین داستان گوئی پر بالاقساط شائع ہوئے یہ کتاب ان کا مجموعہ ہے اس میں داستان گوئی کی تاریخی حیثیت سے بحث نہیں کی گئی ہے بلکہ ادب کو داستانوں سے روشناس کرانے کے لئے یہ مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین سے اردو کی داستانوں کا صحیح مقام واضح ہوتا ہے۔ اس کتاب میں صرف بوستانِ خیال اور طلسم ہوشربا کا ذکر ہے یہ ذکر تاریخی حیثیت نہیں رکھتا جذباتی حیثیت رکھتا ہے۔ داستان پر جس قدر معنوی اعتراض ہو سکتے ہیں یہ کتاب ان کے ڈیفنس اور رد میں اچھی اور کامیاب حیثیت رکھتی ہے اور بس۔

ڈاکٹر گیان چند کی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" ان سب میں بلند اور محققانہ درجہ رکھنے والی کتاب ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ڈاکٹر صاحب کے اس مقالہ پر مشتمل ہے جو موصوف نے پی، ایچ، ڈی کے لئے لکھا۔

ڈاکٹر گیان چند کی کتاب سے محنت و کاوش، دماغی صلاحیت، ذہنی رفعت، موضوع سے دلچسپی اور موضوع کے تحت کام کی باتیں جمع کرنے کا ذوق سب کچھ ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصاً کتاب کا وہ حصہ جس میں انھوں نے الف لیلہ اور پنچ تنتر وغیرہ کی ہر کہانی کے متعلق تحقیق و جستجو کر کے ہمیں بتایا ہے کہ اس کہانی کی اصل کیا ہے۔ اس کا بنیادی خیال کہاں سے چلا ہے اور کس دوسری کہانی سے اس میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اردو میں یہ کام ڈاکٹر گیان چند سے قبل کہیں نظر نہیں آتا اور نہ اس کی افادیت سے انکار ہی کیا جا سکتا ہے۔ غور کیجئے یہ کام کس قدر ہمت طلب ہے کہ ایک ایک کہانی کے متعلق دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں کی موٹی موٹی فہرستوں سے مواد تلاش کر کے کسی ایک زبان کے لئے جمع کیا جائے اور وہ بھی اردو جیسی نوخیز زبان کے لئے۔ درحقیقت ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا یہ تحقیقی حصہ ہی اس قابل تھا کہ اردو میں ایسا مواد جمع کر دینے پر ہی ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دی جاتی اور باقی کام کسی دوسرے دماغ سے لیا جاتا۔ یہاں نفسیاتی طور پر یہ نکتہ غور کرنے کے قابل ہے کہ جب کوئی شخص کوئی ایسا کام واضح اور روشن طور پر تکمیل کو پہنچا دیتا ہے تو باقی کام سے اُسے ذہنی طور پر وہ دلچسپی قائم نہیں رہتی۔ ڈاکٹر گیان چند بھی اپنی کتاب میں یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دینے کے بعد تکان زدہ سے نظر آنے لگے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بوستانِ خیال اور داستانِ حمزہ کے ساتھ انصاف کرنے میں جادۂ اعتدال سے کچھ نہ کچھ ہٹ ہی گئے ہیں۔ کوشش کروں گا کہ بوستانِ خیال اور داستانِ حمزہ کو ڈاکٹر صاحب سے جو انصاف نہ مل سکا وہ انھیں مل جائے۔

بوستانِ خیال

مشہور ہے کہ "جو بوئے گا وہ کاٹے گا" یہ مثال بوستانِ خیال کے مصنف میر تقی خیال پر اس بڑی طرح صادق آتی ہے کہ عبرت ہوتی ہے۔ خیال نے مصر کے بادشاہوں کے تاریخی کارناموں کی آڑ لے کر چار ہزار سے زیادہ صفحات میں جھوٹ کے پلندے باندھے۔ اس نیک کام کو ابھی ایک ہی صدی[1] گذری تھی کہ خواجہ امان دہلوی نے خود خیال پر حاشیہ آرائی کر دی

---

[1] بوستانِ خیال کی تصنیف ۱۱۵۵ھ/۱۱۷ھ کی بات ہے اور خواجہ امان کا ترجمہ ۱۲۷۵ھ/۱۲۹۵ھ میں ہوا ہے۔

اور "حدائق الانظار" کے دیباچہ میں صفحہ ۳ پر لکھ دیا۔ "قضائے کار ایک زن مطربہ میر تقی کے ہمراہ احمد آباد سے آئی تھی۔" اس کے یہ غیر مبہم معنے یہ ہوئے کہ "میر تقی خیال جب احمد آباد گجرات سے دہلی آئے تو اپنے ساتھ ایک رنڈی کو لائے تھے۔" اس دیباچہ کو ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب میں صفحہ $\frac{۱۹۵}{۱۹۶}$ پر نقل کر دیا اور خیال پر احمد آباد سے ایک رنڈی بھگا لانے کا الزام اور موثق ہو گیا۔

خدا جانے خواجہ امان نے یہ بے پر کی کہاں سے اڑا دی۔ ورنہ انھوں نے جس کتاب کا اردو ترجمہ کیا ہے اس پر خود خیال کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے۔ وہ اسے ہی غور کی نظر سے دیکھتے تو انھیں اتنی جرأت نہ ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ خیال نے احمد آباد میں اپنے ایک عشق کا حال خود لکھا ہے مگر وہ اپنی محبوبہ کے متعلق لکھتے ہیں:

" سرو قامت او در گلشن اہل قرابت ایں بے بضاعت

پرورش یافتہ بود۔" (صفحہ ۷)

اگر "پرورش یافتہ بود" کے انتہائی معنے لئے جائیں اور اُسے کسی رشتہ دار کی اولاد نہ سمجھا جائے تو بھی وہ خیال کے خاندان کے کسی فرد کی "لے پالک" ٹھہرتی ہے۔ لے پالک سے وہ زن مطربہ کس طرح ہو گئی؟ اسے خواجہ امان ہی جانتے ہوں گے جو آج جواب دہی کے لئے موجود نہیں۔ اب رہا یہ امر کہ وہ احمد آباد سے خیال کے ساتھ دہلی آئی یا نہیں اسے بھی خیال نے اپنے دیباچہ کے صفحہ ۷ پر ہی صاف کر دیا ہے —

" ہنوز سالے برآں نگذشتہ بود کہ روزگار ناساز گار

بمقتضائے طبیعت و جبلت خود سنگ تفرقہ درمیان من و او

انداخت۔"

اب اس کے احمد آباد سے خیال کے ساتھ دہلی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بیل ایک سال بھی منڈھے نہیں چڑھی کہ "نخلِ آرزو" کی جڑ کٹ گئی اور جیسا کہ خیال نے خود لکھا ہے وہ محبوبہ کی جدائی کے صدمے اور پریشاں روزگاری سے دل تنگ ہو کر احمد آباد سے دہلی چلے آئے۔

ڈاکٹر گیان چند نے یہ بات بھی خدا جانے کہاں سے لکھ دی ہے کہ

" نواب نے خلعت دے کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا بادشاہ نے تکمیل کی فرمائش کی اور انھیں کتاب خانہ کی خدمت دے دی گئی۔"

کیونکہ خیال نے دہلی میں اپنی ابتدائی ملازمت کے متعلق تو یہ لکھا ہے کہ "در بندگانِ توپ خانہ بسعیت خود راضی شدہ۔" (دیباچہ صفحہ ۸) اور کتاب کے پیش ہونے کے بعد لکھا ہے کہ تکمیل کے حکم کے بعد میری خدمات نواب رشید خاں سے متعلق کر دی گئیں۔ بوستانِ خیال کے متعلق اس کتاب میں ایک بات اور بھی محلِ نظر ہے اور یہ نواب رشید خاں کی شخصیت ہے صفحہ $\frac{۱۹۶}{۱۹۷}$

" خیال بنگال میں سراج الدولہ کے پاس چلے گئے اور انھوں نے جعفر خاں ناظم بنگال کے لڑکوں کی درخواست پر بوستانِ خیال کی تکمیل کی۔ وہ جعفر خاں کے تین لڑکوں کا ذکر کرتے ہیں یعنی نواب رشید الدین سالار جنگ عرف مرزا محمد علی رفیع اللہ نواب نجم الدولہ اسحاق خان اور مرزا علی خاں بہادر۔ رشید خان خیال کے سرپرست تھے اور اسی وجہ سے بوستانِ خیال کو بعض اوقات فرمائشِ رشیدی بھی کہتے ہیں۔"

اب خیال کے مقدمہ کی اصل عبارت دیکھئے:

" ہنوز تا بمرتبہ[1] نرسیدہ بود کہ بسعادت روزگار و مساعدت طالع ساز گار را حقیر را بخدمت فیض درجت نیز آسمان عزت و شوکت ...[2] ... خلعت الصدق نواب موتمن الدولہ مرحوم نواب رشید خاں بہادر المسمی بہ مرزا محمد علی رفیع[3] الشان قدرہ اجلی اتفاق ملازمت روے داد ...

... دکلمہ فرمائش رشیدی کہ در عدد ہزار و صد و پنجاہ و پنج است با تاریخ شروع ایں کتاب ..... مطابق شد"

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بوستانِ خیال کا تاریخی نام ہی نواب رشید خان کے نام کی مطابقت سے "فرمائشِ رشیدی" رکھا گیا اور اس لفظ کے اعداد ۱۱۵۵ ہوتے ہیں۔ اسی سال کتاب شروع بھی ہوئی۔

---

[1] یعنی ابھی بوستانِ خیال ایک چوتھائی بھی نہیں لکھی گئی تھی کہ . . . .

[2] . . . . نقطے اس کی علامت ہیں کہ اقتباس سے غیر ضروری جملے اور الفاظ چھوڑ دئے گئے۔ یہ طریقہ میں اپنے ہر مقالے میں بخوفِ طوالت اختیار کرتا ہوں

[3] صحیح لفظ رفیع ہے۔ کاتب نے غلطی سے ایک شوشہ زیادہ کر کے دفیع لکھ دیا ہے

بوستانِ خیال کو محض "بعض اوقات" فرمائش رشیدی نہیں کہا جاتا بلکہ وہ اس کا تاریخی نام ہے اور یہ نام نواب رشید خاں خلف نواب موتمن الدولہ دہلوی کے نام کی وجہ سے ہے۔ نواب رشید خاں خلف جعفر خاں ثانی بنگال سے اسے کوئی واسطہ نہیں اور کتاب میں نواب رشید خاں مسمی بہ مرزا محمد علی کو مرزا محمد علی رفیع اللہ میں بھی عربی کے دعائیہ فقرے "رَافعَ اللہ شانَہٗ قَدرَہٗ الجَلی" کو دعائیہ فقرہ نہ سمجھ کر رفیع اللہ کو نام کا جزو سمجھ لیا گیا ہے۔

خیال نے بارھویں جلد سے پندرھویں جلد تک بوستانِ خیال کو مرشد آباد میں مرتب کیا یہ صحیح ہے لیکن وہ مرشد آباد کس طرح پہنچے اس پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے جس کا اٹھنا آج ناممکن ہے — امرائے دہلی کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موتمن الدولہ نواب اسحاق خاں دہلوی، صوبہ دار گجرات کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے مرزا محمد خاں نجم الدولہ منجھلے افتخار الدولہ مرزا علی خان اور سنجھلے یعنی سب سے چھوٹے مرزا محمد علی خاں ان ہی کا لقب یا چھوٹا نام نواب رشید خاں تھا۔ یہ خاندان مالک اشتر تک پہنچتا ہے اُن ہی اسحاق خان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام امۃ الزہرا بیگم تھا جسے اودھ کی تاریخ نواب بہو بیگم کے نام سے جانتی ہے۔ محمد شاہ، بادشاہِ دہلی کے حکم سے اس لڑکی کی شادی شجاع الدولہ (نواب وزیر صوبہ دار اودھ) سے ہوئی تھی۔ اور بنگال کی تاریخ بتاتی ہے کہ علی وردی خاں (سراج الدولہ کا دادا) شجاع الدولہ کا ساختہ پرداختہ تھا اور انہی شجاع الدولہ نے اسے بنگال کی صوبہ داری پر اپنی نیابت میں بھیجا تھا کیوں کہ بنگال کی صوبہ داری دہلی سے شجاع الدولہ کے پائے نام ہوئی تھی۔ علی وردی کے بعد سراج الدولہ والیٔ بنگال ہوا۔ بہو بیگم نواب رشید خان کی حقیقی بہن تھیں۔ ممکن ہے کہ خیال کی ملاقات علی وردی خاں سے اُن کی شوکت کی ابتدا میں شجاع الدولہ اور نواب رشید خاں کے رشتہ کی وجہ سے ہو گئی ہو اور وہ دہلی میں اپنے سرپرستوں کے بساطِ سیاست سے محو ہو جانے پر دربار مرشد آباد کے عروج سے متاثر ہو کر ادھر کھنچ گئے ہوں کیوں کہ ——— جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو۔ یہ عالم تو اس زمانہ کے ہر فن کار کا رہا ہے۔

داستانِ حمزہ

داستانِ حمزہ اور طلسم ہوشربا کے متعلق مجھے اس کتاب کے حسب ذیل فقروں میں کھٹک سی محسوس ہوتی ہے۔

(۱) یہ آٹھوں دفتر اٹھارویں صدی کے نصف سے پہلے ہی مرتب ہو چکے تھے کیوں کہ میر تقی خیال نے ۵۶-۱۷۴۲ء میں بوستانِ خیال لکھی۔ اس میں کئی جگہ ہوشربا کے قصہ کے فوق الفطرت واقعات پر اعتراض کیا ہے (۱۹۲)

(۲) کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ اور ہوشربا غالباً ایک ہی آدمی کی تصنیف ہیں (۱۹۴)

(۳) ہم فی الحال داستان کے اس حصہ کو لیتے ہیں جو فارسی سے ترجمہ ہوا ہے۔ اس میں ایک ڈھیلا سا ربط قائم ہے۔ اس سلسلہ میں نوشیرواں نامہ، ہرمز نامہ، کوچک باختر، بالا باختر، ایرج نامہ، طلسم ہوشربا، صندلی نامہ، تورج نامہ اور لعل نامہ ہیں (۲۵۹)

(۴) ہم اس باب میں ابتدائی دس جلدوں کی داستان پر بحث کرتے ہیں کیونکہ یہ اصل فارسی دفتروں پر مبنی ہے (۲۶۰)

(۵) اس طرح نوشیرواں نامہ سے لعل نامہ تک ایک مسلسل داستان ہے جس میں (۲۵) جلدیں ہیں (۲۶۰)

(۶) آخری جلد میں حمزہ ثانی بدیع الملک کو صاحبقرانِ ثالث مقرر کرتے ہیں اور ہماری خوش قسمتی سے ان کے سوانح حیات کا بیان نہیں کیا گیا (۲۶۳)

(۷) گو تصدق حسین نے آفتابِ شجاعت میں ان کا بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مصنف اوّل کی طرف سے نہیں اس لئے ہم اس کو اہمیت نہیں دیتے

(۸) ہرمز نامہ فارسی سے ترجمہ ہے (۱۸۳)

(۹) قمر نے ہوشربا کی ساتویں جلد تک ترجمہ کیا تھا۔ ہومان نامہ بیچ میں ایک حشو ہے۔

(۱۰) فارسی میں طلسم ہوشربا کے بعد صندلی نامہ وغیرہ ہیں (۴۱۸)

(۱۱) طلسم ہوشربا کی فارسی اصل اردو کے نصف سے کم ہوگی (۴۱۹)

ان فقروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبِ کتاب لعل نامہ تک فارسی سے ترجمہ سمجھتے ہیں جس میں طلسم ہوشربا بھی شامل ہے اور یہی وہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو داستانِ حمزہ کے متعلق پھیلائی گئی ہے۔ فارسی میں سوائے

رموزِ حمزہ کے کوئی قلمی کتاب کہیں نہیں ملتی۔ داستان حمزہ کی اصل رموزِ حمزہ ہے اور اس کی یہ صورت ہے کہ اس میں صرف تین دفتروں کا نام ملتا ہے۔ نوشیرواں نامہ، ایرج نامہ اور صندلی نامہ۔ اور صندلی نامہ کے بعد ۲۵ ورق حمزہ ثانی اور بدیع الملک کے حال میں جن میں لعل نامہ اور نہ تورج نامہ کے طلسموں کا کہیں ذکر نہیں۔ رموزِ حمزہ میں نہ طلسم ہوشربا کا ذکر ہے نہ طلسم چہرخِ گرداں کا۔

حقیقت یہ ہے کہ "رموز حمزہ" کے ہندوستان پہنچنے کے بعد یہ تمام طویل داستانیں اپنے اپنے عہد میں مشہور داستان گویوں نے بڑھا کر اصل داستان میں شامل کی ہیں یہاں تک کہ منشی نولکشور کے عہد میں داستانِ حمزہ اُسی صورت میں بیان کی جاتی تھی جس صورت میں اردو میں لکھی گئی۔ نول کشور پریس میں بھی کوئی فارسی مسودہ موجود نہیں تھا۔ صاحب کتاب اگر نولکشور پریس کے فارسی مسودات کے متعلق تحقیق کرتے تو انہیں بھی وہی جواب ملتا جو راجہ رام کمار بک ڈپو کے مشیرِ ادب جناب امیر حسین صاحب نورانی کی جانب سے ۲۳ - اپریل ۵۹ء کو مجھے ملا جس میں وہ صاف صاف کہتے ہیں۔

"اصل فارسی داستانوں میں کسی طرح کوئی سراغ نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک بنیادی کتب ضرور تھیں۔ لیکن یہ داستانیں خود مطبع کے ملازم داستان گو روزمرہ سناتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کی کوئی اصل بھی محفوظ نہیں ہے (یعنی کاتبوں کی لکھی ہوئی اصل) ایک جیو تزہ یہ جواب تک بنا ہوا ہے یہ لوگ بیٹھتے تھے سامنے کاتب بیٹھے تھے وہ سنتے اور لکھتے جاتے تھے اس سے زیادہ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔"

ظاہر ہے کہ بنیادی کتب سے "رموزِ حمزہ" اور وہ فارسی نسخے مطلب ہو سکتے ہیں جو شاہانِ اودھ نے تیار کرائے تھے اور جن کی تعداد (دو) تھی۔ باقی سب داستان گویوں کا پروپیگنڈہ ہے اپنے کام کو فارسی کا ترجمہ کہہ کر اس کو دقیع تر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جب دنیا کی کسی لائبریری میں ہی اتنی تفصیل موجود نہیں تو کیا نول کشور پریس پر ان فارسی اصلوں کی آسمان سے بارش ہوئی۔ افسوس ہے کہ طلسم ہوشربا کو بھی ڈاکٹر صاحب نے غور سے نہیں دیکھا ورنہ انہیں خود قمر لکھنوی کا یہ اعتراف مل جاتا کہ طلسم ہوشربا کے اصل مصنف میر احمد علی داستان گو ہیں اور وہ خالص اردو کی "چیز" ہے۔ وہ رام پور کے کتاب خانہ میں میر احمد علی کی طلسم ہوشربا بھی دیکھ سکتے تھے جسے منشی غلام رضا نے مرتب کیا ہے۔ شیخ تصدق حسین کے لکھے ہوئے دفتر آفتاب شجاعت پر رائے نہ دینا بھی صحیح نہیں کیوں کہ اردو کی تمام داستانیں لکھنے والے کے سامنے تو اردو کا ہر وہ کام ہونا چاہئے جو اس زبان میں موجود ہے۔ اسے محض فارسی ترجمے سے غرض رکھنے سے کیا مطلب۔ ہوشربا کو اٹھارھویں صدی کی تصنیف ثابت کرنے کے سلسلہ میں بوستانِ خیال سے جو دلیل دی گئی ہے (اقتباس ۱) وہ بھی صحیح نہیں اصل فارسی مخطوطے میں جہاں جہاں میر تقی خیال نے داستان حمزہ کے جادو پر اعتراض کیا ہے وہاں ہوشربا اور اس کے جادوگروں کا نام نہیں۔ یہ مترجم کی طرف سے ایزادی ہے اور اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ طلسم ہوشربا ۱۸۵۵ء کے بعد کی یعنی فارسی بوستان خیال سے بعد کی تصنیف ہے ورنہ خیال اس کے جادوگروں کا حوالہ ضرور دیتے۔

ضروری گذارش

۱۔ مضمون کاغذ کے ایک طرف اور خوش خط لکھیے
۲۔ غیر مطبوعہ مضامین اسی صورت میں واپس کیے جائیں گے جبکہ ان کے ساتھ مناسب سائز کا لفافہ اور ڈاک کے ٹکٹ ہوں گے۔

سلامت اللہ

مولانا محمد اسماعیل - بچّوں کے ادیب کی حیثیت سے

میری طرح غالباً بہت سے لوگ ہوں گے جو شاعری کی دنیا میں سب سے پہلے مولانا محمد اسماعیل میرٹھی سے متعارف ہوئے ہیں۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جب میں نے شاید تیسری جماعت میں مولانا کی نظم "کچھوا" اور "خرگوش" پڑھی تھی تو مجھے اس میں کیسا مزا آیا تھا۔ اس وقت مجھ میں اتنی سمجھ بوجھ تو تھی نہیں کہ شعر کی اچھائی اور بُرائی میں تمیز کر سکتا۔ لیکن اس نظم میں کچھ ایسی دل کشی تھی کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ اتنی بار دہرایا کہ پوری نظم ازبر ہو گئی۔ اور یہ صرف میری ہی کیفیت نہیں تھی بلکہ میرے سبھی ہم جماعت خوش ہو ہو کر نظم کو پڑھا کرتے۔ کبھی کبھی ہم اپنی اُپج سے کچھوے اور خرگوش کے مکالمے اس طرح ادا کرتے کہ ایک کچھوا ہے اور دوسرا خرگوش۔ اسی طرح مولانا کی بعض دوسری نظمیں ہمارے لئے بے حد دل چسپ تھیں۔ ہم انھیں جتنا زیادہ پڑھتے اتنا ہی مزا آتا۔

آخر اس کا راز کیا ہے کہ مولانا کی نظمیں ہی نہیں بلکہ ان کے نثری مضامین اور قصے بھی بچّوں کو عموماً پسند آتے ہیں۔ بچّوں کی کئی نسلیں اب تک مولانا کی ادبی تخلیقات سے لطف اندوز ہو چکی ہیں۔ آج بھی اردو کی کسی ریڈر کی ورق گردانی کیجئے، اس میں مولانا کی متعدد چیزیں ملیں گی، جنھیں بچّے خوشی سے پڑھتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں سرسری بحث کی جائے گی کہ مولانا کی تحریریں بچّوں کے لئے اتنی جاذب کیوں ہیں۔

اس کے لئے ہمیں مولانا کے تخلیقی سرمایے کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ امر مسلّم ہے کہ کسی فن کار کے کارنامے کی صحیح جانچ اور پرکھ صرف اسی حالت میں ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم اس کی شخصیت کو سمجھیں کیونکہ فن دراصل فن کار کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، فن کار اپنی تخلیق میں اپنا ہی رنگ روپ بھرتا ہے۔

مولانا محمد اسماعیل انیسویں صدی کی اُس تعلیمی اور تہذیبی تحریک سے بہت متاثر ہوئے، جس کے علم بردار سر سیّد احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حاؔلی اور ان کے دیگر رفقاءِ کار تھے۔ یہ تحریک ان تاریخی حالات کی پیداوار تھی جو ملک میں بیرونی حکومت کے اقتدار کے استحکام سے رونما ہوئے تھے۔ ہندوستانیوں کی سیاسی محکومی کا نتیجہ اقتصادی بدحالی اور تہذیبی پستی کی شکل میں ظاہر ہو رہا تھا اور لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔ یکایک ۱۸۵۷ء میں ملک کے اندر کئی علاقوں میں بہ یک وقت ہلچل پیدا ہوئی جسے غدر کا نام دیا گیا۔ لیکن دراصل یہ ہلچل ایک عام بے چینی اور غصّے کا مظہر تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ ملک کو بیرونی استبداد سے نجات دلانے کی ایک کوشش تھی مگر اس میں ملک کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد حکومت نے اور زیادہ تشدّد آمیز پالیسی اختیار کی۔ یوں تو اس کی چوٹ عموماً سبھی ہندستانیوں پر پڑی لیکن خصوصاً مسلمان بوجوہ اس کا نشانہ بنائے گئے۔ قوم کی اس بے بسی کے عالم میں جہاں ایک طرف سیاسی آزادی کی ایک منظّم تحریک شروع ہوئی، وہاں دوسری طرف سماجی اصلاح کی کئی ایک تحریکیں وجود میں آئیں۔ بعض دُور رس نگاہوں نے دیکھا کہ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اُسے تعلیمی اور تہذیبی لحاظ سے اُٹھایا جائے۔ چناں چہ اس دور میں تعلیم اور تہذیب کے میدان میں مختلف قسم کے اقدامات کئے گئے۔ ان اقدامات کا

بنیادی اصول یہ تھا کہ مشرق کی ان فرسودہ روایات کو ترک کیا جائے جو قومی ترقی کی راہ میں عرصے سے رکاوٹ بنی ہوئی ہیں اور مغرب کی نئی تہذیب کے ان صحت مند عناصر کو اپنایا جائے جن کی بدولت قوم اس دنیا میں خوش حالی اور سرخروئی حاصل کر سکے۔ مگر اس ردّ و قبول کے عمل میں اس بات کا بہر کیف خیال رکھا جائے کہ مشرقی تہذیب کے محاسن نہ صرف اپنی جگہ قائم رہیں بلکہ پروان چڑھیں۔ گویا قدیم اور جدید میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کی جائے کہ قدیم کے خدوخال جدید کی روشنی میں اُجاگر ہوں اور ایک ایسی تہذیب کی تشکیل ہو جس میں مشرق کی روحانی بصیرت کے ساتھ ساتھ مغرب کی سائنسی نظر کا عمل دخل ہو اور جو روحانی اقدار اور مادی امکانات دونوں کی بیک وقت حامل ہو۔ غرض، ایک ایسی تہذیب کا نشوونما مقصود تھا جس کی جڑیں تو اپنے ماضی کی حیات بخش سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ پیوست ہوں مگر اس کے پھول اور پھل حال کی تازہ ہوا اور روشنی سے خوش رنگی اور توانائی حاصل کر سکیں۔ سر سیّد اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور تہذیب کے میدان میں جس تحریک کی داغ بیل ڈالی، ان میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

مولانا اسماعیل اس تحریک میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ مولانا نے اپنے لئے تعلیم اور ادب کا میدان منتخب کیا اور اپنی زندگی کا بہترین حصہ ان کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ مولانا کی شخصیت پر نظر ڈالئے تو وہ خود اس نئی تحریک کے ایک سچّے خادم ہیں۔ ان کی ذات میں جذبۂ روحانی اور سائنسی فکر کا ایک حسین سنگم نظر آتا ہے۔ مولانا نے بچپن میں گھر ہی پر تعلیم حاصل کی۔ گھر کی تربیت میں حسبِ دستور مذہبی رنگ غالب تھا۔ پھر اُنھیں حضرت مولانا سیّد غوث علی شاہ جیسے بلند پایہ بزرگ سے دولتِ باطنی نصیب ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا اسماعیل وسیع القلبی کی اس راہ پر گامزن ہو گئے جس کی منزل پر پہنچ کر ہر ایک مخلوق میں خالق کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے اور جہاں اپنے اور پرائے کی، چھوٹے اور بڑے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں یہی انسان دوستی کی منزل ہے۔ اس طرح ایک طرف مولانا کی شخصیت اخلاقی اقدار سے مالا مال ہوئی تو دوسری طرف انھوں نے انگریزی تعلیم سے انسانی زندگی اور کائنات کو دیکھنے کا سائنسی نقطۂ نظر سیکھا۔ اس کی بدولت ان میں مشاہدے اور تجربے کا سلیقہ پیدا ہوا کہ یہی چیزوں کی حقیقت کو پرکھنے اور جانچنے کی سچّی کسوٹی ہے۔ مولانا کو انگریزی ادب کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اس میں وہ جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ انگریزی کی سادہ اور سلیس شاعری ہے

مولانا کی ادبی نگارشات میں ان کی شخصیت کے یہ سبھی رنگ جھلکتے ہیں۔ قدرت اور انسانی زندگی کا انھوں نے بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ یوں تو مولانا واقعی ایک مذہبی آدمی ہیں، لیکن وہ سائنسی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دل کے ساتھ پاسبانِ عقل کا رہنا ضروری ہے۔ وہ توہمات اور نامعقول رسوم کے مخالف ہیں۔ ان کی شاعری میں اس کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں۔ سائنسی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ مولانا کو اخلاقی اقدار کا ہمیشہ خیال رہتا ہے۔ نظم ہی میں نہیں، ان کی نثر میں بھی اس کا ثبوت ملتا ہے غرض مولانا نے جو کچھ لکھا ہے، چاہے وہ بڑوں کے لئے ہو یا بچوں کے لئے، اس میں سائنسی اور اخلاقی پہلو ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آئیے اب ذرا غور کریں کہ مولانا کے اس ادب کی مقبولیت کا راز کیا ہے جو اُنھوں نے خاص طور پر بچوں کے لئے تخلیق کیا ہے۔ مولانا اپنی ریڈروں کے دیباچے میں اس طرف خود اشارہ کرتے ہیں — فرماتے ہیں۔ ان ریڈروں میں "اوّل یہ کہ تفنّنِ طبع اور تفریحِ خاطر کی تا بمقدور رعایت کی گئی ہے، جو طلباء کے حق میں مشقّتِ مطالعہ کا ایک نعم البدل اور شغلِ درس کو دل آویز بنانے میں نہایت مؤثر ہے۔ چناں چہ مطالب و مضامین کی رنگا رنگی، ان کا نتیجہ خیز ہونا اور مختلف اوزان کی اقسامِ نظم۔ ان سب کا مجموعی اثر غالباً طلباء کی طبیعت کے لئے کافی موجباتِ ترغیب ہے۔ دوم، یہ کہ ان کتابوں کی تالیف و تصنیف کا ماخذ و منشا چونکہ مختلف علوم و فنون ہیں۔ مثلاً امثال و قصص، اخبار و سیر، آداب و اخلاق، تواریخ طبعی، تشریحِ ابدان، فزیالوجی، حفظانِ صحت، اصولِ فلاحت، علمِ انتظام وغیرہ۔ لہٰذا یہ توقع کچھ بے محل نہیں ہے کہ ان کا مطالعہ عقلی اور اخلاقی تربیت کا معاون اور واقفیت عامّہ کی توسیع کا ممد ہوگا۔"

واقعی، مولانا کے مضامین، قصّے کہانیاں، نظمیں وغیرہ پڑھ کر بچّے مندرجہ بالا مقاصد بخوبی حاصل کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ چیزیں بچّوں کی نفسیات

کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ مولانا نے بھلے ہی علم نفسیات کا باضابطہ مطالعہ نہ کیا ہو لیکن انھوں نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے بچوں کی دلچسپیوں اور ضرورتوں، صلاحیتوں اور رجحانوں کا صحیح اندازہ کر لیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشوونما کس طرح ہوتی ہے، بچے ذہنی اور جذباتی اعتبار سے منزل بہ منزل کیوں کر ترقی کرتے ہیں، کسی خاص عمر کے بچوں کو کون سی چیزیں اپیل کرتی ہیں اور عمر کی کسی منزل پر ان میں سیکھنے کی صلاحیت کس درجہ فروغ پاتی ہے۔ مثال کے طور پر چھ سات برس کے بچوں کے لئے مولانا نے خصوصاً جانوروں کی کہانیاں اور نظمیں لکھی ہیں۔ اس عمر کے بچوں کو ایسے موضوعات سے فطری طور پر دل بستگی ہوتی ہے۔ مزید، ان کی عبارت اتنی سادہ، سلیس اور آسان ہے اور اندازِ بیان اتنا دل کش ہے کہ بچے بار بار پڑھتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ان تمام کہانیوں اور نظموں میں کوئی نہ کوئی اخلاقی نکتہ ضرور موجود ہے اور اُسے ایسے عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے کہ وہ پڑھتے پڑھتے دل نشین ہو جاتا ہے۔ مولانا کی نظمیں خاص طور پر بحر اور ترنّم کے لحاظ سے بچوں کے لئے بہت موزوں ہیں۔ مثلاً 'ہماری گائے' اسی قسم کی ایک دل چسپ نظم ہے اس کی بحر چھوٹی ہے اور لَے اور تال آسان ہے جسے بچے آسانی سے ادا کر سکتے ہیں اور مطلب اتنا سیدھا سادا ہے کہ اسے سمجھنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں مولانا بچوں کی جبلّتِ تجسّس اور جذبۂ تجرّ کو بڑی کامیابی کے ساتھ اُکساتے ہیں۔ بعض نظموں میں انھوں نے موضوع کو ایک پہیلی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بچے اس قسم کی نظموں کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں، کیوں کہ اس طرح انھیں غور و فکر کرنے اور اپنے تخیل سے کام لینے کی ترغیب ملتی ہے۔ نظم کے اختتام پر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس چیز کے متعلق ہے۔ اس وقت بچوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اپنا قیاس صحیح تھا یا غلط۔ "عجیب چڑیا" اسی قبیل کی ایک نظم ہے۔ 'ریل گاڑی' کی نظم میں بھی کسی حد تک یہی خوبی پائی جاتی ہے۔

مولانا اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کی قوتِ تخیل کو بروئے کار لاتے ہیں اور انھیں زندگی کے حسن و قبح سے روشناس کراتے ہیں۔ ان کی بیشتر نظمیں اخلاقی درس کا بے نظیر نمونہ ہیں۔ وہ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں کہ اس پر پند و نصیحت کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ بات چپکے سے دل میں اُتر جاتی ہے۔ وہ جو پیغام دینا چاہتے ہیں اس کا براہِ راست ذکر نہیں کرتے بلکہ قصّے، کہانی، چٹکلے یا حکایت کا سہارا لیتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات کی روشنی میں دیکھئے تو بچوں کی تعلیم و تربیت کا یہ بہت مؤثر طریقہ ہے۔ مولانا نے اس قسم کی کئی نظمیں لکھی ہیں جن میں سے چند ایک مشہور نظموں کے عنوانات یہ ہیں:- بارش کا پہلا قطرہ، ناقدردانی، کچھوا اور خرگوش، دو مکھیاں، مور اور کلنگ، ایک پودا اور گھاس، ایک جگنو اور بچے کی باتیں، ایک گھوڑا اور اس کا سایہ، دال کی فریاد، شمع کی انگوٹھی، صبح کی آمد، چھوٹی چیونٹی۔

بچوں کے لئے مولانا اسماعیل نے جس اعلیٰ درجے کا ادب تیار کیا ہے، اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ وہ اس صنف کے اولین ادیبوں کے امام ہیں۔ مولانا کے زمانے تک اکثر ادیب یہ سمجھتے تھے کہ بچوں کے لئے کسی مخصوص قسم کا ادب درکار نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جو چیزیں بالغوں کے لئے لکھی جاتی ہیں ان ہی کو ذرا آسان زبان میں لکھ دیا جائے تو وہ بچوں کے کام آ سکتی ہیں۔ مولانا نے سب سے پہلے بچوں کے ادب کو ایک مخصوص صنفِ ادب کا درجہ عطا کیا، اُسے اپنی ذہنی صلاحیت اور فنی مہارت کے شایانِ شان گردانا اور اس میں اپنی ذات کو پورے خلوص اور لگن کے ساتھ کھپایا۔ انھوں نے بچوں کے لئے جو ادبی سرمایہ چھوڑا ہے وہ آج ساٹھ ستّر سال بعد بھی اتنا ہی مقبول ہے جیسا کہ ان کے زمانے میں تھا۔ یہ مولانا کا فن کارانہ اعجاز ہے۔ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اب تک بچوں کا کوئی ایسا ادیب منظر نہیں آیا جو اس بلندی کو چھو سکا ہو جسے مولانا محمد اسماعیل نے حاصل کیا تھا۔

سید محمد جعفری

ایبسٹریکٹ آرٹ[1]

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہِ مروّت بھی ستائش میں نے
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں
صرف کہہ سکتا ہوں اتنا ہی وہ تصویریں تھیں
یار کی زلف کو سلجھانے کی تدبیریں تھیں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی
ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

یہ سمجھنے کو کہ یہ آرٹ کی کیا منزل ہے
ایک نقّاد سے پوچھا جو بڑا قابل ہے
سبزۂ خط میں وہ کہنے لگا رعنائی ہے
میں یہی سمجھا کہ ناقص مری بینائی ہے
بولی تصویر جو میں نے اُسے الٹا پلٹا
"میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا"
اس کو نقّاد تو اک چشمۂ حیواں سمجھا
میں اُسے حضرتِ مجنوں کا گریباں سمجھا
دیر تک بحث رہی مجھ میں اور اُس میں جاری
تب یہ ثابت ہُوا ہوتی ہے یہ اک بیماری

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

---

[1] Abstract Art

ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

بولا نقّاد جو یہ آرٹ ہے تجریدی ہے
آرٹ کا آرٹ ہے تنقیدی کی تنقیدی ہے

تھا کیوبزم میں کاغذ پہ جو آتا تھا نظر
مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اُسے حسنِ بشر

بولا نقّاد نظر آتے یہی کچھ ہم تم
خُلد میں حضرتِ آدم جو نہ کھاتے گندم

ایبسٹریکٹ آرٹ بہر طور نمایاں نکلا
"قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا"

وہ خد و خال کہ ثانی نہیں جن کا کوئی آج
بات یہ بھی ہے کہ ملتا نہیں رنگوں کا مزاج

اس کو کیوبزم کا آزار کہا کرتے ہیں
اس کے خالق جو ہیں بیمار رہا کرتے ہیں

ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی

ایبسٹریکٹ آرٹ کی اس چیز پہ دیکھی ہے اساس
"تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس"

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

ایبسٹریکٹ آرٹ کا اک یہ بھی نمونہ دیکھا
فریم کاغذ پہ تھا کاغذ جو تھا سونا دیکھا

وہ ہمیں کیسے نظر آئے جو مقسوم نہیں
"لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں معلوم نہیں"

ڈر سے نقّادوں کے اس آرٹ کو یوں کہتے ہیں ہم
"شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم"

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

کیسی تصویر بنائی مرے بہکانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

۱-۲ـھ Cubism

مکتوبِ گرامی

مالک رام صاحب کا ذیل کا خط ڈیڑھ سال کے قریب ہوا موصول ہوا تھا، کچھ بحث طلب موضوعات کا حامل تھا۔ اسے اسی وقت شائع ہو جانا چاہیئے تھا لیکن کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ اب اسے شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اگر کوئی صاحب زیر بحث امور پر روشنی ڈال سکیں تو فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے میں مدد ملے۔ (ادارہ)

قاہرہ

۲۱-۱۱-۱۹۵۸

جنابِ مکرم

'آج کل' کے 'ابوالکلام نمبر' کے لئے ہدیۂ تبریک قبول فرمایئے

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مضامین، تصاویر، منظومات غرض ہر عنوان سے بہت کامیاب ہا۔

اس وقت مجھے حمیدہ سلطان کے مضمون 'زلیخا' کی ایک غلطی کی طرف اشارہ کرنا منظور ہے۔ لکھتی ہیں:

"مولانا آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی تو وہ بارہ سال کے معصوم لڑکے اور زلیخا بیگم چھ سال کی ننھی منّی بچی تھیں۔" (ص ۱۱۹)

اگر یہ صحیح ہے تو ان کا نکاح ۱۹۰۰ء میں ہوا ہوگا کیونکہ انھوں نے خود 'تذکرہ' میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۸۸ء لکھی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۰ء کا نکاح غلط ہے۔ جناب بیگم صاحبہ کا انتقال ۱۹- اپریل ۱۹۴۳ء کو ہوا جیسا کہ اس مضمون میں حمیدہ بیگم صاحبہ نے بھی لکھا ہے۔ اس سانحے پر جو خط مولانا نے نواب صدر یار جنگ مرحوم کو لکھا تھا اور جو 'غبارِ خاطر' میں شامل ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں (یہ خط 'آج کل' میں بھی نقل ہوا ہے)

"اس طرح ہماری چھبیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے" (ص ۷۰)

یہاں انھوں نے صراحت سے اپنی ازدواجی زندگی کی مدت ۲۶ برس رکھی ہے۔ چونکہ بیگم کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا تو ثابت ہوا کہ نکاح ۱۹۱۷ء میں ہوا تھا نہ کہ ۱۹۰۰ء میں جیسا کہ حمیدہ سلطان نے لکھا ہے۔

سیرت و سوانح کے بیان میں ایسی غلطی بہت سی اور غلط فہمیوں کی بنیاد بن سکتی ہے اس لئے اس سے اجتناب لازم ہے۔ اسی طرح کی ایک اور غلطی پچھلے دنوں ایک سرکاری بیان میں نظر سے گذری جہاں کسی ادارے کے افتتاح کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا کہ ۱۱- نومبر مولانا کا یومِ ولادت ہے۔ مولانا نے 'تذکرہ' میں لکھا ہے کہ میں "۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہستیٔ عدم سے عدمِ ہستی نما میں وارد ہوا"۔ ۱۳۰۵ھ میں ذوالحجہ کی پہلی ۹- اگست ۱۸۸۸ء کو ہوئی تھی اور محرم ۱۳۰۶ھ کی پہلی ۷- ستمبر ۱۸۸۸ء کو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیدائش ۹- اگست اور ۷- ستمبر ۱۸۸۸ء کے درمیان ہوئی۔ اس لئے ۱۱- نومبر کی تاریخ کسی طرح درست نہیں ہو سکتی۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

جی۔ ایس آزاد

تیرتھ یاترا

پوس کا مہینہ تھا۔ کھیتوں میں سرسوں کے بسنتی پھول جاں فزا اور روح پرور بہار دکھا رہے تھے۔ بیچ بیچ میں مٹر کے گلابی، بینگنی اور السی کے نیلے پھول اپنے نرم نرم ڈنٹھلوں پر یوں جھوم رہے تھے جیسے پتلی کمر والی معصوم لڑکیاں رقص کے انداز میں ناچ رہی ہوں۔ چاروں طرف ہریالی اور رنگینی بکھری پڑی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ گنے کے کھیت کے پاس سے نکل کر بوڑھی بھگتن سرسوں کے کھیت میں چلی گئی اور ہرا ہرا ساگ نوچ کر اپنے آنچل میں رکھنے لگی۔ پاس ہی ادہر کے کھیت میں سے کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے گاؤں کے زمیندار اور مہاجن شودیال نکلے اور بولے۔ "کہو بھگتن ساگ چُن رہی ہو؟"

"ہاں بھیّا، سوچ رہی تھی کہ اب تو پھول آ ہی رہے ہیں۔ دو چار دن اور ساگ کھا لوں، پھر اس سال ساگ کہاں ملے گا۔"

"انسان کی زندگی کی طرح ساگ پات کی زندگی بھی چھوٹی ہی ہوتی ہے۔"

"لیکن اس چھوٹی سی زندگی میں آدمی پتہ نہیں کتنے بڑے کام کر جاتا ہے۔"

شودیال چلتے چلتے بولے۔ "بھگتن سنا ہے کہ تم تیرتھ یاترا کو جانے والی ہو؟"

بھگتن نے ساگ چننا بند کر دیا اور سیدھی کھڑی ہو کر بولی:

"بھیّا سوچتی ہوں زندگی میں نہ جانے اب تک کتنے پاپ کئے ہیں۔ اب اس آخری وقت میں بھی کچھ دھرم کرم نہ کیا تو پرلوک کیسے سدھرے گا۔ اب تو چیت کے مہینے میں بدری ناتھ کے درشن کرنے کا ارادہ ہے۔"

"اس کے لئے روپیہ پیسہ ہے؟"

"رام کی کرپا سے دو چار سو روپے اکٹھے ہو ہی گئے ہیں۔"

"اچھا یہ تو کافی ہیں۔۔ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنے کے معاملے میں بڑی چالاک ہو گئی ہو۔"

"چالاک کیا ہونا ہے بھیّا۔ جیون بھر لے دے کر یہی تو جوڑا ہے۔ جانتے ہو کہ جب بھگت جی سورگ سدھارے تھے تو ان کے کفن کو بھی کچھ نہیں تھا، لیکن کسی نہ کسی طرح کام چل گیا۔ تب سے ہزار طرح کی مصیبتیں جھیل کر پیٹ پالتی رہی ہوں۔ اپنی اس گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے کچھ بچا کر اکٹھا کیا تبھی بھگوان رام نے یہ دن بھی دکھایا کہ کل کو ان کے لئے کچھ کر سکوں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" شودیال کہتے ہوئے چلے گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ چار سو روپے کو ایک آنہ روپیہ ماہوار سود پر غریبوں کے ہاتھ اٹھا دینے سے چاندی ہی چاندی ہے۔

پوس میں جاڑا بہت پڑتا ہے۔ پوجن چمار نے سوچا کہ بچھڑے کو باہر باندھتا ہوں تو رات میں ٹھٹھر جائے گا اسی لئے وہ اسے اب پوس کے مہینے گھر کے کنارے والی کوٹھڑی میں باندھتا تھا۔ گیہوں کا کھیت سینچ کر شام کو وہ گھر لوٹا اور بچھڑے کو اندر باندھ کر نکل ہی رہا تھا کہ باہر پڑے ہوئے گنے کی پتیوں کے گٹھڑ پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے سوچا کہ آج کل کسی کا بھروسہ نہیں ہے۔ اندھیرے میں کوئی اسے اٹھا لے جائے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اس لئے اس نے گٹھڑ اٹھایا اور اسی کوٹھڑی میں لے جا کر پٹک دیا۔ جھک کر گٹھڑ کو سیدھا کر رہا تھا کہ پھٹی قمیض کی جیب سے نکل کر کچھ زمین پر آ پڑا۔ اس نے ہاتھ سے زمین کو ٹٹولتے ہوئے آواز دی۔ "روپا، او روپا، اری دیا تو لا۔"

اس کی بیوی دیا دبا لے کر آئی اور بولی ۔ "کیا ہوا ہے ؟"

"جیب میں ادھنی پڑی تھی ۔ وہی گر پڑی ۔" پوجن نے دیا اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ۔ بائیں ہاتھ سے گٹھڑ کو کھسکا کر دیکھ ہی رہا تھا کہ داہنا ہاتھ تھوڑا سا کانپ گیا اور دیئے کی لو ایک پتی سے ٹکرا گئی ۔ پتی سے لو بڑھ کر گٹھڑ میں لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے گٹھڑ جلنے لگا ۔ پوجن دوڑ کر باہر گیا مگر مٹکے میں پانی نہ ملا ۔ ناچار لاٹھی پیٹ پیٹ کر آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا ۔ لاٹھی جہاں گرتی وہاں کی آگ تو بجھ جاتی مگر باقی حصہ جلتا ہی رہتا ۔ نیچا گھر ٹھہرا ۔ آگ نے چھپر گھیر لیا ۔ ددیا جان گئی کہ آگ پر قابو پانا مشکل ہے ۔ وہ چلّائی "بچھڑے کو نکالو ۔ بچھڑے کو ۔"

بچھڑا آگ دیکھ کر بدک گیا ۔ اپنے کھونٹے کے چاروں طرف اُچھل کود کرنے لگا ۔ پوجن اُسے کھولنے گیا تو وہ اور کودنے لگا ۔ اس لئے بچھڑے کو کھولنے میں دیر لگ گئی اور آگ تو پھر آگ ہی ہے ۔ بچھو کے زہر کی طرح وہ تو بڑھنا اور پھیلنا ہی جانتی ہے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھپر جلنے لگا ۔ اب میاں بیوی دونوں چلّانے لگے ۔ "ارے دوڑیو ! ہمارے گھر میں آگ لگی ہے آگ ۔"

چماروں کی دس گھروں کی یہ بستی تھی ۔ تمام گھر ایک دوسرے سے لگے ہوئے بنے تھے اور سبھی چھپر کے تھے ۔ وہاں کہیں نزدیک کوئی کنواں نہیں تھا ۔ دور کھیتوں کو پانی دینے کے لئے جو کنوئیں بنے ہوئے تھے وہیں سے پانی آتا تھا ۔ ایک برساتی جوہڑ تھا جس کا پانی دو ماہ پہلے ہی سوکھ چکا تھا ۔

آگ لگنے کا شور سن کر جو چمار کھیتوں سے لوٹ رہے تھے وہ دوڑ پڑے ۔ کوئی مٹکا لے کر کنوئیں کو دوڑ پڑا ۔ کوئی سوکھے ڈھول لے کر بھاگا آیا اور بہت سے کھڑے ہو کر ہائے ہائے کرنے لگے ۔ چھپر جل رہا تھا ۔ اس سے بڑی بڑی لپٹیں نکل رہی تھیں ۔ دروازے سے دھواں نکل رہا تھا اور بڑی بڑی چنگاریاں اڑ رہی تھیں ۔

آس پاس کے گھر والے اپنے اپنے چھپر گرا رہے تھے ۔ کچھ لوگ گھروں سے سامان نکال کر باہر لا رہے تھے ۔ ہر شخص پریشان تھا ۔ ایسے میں ایک کو دوسرے کی فکر نہیں تھی ۔ سب اپنے آپ کو بچانے میں لگے ہوئے تھے ۔

دس منٹ کے اندر اندر پوری بستی میں آگ پھیل گئی ۔ اسی وقت دور سے ایک عورت چلّاتی ہوئی آئی اور اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہو کر چھاتی پیٹ پیٹ کر چلّانے لگی ۔ "ہائے میرا موا اسی میں رہ گیا ۔ ارے اسے نکالو میرا لال چارپائی پر سو رہا ہے ۔ میں اب کیا کروں ؟ میں ضرور اندر جاؤں گی اور اُسے اُٹھا کر لاؤں گی ۔" اس کا چہرہ قدرے سرخ ہو گیا تھا ۔

وہ دیوانہ وار اپنے گھر میں گھسنے لگی ۔ لوگوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ممتا کی ماری نہیں رُکی ۔ بلا خوف و خطر وہ اندر چلی گئی اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سے اپنے بچے کو لے کر باہر آ گئی ۔ اس کا ایک ہاتھ بُری طرح جھلس گیا تھا اور اس کی دھوتی بھی جل گئی تھی ۔ اس کا بچہ بھی آگ میں بُری طرح جھلس گیا تھا ۔ اس کے بال جل گئے تھے اور جسم پر بڑے بڑے پھپھولے پڑ گئے تھے ۔ بچہ شدید درد سے چیخ رہا تھا ۔ عورت دور جا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں موند کر بچے کو اپنی چھاتی سے لگا لیا ۔

جو لوگ پانی لانے گئے تھے وہ تھوڑی دیر میں مٹکوں اور گھڑوں میں پانی لے کر لوٹ آئے ۔ پانی چھڑکا جانے لگا لیکن بھلا اوس سے اونٹ کی پیاس کیا بجھتی ۔ آگ پھیلتی ہی گئی اور آن کی آن میں چماروں کی پوری بستی کی دیواریں ننگی ہو کر رہ گئیں ۔

یہ آگ گاؤں والوں کے لئے بہت منحوس ثابت ہوئی ۔ پسینہ بہا کر پیٹ کاٹ کر بنی ہوئی غریب کسانوں کی جھونپڑیاں پل بھر میں خاک ہو کر رہ گئیں

گاؤں کے اونچی ذات کے لوگ بھی وہاں اکٹھے ہو گئے تھے اور چماروں کی روتی ہوئی عورتوں، من مارے ہوئے نوجوانوں اور بھگوان کے عذاب یعنی اس دوزخی آگ میں جھلسے ہوئے بچوں اور بوڑھوں پر خیال آرائیاں کر رہے تھے ۔ ایک براہمنی کہہ رہی تھی ۔ "میں تو تڑکا دی چھیل کر اُٹھی ہی تھی کہ سنا آگ لگ گئی ۔ میری ساس نے تو بہت روکا کہ چماروں کی بستی میں کہاں جاؤ گی مگر میں تو بھاگ آئی ۔ ہمیں آدمی سے آدمی کا دکھ درد دیکھا جاتا ہے ۔"

دوسری بولی ۔ "بہن مجھے تو ان سب کو دیکھ کر بڑی دیا آ رہی ہے ۔ بے چارے کیسے رونی صورت بنائے بیٹھے ہیں ۔"

ایک طرف ایک اہیرن اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی ۔ "بے چارے کیسی تیزی اور پھرتی سے اپنی چیزیں سنبھال رہے ہیں ۔"

شوہر بولا ۔ "بچاری چھالی کا لڑکا ہی اندر رہ گیا تھا ۔ وہ جلتے گھر میں سے اُسے اُٹھا لائی ۔"

"ماں کا دل جو ٹھہرا ۔ آگ کی پرواہ نہیں کی اور اپنے بچے کو اُٹھا لائی ۔ بے چارے دونوں ہی جل گئے ہیں ۔" بیوی سسک کر بولی ۔

دوسری طرف خود کو ذمہ دار سمجھنے والے لوگوں کی بات چیت ہو رہی تھی۔ "کافی نقصان ہوا ہوگا غریبوں کا۔ بہت سا سامان جل گیا ہے۔"

"اب یہ لوگ کیا کریں گے؟"

"رات کسی نہ کسی طرح گزار دیں گے۔ پھر صبح کچھ کریں گے ہی۔"

"کیوں نہ بڑے مہاجن تک ان کی فریاد پہنچا دیں؟"

"اجی چھوڑو ان باتوں کو ہمیں کیا پڑی ہے۔ مہاجن ناراض ہو جائے گا چماروں کی فریاد سن کر۔"

تھوڑی دیر تک یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اپنے اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ وہاں رہ گئے وہی بدنصیب، سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے غریب چمار۔ کھلے آسمان کے نیچے سردی بڑھنے لگی تھی اس لئے ان بدنصیب لوگوں کا کارواں اپنا بچا کھچا سامان اٹھا کر پیڑوں تلے پناہ لینے باغیچے کی طرف چل دیا۔ ان دبلے پتلے انسانوں کے بدن پر پھٹے پرانے کپڑے تھے اور ان کے پیٹ خالی تھے۔

جو لوگ اپنی گدڑیاں بچا لائے تھے وہ انھیں کو زمین پر بچھا کر پڑ رہے۔ باقی لوگ سوکھی پتیاں اکٹھی کر کے اور انھیں جلا کر تاپنے لگے۔

تھوڑی دیر میں سوکھی پتیاں ختم ہو گئیں، چاند بھی نکل آیا۔ چاندنی پھیل جانے سے سردی بہت بڑھ گئی۔ ایک پیڑ سے پیٹھ لگا کر بیٹھے ہوئے پوجن نے اپنے آپ کو گدڑی میں لپیٹتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "ردیا رات کیسے کٹے گی؟"

"رام جانے کیسے کٹے گی، دانت تو ابھی سے کٹکٹانے لگے ہیں۔"

جسم اکڑا جا رہا ہے۔ خون جم رہا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے آج رات پالا ضرور پڑے گا۔"

پاس ہی چھالی اپنے پتی دیو چنو کی بغل میں بیٹھی تھی۔ اپنی گود میں سے رموا کو پیڑ کے پتوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی میں نکال کر بولی۔ "صبح اس کو قصبے کے سرکاری ڈاکٹر کے ہاں لے چلیں گے۔"

"ہوں۔" چنو بغیر دھیان دئے ہوئے بولا۔

"بھگوان رات پار لگا دیں۔"

"رات ہی تو پہاڑ ہے۔ دیکھتی نہیں ہو گھرتی چلی آ رہی ہے۔ جسم کے رونگٹے سردی کے مارے کھڑے ہو گئے ہیں۔ جسم بے جان سا ہو رہا ہے۔"

"ہائے کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا؟ پچھلے جنم میں جو پاپ کئے ہیں انھیں کا پھل ملے گا۔ اس وقت نہ جانے کتنے لوگ نیچے گرم گرم گدے اور اوپر سے بڑھیا لحاف اوڑھے سو رہے ہوں گے مگر ہم ایسے بدنصیب ہیں کہ گھر جلنے سے پہلے بھی ایک پھٹے کمبل کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بھگوان سے ہمیں کوئی گلہ نہیں۔ ہمارے بدن پر پھٹی قمیض اور دھوتی ہی بہت ہے غنیمت ہے تیری یہ کرپا۔ امیروں کے پاس درجنوں بڑھیا کپڑے ہوتے ہیں تو ہی انھیں دیتا ہے کیا اب اس وقت تجھے ہم پر ترس نہیں آتا۔ کیا ہم سدا اپنی قسمت کو روتے رہیں گے۔"

کچھ دور پر پڑے ہوئے رام جی نے اپنی بیوی ردھیا سے کہا۔

"مجھے تو اس سردی میں بھوک لگ رہی ہے۔"

"مجھے بھی لگ رہی ہے۔ ایک بات بتاؤں؟" شوہر کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر رازدارانہ انداز میں بولی۔ "چنو آج دوپہر کو آلو کھود کر لایا تھا۔ وہ ابھی اس کے گھر پر پڑے ہوں گے۔"

رام جی فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ردھیا بولی۔ "میرے لئے بھی لانا۔"

"ہاں ہاں" کہہ کر دبے پاؤں وہ باغیچے سے کھسک گیا۔

باغیچے سے باہر آتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سرجو کے برفیلے پانی میں آدھی رات کو کھڑا ہو گیا ہو۔ قمیض میں بٹن نہیں تھے اور وہ پیٹھ پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سردی پیٹ اور پیٹھ کو ایک کر دے گی۔ اس نے دونوں ہاتھ باندھ کر اپنی چھاتی دبا لی۔ جھک کر چلنے میں اسے آرام سا محسوس ہوا۔ مینڈھ اوس سے بھیگ گئی تھی جو تلوؤں کو بڑی تکلیف دے رہی تھی۔

گھر کے پاس آ کر جب وہ دروازے پر کھڑا ہوا تو اسے کچھ گرمی محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اندر گھس گیا۔ گرم گرم راکھ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ گرم دیواروں پر ٹھنڈی چاندنی بھی کوئی اثر نہیں کر سکی تھی۔ راکھ میں وہ ہاتھ سے جگہ جگہ ٹٹولنے لگا۔ اس میں کئی بار اس کا ہاتھ جل بھی گیا۔ چھپر کی لکڑیاں ابھی جل کر ختم نہیں ہوئی تھیں بلکہ راکھ میں پڑی سلگ رہی تھیں۔ ایک جگہ جلتے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں کے بیچ میں کچھ آلو پڑے ہوئے ملے۔ اس نے ایک آلو اٹھا لیا جو بھن کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ اس نے اسے پھوڑا۔ اندر سے کچھ جلا ہوا گودا نکلا۔ گودے کو اس نے فوراً منہ میں رکھ لیا۔ زبان جل گئی اور منہ میں

پانی بھر گیا۔ کسی طرح اس نے اس کو گلے سے نیچے اُتارا۔ اسی طرح زبان جلاکر اس نے کئی ٹکڑے کھائے۔ رودھیا کی بات وہ بالکل بھول گیا تھا اور اگر یاد بھی آئی ہوگی تو اس نے جان بوجھ کر بھلا دیا ہوگا جب سب آلو ختم ہوگئے تو وہ اُٹھا۔

لوٹتے وقت شکر قندی کے کھیت میں سے کچھ کھودنے کے خیال سے وہ مینڈھ پر بیٹھا ہی تھا کہ رکھوالے کی "کون ہے رے؟" کی آواز سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گنّے کا کھیت دیکھا تو اس کے منہ میں پانی آگیا۔ دھیرے سے اس نے ایک گنا توڑنا چاہا لیکن آہٹ ہوگئی۔ کھیت کے دوسری طرف کوئی زور سے کھانسا۔ گنّے کے کھیت کا مالک جاگ رہا تھا اس پر بھی وہ ایک گنا لے کر بھاگ ہی گیا اور کھیت کے پاس والے ایک ٹیلے کی آڑ میں آکر اُسے چوسنے لگا۔

باغیچے میں رودھیا اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔

رودیا اور پوجن نے تنگ آکر سردی کا ذکر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ پڑے ہوئے تھے۔

چنو پاؤں کو سکیڑے پڑا تھا۔ چھالی بچے کے بخار سے تپتے جسم کو اپنے ٹھنڈے بدن سے لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

جیسے جیسے رات ڈھلتی جاتی تھی چاندنی کی وجہ سے سردی بڑھتی جاتی تھی اچانک دور کہیں گنا چوستے ہوئے گیدڑوں کی آواز اس سنسان فضا میں پھیلنے لگی۔ ہوآں ہوآں کا شور جنگل کے پیڑوں سے ٹکرانے لگا۔ چھالی چونک سی گئی۔ بچے کی سانس گھرر گھرر چل رہی تھی۔

پاس ہی سے ایک لومڑی "کھل ہو ہو" کرتی ہوئی بھاگی۔ چھالی نے خوف اور سردی سے کانپتے ہوئے آس پاس دیکھا۔ سبھی چپ چاپ چھاتی اور گردن سے گھٹنے لگائے پڑے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنی طرف دیکھا۔ پھٹی قمیض کو چیرتا ہوا جاڑا چھاتی کو برف کئے جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کم بخت پسلیوں میں گھس جائے گا۔ رموا کو ایک بار دیکھ کر اس نے اپنے بازوؤں میں اور بھینچ لیا۔

گاؤں کے پیپل کے پیڑ پر اُلّو "ہوں آؤں آؤں" چلا رہا تھا۔ اس کی چیخوں سے فضا اور بھی بھیانک ہو رہی تھی۔ کسی دوسرے گاؤں میں ایک کتے کے رونے کی آواز آئی اور اوپر پیڑ پر ایک چڑیا "موآؤں موآؤں" کرنے لگی۔ چھالی خوف سے بُری طرح کانپنے لگی۔ اس نے بچے کی طرف پھر دیکھا اور اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھ کر آنکھیں بند لیں۔

مشرق میں صبح کا نور پھیلنے لگا اور خوشگوار ہوا چلنے لگی۔

اس وقت ستو دیال مہاجن کا لڑکا کرشن دیال اُٹھا اور گرم کپڑے پہن کر ہوا خوری کے لئے باہر نکلا۔ گرم گرم بستر اور لحاف سے باہر نکل کر ٹہلنے کو وہ بہت بڑی ہمت کا کام سمجھتا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا، "میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کے لئے کتنی بڑی قربانی کر رہا ہوں۔"

ستو دیال کو بھی کچھ کام تھا اس لئے وہ بھی کمبل اوڑھے کچھ جلدی ہی باہر نکل آیا تھا۔ بڑے بڑ کے پیڑ کے پاس وہ مڑا اور ادھر سے کرشن دیال اپنی دُھن میں مست نکلا۔ سامنے باپ کو دیکھ کر اس نے منہ کا باجا بجانا بند کر دیا۔ ستو دیال اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور بولے "بیٹا کچھ کام دھندے کا بھی خیال کیا کر۔ ابھی تو میں زندہ ہوں، کچھ دنوں بعد جب میں تیرتھ پر چلا جاؤں گا تو تمہارے ہی اُوپر ساری ذمہ داری آجائے گی۔"

کرشن دیال نے دل ہی دل میں باپ کی اس تیرتھ یاترا پہ ہنستے ہوئے بناوٹی حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا: "کیا آپ تیرتھ پر جا رہے ہیں؟"

"ہاں سوچتا ہوں کہ اس جیٹھ میں بدری ناتھ جی کے درشن کر آؤں۔ گاؤں کی بھگتی بھی جانے گی۔"

آگے چل کر دونوں الگ الگ راستوں پہ ہو گئے۔ ستو دیال آموں کے باغیچے کی طرف چل دیا۔ پھر رُک کر اس نے کرشن دیال سے کہا۔ "ذرا اگلے گاؤں کی طرف چلے جاؤ۔ وہاں کے سب برہمنوں کو نیوتا دینا ہے۔ کہنا کہ نیا مکان ہو لیا ہے۔ اس کے مہورت کے سلسلے میں انہیں دعوت دے رہے ہیں۔ وہاں کے بنئے ہری چرن سے کہنا کہ دس روپے کا گڑ اور دس روپے کی چینی دے جائے۔ اور دیکھو زیادہ دیر مت لگانا۔ گھر جا کر پوریاں تلوانے کا کام دیکھنا ہے۔ کم سے کم سو آدمی آئیں گے۔"

باغیچے میں سبھی چمار سورج دیوتا کے نکلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سردی میں وہی تو ایک سہارا تھا۔ ستو دیال کو دیکھتے ہی چنو دوڑ پڑا۔ قریب آکر پاؤں پر گر پڑا اور بولا۔ "مالک بڑی مصیبت میں پڑا ہوں۔"

"تو میں کیا کروں؟" ستو دیال نے کچھ پیچھے ہٹ کر دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی تو ہمارے سب کچھ ہو سرکار۔"

"میں کیا ہوں۔ پہلے تو زمیندار اور کاشتکار کا رشتہ تھا۔ اب تم لوگ زمینوں کے خود مالک بن بیٹھے ہو۔ ہمارا تمہارا کیا رشتہ؟"

"سرکار بڑی مصیبت میں ہوں - رات آگ لگ گئی - سب کچھ جل کر خاک ہو گیا - کچھ بھی نہیں بچا ہے - بچہ بھی جھلس کر مر گیا - اب اُس کے کفن بھر کے لئے بھی کچھ نہیں بچا - کیسے کام چلے گا؟ مالک تمھارے پاؤں پڑتا ہوں - کچھ مدد کرو -"

شو دیال نے سُنی اَن سُنی کرکے کہا - "ارے میں کیا کر سکتا ہوں -"

"آپ ہمارے مائی باپ ہو - دکھ درد میں آپ مدد نہ کریں گے تو اور کون کرے گا؟ مجھے کچھ روپے دے دو تو کم سے کم رموا کی لاش کا بندوبست کر دوں - ایک آنہ روپیہ مہینہ سود دوں گا -"

شو دیال نے روکھے پن سے جواب دیا - "خواہ کتنا بھی سود دو مگر میرے پاس آج کل ایک پیسہ بھی فالتو نہیں ہے - میں خود غریب ہو رہا ہوں آج ہی نئے مکان کا "گرہ پرویش" ہے - اس میں کم سے کم سو روپے کا خرچ ہے - پھر کرشن دیال کی شادی بھی کرنی ہے اسی میں ہزاروں پار ہو جائیں گے سب کا ابھی سے انتظام کرنا ہے -"

"بہت جلدی واپس کر دوں گا مالک -"

مگر شو دیال دو آنے روپیہ مہینہ سود چاہتا تھا - کچھ نہیں بولا اور آگے چل دیا -

بھگتن نیم کی چھال اتارنے کے لئے کھرپا لئے باغیچے کی طرف آرہی تھی - باغیچے میں کچھ لوگوں کو پڑے دیکھا تو اور قریب آگئی - دیکھا تو پیڑ کے تنے سے پیٹھ لگائے چھالی بیٹھی تھی - اس پاس کچھ چمار بھی تھے - بغل میں ہی چنو گال پر ہاتھ رکھے اداس بیٹھا تھا - سامنے زمین پر رموا پڑا تھا - اس کا جسم نیلا پڑ گیا تھا - پھپھولے پھوٹ گئے تھے - اور اس کے آس پاس چیونٹے رینگ رہے تھے - بھگتن نے یہ نظارہ دیکھا تو ہکا بکا رہ گئی اور بولی: -

"ارے یہ کیا ہوا؟ تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

کوئی جواب نہ پا کر اس نے سب کی طرف دیکھا - پوجن نے کہا - "رات ہماری جھونپڑیاں جل گئیں - بس یہ اسی آگ کا نتیجہ ہے -"

"تو سر جھکائے اور گم سم کیوں بیٹھے ہو؟"

"جو نصیب میں لکھا ہے بھگت رہے ہیں - کیوں ہم چماروں کے گھر میں جنم لیتے اور کیوں اس طرح دانے دانے کو محتاج ہوتے - سب پچھلے جنم کے کرموں کا پھل مل رہا ہے -"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا ہے! ایسے ہی بیٹھے رہیں گے -"

"تو ایسے کیسے کام چلے گا؟"

"پھر؟"

"ارے کچھ کرو بھی تو - جو ہوا سو ہوا، آگے کی اب کچھ سوچو -"

"آگے کی کیا سوچیں - جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہے - دیال بابو کے پاؤں پڑے، منت سماجت کی - مگر وہ پسیجا ہی نہیں - نئی جھونپڑیاں بنانے کے لئے کہاں سے روپیہ لائیں؟"

بھگتن کچھ دیر چپ چاپ کھڑی سوچتی رہی - پھر چلنے لگی - قدم اٹھایا ہی تھا کہ نظر رموا پر پڑی - اسے دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور وہ ٹھہر گئی - رموا پہ نگاہ اٹھا کر پھر جب ان مصیبت زدہ لوگوں کی حالت زار کو دیکھا تو بھگتن کو وہ دن یاد آگئے جب بھگت کا انتقال ہوا تھا اور ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا -

وہ پھر چلنے کو ہوئی - اچانک ہی اس کی آنکھوں میں ہمدردی اور مجبوری کے ملے جلے آنسو چھلک آئے اور ان آنسوؤں نے اس کا راستہ روک لیا - وہ ماں نہیں بنی تھی تو کیا - وہ عورت تو تھی - اس کے دل میں دیا، دھرم اور رحم کا چشمہ جو چھپا تھا -

تبھی چنو نے کہا - "ایک آنہ روپیہ سود ......"

"تو کیا مہاجن تم لوگوں سے سود مانگتے تھے؟" بھگتن نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے پوچھا -

"ہم تو اتنا دے رہے تھے انھوں نے تب بھی قرض نہیں دیا -"

"اچھا! جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے اس کی اتنی ہی زیادہ پیاس بڑھ جاتی ہے - تم فکر نہ کرو - میرے پیچھے کوئی رونے پیٹنے والا نہیں کہ جس کے لئے میں کچھ جوڑ کر رکھوں - آج سے میرا تمام روپیہ پیسہ تمھارا ہے -"

اس کے بعد ان لوگوں میں کچھ بات چیت اور ہوئی - پھر بھگتن نے کہا - "میں نیم کی چھال لے آؤں - تم لوگ بے فکر ہو کر اپنے کام پر لگ جاؤ -"

نیم کے پیڑ سے وہ چھال کاٹ رہی تھی کہ ادھر سے شو دیال لوٹ کر آتے دکھائی دیا - شو دیال آتے ہی رک گیا اور مسکرا کر بولا: - "بھگتن
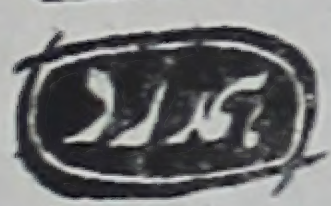
رات میں نے ایک بہت بڑی بات سوچ ڈالی ہے۔"

"کیا؟"

"تمہارے ساتھ میں چیت کے مہینے میں بدری ناتھ کے درشن کرنے چلوں گا۔"

"میں تو درشن کرنے نہیں جا رہی ہوں۔"

"ایں!"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"یوں ہی - میں اب تیرتھ یاترا کے لئے نہیں جاؤں گی۔"

"تو پرلوک کیسے سدھرے گا؟ زندگی بھر کے پاپ کیسے دھلیں گے؟"

"زندگی بھر کے پاپ جیون کے پن اور اچھے کرموں سے دھلیں گے یہ لوک سدھر جانے پر پرلوک رام سدھار دیں گے۔" بھگتن نے چھال کاٹتے ہوئے مستقل مزاجی سے کہا: "میں نے تو آج بدری ناتھ کے درشن یہاں ہی کر لئے ہیں۔ اب آپ کے ساتھ جانا فضول ہی ہوگا۔"

"بدری ناتھ کے درشن یہاں ہی کر لئے ہیں؟ یہاں کہاں؟؟"

بھگتن نے انگلی سے اس طرف اشارہ کر دیا جہاں باغیچے میں مصیبت اور افلاس زدہ چمار منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔

شو دیال ہکا بکا ہو کر اس طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ رات بھر میں یہ کیا شعبدہ سا ہو گیا۔

ضروری اطلاع

قبول شدہ منظومات کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس لئے کچھ مدت تک غیر طلبیدہ نظمیں عام طور پر قبول نہیں کی جائیں گی۔